
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نومبر 2017
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
رفعت سراج اور شیریں حیدر کے پُراثر قسط وار ناول
رائٹرز وریڈرز کی خوشگوار تقریب کا احوال رخ چوہدری کے قلم سے

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313-35802552 , E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام! السلام علیکم......

بچوں کو مستقبل کا معمار کہا جاتا ہے۔ انہی بچوں کو ملک وقوم کا سرمایہ بھی کہا جاتا ہے اور انہی سے ڈھیروں ڈھیر امیدیں بھی وابستہ کی جاتی ہیں، بے شک بچے اپنے، اپنے خاندان کا اثاثہ، معاشرے کا سرمایہ اور ملک وقوم کے لیے خزانہ بے بہا ہوتے ہیں......مگر کون سے بچے......؟ کیا بھوک وافلاس کے مارے بچے......یا وہ جو کم عمری میں اپنے خاندان کی کفالت کے لیے سخت ترین محنت اور جفاکشی کی تصویر بنے کبھی کسی ورکشاپ پر......کبھی چائے خانوں میں گاہکوں کے آگے چائے کی پیالیاں رکھتے اور میزیں صاف کرتے ہوئے اور کبھی قیمتی گاڑیاں دھوتے ہوئے......ان مراعات یافتہ طبقے کے بچوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں جو کلف لگا یونیفارم پہنے قیمتی بستے لٹکائے مہنگے ترین اسکولوں میں جا رہے ہوتے ہیں۔

لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ بچوں کا عالمی دن تو بڑے شاندار طریقے سے منایا جا رہا ہے مگر جن کے لیے منایا جا رہا ہوتا ہے ان کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ تو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں......طبقۂ امرا کے بچوں کو اس سے کوئی سروکار ہی نہیں ان کے لیے تو مراعات بڑے، بڑے نقشین تھالوں میں رکھی رہتی ہیں اور غریب ترین طبقے کے بچے دو وقت کی روٹی کے لیے کبھی محنت مزدوری میں سرگرداں اور کبھی اخلاقیات کا درس بھولے والدین کے زیر سرپرستی چھوٹی عمر سے ہی ہیرا پھیری اور چوری چکاری کی تربیت میں مصروف......اب رہ گیا متوسط طبقہ تو وہ معاشرے میں ایک معزز مقام بنانے کے لیے تمام عمر ڈولتا ہی رہتا ہے......بنیادی ضروریات اور سہولیات کا عدم توازن اور مراعات کی غیر منصفانہ تقسیم اسے اپنی ہی زمین پر قدم جمانے نہیں دیتی ایسے میں بچوں کا عالمی دن منانا تو محض میڈیا اور این جی اوز کی ذمے داری رہ جاتی ہے تاکہ ریٹنگ کا تناسب اور فنڈز کا حصول برقرار رہے انہیں کہیں بے خبری کے خمیازے نہ بھگتنے پڑ جائیں اور ساتھی میڈیا ہاؤس بازی نہ لے جائیں۔

جہاں تک بچوں کے اصل حقوق کی بات ہے تو اس کا مکمل نصاب تو ہمیں چودہ سو سال پہلے ہی مل چکا ہے جو ہماری اپنی ہی غفلت اور کوتاہی سے رائج نہ ہو سکا۔

اس دن کے حوالے سے صرف اتنا ہی کہیں گے کہ کیا ایک دن منا لینا بچوں کے حقوق سے آگاہی اور وقتی اطلاق کے لیے کافی ہے......؟ اس پر تو اجتماعی عملی اقدام کی ضرورت ہے۔

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہوگا۔ اور ان کے اوپر سے (وہی) ان کا اوڑھنا، اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۴۱) اور وہ لوگ جو ایمان لاچکے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، ہم کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ (۴۲) اور جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہوگا، وہ ہم نکال دیں گے، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے ہر قسم کی حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی۔ اور ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ کرتا۔ بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق کے ساتھ آئے تھے۔ اور انہیں ندا دے دی جائے گی کہ تم جو عمل کیا کرتے تھے اس کی وجہ سے یہ جنت ہے جس کے تم وارث بنا دیے گئے ہو۔ (۴۳) اور جنت والے دوزخ والوں کو آواز دیں گے کہ جو کچھ ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ ہم نے یقیناً پالیا۔ تو کیا تم سے جو کچھ تمہارے پروردگار نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اسے ٹھیک پالیا۔ وہ جواب دیں گے کہ ہاں۔ پھر ایک آواز دینے والا ان کے درمیان آواز دے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (۴۴) یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس میں کجی پیدا کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں (۴۵) اور ان دونوں (گروہوں) کے درمیان پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ہر ایک کو ان کے نشانوں سے پہچان لیں گے۔ اور جنت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ وہ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے حالانکہ وہ خواہش رکھتے ہوں گے (۴۶) اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی، وہ کہہ اٹھیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالموں کی قوم کے ساتھ نہ رکھیو (۴۷)۔ اور اعراف والے ان لوگوں کو آوازیں دیں گے جنہیں وہ ان کی پیشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہاری جمعیت، اور جو کچھ تم تکبر کیا کرتے تھے۔ تمہارے کام نہ آئے۔ (۴۸) کیا یہی وہ لوگ تھے جن کی نسبت تم قسمیں کھا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا۔ (آج انہیں کہا جائے گا کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں ہے، اور نہ تم غم کرو گے۔ (۴۹) اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے، کہ تھوڑا سا پانی اور کچھ اس رزق میں سے جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ہم پر بھی ڈال دو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر یقیناً حرام کر دی ہیں۔ (۵۰) جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور کود بنا رکھا تھا۔ اور انہیں دنیاوی زندگی نے دھوکا دے رکھا تھا۔ پس آج کے دن ہم انہیں اسی طرح چھوڑ دیں گے جیسا کہ انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کی (تیاری) کو چھوڑ دیا تھا، اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ (۵۱)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۴۱ تا ۵۱)

دین کی باتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ رَّسُوْلَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

افضل الانبیاء ختمی مرتبت، سید المرسلین، حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی ومفہوم، رسول، پیغام رساں، پیغمبر اور پیامبر کے ہیں۔

1۔ القرآن: ۱۔ ترجمہ: کہہ دو کہ لوگوں میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۵۸)

۲۔ ترجمہ: اور اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تمہیں سب لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور اللہ گواہ کافی ہے۔ (سورۂ نساء آیت ۷۹)

2۔ الحدیث: ۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ میں تھا ایک روز ہم اس کے بعض نواح میں نکلے تو راستے میں جو پہاڑ یا درخت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آتا تھا کہتا تھا۔

"السلام علیک یا رسول اللہ" اور میں اس کو سن رہا تھا۔

3۔ الرائے: ۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی رسالت کی صداقت پر جو پختہ یقین تھا وہ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا جو پہلو نہایت شدت سے ابھرا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دینی جذبہ تھا جب اس کا امتزاج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی سیاسی صلاحیتوں سے ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت دنیا میں ہی کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔ (جوزف شاخت)

۲۔ پوری نسل انسانی کو اسلام کے پیغمبر پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کے لیے وہ قانون چھوڑا ہے جس کے اعلیٰ معیار پر انسانیت اگر آئندہ دو ہزار سال میں بھی آجائے تو بڑی باعث مسرت کامیابی ہوگی۔ (پروفیسر سپر بل۔ جنیوا یونیورسٹی)

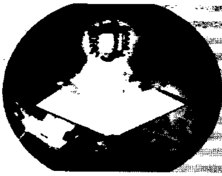
اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انصاف وایمان داری سے تنقیدی نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ مرسل اور مامور من اللہ تھے۔ (ریورنڈ آر میکویئل)

4۔ الفضائل: ۱۔ ہر نماز کے بعد ۲۹۶ مرتبہ اس اسم پاک کا ورد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے دور رکھے گا۔

۲۔ کسی سخت مالی مشکلات میں نقصان ہونے کا خدشہ لاحق ہو تو نماز عصر کے بعد باوضو حالت میں قبلہ رخ نہایت یکسوئی کے ساتھ مغرب کی اذان تک بکثرت اس اسم پاک "سیدنا رسولؐ" کا ورد کرے اور مشکل کے حل کے لیے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ ہر پریشانی دور کردے گا۔ (الٰہی آمین)



قیصر روحیات کی کتاب "انوار اسماء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



قرآن پاک سے عشق کی پرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب دھم

برائی کا بدلہ اور معافی

اللہ تعالیٰ کی معاف کردینے والی خصوصیت کی بابت آپ نے گزشتہ شمارے میں پڑھ لیا ہوگا۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتا ہے جو دوسروں کو معاف کردیتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ برائی کی ہے تو اس کا جواب تین طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

1۔ برائی کے بدلے میں برائی۔

2۔ برائی کے بدلے میں خاموش رہنا، صبر کرنا۔

3۔ برائی کے بدلے میں بھلائی کرنا۔

ان تینوں صورتوں کی وضاحت مندرجہ ذیل آیات سے ہورہی ہے۔

''اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو (مناسب طریقے سے) بدلہ لیتے ہیں۔'' (الشوریٰ آیت 39)

''اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور (معاملے) کو درست کردے اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے۔'' (40)

''اور جس پر ظلم ہوا ہو (مگر وہ اس کے بعد انتقام لے) تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔'' (41)

''اور جو صبر کرے اور قصور معاف کردے تو یہ ہمت کا کام ہے۔'' (43)

سورہ حٰم سجدہ (41) کی مندرجہ ذیل آیات بے حد اہمیت اور توجہ کی حامل ہیں۔

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں

دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔‘‘ (34)

’’اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔‘‘ (35)

اگرچہ برائی کا بدلہ برائی سے لینے کی اجازت ہے مگر درگزر کرنے، معاف کردینے اور صبر کرنے کے بڑے درجات ہیں اور جو لوگ برائی کے بدلے میں بھلائی کرتے ہیں تو بہت اونچے نصیب والے ہوتے ہیں۔ معاف کردینے والوں کو اللہ نے اپنا دوست کہا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 134 میں کہا گیا ہے۔

’’جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں اور خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘

اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیات طیبہ ہمارے سامنے ہے۔ کفار نے آپ کے اوپر اتنے مظالم ڈھائے، طرح، طرح سے ستایا، پتھر مارے مگر آپؐ نے صبر اور برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپؐ نے نہ صرف انہیں معاف کردیا بلکہ ان کے لیے دعائے خیر بھی کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری ان برائیوں کو ہم سے دور کردے جنہوں نے ہماری زندگیوں کو کھوکھلا کردیا ہے۔ دلوں میں کشادگی پیدا ہو اور معاف کردینے کی عادت کو اپنا کر ہم اللہ کے دوست بن جائیں۔ آمین!

بے حیائی کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت نمبر 151 میں اللہ تعالیٰ ان باتوں کے بارے میں بتا رہا ہے جو اس نے حرام قرار دیں۔ اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ’’اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ پھٹکنا۔‘‘

اسی طرح سورۂ اعراف آیت نمبر 33 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

’’کہہ دو کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے۔‘‘

کہنے کو یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے لیکن اگر اس بات کی گہرائی میں جائیں تو آیت اپنے معنی و مطالب کے لحاظ سے بے حد وسعت رکھتی ہے۔ اس کا پھیلاؤ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بے حیائی اور فحاشی خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ طور پر اختیار کی جائے ہر حال میں حرام قرار دی گئی۔ جس بات کے لیے ایک قطعی حکم آگیا اس میں کسی لچک کی کوئی گنجائش نہیں۔

بے حیائی کے مظاہرے کئی انداز میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم لباس کی بات کرلیں۔ لباس زینت، زیبائش اور ستر پوشی کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ستر پوشی کا خیال نہیں رکھا گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی ہوگی۔ مغرب کی تقلید میں آج کل مسلمان لڑکیوں نے بھی اپنے جسم کو عریاں کرلیا ہے۔ دوپٹا تو اب بھولی بسری کہانی بن چکا ہے۔ اگر ہوتا بھی ہے تو صرف ایک طرف شانے پر ڈالنے کے لیے یا پھر بازوؤں میں جھول رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے صاف، صاف حکم دیا ہے کہ اپنی اوڑھنی کو اپنے سینے پر اچھی طرح سے پھیلالو۔

اس کے خلاف کرنے والی عورت اپنے لیے جہنم کی آگ خرید رہی ہے۔ نظروں کی بے حیائی بھی سراسر حرام ہے۔ جیسا کہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنی نگاہیں نیچے رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سورۂ مومن (آیت نمبر 19) میں فرماتا ہے۔

’’وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو (باتیں) سینوں میں پوشیدہ ہیں (ان کو بھی)‘‘

بے حیائی کے مناظر دیکھنا، خواہ وہ کسی فلم ہی میں کیوں نہ ہوں، حرام ہے۔ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا جو بے حیائی اور فحاشی پھیلانے والے ہوں، غلط ہے۔

بے حیائی والی فلم دیکھنا دکھانا، بنانا، اس میں کام کرنا، اسے لوگوں کے سامنے پیش کرنا، سب حرام ہے۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے۔ ایسے مقام پر جانا جہاں بے حیائی کے مظاہرے ہوتے ہوں، حرام ہے۔ فحاشی والا لٹریچر پڑھنا بھی عذاب ہے۔ لوگ گندی کتابیں چھپ، چھپ کر پڑھتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے فحاشی ہر دو صورتوں میں منع فرمائی خواہ وہ ظاہر میں ہو یا پوشیدہ طور پر۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزرتے ہیں۔'' (آیت نمبر 72)

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قلم میں قسم کھائی ہے قلم اور اس سے لکھنے والے دونوں کی۔ اب قلم کار کے اوپر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریر سے دوسروں تک کون سی بات پہنچا رہا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر...... یعنی اچھی بات لوگوں کو پہنچاؤ اور بری بات سے منع کرو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حرام کاموں سے دور رکھے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن کرے۔ (الٰہی آمین)

متاع الغرور

ایک زمانہ تھا جب انسان کی شرافت اور اخلاق کو ہی انسانی پرکھ کا معیار خیال کیا جاتا تھا مگر اب بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ لوگوں کی اقدار بھی بدل چکی ہیں۔ شرافت، عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ظاہری نمود ونمائش، چمک دمک اور دولت کی ریل پیل نے انسان کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ان دھوکا دینے والی چیزوں میں اس قدر گم ہو چکا ہے کہ احساس بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر آخرت کی زندگی سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ حدید (57) کی آیت نمبر 20 میں ارشاد فرماتا ہے۔

(ترجمہ) ''دنیا کی زندگی تو متاعِ فریب ہے۔''

غرور کے معنی دھوکا، فریب اور سراب کے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی زندگی کو دھوکے کی چیز قرار دیا اور اپنی بہت سی آیات میں واضح کر دیا کہ دنیاوی مال ومتاع، آسائشیں یہ سب کچھ دھوکا ہیں، فریب ہیں۔ اصل زندگی تو وہ ہے جو آنے والی ہے اور جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس سلسلے کی آیات کا ترجمہ پیش ہے۔ سورۂ آل عمران (3) آیت نمبر 185 (ترجمہ) ''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا، پورا بدلہ دیا جائے گا اور جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔''

سورۂ انعام (6) آیت نمبر 32 ''اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور مشغلہ ہے اور بہت اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے۔ (یعنی) ان کے لیے جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔''

اسی سورۂ کی آیت نمبر 70 میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان سے کچھ کام نہ رکھو۔ ہاں اس (قرآن کے) ذریعے سے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔ (اس روز) خدا کے سوا نہ تو کوئی اس کا دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا...... اور اگر وہ ہر (چیز جو روئے زمین پر ہے بطور) معاوضہ دینا چاہے تو وہ اس سے قبول نہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔ ان کے لیے پینے کا کھولتا پانی اور دکھ دینے والا عذاب ہے۔ اس لیے کہ کفر کرتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو بتاتا ہے کہ دنیا کی زندگی پر خوش ہونا نادانی ہے اور اس کے فائدے بھی عارضی ہیں اور آخرت کی نعمتیں تو بہت

زیادہ ہیں۔

سورۂ توبہ (9) آیت نمبر 38 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ''مومنو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم (کاہلی کے سبب سے) زمین پر گرے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت (کی نعمتوں) کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔''

سورۂ یونس (10) کی آیت نمبر 24 میں اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی کی بہت اچھی مثال پیش کر رہا ہے۔ ''دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں مل کر نکلا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوش نما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم (قدرت کی نشانیاں) اسی طرح کھول، کھول کر بیان کرتے ہیں۔

سورۂ رعد (13) آیت نمبر 26 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''خدا جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور (جس کا چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے اور کافر لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں اور دنیا کی زندگی آخرت (کے مقابلے) میں (بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔

سورۂ کہف (18) کی آیت نمبر 45,46 میں اللہ تعالیٰ دنیا کی مثال کچھ یوں بیان کر رہا ہے۔

''اور ان سے دنیا کی مثال بھی بیان کر دو۔ (وہ ایسی ہے) جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل گئی، پھر وہ چورا، چورا ہوگئی کہ ہوائیں اسے اڑائے پھرتی ہیں اور خدا تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' (45)

''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق) زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں، وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔'' (46)

سورۂ قصص (28) آیت نمبر 60 ... ''اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟''

سورۂ قصص آیت 61: ''بھلا جس شخص سے ہم نے وعدہ کیا ہے اور اس نے اسے حاصل کر لیا تو کیا وہ اس شخص کا سا ہے جس کو ہم نے زندگی کے فائدے سے بہرہ مند کیا پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہو جو (ہمارے روبرو) حاضر کیے جائیں گے۔''

قارون کے پاس بہت بڑا خزانہ تھا۔ اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش اتنی دولت ان کے پاس بھی ہوتی۔ حالانکہ انجام اس کا یہ ہوا کہ قارون کا خزانہ اللہ کے حکم سے دفن ہوگیا اور وہ خود بھی دفن ہوگیا۔

''اس بات کو سورۂ قصص کی آیت نمبر 79 میں یوں بیان کیا گیا ہے۔'' ''تو (ایک روز) قارون (بڑی) آرائش (اور ٹھاٹھ) سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ جو لوگ دنیا کی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے کہ جیسا (مال و متاع) قارون کو ملا ہے کاش (ایسا ہی) ہمیں بھی ملے۔ وہ تو بڑا ہی صاحب نصیب ہے۔''

آیت نمبر 80 ''اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا کہنے لگے کہ تم پر افسوس مومنوں اور نیکو کاروں کے لیے (جو) ثواب خدا (کے ہاں تیار ہے) کہیں بہتر ہے اور وہ صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو کھیل اور تماشا کہا ہے جیسا کہ سورۂ عنکبوت (29) میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔'' (آیت 64)

(جاری ہے)

...... یہ کہاں کی بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں...
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے...
دل کو رو دیا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے...
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے...
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا...
عبادات، معاملات...
جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط نمبر 16

پرنس کے گم صم ہو کر رک جانے کو سب ہی نے محسوس کیا۔ گارڈ کی بات تو پرنس کے علاوہ کوئی نہ سن سکا۔ مگر ہر آنکھ متجسس نظر آئی۔

لیڈی صوفیہ نے اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"what happend?" وہ پرنس کے قریب جا کر سوال کر رہی تھیں۔ تاجور، سفینہ، زارا، انجیلا سب دادی، پوتے کی طرف متوجہ تھیں جس کا احساس پرنس کو فوراً ہی ہو گیا تھا...... وہ زبردستی کے انداز میں مسکرایا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر ثوبان کی طرف لگ چکا تھا جو گیٹ کے اس پار پرنس کا منتظر تھا۔

''گرینڈ مام آپ گیسٹ کو لے کر اندر جائیں...... باہر ایک وزیٹر میرا منتظر ہے بس میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں......'' اس کی نظر غیر ارادی طور پر سفینہ کی طرف اٹھ گئی جس کا انتظار وہ اس بے تابی سے کر رہا تھا کہ وقت و زمانے کی



قید سے آزاد ہو کر بس دل کی دھڑکنیں شمار کی تھیں۔ سفینہ بھی عجوب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
وہ روحانی مسرت جس کا انتظار بے شمار لوگ کرتے ہیں۔ نصیب کسی، کسی کو ہوتی ہے۔ سفینہ کی آنکھوں سے قدرتی چشمے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔
''اوکے......'' لیڈی صوفیہ الجھن میں ضرور تھیں مگر خاصی حاضر دماغی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے باوقار و دل نشین انداز میں ہاتھ کے اشارے سے مہمانوں کو آگے بڑھنے کا عندیہ دیا۔
وہ جس کے ہم قدم چل کر یہ حسین وقت امر کرنے کی لاشعوری خواہش دل میں ہمک رہی تھی...... یوں ٹھہر گئی جیسے شیر خوار دودھ پیتے، پیتے ماں کی آغوش میں سو گیا ہو...... طوعاً و کرہاً وہ اندر کی طرف بڑھ رہی تھی...... پلٹ کر دیکھنے کی آرزو کو اس نے گردن سے دبوچ کر انا کی ریت میں دھنسا دیا۔

☆☆☆

ثوبان گیٹ سے باہر ایک کیاری کی منڈیر پر بیٹھا دونوں ہاتھوں میں چہرہ لیے پرنس کا منتظر تھا...... بچے کی آنکھوں میں کوئی فکر جھلکتی تھی۔ جیسے ہی اس نے پرنس کو گیٹ سے باہر آتے دیکھا۔ بجلی کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑنے کے انداز میں اس کے قریب پہنچا۔
''انکل...... پلیز...... میرے ساتھ گھر چلیں......'' ثوبان کے انداز میں بے قراری، عجلت اور ایک محسوس ہونے والا پوشیدہ سا خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے سلام یا مصافحے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا جس سے اس کی اضطراری کیفیت واضح ہو رہی تھی۔
بے ساختگی بچوں والی تھی...... تڑپ دیوانوں جیسی...... پرنس تو بری طرح چکرا کر رہ گیا تھا۔
''انکل...... پلیز ہری اپ...... پلیز انکل......'' ثوبان، پرنس کا ہاتھ پکڑ کر ملتجی انداز میں کہہ رہا تھا...... معاً اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے...... اور آنسو پرنس کی کمزوری تھے۔ وہ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔ اسے شعور تھا کہ آنسو کا ایک قطرہ بے شمار اذیتوں سے کشید ہوتا ہے۔
''اوکے!'' اس نے شدید روحانی اذیت برداشت کرتے ہوئے ثوبان کا ہاتھ نرمی سے دبایا اور گارڈ کو اشارے سے قریب بلایا۔
گارڈ مؤدبانہ انداز میں آ کر کھڑا ہو گیا۔
''میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں...... گرینڈ مام کو بتا دو کہ میں گھر سے قریب ہی ہوں، وہ پریشان نہ ہوں۔'' جو فطرت سے ہم آغوش رہتے ہیں، فطرت بھی انہیں بازوؤں کے گھیرے میں لیے رکھتی ہے۔ کیسا نازک مقام تھا کہ دل جذبات کی انتہاؤں پر دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔
ایک طرف وہ دلنواز محبوب تھا...... جو پل، پل اپنی موجودگی کے احساس سے سرشار رکھتا تھا...... دوسری طرف فطرت کا وہ شاہکار جس کی آنکھوں میں تخلیق کائنات کا منشور رقم تھا۔
وہ ثوبان کا ہاتھ تھامے اس کے گھر کی طرف چل پڑا...... ثوبان کا انداز بھاگنے جیسا تھا۔ وہ پرنس کی متوازن چال سے الجھ رہا تھا۔ اس کا مافی الضمیر جاننے کے بعد پرنس نے بھی تیز رفتاری اختیار کی۔

☆☆☆

''کیوٹ...... زارا تو ایک ہی میٹنگ میں میری کمزوری بن گئی ہے۔ جب سے مل کر گئی ہے تب سے میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔'' لیڈی صوفیہ نرم و شفیق لہجے میں بولتے ہوئے زارا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
اور زارا یوں ناز سے مسکرائی گویا سفینہ کو بتا رہی ہو کہ میں تم پر بازی لے گئی ہوں۔ تاجور تو پرنس کے گھر کو دیکھ کر ہی مبہوت رہ گئی تھیں۔ حالانکہ خود بھی جس کوٹھی میں رہتی تھیں اس کی موجودہ مالیت پینتیس کروڑ سے زائد ہی تھی۔ جس کا وسیع و



عریض لان اتنا منفرد اور قیمتی پھولوں، پودوں سے سجا ہوا تھا کہ جو بھی گھر میں داخل ہوتا اس پر امارت کا رعب طاری ہوجاتا تھا۔ مگر پرنس کا گھر جو آنے والے دنوں میں ان کی بیٹی کا گھر ہونے جارہا تھا۔ دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئی تھیں۔

''اس گھر میں حرام کا مال تو نہیں آتا...... اتنی دولت ظاہر ہے تو چھپی ہوئی کتنی ہوگی؟'' چھوٹتے ہی شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

''سفینہ آج تو تم بس قیامت لگ رہی ہو...... دل چاہ رہا ہے کہ بس تمہیں دیکھتی رہوں۔ تھینک گاڈ...... پرنس کے لیے میں جیسی لڑکی اور فیملی چاہتی تھی مجھے مل گئی۔ اِدھر میرے پاس آکر بیٹھو......'' لیڈی صوفیہ نے سفینہ کو اپنے پہلو میں آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ اٹھ کر ان کے پہلو میں جا بیٹھی۔

زارا کو یوں لگا جیسے نرم گھاس پر چلتے، چلتے پاؤں کسی گڑھے میں جا پڑا۔ لیڈی صوفیہ نے اپنے خیالات کا واضح اظہار کر کے اسے وقتی طور پر مایوسی سے دوچار کر دیا تھا...... خوب صورت ماحول میں عجیب سی بدمزگی کا ذائقہ چکھنے کو ملا تھا...... وہ اضطراری انداز میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

''پتا نہیں کون وزیٹر اس وقت آگیا...... بہت کوفت ہوتی ہے...... اس ملک کے اکثر لوگ وقت کی ویلیو سے آگہی نہیں رکھتے۔ موت کی طرح منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔'' لیڈی صوفیہ کے بے ساختہ جملے پر تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ سفینہ نے یوں داخلی دروازے کی طرف دیکھا گویا تڑپ و بے چینی کسی بھی طرح پرنس کو کھینچ

لا رہی ہو...... وہ بے خبر تھی کہ زارا اس کے دیکھنے کو دیکھ رہی ہے۔ ان حسین لمحات میں کون اس سے بازی لے گیا تھا کہ جس سے پرنس معذرت بھی نہ کر سکا تھا...... پے در پے خیالات آ رہے تھے۔

☆☆☆

سناٹے میں ڈوبا ہوا عالیشان گھر...... جس کی زیادہ سے زیادہ روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔

کائنات کی شب اوّل کی سی حیرانی...... آج گیٹ بھی دربان سے خالی تھا...... اور گھر میں وہ نوکر بھی دکھائی نہیں دیا جس سے ملاقات ہو چکی تھی۔

ثوبان کھلے گیٹ سے اسے لے کر اندر داخل ہوا تھا اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی پرنس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی تھی۔ پرنس نے گیٹ خود بند کیا...... وہ تاریک راہداریوں سے گزرتا اب زینے کی طرف جا رہا تھا۔

''ثوبان...... گھر میں کوئی نہیں ہے؟''

''آپ آئیں تو سہی......'' وہ آہستہ آواز میں بولا۔

اب وہ زینہ چڑھ رہے تھے۔

پہلی منزل بھی نچلی منزل کے نمونے پر تھی البتہ آرائشی اشیا میں خاصا فرق تھا۔

ثوبان ایک خواب گاہ کے دروازے پر جا کر رک گیا اور اس نے پرنس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔

پرنس جس وضع داری اور اعلیٰ اخلاقیات کے ساتھ زندگی گزارتا چلا آ رہا تھا اس کے نزدیک تو براہ راست کسی کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہونا ایسا ہی تھا جیسے اس نے موٹر وے پر کوئی بہت بڑی قانون شکنی کی ہو، متذبذب کیفیت میں اس نے ثوبان کی طرف دیکھا۔

"please come" ثوبان نے ہینڈل کو حرکت دی اور دروازہ کھول دیا، ایک دل پذیر خنکی اور جانفزا مہک نے پرنس کا استقبال کیا...... اندر داخل ہونے میں ایک جھجک مانع تھی...... قدم اٹھ کر ہی نہیں دیے۔

''پلیز انکل......'' ثوبان التجائیہ انداز میں اسے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پٹ تھاما ہوا تھا۔ اس کی پشت کمرے کے اندرونی حصے کی طرف تھی اور رخ پرنس کی طرف stopper کی وجہ سے اس نے پوری قوت سے دروازے کو تھاما ہوا تھا مبادا وہ دھڑ سے بند ہو جائے۔

گھر میں پھیلی خاموشی بہت معنی خیز و پُراسرار تھی...... کانوں کو دھڑکنیں سننے کے علاوہ اس وقت کوئی کام نہیں تھا۔

''انکل آئیں ناں...... پلیز انکل...... ہیلپ می......'' اب ثوبان کی آواز آنسوؤں کے باعث رندھی ہوئی محسوس ہوئی...... بس یہ پرنس کی برداشت سے زیادہ کا دباؤ تھا۔

وہ ثوبان کے ساتھ یوں کھنچتا اندر داخل ہوا گویا کوئی پشت سے دھکیل رہا ہو۔

کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا اور بس بیڈ کے آس پاس ہی روشنی بکھری ہوئی تھی...... پہلی نظر میں تو بیڈ خالی نظر آیا مگر جیسے ہی نگاہ دھندلاہٹ میں دیکھنے کے قابل ہوئی حیرت کا زوردار جھٹکا یوں لگا تھا...... گویا بے خبری میں کسی نے پشت پر کوڑا دے مارا۔ ایک نوجوان عورت کا سر بیڈ کے کنارے سے ٹکا ہوا تھا...... اور وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔

فرش کی ٹائلیں سیاہ پر نہایت چمکدار تھیں اسی باعث کمرے میں تاریکی کا عنصر زیادہ محسوس ہوتا تھا۔

''یہ...... یہ......؟'' حیرت کی انتہا پر گنگ زبان سے ایک ہی لفظ نکل سکا۔

''یہ میری ممی ہیں انکل...... دیکھیں...... پتا نہیں کیا ہو گیا انہیں...... میں تو چھوٹا ہوں ناں...... ان کو بیڈ پر نہیں لٹا سکتا......'' ثوبان بہت معصومانہ انداز میں اپنی مجبوری و معذوری بیان کر رہا تھا۔

''آپ کے ڈیڈ کہاں ہیں؟''

پرنس کو پل بھر میں طرح طرح کی بریکنگ نیوز یاد آ گئیں...... اسے یوں لگا وہ کسی عفریت کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ عورت کو چھوتے ہوئے ایک فطری جھجک مانع تھی...... وہ جواب کے لیے ثوبان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''پتا نہیں...... شاید ان کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے...... ان کے پاس پسٹل تھا ناں......'' ثوبان تو بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا مگر درحقیقت پرنس کے پسینے چھوٹ گئے تھے...... اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا جو دیکھنے میں نوخیز دوشیزہ نظر آتی تھی اور اسے یاد آ رہا تھا کہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہے مگر اس وقت یادداشت بھی جواب دے رہی تھی۔ اسے کہیں سے بہتے خون کے نشان نظر نہیں آئے۔ اس نے غیر ارادی طور پر سر گھما کر سوئچ بورڈ تلاش کیا جو اسے دروازے کے ساتھ ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ٹھک، ٹھک کئی سوئچ دبا دیے...... بیڈ کے عین اوپر بہت خوب صورت فانوس لٹک رہا تھا جس میں درجن بھر بلب لگے ہوئے تھے...... کمرے میں ایک دم دن نکل آیا...... ہر شے واضح ہو گئی۔

ثوبان اب بے قراری سے ماں کا کندھا ہلا رہا تھا۔

''ممی، ممی اٹھیں، دیکھیں انکل آئے ہیں، ممی، ممی۔'' وہ ماں کو آواز دے رہا تھا مگر عورت کے ساکت وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔

پرنس نے اپنے چکراتے ذہن کو قابو میں کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔

''کیا پولیس کو فون کرنا چاہیے؟'' اس نے خالی، خالی نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا اور سوچا جو اب صرف اور صرف ماں کی طرف متوجہ تھا، آنکھوں میں موٹے، موٹے آنسو تھے پرنس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے...... عورت کہیں سے بھی زخمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کیا پہلے ڈاکٹر کو بلاؤں......'' مگر اس کے پاس تو سیل فون ہوتا نہیں تھا۔ ڈائریکٹری گھر میں پڑی تھی۔ وہ ہاؤس منیجر کو فون کر کے اپنے فیملی ڈاکٹر کو کال کر سکتا تھا مگر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ عورت کو فرش سے اٹھا کر بستر پر کیسے ڈالا جائے...... ایسا نہ ہو وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرے اور عورت خود ہی ہوش میں آ کر اٹھ کھڑی ہو...... اس صورت حال میں تو وہ بدحواس ہو کر اسے چھوڑ سکتا تھا جیسے کوئی وزنی شے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر جا پڑے۔ زخمی نہیں تھی مگر اس طرح زخمی ہو سکتی تھی۔

''انکل، ممی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے...... یہ بول ہی نہیں رہیں......'' ثوبان بڑے لاچار و بے بس لہجے میں ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ڈونٹ وری ثوبان...... لگتا ہے آپ کی ممی بے ہوش ہیں...... ابھی ہوش میں آ جائیں گی۔'' وہ تسلی دیتے ہوئے سوچ رہا تھا شاید اس عورت پر جسمانی تشدد کیا گیا ہے اسی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس محیر العقول واقعے سے گزرتے ہوئے اس کا ذہن اپنے گھر سے قطعی طور پر ہٹ چکا تھا...... اس کی محبوبہ گھر میں تھی جس کے انتظار میں اس کے شب و روز بے قراری سے کٹ رہے تھے...... کمال ہو گیا کہ وہ خود گھر سے غیر حاضر تھا...... اس نے ساری ہمت مجتمع کر کے عورت کا شانہ آہستہ سے چھوا...... مگر یوں جیسے کسی پتھر کو ہاتھ لگایا ہو...... عورت کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا ہمت بندھ گئی...... ثوبان کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے وہ سسکیاں روکنے کی جدوجہد میں بھی لگا ہوا تھا...... اس کے آنسوؤں نے پرنس کو بے قرار کر کے بلکہ تڑپا کر رکھ دیا۔

اس نے عورت کو بانہوں میں بھر کر اٹھانے کے بجائے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تھی اور اپنی تمام تر قوت کا استعمال کیا تھا۔

وہ عورت کو کھڑا کرنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر عورت کھڑی ہو کر یوں جھولنے لگی گویا تیز آندھی میں کمزور تنے کا درخت جھول رہا ہو۔

بس اتنا بھی غنیمت تھا اس نے کھڑی اور جھولتی عورت کو بہر حال بیڈ پر لٹا ہی دیا...... تیز روشنی مزید تیز ہوگئی......سیاہ لباس میں دودھیا رنگت سے گویا روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک موی گڑیا ہاتھ پاؤں ڈالے لیٹی ہوئی تھی۔ پرنس نے جھجکتے ہوئے اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''ممی......دیکھیں یہ انکل ہیں......آپ ڈریں نہیں...... یہ کچھ نہیں کہیں گے۔انکل روزانہ مسجد جاتے ہیں...... یہ دعا کریں گے ناں تو آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' ثوبان ماں کے گالوں کو چھو، چھوکر بھرائی آواز میں کہہ رہا تھا......آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

''ثوبان آپ کے ڈیڈی گھر سے کب گئے تھے؟'' پرنس سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا......سب کچھ بھلا کر معصوم ثوبان کی مدد کرنا اس کے نزدیک اس وقت کا سب سے ضروری کام تھا۔

''انکل، پاپا، ممی کو بہت مارتے ہیں۔'' یہ کہتے ہی ثوبان بلک، بلک کر رو پڑا۔

''یا اللہ......!'' پرنس نے بے ساختہ کہا اور روحانی اذیت کے باعث پل بھر کو آنکھیں بند کرلیں......مگر اس خیال سے فوراً ہی چوکس ہوگیا کہ اس عورت کو کسی بھی صورت ہوش میں لانا ہے۔ساتھ ہی اب وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا لاشعوری طور پر وہ تشدد کے نشان تلاش کررہا تھا۔ثوبان اب خود پر قابو کھو چکا تھا...... ماحول میں اس کی سسکیاں نمایاں تھیں...... پرنس نے بے اختیار اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا......اوسان قدرے بحال ہوچکے تھے کیونکہ عورت کے وجود پر کسی زخم کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ پرنس اس کے حسن و جمال سے یوں نگاہ بچا رہا تھا گویا کراماً کاتبین اسے گھور رہے ہوں......شادی شدہ ایک بچے کی ماں جو کسی کی امانت تھی۔اس کے نزدیک تو اسے نگاہ بھر کر دیکھنا اعلیٰ درجے کا اخلاقی جرم تھا۔

''میں ایک فون کرنا چاہوں گا......ڈاکٹر آکر چیک کرکے بتائے گا کہ آپ کی ممی کیوں بے ہوش ہیں...... میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔''

ثوبان بہت ذہین تھا فوراً مدعا سمجھ گیا کیونکہ ماں کو ہوش میں دیکھنے کی جلدی تھی تیزی سے ایک طرف گیا اور سیل فون اٹھا کر لے آیا۔

''یہ پاپا کا ہے......ممی کے پاس سیل فون نہیں ہے۔'' ثوبان نے سیل پرنس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پاپا کا......؟'' پرنس کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

''وہ سیل اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے۔'' ساتھ ہی پرنس کو ایک اندیشے نے ستایا......کہ کہیں ثوبان کا باپ گھر کے کسی اور کمرے میں موجود تو نہیں؟ جانے کب اپنا سیل ڈھونڈتا اس طرف آنکلے۔

بہر حال اس نے سیل فون آپریٹ کرنا شروع کیا تو سامنے کئی مسڈ کالز اور میسج کی خبریں تھیں۔اسے ان سب سے کوئی غرض نہیں تھی۔اس نے اپنے منیجر کا نمبر ڈال کیا......کال دوسری بیل پر ہی ریسیو ہوگئی تھی۔

''سر آپ کہاں ہیں......لیڈی صاحبہ بہت پریشان ہیں...... یونو گھر میں گیسٹ ہیں......آپ کا انتظار کررہے ہیں۔'' منیجر ایک سانس میں یوں گویا ہوا گویا تلاشِ بسیار کے بعد گم شدہ شے مل گئی ہو......اس کے لہجے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں گھر سے قریب ہی ہوں......گرینڈ مام کو بولیں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں پریشان نہ ہوں......ہاں اس نمبر پر ڈاکٹر ذکی کا نمبر سینڈ کردیں۔'' وہ عجلت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔جس سے دوسری جانب تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''سر آپ خیریت سے ہیں......؟'' منیجر اچانک حواس باختہ ہوگیا تھا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں پلیز آپ جلدی نمبر سینڈ کریں......اور گرینڈ مام کو بالکل بھی پتا نہیں چلے کہ

میں نے آپ سے ڈاکٹر ذکی کا نمبر لینے کے لیے فون کیا تھا بلکہ ان کو پتا ہی نہیں چلے کہ میں نے آپ سے کانٹیکٹ کیا ہے......'' وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا...... گھر میں خاص مہمان موجود تھے اور وہ ثوبان کی مدد کرنے سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا...... بڑی آزمائشی صورت حال تھی۔

ثوبان کے چہرے پر امید نے ایک روشنی سی بکھیر دی تھی...... ڈاکٹر کی آمد کا خیال ہی بہت باعثِ تقویت تھا۔

پرنس سیل ہاتھ میں لیے میسج کا منتظر تھا...... گاہے گاہے نگاہ ثوبان کی ماں کی طرف جاتی تھی مگر فوراً ہی یوں لوٹ آتی جیسے کوئی نگاہ پر نگاہ جمائے بیٹھا ہو۔

اسی وقت میسج الرٹ کی بیپ سنائی دی۔ اس نے میسج دیکھا۔ ڈاکٹر ذکی کا نمبر آ گیا تھا...... اس نے فوراً ہی نمبر ذہن نشین کر کے ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

سفینہ کی بے قراری کا عالم یہ تھا کہ گویا چاند کی چودہ کو جوار بھاٹا چاند کو چھونے کو بے تاب ہو مگر اسے خود پر بہت قابو تھا...... چہرے پر پھیلی متانت سے کسی کی عمیق نگاہ بھی اس کے دل کا بھید نہیں پا سکتی تھی۔

زارا البتہ اپنی بے چینی کو چھپا نہیں پا رہی تھی...... کبھی پہلو بدلتی تو کبھی کوئی اینٹیک ڈیکوریشن پیس دیکھنے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

"I am feeling very embambarrassment" لیڈی صوفیہ کئی مرتبہ یہ جملہ بول کر شرمندگی کا اظہار کر چکی تھیں۔

تاجور کو بے بنیاد اندیشے تنگ کرنے لگے تھے۔ آج کل رئیسوں کا اغوا معمول کی بات تھی۔ پرنس گیٹ سے باہر گیا اور اس کے بعد کوئی خبر نہیں...... وہ اپنے اندیشوں کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ سامنے ایک انتہائی بوڑھی عورت

اور دو کم عمر نا تجربہ کار نوجوان لڑکیاں تھیں...... حتیٰ کہ وہ تو اتنی احتیاط کر رہی تھیں کہ پرنس کی غیر موجودگی پر کوئی بات تک نہیں کر رہی تھیں۔

سفینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے گھر بلا کر بے توقیر کر دیا ہو۔ خوش لباس، خندہ رو خادمہ مہمانوں کو تازہ مشروب پیش کر چکی تھی۔ لیڈی صوفیہ مکمل طور پر غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ سب پڑھا بھولے بیٹھی تھیں...... بار، بار نگاہ داخلی حصے کی طرف جاتی تھی۔

زارا کا تو کوفت سے برا حال ہو رہا تھا۔ ساری آرائش دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

''ایسا کرتے ہیں کہ ہم پرنس کے اسٹوڈیو کا وزٹ کرتے ہیں، زارا نے اس وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا جب یہ یہاں آئی تھی اور میں نے اس سے پرامس کیا تھا کہ جب وہ دوبارہ آئے گی تو اسٹوڈیو کا وزٹ ضرور کرے گی۔''

''مگر پرنس کے بغیر اسٹوڈیو کا وزٹ......؟'' کوفت سے زارا کا برا حال ہو گیا یہاں تو بس ایک ہی تمنا مچل رہی تھی کہ پرنس اسے اور سفینہ کو دیکھے...... بار، بار دیکھے اور کسی بھی طرح اسے احساس ہو جائے کہ سفینہ کا انتخاب کر کے اس نے جلدی کی...... آرٹ اس کا شوق تھا...... آرٹ وہ پڑھ رہی تھی...... ذہنی ہم آہنگی تو اس کے ساتھ ہی ہونی چاہیے تھی...... وہ آج پرنس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے درپے تھی۔

حاسد کے جذبات بہت توانا ہوتے ہیں...... اسی لیے حسد کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حاسد کی خواہشات میں بھی طوفانی قوت ہوتی ہے...... خواہشات میں شدت نہ ہو تو وہ کچھ اور بھی سوچ لے......

احساسِ برتری کی کوکھ سے ہی تمام روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں...... تکبر، خود پسندی، حسد، بغض، کینہ، جھوٹ، خوشامد پسندی...... یہ تمام روحانی بیماریاں دانائی و فراست کی دیمک ہیں...... کھوکھلا دماغ کبھی فطرت کے اشارے نہیں سمجھ سکتا۔

بدنصیبی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان تکبر میں مبتلا ہو جائے...... عموماً دولت کی کثرت کو خوش نصیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

خوش نصیبی میں خوشحالی کے ساتھ فطرت کے بنائے ہوئے تمام رشتے اور تعلقات سے لطف اندوز ہونا بھی شامل ہے۔

جب بہن، بہن سے اور بھائی، بھائی سے حسد کرے تو یہ اس کی بدقسمتی کی بالکل واضح اور کھلی نشانی ہے۔

روحانی مسرت ہمیشہ خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی ہے...... جو چہرے کو چمک اور آنکھوں کو دمک عطا کرتی ہے۔

وہ اتنی دور سے اڑان بھر کر آئی تھی...... پل، پل اس ملاقات کو سوچا تھا...... مگر یہ ایک دم سے کیا ہو گیا......؟ سفینہ کے دل پر اداسی اتر رہی تھی اس کے خیالات زارا سے یکسر مختلف تھے...... اس کو کڑھن نہیں تھی...... روح، محبوب سے محبوبانہ شکوے کر رہی تھی۔

لیڈی صوفیہ کی ایما پر طوعاً و کرہاً نشست سے اٹھنا پڑا...... بے قرار دل کہہ رہا تھا کہیں ایسا نہ ہو وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوں اور پرنس گھر میں...... پھر...... ملن میں اذیت ناک وقفہ...... وہ بھی ایک چھت تلے...... جتنا دیکھنا تھا آج ہی تو دیکھنا تھا...... یہ اس دوشیزہ کی فطری بے قراری تھی جسے اس نے چاہا تھا، جسے دنیا چاہتی تھی...... خلقِ خدا سے دیکھتی تھی اور وہ اس کو دیکھنے کا خواہش مند تھا...... خواب دیکھنے کی عمر میں چاہے جانے سے زیادہ حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا...... خاص طور پر جب فقر و فاقے سے آزاد نعمتوں بھری زندگی میسر ہو تو بس پھر ایک ہی کمی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی دل و جان سے چاہنے والا بھی ہو...... جو عین اس عمر میں میسر آ رہا تھا۔ جس عمر میں چاہے جانے کی آرزو

اوجِ کمال پر ہوتی ہے۔
انجیلا، لیڈی صوفیہ کو سہارا دے کر چھڑی تھما رہی تھی...... لیڈی صوفیہ بہت گم صم اور شرمندہ، شرمندہ سی نظر آ رہی تھیں۔
''کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے...... میرا مطلب ہے پرنس اچانک کچھ دیر کے لیے گھر سے چلے جاتے ہوں۔'' تاجور سے رہا نہ گیا...... بالآخر بول پڑیں۔ لیڈی صوفیہ نے چوری، چوری تاجور کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔
''وہ صرف پانچ وقت نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے...... اس کے علاوہ اس کے باہر جانے کا پورے ویک کا شیڈول ہوتا ہے...... اور وہ مجھے پتا ہوتا ہے۔'' لیڈی صوفیہ نے دھیمی، کانپتی آواز میں جواب دیا اور چھڑی پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر قدم بڑھائے۔ انجیلا سائے کی طرح ان کے ساتھ تھی۔
''کتنی حیرت کی بات ہے...... پرنس کے پاس سیل فون نہیں ہوتا......'' زارا اندر ہی اندر تلملا رہی تھی بظاہر عام سے انداز میں گویا ہوئی۔ ''جبکہ آج کل تو سوئیپرز بھی سیل فون کے بغیر نہیں ہوتے......'' وہ مزید گویا ہوئی۔
''وہ creative ہے...... creation مکمل آزادی مانگتی ہے۔ بس اسے کسی بھی قسم کی باؤنڈنگ پسند نہیں...... وہ اتنے حسین تصورات ڈلیور کرتا ہے...... پبلک کو اس سے شکایت نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' لیڈی صوفیہ نے مسکرا کر زارا کی طرف دیکھا۔ لہجہ پوتے کی محبت سے سرشار و معمور تھا۔ زارا نے اپنی کوفت چھپانے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔
''شادی کے بعد تو ان کو سیل فون رکھنا پڑے گا...... یہ تو آج کل کی اشد ضرورت ہے۔''
''ناٹ ایٹ آل...... بہت ساری باتیں محبت کی ضمانت نہیں ہوتیں...... میری پیاری زارا...... محبت کو کسی میڈیم کی ضرورت نہیں ہوتی...... مگر ابھی تم بہت چھوٹی ہو...... وقت تمہیں سب کچھ سمجھا دے گا۔'' لیڈی صوفیہ نے کہا۔ سفینہ نے آگے بڑھ کر زارا کا ہاتھ زور سے دبایا...... یہ اشارہ تھا کہ بس اب خاموش ہو جاؤ، بے وقوفوں والی باتیں نہ کرو۔
انجیلا سمیت پانچوں اب سرخ بجری کا کارپٹ عبور کرتی اسٹوڈیو کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

☆☆☆

''اچانک کوئی شاک لگا ہے......'' ڈاکٹر ذکی، پرنس کی استدعا پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ثوبان کے گھر پہنچ گئے تھے۔ تیز رفتاری کی وجہ پرنس کے وہ الفاظ تھے جو اس نے غیر معمولی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لیے ہوا کے دوش پر ارسال کیے تھے۔
''ڈاکٹر...... کچھ دیر بعد ہو سکتا ہے میں ایک ڈیڈ باڈی کے ساتھ نظر آؤں اور کرائم رپورٹر میری فوٹو لے رہے ہوں۔'' بس اتنا ہی کافی تھا ڈاکٹر ذکی نے ڈرائیور کا انتظار بھی نہ کیا جو کسی کام سے نزدیکی سپر اسٹور گیا ہوا تھا۔
''کیس survival ہے ناں...... کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟'' پرنس نے اب خاصے پُرسکون انداز میں ثوبان کی ماں کی طرف دیکھا تھا...... موٗمی مجسمہ نگاہ کے سامنے تھا۔
ثوبان بڑی معصومیت، آس و امید سے دونوں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
ایمبولینس کے لیے فون کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ذکی فرسٹ ایڈ دینے میں مصروف تھے۔ پرنس نے ثوبان کو اپنے ساتھ لگا کر بڑی شفقت سے اس کے سر پر بوسہ دیا۔
''ڈونٹ وری...... بس تھوڑی دیر میں ماما بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''
ڈاکٹر ذکی اس وقت سے پرنس کے فیملی ڈاکٹر تھے جب وہ سات برس کا تھا۔ عمر میں تقریباً وہ پرنس سے بائیس

سال بڑے تھے مگر پرنس کے ساتھ ان کا دیرینہ محبتوں کا رشتہ تھا۔
اسی سبب اس نے محتاط انداز میں بتا دیا کہ گھر میں بہت اہم ڈنر ہے...... اس بچے نے گھر آکر مدد چاہی تو اسے آنا پڑا...... وہ بچے کو لے کر چلا جائے گا اور وہ پیشنٹ کو لے کر اسپتال چلے جائیں۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ ان سے رابطہ کر کے اسپتال پہنچ جائے گا۔
''یہ آپ کے پڑوسی ہیں...... اس بچے کے فادر سے تو بات چیت ہوتی ہوگی۔'' ڈاکٹر ذکی نے ایک دوا ثوبان کی ماں کو سونگھاتے ہوئے پرنس کی طرف دیکھا...... کیونکہ بچے نے جس طرح بتایا تھا کہ کیسے پرنس تک رسائی کی اور مدد طلب کی تو سیدھا سا مطلب نکلتا ہے کہ پڑوسیوں کے آپس میں اچھے تعلقات ہیں۔
پرنس نے ایک نظر ثوبان کی طرف دیکھا جو گویا سانس روکے ماں کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا اور آہستگی سے نفی میں گردن کو جنبش دی۔
ڈاکٹر ذکی اپنی حیرانی چھپا نہ سکے مگر مزید سوال بھی نہیں کیا۔
ایمبولینس کے سائرن کی آواز فضا میں گونجی تو پرنس کو یوں محسوس ہوا گویا دلدل میں دھنسے شخص کو کسی نے رسا پھینک کر بچانے کی کوشش کی ہو۔

☆☆☆

سفینہ اگر اسٹوڈیو میں پہلی بار بھی آئی ہوتی تو حیران ہوتی نہ ہی متاثر...... کہ اس وقت تو سفینہ کا ذہن ہواؤں کے سنگ اڑان بھرتا پرنس کے تعاقب میں تھا۔
البتہ زارا کا برا حال تھا اس نے اتنا شاندار اسٹوڈیو تو شاید خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے شوق کا یہ عالم تھا کہ واش روم کا دروازہ تک کھول کر جھانک لیا تھا...... اتنا وسیع و عریض واش روم...... دنیا کی بہترین سینٹری، سائے میں پروان چڑھنے والے ہرے بھرے پودوں کے سرخ گملے...... پینٹنگ، سنہری فریم کی وال کلاک، جس میں ہندسوں کی جگہ پر موتے، موٹے زرقون جڑے ہوئے تھے اور ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ شیشے کی الماری میں سفید ٹاولز تہ در تہ لگے ہوئے تھے۔
یہ اسٹوڈیو کا واش روم تھا تو بیڈ روم کا کیسا ہوگا۔
''یہ اسٹوڈیو بہت پرانا ہے...... پرنس بارہ سال کا تھا تو میں نے اس کے لیے یہ اسٹوڈیو بنوایا تھا...... کیونکہ میں جان چکی تھی کہ وہ آگے کیا کرنے جا رہا ہے۔'' لیڈی صوفیہ جو پرنس کی غیر حاضری کی وجہ سے ذہنی طور پر بہت منتشر تھیں اور مہمانوں کے سامنے بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہی تھیں...... خود کو نارمل ظاہر کرنے کی حتی الوسع کوشش ضرور کر رہی تھیں۔
تاجور نظر بچا کر گاہے گاہے اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑا لیتیں۔ پرنس کی اچانک گم شدگی سمجھ سے بالاتر تھی۔
سفینہ کا ذہن بار، بار صرف ایک سوال کر رہا تھا کہ کیا کوئی اتنا اہم ہے جو پرنس کو سفینہ کی طرف سے غافل کر دے...... جبکہ وہ بن بلائی بھی نہیں۔ نہ اس کا ذہن پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو رہا تھا نہ لیڈی صوفیہ کی بات چیت میں اسے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔
معاً انٹر کام پر رنگ ہوئی...... انجیلا بڑی پھرتی سے آگے بڑھی۔
''لیس......!'' اس نے ریسیور کان سے لگایا...... پھر ایک دم خوش و پُرجوش نظر آئی۔
''او کے......!'' کہہ کر اس نے ریسیور رکھا۔
''میم، پرنس آگئے ہیں۔'' وہ لیڈی صوفیہ سے مخاطب ہوئی۔
لیڈی صوفیہ یوں خوشی سے کانپنے لگیں گویا پرنس برسوں بعد پرائے دیس سے واپس آیا ہو...... مارے جذبات

کے چلتے ہوئے لڑکھڑا گئیں...... انجیلا نے لپک کر تھام لیا۔

تاجور نے سکون کی گہری سانس لی۔ زارا کو ایک دم اپنے دوپٹے اور ہیئر اسٹائل کا خیال ہوا۔ اسٹوڈیو میں آئینوں کی کمی نہیں تھی اس نے چلتے، چلتے آئینے میں نظر دوڑا کر اپنی تسلی کی۔

سفینہ اندر ہی اندر یوں لجائی گویا دلہن کو حجلہ عروسی میں لے جایا جا رہا ہو۔ اب یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ پرنس واپس آ گیا ہے تو اچانک گھر سے جانے کی وجہ بھی سامنے آ جائے گی۔

زارا نے چور نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

سفینہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکان اس کی نگاہوں سے نہ چھپ سکی۔

''سب کچھ اسی کے لیے کیوں ہو...... ہم بھی زندہ ہیں...... مر تو نہیں گئے......'' حسد میں انسان جو کچھ سوچتا ہے...... وہ شیطان کا مشترکہ کائناتی ایجنڈا ہے...... زبان خواہ کوئی ہو...... جذبات کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ثوبان لاؤنج میں پرنس کا ہاتھ یوں دبوچے بیٹھا تھا گویا اسے پرنس کے کہیں بھاگنے کا اندیشہ ہو۔

''ریلیکس، ابھی تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کی کال آئے گی...... اور ہم اسپتال چلے جائیں گے...... بس تھوڑا سا انتظار کرنا ہے۔ ماما بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ثوبان مسلسل گردن ہلا رہا تھا جیسے وہ پرنس کے ایک، ایک لفظ پر اعتبار کرنے کا عندیہ دے رہا ہو۔ اور ذرہ برابر شک نہ ہو۔

گھر میں داخل ہوتے ہی خادمہ نے بتا دیا تھا کہ لیڈی صاحبہ مہمانوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں ہیں۔ اب پرنس انتظار کی گھڑیاں ثوبان کو تسلیاں دیتے ہوئے گزار رہا تھا۔ اسے خادمہ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ گرینڈ مام کو مطلع کر دے وہ گھر واپس آ چکا ہے۔

اس طرح کی ہدایات دینے کا اس گھر میں مطلب یہ ہوتا تھا کہ ملازمین پرلے درجے کے نکمے اور غیر ذمے دار ہیں۔ ہوش ربا تنخواہ اٹھانے والے ملازمین کی سب سے بڑی پرکھ ان کا کامن سینس ہی ہوتا ہے۔

اس گھر میں نوکری پانے والے یہاں سے نکل کر کہیں اور نوکری کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے تھے...... یوں گویا کسی بیوروکریٹ افسر کو ریٹائرمنٹ کے بعد پرچون کی دکان پر بٹھا دیا جائے۔

ایک قابلِ برداشت وقفے کے بعد لیڈی صوفیہ، تاجور، سفینہ، زارا، انجیلا لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

سب کے ذہنوں میں اسٹوڈیو سے لاؤنج تک آتے، آتے بے شمار سوالات مرتب ہو چکے تھے مگر ثوبان پر نظر پڑتے ہی سب سوالات وفات پا گئے۔

عجیب حیرت کا عالم تھا...... گویا کسی خطے میں بارش کے ساتھ پہلی بار اولے پڑے ہوں، ثوبان بھی ایک دم سے پانچ مختلف انداز کی خواتین کو سامنے پا کر سراسیمہ ہو گیا تھا۔ اور گھبرا کر پرنس کی طرف دیکھا تھا۔

لیڈی صوفیہ تو اتنی زیادہ حیران پریشان ہوئیں کہ خزاں کے زرد پتے کی طرح کانپنے لگیں۔ تاجور کو فضول کے وہم آسیب بن کر چمٹ گئے۔ سفینہ بچے کو یوں غور سے دیکھ رہی تھی گویا چہرے سے تفصیلات پڑھ کر ہی دم لے گی...... البتہ زارا جس کو ہمیشہ بولنے کی جلدی بلکہ تڑپ رہتی تھی...... بول پڑی۔

''اوہ، ویری کیوٹ...... کس کا بچہ ہے...... کم از کم آپ کا تو نہیں ہو سکتا...... ویسے زبردست مسٹری ہے...... آپ اچانک غائب ہوئے پھر بچے کے ساتھ appear ہو گئے۔'' تاجور نے گھور کر زارا کی طرف دیکھا...... سفینہ اپنی جگہ جزبز نظر آئی۔

''ارے...... اسے میرا ہی بچہ سمجھیے......'' پرنس نے پیار بھری نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا۔

''what a nonsense'' لیڈی صوفیہ نے کھل کر اعتراض کیا۔

''آپ سب تو پریشان ہو گئے...... اتنا پیارا بچہ دیکھ کر پریشان تھوڑی ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں...... وہ جو کہتے ہیں ناں پھول، بچے، نظارے سب کے ہوتے ہیں۔'' پرنس نے اب بہت اہتمام سے مسکرا کر سفینہ کی طرف دیکھا تھا۔ سفینہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''آنٹی پلیز......!'' پرنس نے ہاتھ کے اشارے سے تاجور کو نشست سنبھالنے کے لیے کہا...... انجیلا، لیڈی صوفیہ کو پرنس کے پہلو میں بٹھا رہی تھی۔

پرنس کے انداز میں جو اعتماد اور سنجیدگی محسوس ہو رہی تھی وہ کم از کم تاجور کے لیے تو بہت باعث تقویت تھی۔ ہر قسم کی منفی سوچ ہوا میں گم ہو گئی۔ کوئی گڑبڑ والی بات ہوتی...... اور یہ بچہ پرنس کا ہوتا تو وہ اس موقع پر تو کبھی سامنے نہ لاتا۔

''فار گاڈ سیک...... پرنس مجھے بتاؤ یہ کون ہے؟'' لیڈی صوفیہ اب مہمانوں کے سامنے پہلے سے زیادہ شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔

''یہ بہت پیارا بچہ ہے...... اسے جب موقع ملتا ہے یہ مسجد میں آ کر نماز پڑھتا ہے۔'' پرنس نے ثوبان کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تعارف کرانا شروع کیا...... اور اس کے گال پر بوسہ دیا۔

''اوہ......'' لیڈی صوفیہ ایک دم مطمئن ہو گئیں...... وہ سمجھ گئیں کہ مسجد کی وجہ سے اس بچے کا پرنس سے تعارف ہوا ہے۔ اور ان کا پوتا ضرور اس بات سے متاثر ہوا ہوگا کہ اتنا چھوٹا بچہ عید کے علاوہ بھی مسجد آتا ہے۔

''آنٹی یہ چھوٹا پرنس ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ مجھ سے تو اس کی ملاقات مسجد میں ہی ہوئی تھی۔''

''ماشاءاللہ...... بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو مسجد کا عادی بنانا...... یہ تو بہت اچھی بات ہے......'' اب تاجور کے انداز میں خود بخود حلاوت وشیرینی جھلکنے لگی تھی۔ درحقیقت بچے پر پیار آنے لگا تھا۔

سفینہ کی آنکھوں میں حیرت آمیز مسرت در آئی تھی۔

''بیج...... لیکن...... یہ تو بتائیں...... آپ ہمیں چھوڑ کر اسپیشلی اس بابا سے ملنے چلے گئے تھے......؟ کچھ سمجھ نہیں آئی۔''

زارا جذبات سے عاری اپنے سوالات میں الجھی ہوئی تھی۔

سب اس سوال کے بعد بہت غور سے پرنس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ گویا زارا سب کی ترجمان بنی ہوئی تھی۔

پرنس نے ثوبان کو بالکل اپنے ساتھ لگا لیا تھا...... ثوبان، پرنس کے بازو سے سر ٹکائے سب کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی ہجوم میں ماں کے ہاتھ کا سہارا مکمل تحفظ کا احساس دیتا ہے۔ گم نہ ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

☆☆☆

تاجور کا سیل مسلسل پاورڈ آف مل رہا تھا۔ ساحل بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ site پر ایک ایمرجنسی ڈیکلیئر ہو گئی تھی۔ آج کل سائٹ آفس کا کرتا دھرتا وہ ہی بنا ہوا تھا۔ اس طرف ہونے والے تمام معاملات ڈائریکٹ اس کو رپورٹ ہوتے تھے۔ زیرِ تعمیر عمارت کی ایک نئی دیوار ڈھے گئی تھی اور ایک مزدور جاں بحق ہو گیا تھا جو وہیں دیوار کے ساتھ چارپائی پر سو رہا تھا۔

پولیس، سیکیورٹی کے لوگ جائے حادثہ پر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے...... اور مزدور کا جسد خاکی سرد خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

پولیس ضابطے کی کارروائی میں مصروف ہو چکی تھی۔ کنسٹرکشن کمپنی کے تمام ذمے داروں کو ان کے گھروں سے اٹھا لیا گیا تھا۔

تاجور کی غیر موجودگی کے باعث تمام معاملات براہِ راست ساحل سے طے ہو رہے تھے۔ اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت نے تو گویا ساحل میں برقی رو دوڑا دی تھی۔ گاہے گاہے تاجور سے رابطے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

اذیت ناک پریشانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ لینڈ لائن نمبر بھی اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تاجور دن بھر لگ بھگ چار نمبر استعمال کرتی تھیں، اس وقت چاروں پر رابطہ نہ ہونا، اس حادثے کے بعد دوسرا حادثہ تھا۔

اوورسیئر، ٹھیکیدار، آرکیٹیکٹ، آؤٹ ڈور پلانر، سرویئر، انجینئر...... سب قانون کی گرفت میں آچکے تھے۔

مگر مالکہ لاپتا ہوگئی تھی۔

ساحل سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ کسی بھی صورت پولیس تاجور کے گھر نہ پہنچے...... اس غریب مزدور مرحوم نے جان دے کر اسے ایک سنہری موقع فراہم کیا تھا کہ وہ ایک جست میں کامیابی کی بلندیوں کو چھولے۔

وہ ایک مالک کی طرح تمام معاملات دیکھ رہا تھا۔

اس نے تو تاجور کے ہیڈ آفس کے کسی کرتا دھرتا تک کو فون نہیں کیا تھا۔ یوں گویا آج کی تاریخ میں تاجور کو اپنا ممنونِ احسان کر کے ہی چھوڑے گا۔

''دیکھیے آفیسر...... میری اونر ایک خاتون ہیں، اس شہر کی ایک معزز شہری ہیں اور اس سارے قصے میں بالکل innocent ہیں۔ یہ سراسر کنسٹرکشن کمپنی کی ذمے داری ہے۔''

''وہ مالکہ ہیں، ان کا جائے وقوعہ پر موجود ہونا قانونی تقاضا ہے۔'' آفیسر نے ایک جملے میں ساحل کی ساری خطابت پر پانی پھیر دیا۔

''اس ملک میں قانون کی کتنی حکمرانی ہے...... دن بھر کی بریکنگ نیوز سے پتا چلتا ہے۔'' ساحل نے تلملا کر سوچا مگر خود پر قابو رکھا۔ اس وقت اسے صورتِ حال کو حسبِ منشا کنٹرول کرنا تھا۔

''ایک بے قصور، عزت دار خاتون کے گھر پر رات کے اندھیرے میں پولیس کا جانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ میں مسلسل ٹرائی کر رہا ہوں جیسے ہی رابطہ ہوگا وہ خود آپ سے ملیں گی...... اور جو کچھ بھی ہے فیس کریں گی...... ہر طرح کا تعاون کریں گی......''

''آپ سچویشن کو سمجھیں...... اس مزدور کے لواحقین ان کے بنگلے کا گھیراؤ کر لیں گے، اس کو بھی روکنا ہے۔'' آفیسر اپنی جگہ اڑا ہوا تھا۔

''آپ اپنی منطق اپنے پاس رکھیں، ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا ہے۔'' آفیسر نے آنکھیں ماتھے پر رکھ کر جواب دیا۔

''اوکے...... تو پھر میں خود گھر جا کر انہیں لے آتا ہوں...... اطمینان رکھیں ہم لوگ بھاگیں گے نہیں...... میڈم کا پھیلا ہوا بزنس ہے، سیکڑوں لوگ ان کے ماتحت کام کرتے ہیں...... یہ سب کچھ چھوڑ کر کون بھاگ سکتا ہے......؟ آپ خود سوچیں......''

''دیکھیں...... ہم وقوعہ پر کھڑے، کھڑے سب کچھ سوچ لیتے ہیں۔ مشتعل ہجوم تھانے کو آگ لگانے پہنچ جاتا ہے...... ہم بھی اتنے ہی بے قصور ہیں جتنی آپ کی مالکہ......'' آفیسر کی ٹون نہ بدل کر دی...... ساحل کی بات کاٹ کر اپنی سنائی۔

''ٹھیک ہے...... میں جاتا ہوں، میڈم کو لے کر آتا ہوں...... میرا اسیل نمبر آپ کے پاس ہے...... جب تک میں میڈم کو لے کر نہیں پہنچتا...... آپ سے رابطے میں رہوں گا۔''

''ایسے کیسے جانے دیں بابا...... آپ بھی غائب ہوگئے تو ہماری پیٹیاں اتر جائیں گی۔'' ساحل نے اب بڑی بے بسی سے آفیسر کی طرف دیکھا تھا۔

چند لمحے سوچا...... پانچ، پانچ ہزار کے آٹھ نوٹ اس کے والٹ میں موجود تھے۔ اس نے پرس کھول کر سب کے سب نکال لیے۔ ساتھ ہی شناختی کارڈ بھی......

''یہ رکھ لیجیے...... مجھے تو لگ رہا ہے کورٹ یہیں لگ گئی ہے...... زرِضمانت کے طور پر رکھ لیں...... یہ میرا اوریجنل شناختی کارڈ ہے، کاپی نہیں ہے۔ چیک کرلیں۔'' سامنے کروڑوں، اربوں نظر آرہے ہوں تو چالیس ہزار ٹکے برابر لگتے ہیں۔ آفیسر کو پہلے ہی ساحل کی بات پر یقین تھا...... مگر ساری بحث شاید اسی مقصد کے لیے تھی۔ اس کے منہ تل کا لڈو پڑ گیا تھا...... منہ بند ہوگیا اور ساحل عطا کردہ اپنی لگژری گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

سائٹ آفس میں دن نکلا ہوا تھا۔ ساری لائٹس آن تھیں اور تمام متعلقہ افراد یوں جاگ رہے تھے گویا آج کے بعد قیامت تک جاگتے رہیں گے۔

☆☆☆

''ایکچوئیلی اس سچویشن میں بچے بہت گھبرا جاتے ہیں...... اس کو پریشانی میں بس انکل یاد آئے۔'' پرنس نے اہم کتھیاں کرتے ہوئے مختصراً اپنی غیر موجودگی کی وجہ بیان کردی تھی۔

اب سب کے چہروں پر اطمینان نظر آرہا تھا بلکہ پیار بھری نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اسپتال میں اس کی مما کے ساتھ کون ہے؟'' سفینہ نے ایک خیال کے وارد ہوتے ہی سوال کیا تھا۔

زارا نے سفینہ کو یوں دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ ''تمہیں بہت فکر ہے۔''

''ڈاکٹرز کی نے ایک نرس اپائنٹ کردی ہوگی...... ان کو ساری سچویشن پتا ہے۔ وہ ہینڈل کرلیں گے۔'' پرنس کو سفینہ سے براہِ راست ہونا اچھا لگا...... جواب دیتے ہوئے خوب دیکھا بھی...... حسنِ سادہ کی بلائیں بھی لیں...... اس استحقاق کے احساس کے ساتھ کہ وہ اس کی ہی تو ہے۔

خادمہ نے تیسری مرتبہ آکر مطلع کیا کہ کھانے کی میز تیار ہے۔

لیڈی صوفیہ نے ثوبان کی طرف دیکھ کر پرنس کو مخاطب کیا۔

''ثوبان کو بہت توجہ سے کھانا کھلانا ہوگا...... پتا نہیں بچے نے کب سے کھانا نہیں کھایا۔ جیسا کہ ابھی اس نے بتایا کہ گھر کے نوکر چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔''

''کیا یہ عجیب و غریب بات نہیں کہ سارے نوکر ایک ساتھ چھٹی پر چلے گئے ہوں ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔''

زارا کا سارا مزہ کرکرا ہوچکا تھا...... اس کے دماغ کا تنقیدی حصہ بڑی سرعت سے کام کررہا تھا۔ ثوبان تو اسے کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا جس نے اس کی ساری منصوبہ بندی خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔

وہ جس رومانس اور فینٹسی کو اپنے حق میں موڑنے کے درپے تھی وہ تو ہوا ہوگئی تھی۔ بدترین زمینی حقائق اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اور تو اور لیڈی صوفیہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

البتہ سفینہ کے جذبات مزید خوشگوار ہوچکے تھے۔ پرنس کی خوب صورت شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا تھا...... وہ مطالعے کی شوقین تھی...... اس نے کبھی پڑھا تھا کہ بچوں پر پیار آنا اللہ کی رحمت کی نشانی ہوتی ہے۔

اسے یوں محسوس ہورہا تھا گویا وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہے جسے مستقبل میں بہترین شخصیت کا جیون ساتھی ملنے والا ہے۔ ایسا ساتھی جس کے ساتھ زندگی مکمل ہوجاتی ہے اور ذات روحانی مسرت کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتی ہے۔

تاجور کے خیالات بھی سفینہ سے مختلف نہیں تھے، ایک روحانی اطمینان محسوس کررہی تھیں...... خود بخود ایسا کچھ سامنے آیا تھا کہ مزید کھوج و تجسس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

اگر لیڈی صوفیہ کھانے کی میز پر شادی کا وقت معین کرنے کی بات کرتیں تو اب وہ مکمل طور پر تیار تھیں۔ لاؤنج سے اٹھنے اور ڈائننگ تک جانے کا فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں تھا...... مگر وہ فیصلہ کرچکی تھیں۔

پرنس، ثوبان کا ہاتھ پکڑ کر نشست سے اٹھا تو وہ سفینہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر ثوبان کا دوسرا ہاتھ تھام

لیا......ثوبان اب پرنس اور سفینہ کے درمیان تھا۔

سفینہ کی یہ بے ساختگی پرنس کو اچھی لگی۔

"love you" اس نے پیار کی پہلی سرگوشی سفینہ کے کان میں کی......سامان باندھنے سے لے کر دوڑیں لگانے تک کی تھکن پلک جھپکتے اتر گئی تھی۔ یہ اس نے کیا سنا؟ گویا اب ساری کائنات اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

زارا کو ٹیبل کراس کر کے ان کے نزدیک آنے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہوئی مگر نظارہ اس نے کر لیا تھا۔

وہ ایسے گڑھے میں جا پڑی جس میں سوائے شعلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

ساحل مینول گاڑی بھگاتا تاجور کے گھر پہنچا تھا۔

گارڈ نے اسے پہچان کر بہت احترام سے سلام کیا۔

''بیگم صاحبہ اگر سو رہی ہیں تو انہیں اٹھا دو......'' ساحل نے لاحاصل تفصیلات و تکلفات کو پرے کر کے مطلب کی بات کی۔

''بیگم صاب تو گھر پر نہیں اے......او......تو کسی دعوت میں گیا ہے۔'' گارڈ نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں مطلع کیا۔

''اوہ نو......'' ساحل کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''شاید اسی وجہ سے ان کے تمام نمبرز آف مل رہے ہیں۔'' یہ گتھی تو کھڑے، کھڑے سلجھ گئی۔

''یار گھر میں جو بھی ہے اس سے بات کراؤ......'' وہ کوفت کے عالم میں گویا ہوا۔

''کوئی نہیں اے......'' گارڈ نے صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ ہاتھ کو پنکھے کی طرح پھیلا کر بھی حرکت دی۔

''مائی گڈنیس......'' ساحل نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''کیا میں اندر بیٹھ سکتا ہوں؟'' ساحل نے بے بسی سے چاروں اور نظر دوڑائی۔

''نہیں......اندر کوئی نہیں اے......ام کدھر سے تم کو جانے دے گا؟'' گارڈ نے ڈمی کے انداز میں کھڑا ہو کر صفاچٹ انکار کر دیا......

''تمہارے پاس ان کی بیٹی کا نمبر ہے......؟'' اسے پھر ایک راستہ سوجھا۔

''کون سا بیٹی...؟ اس کا ایک بیٹی لاہور میں پڑھائی کرتا اے......دوسرا اِدھر ہوتا ہے۔'' گارڈ نے اب اس پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔

''کسی کا بھی دے دو یار......'' ساحل جھلایا۔

''کیسے دے، دے؟ کسی کا بیٹی کا نمبر غیر مرد کو کیسے دے گا؟'' الٹی آنتیں گلے پڑ چکی تھیں......ساحل کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''ام کو پتا ہے تم بیگم صاحبہ کے دفتر میں کام کرتا اے......مگر لڑکی کا معاملہ اے......ام کسی کا بھروسا نہیں کرے گا......ابھی تم جاؤ......صبح کو آنا......'' گارڈ نے اب ہری جھنڈی لہرا دی۔

''گھر میں کوئی نوکر ہے تو اس سے بات کرا دو۔''

''ام کو معاف کر دو صاب......آپ کچھ بھی بولو ام کچھ نہیں کرے گا۔ امارا ڈیوٹی گیٹ پر اے......اندر نہیں جائے گا۔''

ساحل اب سچ مچ اس کے سامنے لاچار ہو چکا تھا۔

''خوش رہو یار......اللہ تمہیں اس گیٹ کے سائے میں لمبی عمر عطا فرمائے۔'' ساحل تلملاتا ہوا اپنی گاڑی کی

طرف بڑھ رہا تھا۔ طے کر لیا تھا گاڑی میں بیٹھ کر تاجور کا انتظار کرے گا۔

☆☆☆

ثوبان نے آج کی رات اپنے نام کرلی تھی۔ زارا کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے لیڈی صوفیہ پر اثر انداز ہونے کے لیے جو کچھ سوچا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کا کوئی راستہ نہ ملا...... اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔

ثوبان کھانے کی میز پر بھی سفینہ اور پرنس کے درمیان بیٹھا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے...... اور وہ نامانوس چہروں کے درمیان بہت گھبرایا ہوا تھا۔ سفینہ مسلسل خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ سفینہ اور پرنس، ثوبان کے حوالے سے بھی اس وقت بہت قریب ہو رہے تھے۔ پرنس، ثوبان کو کچھ کھلانے کی کوشش کرتا...... وہ انکار کرتا تو سفینہ ذمّہ لے لیتی اور اصرار کرتی...... ثوبان کو خود سے شناسا کرنے کے لیے اس نے ایک دو بچگانہ لطیفے بھی سنائے تھے۔ لیڈی صوفیہ، ثوبان پر ایک نگاہ ڈال کر پھر تاجور کو کوئی ڈش پیش کرنے لگتیں۔ ان کی نگاہوں میں اس کے لیے بہت اپنائیت و پیار نمایاں طور پر جھلک رہا تھا۔

''بھئی ہمیں نہیں پتا تھا کہ آج کا ڈنر ثوبان کے آنر میں ہے۔ ورنہ میں اس کے لیے کوئی گفٹ ضرور لے آتی۔'' ثوبان کے حوالے سے بات کر کے زارا نے سب کو گویا اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لہجے میں کوئی بات نہیں تھی مگر ایسا کچھ ضرور تھا کہ سفینہ نے چونک کر زارا کی طرف دیکھا تھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا ڈنر ثوبان کے آنر میں ہے...... مگر یہ کیا یہ تو کچھ کھا ہی نہیں رہا......'' تاجور نے بھی خوب صورت، صحت منداور گھبرائے ہوئے بچے کی طرف خاص توجہ کی...... بلکہ انہیں کھانے کی میز پر ایک پیارے سے بچے کو دیکھ کر ایک عجیب سی مسرت محسوس ہو رہی تھی...... یوں جیسے اس کی وجہ سے محفل کو چار چاند لگ گئے ہوں۔ ثوبان ٹکر ٹکر سب کی طرف دیکھ رہا تھا...... معصوم بچے کا ذہن تو اپنی ماں میں الجھا ہوا تھا...... دوسرے پرنس کے گھر کے شاہانہ انداز بھی اسے بہت نامانوس لگ رہے تھے۔ لیڈی صوفیہ کو تو وہ بار، بار دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے اتنی بوڑھی مگر سجی سنوری خاتون پہلی بار دیکھی تھی۔ جب وہ ان کی طرف دیکھتا تھا وہ ایک مسکراہٹ ضرور نچھاور کرتی تھیں۔

پرنس نے ایک حسین سنہری گلاس میں ثوبان کو پائن ایپل جوس پلانے کی کوشش کی تو اس نے پرنس کا ہاتھ پرے کر دیا۔

سفینہ نے فوراً پرنس کے ہاتھ سے گلاس لیا...... دونوں کی انگلیوں میں ہلکا سا تصادم ہوا اور دل نے ایک حادثے کی طرح محسوس کیا۔

آج پہلی بار دونوں ایک دوسرے کے لمس سے آشنا ہوئے تھے۔

سفینہ کے چہرے پر گلابیاں تیر گئیں۔ پرنس کا جی چاہا اپنا ہاتھ چوم لے۔

''بھئی ہم اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں مگر ابھی تک وہ بات نہیں ہو پائی جس کے لیے آج ساتھ بیٹھے ہیں۔'' لیڈی صوفیہ کو معاً خیال آیا۔ ورنہ ثوبان کی وجہ سے ان کی رو بہک چکی تھی...... وقتی طور پر بوڑھے حافظے نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

''لیڈی صوفیہ...... ہم آپ کے بلانے پر آگئے ہیں، آپ جو بات کرنا چاہیں حاضر ہیں۔'' تاجور نے مؤدبانہ انداز میں بات کی تھی۔ زارا کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہونے لگیں۔

''اصولاً تو یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والے پروپوزل کے بعد ہاں یا نہ میں جواب دیتے ہیں یا تو بات بڑھتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے......'' لیڈی صوفیہ نے پیار سے سفینہ کی طرف دیکھا۔

''بات آگے بڑھائیں گرینڈ مام......'' پرنس نے برجستہ کہا تو سفینہ محجوب انداز میں مسکرا پڑی۔ تاجور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ثوبان سر اٹھا کر پرنس کی طرف دیکھنے لگا۔ زارا کو یوں محسوس ہوا وہ کسی خزاں رسیدہ باغ میں آنکلی ہو اور پاؤں تلے خشک پتے چرچرا رہے ہوں۔

''تو پھر بہت مختصر بات کرتے ہیں...... یہ بتایئے سفینہ کو انگوٹھی پہنانے کب آئیں؟'' لیڈی صوفیہ نے ایک ڈش اٹھا کر تاجور کو پیش کی گویا اپنی بات منوانے کے لیے لاشعوری طور پر کوئی رشوت پیش کر رہی ہوں۔

''آپ جب مناسب سمجھیں تشریف لائیں......بس یہ خیال رہے کہ سفینہ کو لاہور سے آنا ہوگا۔'' تاجور نے بلاتکلف جواب دیا۔ گویا پل میں ہاں ہوگئی تھی۔

سفینہ کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اس نے پرنس کی جانب دیکھنا چاہا مگر دیکھا نہ گیا۔

زارا کو کھانے کی پلیٹوں میں کھانے کے بجائے زہر نظر آنے لگا۔

''ویسے تو اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں...... سفینہ کے فائنل ایگزام ہونے والے ہیں۔ ایگزام کے بعد شادی ہوجائے تو اچھا ہے۔ میری اماں کہتی تھیں جب لڑکی کا رشتہ طے ہوجائے تو اسے رخصت کرنے کی جلدی ہونا چاہیے۔ وہ تو خیر یہ بات شرعی پوائنٹ سے کہا کرتی تھیں۔''

''stay blessed always آپ کی اماں کتنی اچھی باتیں کرتی تھیں۔'' پرنس نے تاجور کا جملہ جس برجستگی سے اچک لیا تھا...... تاجور اور لیڈی صوفیہ بے ساختہ ہنس پڑی تھیں...... سفینہ یوں شرمائی گویا دلہن بنی پرنس کے پہلو میں بیٹھی ہو...... زارا نے بھی ہنسنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

''یہ کیا یہاں تو ایک دم شادی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ اُف...... کہیں یہ لوگ تاریخ رکھ کر ہی یہاں سے نہ اٹھیں۔'' زارا تو رشتہ ہی روکنا چاہتی تھی...... اب شادی روکنے کا مرحلہ سر پر آپڑا تھا۔

''as you wish ...ok!'' لیڈی صوفیہ نے پُرمسرت انداز میں کہا۔

''یہاں آنے سے پہلے میں نے سفینہ کے ساتھ پراپر میٹنگ کی تھی، اس کو لاہور سے بلانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس لیے اب میں بہت کانفیڈنٹ ہو کر آپ سے بات کر رہی ہوں۔'' تاجور نے اب اپنی بات مکمل کی۔

''تھینک یو سفینہ......'' لیڈی صوفیہ نے اپنا مضبوط مہذبانہ خاندانی پس منظر ثابت کیا۔

''تھینک یو سفینہ......'' پرنس نے بھی سفینہ کی طرف غور سے دیکھ کر روحانی مسرت میں ڈوب کر شکریہ ادا کیا تھا۔

سفینہ نے گھبرا کر پانی کا گلاس اٹھالیا۔

''تاجور، سفینہ میرے بیٹے کا ڈریم ہے...... مجھے یاد نہیں پرنس نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش کی ہو پھر اصرار کیا ہو...... ایموشنلی بلیک میل کیا ہو...... صرف سفینہ اس کی پہلی فرمائش ہے۔'' لیڈی صوفیہ اپنے مخصوص صاف گو اور... دوٹوک انداز میں کہہ رہی تھیں۔

زارا کو یوں لگا گویا اس کا دل کسی اتھاہ میں ڈوبتا جارہا ہو۔ اس نے بیزاری سے ثوبان کی طرف دیکھا جو کھانا نہیں کھا کر دے رہا تھا مگر اس کا قیمتی وقت کھا گیا تھا۔

''سفینہ اس شہر کی موسٹ لکی لڑکی ہے تاجور...... یقین کریں...... جس طرح لڑکیوں کے پروپوزل آتے ہیں، پرنس کو اس طرح پروپوز کیا گیا ہے۔ مگر یہ یہی کہتا تھا گرینڈ مام شادی ایک بار ہوتی ہے اور ہونا چاہیے...... اور اسی لڑکی سے ہونی چاہیے جس کی طرف دل جاتا ہو۔'' لیڈی صوفیہ، پرنس کے حصے کا کام کر رہی تھیں۔

سفینہ کو یہاں کے سامنے حیا آرہی تھی...... اس کی ماں کے سامنے کھلے انداز میں پرنس کے احساسات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔

''آج کل آپ کون سی بک پڑھ رہی ہیں گرینڈ مام......؟'' زارا نے ماحول کے برعکس بے تکا سوال کر کے سب کو اپنی طرف حیرت سے دیکھنے پر مجبور کردیا۔ عموماً ایسے موقع پر چھوٹی بہن ہونے والی دلہن سے زیادہ جذباتی نظر آتی ہے۔ شادی کے حوالے سے ڈھیروں باتیں کرتی ہے۔

''ارے...... زارا...... کیا ہوگیا ہے تمہیں...... یہ باتیں تو تم جب مرضی آ کر لیڈی صاحبہ سے کرسکتی ہو۔''

تاجور کو اتنی زیادہ حیرت تھی کہ بات کرنے کے بعد بھی زارا کی صورت تک رہی تھیں۔

''اوہ آئی ایم سوری...... میں سمجھی آپ لوگوں کی بات ختم ہوگئی۔'' زارا نے فوراً ہنستے ہوئے معذرت کی۔ زارا کی ہنسی میں مرحوم ارمانوں کے نوحے تھے۔

''بہت بے وقوف ہے یہ...... پتا نہیں کب بڑی ہوگی؟'' تاجور نے لاڈ دلار کے انداز میں زارا کا بے تکا پن محو کرنے کی کوشش کی۔

ڈھیروں باتوں کے دوران عشائیہ ختم ہوا...... ثوبان نے سب کی باتیں یوں غور سے سنی تھیں گویا ڈنر کے اختتام پر بطور منصف اس نے کوئی فیصلہ سنانا یا محفوظ کرنا ہو۔

''آنٹی...... آپ کی اجازت سے میں سفینہ کو اسٹوڈیو لے جانا چاہتا ہوں۔'' پرنس نے اٹھتے ہوئے تاجور سے درخواست کی...... ہاتھ آئے ان حسین لمحات سے وہ ممکنہ رس کشید کرنا چاہتا تھا...... سفینہ اس کی تھی، وہ تنہائی میں اس سے اکثر ہم کلام ہوتا تھا...... آج روبرو بھی...... بس تھوڑا سا وقت ہاتھ میں رہ گیا تھا اور یہ لمحات امر ہونے کے لیے میسر آئے تھے۔

''میں بھی چلتی ہوں......'' زارا فوراً کھڑی ہوگئی کیونکہ وہ تاجور کے پہلو میں تھی اس لیے تاجور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا۔

سفینہ کے دل میں اٹھتے جوار بھاٹے...... جھاگ کی طرح بیٹھنے لگے۔

پرنس کو یوں لگا...... کشتی میں پاؤں رکھنے سے پہلے ہواؤں نے کشتی کو ساحل سے دور کر دیا ہو۔ اس نے حیرت آمیز نگاہوں سے زارا کی طرف دیکھا تھا۔

اب اتنی بھی بچی نہیں تھی...... اسے تو اس موقع پر بہن کے لیے خود کوئی موقع فراہم کرنا چاہیے تھا۔

''او کے پرنس...... ہم لوگ لیڈی صوفیہ کی کمپنی انجوائے کرتے ہیں...... مگر خیال رہے ہم آل ریڈی بہت لیٹ ہوگئے ہیں۔'' تاجور نے ابھی تک زارا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ مبادا وہ ہاتھ چھڑا کر کہیں بھاگنے لگی ہو۔

پرنس نے جھک کر ثوبان کے گال پر پیار کیا...... جو ابھی تک گویا سناٹے میں تھا کسی طور بول کر نہ دیا تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے میں ثوبان کو اپنے ساتھ لے جاؤں......'' سفینہ نے اپنی مسرت کو ثوبان کے حوالے سے منسوب کرنے کی کوشش کی تاکہ دیکھنے والی نگاہوں کو الجھا کر رکھ دے اور کوئی اس کے دل کا بھید نہ پائے...... یہ ایک فطری حیا کا ردِعمل تھا۔

''کہاں...... لاہور...... ؟ شور ہو جائے گا وہاں...... پروٹسٹ ہو جائے گا۔''

''وہ کیوں...... ؟'' سفینہ کو پرنس کی طرف دیکھنے کا بہانہ مل گیا۔

''سب یہی کہیں گے کہ اتنا بوڑھا، ضعیف اسٹوڈنٹ نہیں چلے گا۔'' پرنس کی بات پر سب ہنس دیے سوائے زارا کے......

سفینہ، پرنس اور ثوبان کے ساتھ باہر کی طرف جا رہی تھی۔ زارا اپنی جگہ بت کی طرح اِستادہ تھی۔ یونانی شہزادے جیسا وجیہہ، مردانہ حسن کا شاہکار، دنیا کے بہترین دھاگوں سے بنے کپڑے کا قیمتی لباس جو عموماً کرتا پاجامہ ہی ہوا کرتا تھا سوٹنگ صرف گھر سے باہر کی تقریبات میں ہوتی تھی۔ وہ بھی اتنے اہتمام سے کہ شیونگ کریم، کولون، پرفیوم، سوپ، سب ایک فیملی پروڈکٹس ہوتی تھیں۔ ایک خوشبو، ایک مہک، مختلف اقسام کی خوشبویات خلط ملط نہیں ہوتی تھیں...... بہت سے لوگ یہ شناخت بھی رکھتے ہیں۔

اس طرزِ زندگی کو عام انسان ایک خواب کی بات گردانتا ہے۔ مگر اسی دنیا میں لوگ فاقے کی وجہ سے خودکشی بھی کرتے ہیں اور اسی دنیا میں لوگوں کے جہاز بھی چلتے ہیں۔

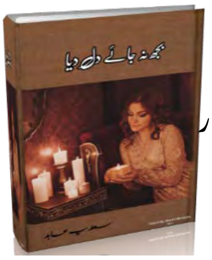
اور نوٹ یا کرنسی کو ہاتھ میں لیے بغیر کروڑوں، اربوں کی تجارت بھی کرتے ہیں اور سرمایہ دار کے دولت

عہدِ وفا



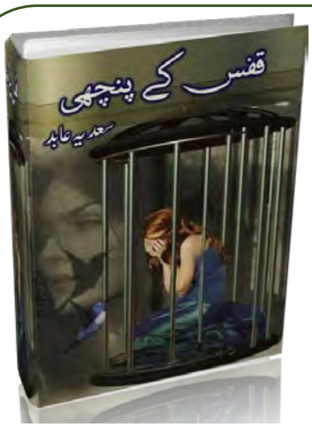
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

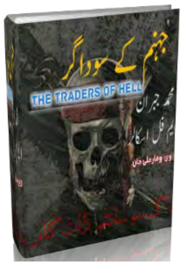
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

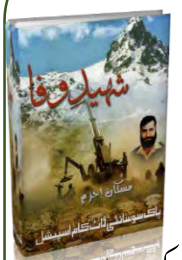
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شمار ہوتی ہے۔

کدے پر مریض کی چارپائی رکھ کر اپنی ہی محنت کی اجرت لینے کے لیے احتجاج کرتے بھی نظر آتے ہیں......جہیز میں چاندی ملنے کا امکان نہیں ہوتا...... بالوں میں چاندی نظر آتی ہے......جبکہ کسی محل میں ہیرے کا کنگن اِدھر اُدھر پھینک کر نئے کنگن کی خریداری کے لیے کمر کسی جاتی ہے۔

انسانوں کے انگوٹھے کے نشان آپس میں نہیں ملتے......اسی طرح مقدر کی تحریر بھی الگ، الگ ہوتی ہے۔

حیرت ہمیشہ بقدرِ علم و آگاہی ہوتی ہے......

''ایسا تو بس شہر میں ایک ہی ہے......اور یہ بھی ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔'' زارا کا دل چاہ رہا تھا وہیں کھڑے، کھڑے چلا، چلا کر رونے لگے۔

بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ حسد کی شدت سے لوگ بری طرح رو پڑتے ہیں کیونکہ اللہ کی رحمت سے دور ہوتے ہیں اس لیے مایوسی اور گھٹن بہت زیادہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

''یہ، یہ......؟'' سفینہ نے وفورِ شوق سے بولتی تصویر پر دھیرے سے ہاتھ پھیرا۔ ''آپ نے تو کمال کر دیا۔''

آسمانی اور بہت بلند رومان پروان چڑھ رہا تھا...... پرنس کی آنکھوں کی چمک سفینہ کو اتنے حسین پیغامات ارسال کر رہی تھی جو بہت انوکھے تھے۔ اس بہشتی پھل کی طرح جس کا ذائقہ گویا موت سے پہلے ہی چکھ لیا ہو۔

''کمال تو اس کا ہے، جس نے آپ کو بہت پیار سے میرے لیے تخلیق کیا۔'' پرنس نے ثوبان سے پہلو بچا کر آہستگی سے سرگوشی کی۔ سفینہ کا جی چاہا کہہ دے۔ ''بس کریں کہیں یہیں کھڑے، کھڑے مر ہی نہ جاؤں۔'' مگر فطری حیا مانع تھی۔

''بہت شاندار...کیا میں اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں؟'' ایک الہڑ معصومانہ خواہش نے ہلکان کیا۔

''ماہین دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی......''

''آف کورس! مجھے کسی میڈیم، واسطے کی ضرورت نہیں......آپ نہیں ہوتیں......مگر پھر بھی صرف آپ ہی ہوتی ہیں......'' پرنس نے ٹیبل پر رکھے گلدان سے ایک پھول نکال کر ثوبان کو تھمایا۔

''انکل، ماما......!'' پھول لیتے ہی ثوبان نے خود کو اذیت ناک گھٹن سے نجات دلانے کی سعی کی۔

اتنی دیر سے وہ اندر ہی اندر سہتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا ان ہنستے مسکراتے لوگوں کو آخر میری ماں کب یاد آئے گی۔

''ثوبان بیٹا......یقین کرو، میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں بھولا ہوں، ابھی ڈاکٹر کی کال آئے گی اور ہم آپ کو ماما کے پاس لے چلیں گے......'' پرنس انتہائی اعلیٰ درجے کے مضبوط اعصاب کا مالک تھا......اتنی دیر سے وہ اپنے مہمانوں کے ہمراہ تھا مگر ذہن کے پردے پر ثوبان کی بے ہوش ماں مسلسل متحرک تھی۔

وہ اس کمال سے اپنا کردار نباہ رہا تھا کہ سفینہ کو ہلکا سا بھی شبہ نہ گزرے کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہے۔

کردار کی پختگی اور روحانی سکون انسان کو کبھی کم ظرف پیمانے کی طرح چھلکنے نہیں دیتے۔

اگر سفینہ کے پاس انسانوں کے دل پڑھنے کی صلاحیت ہوتی تو شاید آج رات ہی اس کی محبت، عشق و عقیدت میں تبدیل ہو جاتی۔

''پرامس......؟'' ثوبان نے چھوٹا سا ہاتھ پرنس کی طرف بڑھایا۔

''پرامس!'' پرنس نے اس کا ہاتھ تھام کر ہاتھ پر بوسہ بھی ثبت کیا۔

''ثوبان......آپ میرا ایک کام کریں......'' پرنس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ کائنات کے حسین ترین لمحات سفینہ کی گرفت میں تھے۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے پرنس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ پرنس کی شوخی کچھ کہہ رہی تھی۔

''جی انکل......!'' ثوبان نے سیاہ بھونرا سی آنکھیں پوری کھول کر پرنس کی طرف دیکھا۔

''سفینہ سے کہو مجھ سے پرامس کر لے۔'' سفینہ نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ کیا کر رہے ہیں؟

''سفینہ، آپ پرامس کریں۔''
ثوبان talky doll کی طرح بول پڑا۔
پرنس نے سفینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا..... سفینہ نے حیا آمیز ادا سے پرنس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔
ثوبان نے معصومانہ خوشگوار حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ گاڑی کا اے سی آن کر کے سیٹ پر لمبی تان کر سو بھی سکتا تھا۔ مگر سیل فون پر وقفے، وقفے سے آنے والی کالز اسے ڈھنگ سے آنکھیں بند کرنے نہیں دیں..... تھکاوٹ، فطری نیند کا غلبہ..... اچانک ہی دماغ میں جیسے دھماکے ہونے لگے..... اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس انداز میں باہر آیا گویا گارڈ کی گردن دبوچنے اور اسے جان سے مارنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہو۔
تیر کی طرح اڑ کر... گویا گارڈ تک پہنچا تھا۔
''احمق، جاہل انسان، دماغ کی جگہ پر پتھر سیٹ کیے ہوئے ہیں..... اندھے نظر نہیں آ رہا ایک گھنٹے سے گاڑی میں مرا پڑا ہوں..... انسان ہو یا ڈنگر مویشی، ابھی پولیس کی چار گاڑیاں آ جائیں گی۔ تمہاری گن چھین کر گیٹ کا تالا توڑ دیں گی..... پھر کیا کرو گے تم.....؟ مجھے کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے..... روڈ پر گاڑی میں سونے کی نہیں..... پاگل آدمی..... موٹی عقل میں اتنی بات... بھی نہیں آتی کہ میں اپنا گھر بستر چھوڑ کر گاڑی میں کیوں مرا پڑا ہوں.....؟'' اونگھتا جھومتا گارڈ تو یوں مستعد ہوا گویا اسے گن سیدھی کر کے..... واردات کے لیے آنے والے ڈاکو کا نشانہ لینا ہو۔ ہکا بکا ساحل کی شکل دیکھ رہا تھا۔
''پو..... پ..... پولیس..... کدر وا ہے؟'' گارڈ نے بڑے فرض شناس پہرے دار کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔
''اگر بیگم صاحبہ سے رابطہ نہیں ہوا تو پولیس اِدھر بیگم صاحبہ کو گرفتار کرنے آ جائے گی.....'' ساحل نے ہراساں کر کے کام نکالنے کی کوشش کی۔
''ام کو سمجھ نہیں آیا.....'' گارڈ، بیگم صاحبہ کی گرفتاری کا سن کر بدحواس ہو گیا۔
''مجھے پتا ہے، پتا ہے مجھے..... میں اس وقت پاکستان کے سب سے ذہین، روشن دماغ سے سر پھوڑ رہا ہوں..... ''بیگم صاحبہ کی فیکٹری دھم سے گر گئی ہے..... مزدور مر گیا ہے..... پولیس، بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہے۔''
''ابھی تو تم بولا پولیس گرفتار کرنا چاہتی ہے.....'' گارڈ کی نگاہ میں ایف آئی اے کے ڈائریکٹر کی طرح شک جھلکنے لگا۔
''ارے علامہ کی اولاد..... اندر کسی نوکر کو جگاؤ..... وہ بیگم صاحبہ سے بات کرائے گا۔''
''تم تو بولا بیگم صاب کا نمبر بند ہے..... اوکدر سے بات کرائے گا؟''
''جہاں وہ گئی ہیں اس جگہ کا نمبر تو کسی کو معلوم ہو گا ناں..... ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ کا کوئی اور نمبر بھی ہو جو صرف کسی خاص نوکر کو پتا ہو.....''
''ام کو تمہارا بات سمجھ نہیں آتا..... ام کو لگتا ہے تم بس اندر جانا چاہتا ہے..... کوئی بھی بہانہ کر کے.....'' گارڈ نے بات کرنے کے بعد رخ بھی پھیر لیا ساحل نے گویا سر پیٹ لیا تھا..... معاً اسے خیال آیا کہ پھر ٹرائی کرے ہو سکتا ہے تاجور نے اب سیل آن کر دیا ہو۔
اس نے اللہ کا نام لے کر نمبر پھر پریس کیا۔
معاً آنکھیں چمکنے لگیں..... بیل پاس ہو رہی تھی۔

(جاری ہے)



دشمن

ہاجرہ ریحان

''تم نے تو کہا تھا کہ یہ تمہارا اور تمہاری محبت کا دشمن ہے؟ ایک تو تمہاری محبوبہ موقع پرست قسم کی تھی، تمہارے دشمن کو بھی قریب کر رکھا ہے اور تمہیں بھی الگ نہیں ہونے دے رہی..... اوپر سے یہ نام نہاد ولن بھی

تم نے دنیا جہان کا انوکھا ہی ڈھونڈا..... محبت میں صرف محبوب ہی نہیں، عاشق، اپنے دشمنوں سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے..... کیا پڑھا نہیں؟ ہیر کا چچا کیسا چالاک، تیز طرار..... اور رانجھے کے بھائی کیا

تگڑے...... بات کے پکے اور دبنگ کردار تھے۔ پھر اپنے رومیو، جولیٹ کو ہی لے لو، بہن کو مر جانے دیا مگر رومیو کی جولیٹ نہ ہونے دی...... تو ایسے ہوتے ہیں دو محبت کرنے والوں کے دشمن...... عرف ولن...... ارے کچھ تو دیکھ بھال کر محبت کی ہوتی...... تم نے تو ناک کٹوا دی...... کہاں تو کہہ رہے تھے کہ یہ بدمعاش ہے تمہاری محبوبہ کو محبت کا جھانسا دے رہا ہے، ارے ایسا ہوتا تو ابھی کل پورا وقت وہ میرے پہلو سے چپکا کیوں بیٹھا رہتا...... نہ ہی اس نے اپنی محبوبہ کو تمہارے ساتھ دیکھ کر کسی قسم کا اظہار کیا...... اوپر سے یہ خط...... اُف اللہ...... اب میں کیا کروں گی؟ کچھ تو کہو...... گونگے کیوں بنے بیٹھے ہو؟''

ساجدہ کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور میں حواس باختہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ کہانی کا سرا کہاں سے پکڑوں کہ تمام راز خود بخود ہی کھلتے ...... چلے جائیں...... میرے ہاتھ میں ساجدہ کا دیا ہوا خط تھا جس میں بہت ہی ملائم اور رواں لفظوں میں ساجدہ سے محبت کا اظہار کیا گیا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا...... واقعی یہ میرا دشمن...... اس نے تو میری محبت کی ناک ہی کٹوا دی ہے۔ میں نے تو ساجدہ کو کل شام کی دعوت میں یہی دلاسا دے کر اس کے ساتھ بٹھایا تھا کہ مجھے روبی کے ساتھ وقت بتانے کا موقع مل جائے گا پھر بھی مجھے تھوڑا سا احتمال تھا کہ مجھے اور روبی کو ایک ساتھ پورے ہال میں اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھ کر کہیں یہ ساجدہ کے قبضے سے نکل نہ بھاگے...... میں ساجدہ کو خوب سکھا پڑھا کر لایا تھا اور کئی روز تک ہم دونوں ہر ایک پہلو، ہر بات اور طریقۂ کار پر غور کرتے رہے تھے...... مگر مجھے اسی وقت کھٹکا سا ہوا تھا جب میں نے دیکھا کہ کس طرح ساجدہ اس کو لے کر کونے کی اکیلی میز پر چلی گئی تو وہ بھی کسی بے دام غلام کی طرح ساجدہ سے ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوا۔ پہلے تو مجھے لگا کہ ساجدہ کے مسلسل منہ چلانے کی وجہ سے وہ بیچارہ توجہ کہیں اور کر ہی نہیں پا رہا مگر جب میں جان بوجھ کر روبی کو ان دونوں کے سامنے سے لے کر ایک نہیں کئی بار گزرا اور اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر روبی کو نہ دیکھا تو مجھے حیرت کے ساتھ، ساتھ ایک اور قسم کی جلن ہونے لگی...... میرے دل میں ایک ہی خیال آیا۔

''کیا ان دونوں کی محبت اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد ہو چکا ہے کہ کوئی بھی پہلو سے آ لگے...... دوسرا اطمینان سے رہتا ہے کہ بالآخر اس کو میرے ہی پاس واپس آنا ہے۔'' یہ سوچتے، سوچتے مجھے ایک اور سوچ نے جھٹکا دیا۔ ایسا اعتماد تو صرف مشہور و معروف ایکٹریسوں کے جیون ساتھی کو ہوتا ہے...... وہ جانتے ہیں کہ ہمارا شوہر یا بیوی کی کئی طرح کی فلمی جوڑیاں ہیں...... ہر روز مختلف قسم کے مردوں، عورتوں سے عشقیہ سین بھی فلم بند کرائے جاتے ہیں...... مگر آنا تو اس نے رات گئے اپنے گھر ہی ہے ناں۔

''تو کیا روبی میرے ساتھ ناٹک کر رہی ہے؟''

مجھے خود پر غصہ آنے لگا...... میں تو چاہتا تھا کہ اپنے دشمن کو جلاؤں گا...... اس کو ساجدہ کے قبضے میں دے کر روبی کو آزادانہ لیے پھروں گا...... اور بعد میں وہ روبی کو یہ بات یاد دلا، دلا کر ستائے گا...... بہت ممکن ہے یہی بات دونوں کے درمیان دوری کا سبب بن جائے...... اور میرا راستہ صاف ہو جائے لیکن اگر دونوں کے درمیان اس قدر اعتماد ہے تو میں لاکھ کوشش کرلوں میرا کچھ نہیں بننے والا...... مگر پھر...... مگر پھر یہ خط؟

''تمہیں یقین ہے کہ یہ خط تمہیں شعیب نے ہی دیا ہے؟'' میں نے چونک کر کئی بار پوچھا گیا سوال پھر دُہرایا...... اور ساجدہ پھر سے ریل کی طرح شروع ہو گئی۔

''ارے دماغ سو گیا ہے کیا؟ اتنی دیر سے بکواس کر رہی ہوں سنائی نہیں دے رہا؟ ایک تو دو عاشقوں کے درمیان ڈولتی اس قدر لوٹا ٹائپ کی محبوبہ پسند کرلی ہے، اوپر سے اس کے اتنے دل پھینک عاشق سے مجھے ملوا دیا ہے۔ میں بتا رہی ہوں وہ مجھے بہت سنجیدہ لگ رہا تھا اگر

امی، بابا تک بات پہنچ گئی ناں تو میں ان لوگوں کو سب کچھ بتادوں گی...... سمجھے...... ساجدہ کو گونگی نہ سمجھو تم......''

''اوہو...... بات کا بتنگڑ بنالو تم تو بس...... بات آنٹی یا انکل تک پہنچے نہ پہنچے......خود ہی منہ سے اگل دو گی تم...... پیٹ میں بھی رکھی ہے زندگی میں کبھی کوئی بات؟'' میں نے جھنجلا کر ساجدہ کو ڈانٹا۔

''ارے واہ...... دیکھو تو ذرا...... کیسا مذاق بنارہا ہے یہ شخص میری سچ بولنے کی عادت کو...... بھائی جی، میرے والدین نے میری تربیت ہی ایسی کی ہے۔ میں اپنے والدین سے... کوئی بھی بات نہیں چھپاتی۔ میرے دل میں کوئی چور تھوڑی ہے...... ہونہہ......'' وہ اپنی بڑی، بڑی آنکھیں مٹکاتی چمکتے ہوئے بولی۔

''والدین کو ہی بتاؤ تو کوئی بات بھی ہو...... تمہاری تو یہ عادت ہے کہ بات کوئی ہو نہ ہو مگر پہنچا دو پورے جہان میں...... ہے ناں؟ یہ سکھایا ہے ماں باپ نے؟'' میں نے بھی دو ٹوک جواب دے ڈالا...... ساجدہ مجھے غصے سے گھورتی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

''اچھا ہوا چلی گئی۔'' میں نے ایک سکون بھری سانس لی۔

''اب کم از کم ٹھنڈے دماغ سے حالات کا جائزہ تو لے سکوں گا۔'' کئی سوال دل میں پھانس کے مانند چبھے ہوئے تھے۔

''کیا روبی میرے ساتھ ناٹک کررہی ہے؟ کیا اس کے بارے میں مشہور ہونے والی چہ مگوئیاں درست ہیں؟ کیا واقعی وہ موقع پرست...... ہے؟ نہیں، نہیں۔'' دل نے خود ہی بہلایا۔ ''روبی کی صورت، عادت، رکھ رکھاؤ، کچھ بھی تو ایسا نہیں کہ یہ کہا جاسکتا کہ وہ مکار اور بقول ساجدہ لوٹا ٹائپ محبوبہ ہے۔ ایسا نہیں ہے بات تو کچھ اور ہی ہے اور مجھے ابھی جا کر اس معاملے پر شعیب سے بات کرنی چاہیے۔ اسے کم از کم شرمندہ تو کر ہی سکتا ہوں...... ایک طرف تو روبی کو محبت کے جال میں پھنسا رکھا ہے دوسری طرف ساجدہ سے بھی پینگ بڑھانے کا سوچ بھی کیسے لیا اس خبیث نے۔'' غصے کی لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔

''ہاں روبی کا شعیب سے کوئی لینا دینا نہیں یہ خود ہی ہر خوب صورت لڑکی کو پھانستا پھرتا ہے اور جو اس کے دام میں نہیں پھنستی اس کو بدنام کرتا ہے جیسا کہ روبی کے بارے میں اندر ہی اندر لوگوں میں باتیں پھیل رہی ہیں...... یقیناً روبی نے اس کو اسی دن دور فٹے منہ کردیا ہوگا۔'' مجھے اپنا اعتماد بحال ہوتا محسوس ہوا...... میں نے چند ہی لمحوں میں روبی کو ایک بہت ہی معصوم، نیک اور شریف انسان کے طور پر دوبارہ سے دل میں زندہ کرلیا اور اپنا تمام تر غصہ شعیب کی طرف موڑ دیا۔ ''یہی بات ہوسکتی ہے ورنہ روبی جیسی سمجھدار...... نیک سیرت اور شریف لڑکیاں شعیب جیسے دل پھینک مردوں کو کہاں پسند کرتی ہیں......'' مجھے روبی کے ساتھ چند لمحے گزار کر ہی اس کی عادت کا اندازہ ہوگیا تھا...... گو کہ جانتا تو میں روبی کو بس اتنا ہی تھا کہ وہ چند ہفتے ہوئے اپنے والد کے ہمراہ ہمارے برابر والے گھر کے پیچھے کے پورشن میں کرائے پر رہنے آئی تھی۔ امی کو تو ویسے ہی محلے بھر سے راہ و رسم رکھنے کا شوق تھا لہٰذا ایک دو دن میں ہی دونوں باپ، بیٹی ہمارے گھر چائے پر مدعو کرلیے گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنی جاب کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا...... اور میری غیر موجودگی میں ہی میرا خاندان اور روبی اور اس کے والد گھل مل گئے تھے...... اور روبی اکثر میرے گھر آنے لگی تھی...... وہ میرے سامنے بھی کئی بار آئی اور ہر بار اس کے آنے سے جو مجھے خوشی محسوس ہوتی وہ میں کسی کو بتا بھی نہیں پاتا مگر چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''پڑھی لکھی...... خوب صورت...... اچھے خاندان کی......'' میں نے امی سے اپنی پسند کا بے دھڑک اظہار کردیا...... امی کچھ سوچنے لگیں...... اور میرا دل ڈوب گیا...... میں تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں...... لہٰذا امی مجھے کبھی کسی بھی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں اور ان کو

مجبوراً جب انکار کرنا ہوتا تھا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھیں...... بہر حال میرا فرض تھا کہ میں پسند واضح کر دوں کیونکہ مجھ پر نوکری کے پکے ہو جانے کے بعد سے شادی کے لیے زور پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں قسمت سے روبی ٹکرا گئی...... اور مجھے جیسے سب کچھ گھر بیٹھے مل گیا...... ابھی تو امی کی طرف سے رضامندی کا معاملہ ہی اٹکا ہوا تھا کہ یہ شعیب آن دھمکا...... منحوس، دشمن کہیں کا شعیب بھی محلے کا نوارد تھا...... وہ دوسرے شہر سے نوکری کے سلسلے میں یہاں رہنے آیا تھا...... اس کے بارے میں معلومات پورے محلے میں اس کے آتے کے ساتھ ہی محلے بھر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے ملیں...... ایسے میں ساجدہ کی اس سے ٹھن گئی تھی...... شعیب کے آنے سے پہلے پورے محلے میں ساجدہ ہی تمام بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی تھی...... اور اکثر بچوں کو وقت کی کمی اور بچوں کی زیادتی کی وجہ سے کئی کئی مہینے اس کے ٹیوشن سینٹر کو جوائن کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ شعیب کے آنے سے فارغ رہ جانے والے بچوں کو بھی ٹیوشن ملنے لگا...... اور چند ہی دنوں میں ساجدہ کے ٹیوشن سینٹر سے بھی کچھ بچے شعیب کے پاس دوڑ گئے...... کہ وہ زیادہ سہولت اور وقت دے کر پڑھایا کرتا تھا۔

ساجدہ میری بچپن کی کلاس فیلو، محلے دار...... اور مجھ سے ایک سال بڑی بہن کی چہیتی سہیلی تھی...... لہٰذا ہم دونوں میں بے تکلفی بھی ایسی ہی تھی...... اور مجھے اسی سے پتا چلا تھا کہ کس طرح شعیب نے ساجدہ کے اچھے خاصے کاروبار میں نقب لگانا شروع کر دیا ہے...... یوں تو ساجدہ، شعیب سے کبھی نہیں ملی مگر اس کی ٹوہ میں ہر وقت رہتی اور ہر بات مجھے بتا کر جلتی کڑھتی رہتی مگر اس کا کوئی حل بھی نہیں تھا لہٰذا میں ساجدہ کو دلاسا دے کر بہلا دیا کرتا تھا۔ میں نے شعیب کو اس قدر مکار، چالاک اور پہنچا ہوا کب سمجھا تھا مگر جو بات ابھی چند دنوں پہلے مشہور ہوئی تھی اس میں سب کچھ نہ سہی مگر کچھ تو صداقت ہوگی کہ ایسے تو کسی کے لیے یوں بات مشہور نہیں ہوتی ناں! پہلے تو یہ سننے میں آیا کہ روبی کے بوڑھے والد ایک دن نائی کی دکان پر بال بنوا رہے تھے کہ شعیب بھی حجامت بنوانے پہنچ گیا...... بڑے میاں اپنی کرسی چھوڑ نائی کو پرے ہٹا...... شعیب کو باقاعدہ تیز لہجے میں غصے سے کچھ سنانے لگے...... جس کا لب لباب یہ تھا کہ شعیب ان لوگوں کا پیچھا کرتا یہاں تک آگیا ہے مگر بڑے میاں اس کی کوئی چال پوری نہیں ہونے دیں گے۔ ان کی بیٹی یعنی روبی نے جو کچھ بھی سہا ہے اب بڑے میاں اپنی بیٹی کو دوبارہ اس دور سے گزرنے نہیں دیں گے...... لہٰذا شعیب فوراً سے بیشتر اس محلے کو چھوڑ جائے۔ اس وقت دکان میں شعیب، بڑے میاں اور نائی کے علاوہ کوئی نہیں تھا کہ بات پھیلتی...... مگر بات پھر بھی پھیل گئی تھی اور پھر دوسری چہ مگوئی...... یہ دوسری جان لیوا سی افواہ جو مجھے کئی بار توڑ کر رکھ چکی تھی۔ جس نے کئی راتوں مجھے جگایا تھا۔ جس نے مجھے پہلی بار جلن، حسد جیسے جذبے سے روشناس کرایا تھا۔ ہاں یہ ایک ذرا سی افواہ جو مجھ تک ساجدہ کے ذریعے ہی پہنچی تھی کہ وہ ہی ہر وقت شعیب کی ٹوہ میں لگی رہتی۔

سردی کی اس اندھیری خاموش سی شام بھی ساجدہ اسی طرح اپنی چھت پر چڑھی شعیب کے گھر پر ٹیوشن پڑھنے آنے والے بچوں کو گن رہی تھی کہ ایک، ایک کر کے بچوں کو فارغ کر کے شعیب اپنے گھر سے نکلا اور خراماں، خراماں سیدھا روبی کے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا...... اور چند ہی لمحوں میں دروازہ کھولے جانے پر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بات جب ساجدہ میرے اور میری بہنوں کے ساتھ بیٹھی بتا رہی تھی تو مجھے یاد آیا کہ اس دن روبی کے والد اپنی پنشن کے کسی کام کے سلسلے میں میرے ہی والد کے ساتھ نکلے ہوئے تھے اور امی کو ہدایات تھیں کہ روبی کا خیال رکھیں...... میری منجھلی بہن نے اسے گھر پر بلایا بھی تھا مگر روبی سر درد کا بہانہ کر کے گھر پر ہی ٹکی رہی تھی...... میں نہیں جانتا کہ اس دن ساجدہ کی اس بات اور پھر ہمارے گھر پر روبی کے اکیلے ہونے پر جو بات چیت ہوئی تھی اس کی کڑی سے کڑی میری بہنوں نے جوڑ کر

امی کو بھی بتایا کہ نہیں..... مگر میں جیسے پوری کہانی سمجھ چکا تھا..... روبی کے والد گھر پر نہیں تھے اور روبی اکیلے ہو کر بھی شعیب کو گھر کے اندر بلا لیتی ہے..... میں بات سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا..... کئی بار خود کو سمجھا چکا تھا کہ ساجدہ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی..... یا پھر یہ انکل کی غیر موجودگی والے دن کی بات نہیں ہوگی، کہیں ساجدہ کچھ ایسی بات بتانا بھول رہی ہے یا جان بوجھ کر چھپا رہی ہے کہ شعیب تو چلو بدنام ہو ہی رہا ہے مگر روبی.....؟ اس بیچاری کا کیا قصور.....؟

''روبی ایسی نہیں ہوسکتی۔'' میں خود کو دلاسا دیتا..... اور شاید اسی ایک گمان کی تصدیق کرنے کے لیے میں نے ساجدہ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس روز محلے کی ایک شادی تھی اور یقین تھا کہ روبی اور شعیب بھی بلائے گئے ہیں۔ میں نے ساجدہ سے..... بے تکلفی کے باعث پہلے ہی دن سے روبی کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا اور اس کی شعیب والی افواہ کے بعد میں نے اسے زبردستی آمادہ کیا تھا کہ وہ شادی میں شعیب کو مصروف رکھے گی۔ یہاں میں روبی کو ساتھ، ساتھ رکھوں گا..... ایسے میں اگر روبی اور شعیب میں کوئی بندھن ہوا تو یقیناً دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کے لیے بے چین ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ روبی، ساجدہ اور شعیب کو ساتھ دیکھ کر اپنی بے چینی ظاہر کر دے اور ایسا ہی کچھ شعیب بھی کر سکتا ہے..... میں اور ساجدہ کئی دنوں تک ایک دوسرے سے ہر پہلو پر بات کرتے رہے۔ نت نئے طریقوں سے شعیب اور روبی کے معاملے کو بے نقاب کرنے کی منصوبہ بندی کرتے رہے مگر ان دونوں نے تو حد ہی کر دی۔ کچھ اس طرح مجھے اور ساجدہ کو گھن چکر بنایا کہ اب بھی سمجھ نہیں آرہا کہ آیا میں اور ساجدہ ان دونوں کو سبق سکھانے کی مہم پر تھے یا شعیب اور روبی ہم دونوں کے ہوش ٹھکانے لگانے شادی میں آئے تھے۔ روبی مزے میں میری امی، بہنوں اور میرے ساتھ مصروف رہی اور اُدھر شعیب، ساجدہ کی قربت پا کر دنیا جہان سے بیگانہ بیٹھا رہا..... ایسے میں مجھے کئی بار ساجدہ پر غصہ بھی آیا تھا..... یقیناً ساجدہ جھوٹ بول رہی تھی، وہ اس کی ایک بھونڈی افواہ ہی تھی..... روبی ایسی ہرگز نہیں ہو سکتی مگر پھر مجھے ساجدہ پر بھی یقین تھا۔ بہرحال ساجدہ تھوڑی منہ پھٹ، بہت سی بد زبان اور ہر بات کھول، کھول کر بیان کر دینے والی تو ضرور تھی مگر وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی، نہ ہی کسی پر بلاوجہ الزام لگاتی..... اور اب اس بات کو کہاں کس کڑی سے ملاؤں کہ کل رات محض چند گھنٹے ساجدہ کے ساتھ گزار کر شعیب میاں کو ساجدہ اس قدر پسند آگئی تھی کہ اب وہ ان سے عشق فرمانے کی باقاعدہ اجازت طلب کر رہے تھے..... میں نے ہاتھ میں پکڑے خط پر نظر ڈالی..... شعیب نے صاف لفظوں میں ساجدہ کو لکھا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس کی اجازت سے اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیجنے کی اجازت چاہتا ہے..... اجازت ملتے ہی وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دے گا۔

''واقعی یہ تو ایک نمبر کا لچا لفنگا نکلا.....'' میں نے تاسف سے سر ہلایا اور تیار ہو کر شعیب کے گھر کی طرف چل پڑا..... آج اس سے دو، دو ہاتھ ہو ہی جائیں..... ''یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ دماغ ٹھکانے لگانا ہی پڑیں گے اس کے۔'' میں یہی کچھ سوچتا... اس کے گھر تک پہنچا ہی تھا کہ وہ بھی جیسے ہی میرا ہی منتظر تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

''تم کہیں جا رہے ہو کیا؟'' میں تھوڑا گھبرا کر اور بے دھیانی سے ہاتھ ملاتے پوچھ بیٹھا۔

''ہاں، جا تو رہا ہوں..... آیئے آپ بھی چلیے..... کوئی حرج نہیں اب تو آپ بھی اپنی ہی پارٹی کے بندے ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا مجھے اپنے ساتھ لیے آگے بڑھتا ہوا چکا۔

دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ میں چونک گیا..... ہم روبی کے گھر جا رہے تھے۔

ایک دل تو ہوا کہ اس کو یہیں بیچ راستے میں ہی پیٹ ڈالوں..... کس بے حیائی سے ابھی ساجدہ کو

عشقیہ خط ارسال کر کے اب روبی کے گھر کو نکلا ہے اوپر سے مجھے اپنی پارٹی کا کہہ رہا ہے...... ذلالت کی بھی حد ہوتی ہے...... میں ابھی کچھ سمجھتا کہ روبی کا گھر آ گیا...... اور اس سے پہلے کہ میں پیچھا چھڑاتا گھر کا دروازہ کھل چکا تھا۔

''اُف میرے مالک...... کاش یہ ایک افوہ ہی رہتی...... یہ حقیقت مجھ پر قیامت بن کر نہ اترتی......'' میں حد سے زیادہ حساس ہونے لگا اور لٹتا ہوا دل و دماغ لیے شعیب کے پیچھے، پیچھے اندر داخل ہو گیا...... گھر کا پورچ بس چھوٹا سا احاطہ ہی تھا جس کے ایک طرف چھوٹا سا باغ تھا اور اسی میں ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں بھی کھلتی تھیں اور ان ہی کھلی ہوئی ایک کھڑکی سے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ آج تو انکل بھی مزے سے ڈرائنگ روم میں براجمان تھے...... روبی تو دروازہ کھول کر چائے بنانے کا کہہ کر غائب ہو گئی جبکہ وہ بے تکلفی سے مجھے ڈرائنگ روم میں لے کر پہنچا...... انکل نے مجھ سے خوش دلی سے سلام دعا کر لی مگر اس سے منہ پھلائے بیٹھے رہے کہ وہ پھر چہکا۔

''بھائی صاحب آپ ہی معافی دلوادیں بڑے میاں سے...... یہ تو میری سننا ہی نہیں چاہتے......'' روبی کمرے میں چائے کے لوازمات ٹرے میں سجائے داخل ہو چکی تھی۔ اس نے لفظ ''بڑے میاں'' پر تنبیہہ کرنے والے انداز میں گلا کھنکھارا...... شعیب اب کی بار روبی سے گویا ہوا۔

''یار بولو ناں ابا جی کو کہ معاف کر دیں...... کب تک وہاں اکیلے پڑا رہوں گا؟'' روبی ہمیں چائے اور دیگر چیزیں پیش کرتے دھیمے سے مسکرا گئی۔

''اکیلے پن کو دور کرنے کا علاج تو تم ڈھونڈ ہی چکے ہو اب ہم سے کیا غرض تمہیں......''

''کیا ہو گیا ہے...... میں تو تمہارا کام آسان کر رہا ہوں اوپر سے تم مجھے ہی الزام دے رہی ہو۔''

''ویسے اچھی نہیں لگی کیا؟'' روبی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہاہا، ہاہا اچھی تو ہے مگر بولتی بہت ہے...... ریل کی طرح اپنی ہی دُھن میں......'' شعیب کچھ اور بھی کہتا کہ اب کی بار انکل بول پڑے۔

''روبی اس کو کہو کہ یہ ہم سے کوئی امید نہیں رکھے۔''

''ابا جی پلیز...... اتنی معافی تو مانگ چکا ہے اور پھر میں بھی اس کی شرارت میں برابر کی شریک ہوں اور اس کو صحیح ہی سمجھتی ہوں تو آپ صرف اس کو ہی کیوں سزا دے رہے ہیں؟'' عجیب مبہم باتیں ہو رہی تھیں۔ انکل، روبی کی اس کی طرف داری پر بے چین ہو کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

''بیٹا تم ہی انصاف کرو...... اپنی بہن کے لیے ایک پڑھے لکھے شریف آدمی کے رشتے کو کوئی سمجھدار، بہن سے محبت کرنے والا بھائی یوں ذلیل کر کے لوٹا سکتا ہے؟ روبی تو چھوٹی ہے...... نا سمجھ ہے...... مگر یہ مسٹنڈا...... دیکھو کیسے دھڑلے سے معافی مانگ رہا ہے...... بہن کا مستقبل تاریک کرتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی اسے؟''

''ابا جی کہاں کا شریف 'پڑھا لکھا'؟ اس کو بیوی نہیں جہیز اور سامان سے بھرا گھر چاہیے تھا اور فرض کریں آپ اپنی جمع پونجی نکال کر سب کچھ کر بھی دیتے پھر بھی کیا گارنٹی تھی کہ وہ آپ کی بیٹی سے شادی کے بعد کوئی ڈیمانڈ نہ کرتا...... ابا جی اب ایسے جذباتی فیصلے پنپتے نہیں ہیں...... انسان کی زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں...... میں روبی کو بھی اس جہنم میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔'' شعیب اب کی بار ٹھہرے ہوئے اٹل لہجے میں بات کر رہا تھا...... پھر وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''زندگی تو روبی نے ہی گزارنی ہے مگر روبی میری بہن ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والے انسان کو مکمل طور پر دیکھ بھال کے، پرکھ کے رشتہ قائم کروں...... بہرحال اتنا تو ہو کے خواہش مند، میری بہن کو شادی کر کے اپنے گھر لے کر جائے نہ کہ اسے بند تجوری کی چابی سمجھ کر خزانہ ہی سمیٹتا رہے۔''

انکل کی حد ہو چکی تھی انہوں نے مجھ سے الوداعی ہاتھ ملایا اور روبی کو اپنے کمرے میں دودھ پہنچانے کا کہہ کر ہلکے قدموں سے ہم تینوں کو بیٹھا چھوڑ گئے...... شعیب نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''فکر نہیں کرو بھائی...... انشاء اللہ جلد غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا...... تم بس ان کے ساتھ ترکی بہ ترکی سوال جواب نہ کیا کرو......'' انکل کے نکلتے ہی روبی نے شعیب کو دلاسا دیا۔

''یار ابا جی تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح کرنے لگے ہیں...... اب بھلا بتاؤ، منگنی ہی ہوئی تھی ناں ٹوٹ گئی کوئی بات نہیں...... مگر ان کو صرف منگنی کے ٹوٹے جانے سے بدنامی کا ایسا ڈر کہ جھٹ یہاں شفٹ ہو گئے...... اور پھر اب یہاں بھی مجھے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں...... اب اس طرح میں کوئی تمہارے معاملے میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دوں گا......؟ میرا جو فرض ہے وہ تو پورا کروں گا ہی...... چاہے ان کو اچھا لگے یا نہ اچھا لگے تم بڑے میاں کو اچھی طرح سمجھا دینا۔'' شعیب نے اب کی بار مصنوعی غصے سے جواب دیا...... میں سب کچھ سمجھ کر اور سن کر ایک بار پھر سے حواس باختہ ہو رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس تمام صورتِ حال کو کس طرح ہضم کروں...... پھر ابھی تو محبت کا صرف ایک ہی سرا ہاتھ لگا تھا۔ ابھی تو امی کو بھی منانا تھا، روبی کے والد اور یہ میرا سالا...... اُف...... ابھی تو سمجھو کہانی شروع ہی ہوئی ہے اور میں ابھی سے گھبرا گیا ہوں کہ مجھے ایک بار پھر اکیلے ہونے کی جستجو ہوئی اور میں بھی تھوڑی ہی دیر میں بھائی، بہن کو ایک دوسرے کے دلاسوں میں...... چائے کا شکریہ ادا کر کے گھر سے نکل پڑا۔

ابھی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تھا کہ بھاگم بھاگ ساجدہ آتی نظر آئی۔

''یہ کیا...... کیا...... تم...... شعیب کے ساتھ روبی کے گھر میں چلے گئے تھے؟'' ساجدہ نے ہانپتے ہوئے پوچھا تو میں گڑبڑا گیا...... میں اپنی غلط فہمی کی شرمندگی سے ابھی نکلا نہیں تھا کہ یہ افتاد...... ساجدہ کو حقیقت کا پتا چلے گا تو یہ تو میرا حشر ہی نکال دے گی...... بہر حال ہمت کی۔

''یار کس طرح بتاؤں تمہیں کہ وہ میرا دشمن...... میرا سالا نکلا......'' میں نے منہ بسورتے ہوئے اسے بتایا۔

''ہاں ناں...... یہی تو مجھے بھی آج آنٹی نے بتایا...... ایک ہم دونوں ہی انجان تھے یہاں تو پورا محلہ جانتا ہے کہ شعیب، روبی کا سگا بھائی ہے اور اس کے والد کی ناراضی کے باعث دوسرے مکان میں اکیلا رہتا ہے...... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے...... کس قدر فضول انسان ہو تم...... کچھ خبر نہیں تھی اور کیسی فضول حرکت کروائی ہے تم نے مجھ سے...... اللہ معافی دے۔'' ساجدہ کانوں کو انگلی لگاتے بولی...... اب کی بار میں نے اسے دلاسا دیا۔

''چلو کوئی بات نہیں...... شعیب تمہارے لیے واقعی سنجیدہ ہے...... اب تم دونوں مل کر ٹیوشن سینٹر چلایا کرنا...... کتنا مزہ آئے گا ناں......'' میں نے ساجدہ کو بہلانے کی ناکام کوشش کی...... ساجدہ حسبِ عادت لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ایک ہتھیلی رکھے دوسرا ہاتھ میرے منہ کے آگے نچاتی چہکی۔

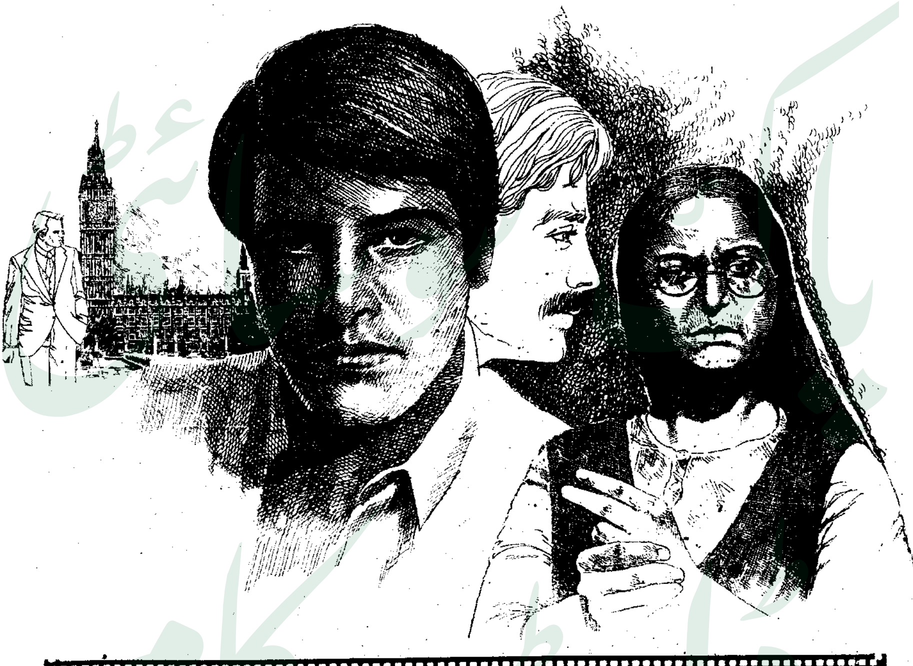
''دماغ ٹھکانے نہیں لگتا مجھے تمہارا...... ہیں؟ محبت نے مت ماردی ہے تمہاری...... ساجدہ اور کسی اور کے ساتھ اشتراکی کاروبار کرے......؟ ابھی یہ دن نہیں آئے ساجدہ پر...... سمجھے تم...... تم نے تو بڑی چالاکی سے اپنا دشمن میرے سر منڈھ دیا مگر بیٹا دیکھ لینا میرا نام بھی ساجدہ ہے...... تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں، میں سولو فلائٹ کرتی ہوں...... ہاں نہیں تو ...... ارے، ارے بات سنے بغیر ہی بھاگے جا رہے ہو...... ٹھیک ہے سب سمجھ رہی ہوں...... میں ہوں......''

میں ساجدہ کی قینچی جیسی زبان سے ہار مان کر اس کو ویسے ہی بات کرتا چھوڑ کر اپنے گھر میں گھس گیا تھا۔

ناولٹ

بوجھ

شہناز وسیم



رات کے تین بج چکے تھے مگر نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پاکستان سے آئی ہوئی وہ ٹیلی فون کال ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کے بعد سے وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی، لندن شہر کو کہر نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شاہراہوں پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹس دھندلائی محسوس ہو رہی تھیں۔ مرکزی لندن کے معروف علاقے میں بنے اپنے خوب صورت اپارٹمنٹ کے بیڈروم کی کھڑکی سے اس پار کا منظر وہ بغیر کسی احساس اور جذبے کے صرف دیکھ رہا تھا۔ بیڈروم کی کھڑکی کے شیشے کے اس پار نظر آنے والی دھند کے آنسو شیشے پر لگاتار بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنی ناک شیشے پر ٹکا کر اسے محسوس کرنا چاہا مگر یخ بستہ شیشے کی چادر اسے برف کی سل کی طرح محسوس ہوئی۔ اوور کوٹ پہن کر اس کے بٹن بند کر کے اس نے مفلر اپنے کانوں اور گردن کے گرد لپیٹا اور بیڈروم سے گیلری کی طرف کھلنے والے دروازے سے باہر آگیا۔



سڑک پر تیز رفتاری سے کئی گاڑیاں آگے پیچھے زن سے گزر گئیں۔ خاموش اور پُرسکون رات میں لمحے بھر کے لیے ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ وہ زیادہ دیر گیلری میں کھڑا نہیں رہ سکا۔ کہر کی تندی اس کی ناک کے حساس حصوں میں سرسراہٹ سی پیدا کرنے لگی اور اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ویسے تو وہ لندن کی اس خون جمادینے والی سردی کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ گزشتہ پندرہ سال سے یہاں مقیم تھا۔ تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے لیے یہاں کی فضا سازگار ہو چکی تھی۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے شاندار نمبروں سے گریجویشن کرنے کے بعد فنانشل ایکسپرٹ کی حیثیت سے وہ اپنی شناخت بنا چکا تھا۔ مختلف اخبارات کے لیے کالمز اور تجزیاتی رپورٹس تو وہ زمانہ طالب علمی سے ہی لکھتا چلا آرہا تھا۔ جس کی پزیرائی بھی اس کے علم میں تھی۔ قارئین اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس کام کا اسے معقول معاوضہ بھی ملتا تھا۔ جہاں اسے ان اخبارات کی ضرورت تھی وہاں وہ بھی دھیرے، دھیرے اخبارات کی ضرورت بنتا جارہا تھا۔

پھر ایک دن اچانک خوش قسمتی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے بھی زیادہ سوچ بچار سے کام نہ لیا اور فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ خوش قسمتی ہر انسان کے دروازے پر ایک بار دستک ضرور دیتی ہے اگر وہ دروازہ کھول دے تو اندر چلی آتی ہے ورنہ کسی دوسرے در پر چلی جاتی ہے۔ امریکا کے مشہور اخبار وال اسٹریٹ جنرل نے ایک پُرکشش پیکج کے ساتھ اسے لندن میں اپنا نمائندہ بنانے کی آفر کردی۔ جس کا وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ مگر یہ خواب نہیں ایک حقیقت تھی۔ وال اسٹریٹ جنرل کی انتظامیہ نے اس کی تجزیاتی رپورٹس اور کالمز کو سراہتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اخبار کی خواہش ہے کہ وہ اسے جوائن کرلے...... اس نے کچھ شرائط کے ساتھ اپنی خدمات انہیں پیش کردیں اور پھر جوں، جوں وقت گزرتا گیا لوگوں پر ہی نہیں خود اس پر بھی اپنے جوہر کھلتے چلے گئے۔ اس کی ماں کی مانگی ہوئی ہر دعا نے عرش پر جیسے اپنے رب سے قبولیت کا وعدہ لے لیا۔ وہ دعائیں جو اس نے رات کے اس پہر رو، رو کر اس کے لیے مانگی تھیں۔ جب سارا زمانہ میٹھی نیند سو رہا ہوتا تھا۔

وہ اپنے بیٹے کی ترقی، کامیابی، صحت، زندگی اور خوشحالی کے لیے اپنے رب کے آگے گڑگڑا رہی ہوتی تھی۔ اپنے آنسوؤں سے مانگی جانے والی دعاؤں کو نہلا رہی ہوتی تھی اپنے پروردگار کو منا رہی ہوتی تھی۔ اس کو راضی کرنے کے لیے اس کے حضور سر پٹخ رہی ہوتی تھی۔ ایک ضدی بھکارن کی طرح اس کے در پر پڑی رہتی تھی کہ لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ اور وہ سوچتا کہ کتنا خوش نصیب ہوں میں... اس کرۂ ارض پر ایک وجود ایسا بھی ہے جس کا خلوص بے پایاں ہے۔ جس میں کھوٹ نہیں ہے جو سچ ہے...... صرف سچ...... وہ خاموشی سے دور کھڑا اپنی ماں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ اسے اپنی ماں پر فخر تھا، وہ اپنی ماں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر دم اپنی ماں کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا...... مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ حکومت کی جانب سے ملنے والی اسکالرشپ کی وجہ سے اسے لندن آنا پڑا۔ لندن اسکول آف اکنامکس میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک محنتی نوجوان تھا۔ وہ بچپن سے سونے کا چمچہ منہ میں لے کر بھی نہیں پیدا ہوا تھا نہ ہی وہ پشتینی رئیس تھا کہ باپ، دادا کی چھوڑی ہوئی دولت پر اپنے مستقبل کی عمارت کھڑی کر لیتا۔ وہ تو سرکاری اسکول میں پڑھانے والی ایک معمولی اسکول ٹیچر کا بیٹا تھا۔ جو بیوہ تھی جس کی اس کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں ایک معمولی سا گھر ضرور بنالیا تھا جو سر چھپانے کو کافی تھا باپ کی پنشن کی معمولی رقم سے گزارہ مشکل تھا اس کی ماں کو ایک ہمدرد رشتے دار نے اپنے اثر رسوخ سے سرکاری اسکول میں ملازمت دلوادی تھی۔ اس نے ٹیوشن پڑھا، پڑھا

کراپنی تعلیم کا بوجھ خود اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنیاد پر وظائف بھی لیتا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے سلیقے سے کبھی کسی کو یہ نہیں محسوس ہونے دیا کہ اس گھر میں اکثر تنگدستی کا بسیرا رہتا ہے۔ اس نے گھر کا بھرم بنائے رکھا۔ وہ کچھ وقت نکال کر راتوں کو کمرا بند کر کے اجرت پر کپڑے سیتی، مردانہ کرتوں پر نفیس کڑھائی کرتی سردیوں میں سوئیٹر بنتی...... اسے بہترین کیک بنانا آتے تھے اور مختلف بیکری آئٹمز بھی......لوگ اجرت پر اس سے اپنی پسند کا سامان بنوا لیتے تھے۔ اس نے محنت کش عورت کی طرح اپنے بچوں کے منہ میں ہمیشہ لقمۂ حلال ڈالا اور اس کو اتنا موقع بھی نہ ملتا کہ وہ اپنے آرام کے لیے بھی تھوڑا وقت نکالتی۔ اس کی ماں کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کی زندگی پر اس کا اپنا بھی کچھ حق ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ سوچتی ہی نہیں تھی۔ بس بچے، بچوں کا مستقبل، بچوں کی صحت، بچوں کے لیے خواب جو اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی طرح چمکتے تھے۔ اس کی زندگی کے شب و روز بچوں سے شروع ہو کر بچوں پر ہی ختم ہو جاتے تھے۔ زندگی کی گاڑی کے دو پہیے مرد اور عورت کو کہا جاتا ہے مگر وہ تو ایک ہی پہیے سے زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی اپنی گاڑی کو کھینچے چلی جا رہی تھی۔

خضر کو اس رات ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات یاد آ رہی تھی۔ اس کی ترقی اور اس کے یہاں تک پہنچانے میں اس کی محنت اپنی جگہ لیکن وہ سارا کریڈٹ اپنی ماں کو دیتا تھا۔ آج اس کے پاس سب کچھ تھا قابلِ رشک بینک بیلنس، کراچی کے پوش ایریا میں بنا ہوا ایک خوب صورت گھر، شاندار گاڑی، ماں کے لیے ہر آرام و آسائش...... دونوں چھوٹی بہنیں صباحت اور مدحت اپنے، اپنے گھروں میں خوش، ایک بہن کینیڈا میں اور ایک بہن پاکستان میں تھی جو ماں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے گھر کے ایک پورشن میں ان کے ساتھ رہتی تھی، آج ہر چیز خضر کی پہنچ اور رسائی میں تھی۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر سال باقاعدگی سے ماں سے ملنے جاتا اپنی ساری چھٹیاں وہ ماں کے ساتھ ہی گزارتا...... اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے دل پر ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا۔ یہ بوجھ وہ اپنے ساتھ لندن بھی لے کر آیا تھا۔ وہ اس بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا تھا، اسے وہ موقع ہی نہیں مل پا رہا تھا کہ اس بوجھ کو اتار پھینکتا۔

مگر رات کو پاکستان سے آنے والی مخدوم خاور کی کال نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مخدوم خاور سے بات کرنے کے بعد سے اب تک وہ صرف اور صرف سوچ رہا تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے کافی میکر میں کافی تیار کی، فریج سے بریڈ نکال کر اس پر پنیر سلائس سلاد کھیرا اور کیچپ لگا کر کھانے لگا۔ اسے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ مخدوم خاور نے اسے فون پر کہا تھا کہ ”تمہارے وطن کو تمہاری اور تمہارے جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اپنے وطن کے لائق نوجوانوں کو وطن آواز دے رہا ہے۔ تم پہلی دستیاب فلائٹ سے پہنچنے کی کوشش کرو۔“

خضر نے زندگی میں بس ایک ہی دوست بنایا تھا۔ ”مخدوم خاور حیات......“ اسے خاور سے دوستی پر ناز تھا۔ جو نفع و نقصان سے بے غرض تھی، خاور نے کبھی اپنے اور خضر کے درمیان طبقاتی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ خاور ایک نامی گرامی سیاسی خاندان کا فرد تھا۔ مگر وہ اتنا مخلص تھا کہ خضر اس کے خلوص کے آگے ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ خاور سے کہتا۔ ”تم ایک ڈھارس بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہنا، تمہیں دیکھ کر میں اپنے اندر انرجی اترتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔“

خاور مسکراتے ہوئے جواب دیتا۔

”اچھا، اچھا میرے پاس اتنے خوب صورت الفاظ نہیں اپنے جذبات تم تک پہنچانے کے لیے...... خیر چھوڑو میں تمہارے گھر اماں جی کے ہاتھ کی دال کھانے آیا تھا۔ بڑا ذائقہ ہے یار ان کے ہاتھوں میں۔“ خضر گھر کے اندر جاتا اسے یقین ہوتا کہ گھر میں دال ہی پکی ہوگی۔ گوشت کی عیاشی کہاں ہو سکتی تھی۔

مخدوم خاور کے والد مخدوم دلاور حیات اپنے علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ کئی سال سے قومی اسمبلی کا الیکشن جیتتے چلے آرہے تھے۔ خاور نے آنکھ کھولی تو گھر میں دولت کی ریل پیل اور نوکروں کی فوج ظفر موج ہی دیکھی مگر وہ فطرتاً ایک سادہ انسان تھا۔ خضر کے لیے تو وہ جان بھی دے سکتا تھا، اسے خضر کی ذہانت اور قابلیت پر ایسے ہی فخر ہوتا جیسے وہ اپنی ذہانت اور قابلیت پر فخر کررہا ہو۔

اگرچہ عزیز از جان دوست کی آفر کو نظر انداز کرنا خضر کے لیے اتنا آسان ہرگز نہیں تھا اور یوں بھی وہ اپنی زندگی کے موجودہ سیٹ اپ سے مطمئن تھا، اسے اب سب کچھ میسر تھا، مالی آسودگی بھی اور ذہنی بے فکری بھی مگر پندرہ سال سے اس کے دل پر پڑے اس بوجھ نے انگڑائی لی اور جاگ اٹھا۔ اس کی پُرسوچ نگاہیں کسی خاص نکتے پر مرکوز تھیں۔ بھاپ اڑاتی گرما گرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے ماضی کی کسی تکلیف دہ یاد سے نبرد آزما تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی وہ لاشعوری طور پر دائیں ہاتھ کی مٹھی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ماررہا تھا، وہ دن اس کے نہ بھولنے والے دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسی تکلیف دہ یاد میں غرق تھا جس کا اس کے دل پر پڑے اس بوجھ سے گہرا اور انمٹ تعلق تھا، وہ کیسے بھلا سکتا تھا اس دن کو......؟ وہ ایک بار پھر ماضی میں جا گھسا۔

☆☆☆

''خضر بیٹا......'' اس کی ماں ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی اس کے بستر تک آئی اور کنارے پر بیٹھ کر بولی۔

''رات کو میرے پیر میں چوٹ لگ گئی تھی۔ لائٹ نہیں تھی اندھیرے میں مجھے نظر نہیں آیا میز کا نوکیلا کونا میرے گھٹنے میں لگ گیا اور نیل پڑ گیا ہے تھوڑا سا زخم بھی آیا ہے۔ سردی کی وجہ سے درد زیادہ ہورہا ہے، چلا نہیں جارہا۔ تم میری چھٹی کی درخواست اسکول دے آؤ۔'' وہ تکلیف سے بول نہیں پارہی تھی۔

''امی آپ نے رات کو ہی مجھے کیوں نہیں بتایا، میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھاتا۔'' خضر نے تڑپ کر ماں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

''ارے نہیں بیٹا...... میں نے رات کو گرم پانی سے ٹکور کرلیا تھا۔ اور دودھ میں ہلدی ڈال کر پی لی تھی۔ خواہ مخواہ ڈاکٹر کے پاس فضول پیسے ضائع ہوجاتے۔ دو دن کی تو بات ہے، میں ٹھیک ہوجاؤں گی تو پھر پرسوں سے اسکول چلی جاؤں گی، تم ہیڈ مسٹریس مسز تمکین کو اطمینان دلا دینا کہ میں پرسوں ضرور آجاؤں گی۔ بس بیٹا جلدی سے چلے جاؤ اللہ کی رحمت تمہارے ساتھ رہے جاؤ میرے بچے دیر نہ کرو۔''

جب وہ اسکول پہنچا تو اسمبلی شروع ہوچکی تھی۔ نائب قاصد نے اسے انتظار کرنے کو کہا مسز تمکین جب اپنے آفس میں آئیں تو چپڑاسی کے ذریعے اسے اندر بلایا، اس نے سلام کے بعد درخواست ان کے سامنے رکھ دی۔ درخواست پڑھتے ہی ان کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

''تمہاری ماں کو نوکری کرنی ہے یا نہیں......؟ مذاق سمجھ رکھا ہے نوکری کو...... جب دل چاہا چھٹی کرلی جب دل چاہا گھر بیٹھ گئیں، درخواست بھیج دی۔ بھلا بتاؤ معمولی سی چوٹ پر دو دن کی چھٹی مانگ لی۔ ارے میں کہتی ہوں ایک ہی مرتبہ تمہاری ماں کی ٹانگیں کیوں نہیں ٹوٹ جاتیں ہماری بھی جان چھوٹے ان سے...... ہر روز بہانے، ہر روز بہانے، میں پوچھتی ہوں اگر نوکری نہیں کرنی ہے تو گھر بیٹھے، ہمارا دماغ خراب نہ کرے۔'' ان کے منہ سے غصے میں کف اڑ رہا تھا۔ خضر نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''میڈم وہ تو بہت ریگولر اسکول آتی ہیں، صرف دو دن کی ہی تو بات ہے آج ہی کچھ اتنی تکلیف......''

مسز تمکین نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور غصے میں چیخنے لگیں۔

''تمہاری ماں ایک مکار عورت ہے، وہ کام کرنا ہی نہیں چاہتی اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتی تو میں اسے بتاتی کہ میں کون ہوں، میرے اختیارات کیا

ہیں، دونوں ٹانگیں توڑ دیتی میں اس کی، نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری......'' انہوں نے درخواست پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دی اور گرج کر کہا۔

''جاؤ اور اسے فوراً بھیجو، میں اس کی درخواست منظور نہیں کر رہی ہوں اور ہاں یہ بھی سن لو...... اگر وہ نہیں آئی تو اس کی دو دن کی تنخواہ کٹوا دوں گی یا پھر اسے میڈیکل سٹیفکیٹ دینا ہوگا۔ مائنڈ اٹ کہ C.R پر بھی میرے ہی ریمارکس ہوتے ہیں۔''

خضر نے حیران ہو کر اُن کا چہرہ دیکھا۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون سے وہ قطعی یہ امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس قدر جاہلانہ طرزِ تخاطب؟ اتنا اخلاق سے گرا ہوا رویّہ؟ صرف دو دن کی چھٹی مانگنے پر ایسا ردِعمل جبکہ چھٹی حاصل کرنا تو اس کی ماں کا قانونی حق تھا پھر... مسز تمکین کا ایسا شدید ردِعمل اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اپنی عظیم ماں کے بارے میں اتنے تکلیف دہ جملے ......ایک، ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہوتا چلا گیا۔ قوم کے معماروں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے والے ادارے کی سربراہ سے اس رویّے اور تخاطب کی وہ توقع بھی کیسے کر سکتا تھا۔

''تھینک یو میڈم پرنسپل...... انشاء اللہ ہم زندگی میں ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں گے مگر اس وقت ہم دونوں کی حیثیتیں مختلف اور جدا ہوں گی کوشش کروں گا کہ آج کا یہ قرض مع سود لوٹا سکوں...... میری والدہ دو دن اسکول نہیں آئیں گی تو مطلب کہ نہیں آئیں گی۔ میڈیکل سرٹیفکٹ کچھ دیر بعد آپ کی ٹیبل پر ہوگا۔'' ایک زخمی ناگن کی طرح اس کی آنکھوں کے کیمروں نے میڈم تمکین کی تصویر محفوظ کر لی، وہ باہر نکلا تو اس کا جوان خون جسم کی ہر، ہر ورید سے سنسناتا ہوا سر پٹخ رہا تھا۔ نکلتے وقت اسے اپنے پیچھے سے مسز تمکین کی آواز سنائی دی۔

''ارے جاؤ، جاؤ یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ متوسط فیملیز کے بچوں کا یہی تو المیہ ہے کہ وہ دنیا کو الٹ دینے کے خواب دیکھتے ہیں مگر بیچارے کچھ کر نہیں سکتے، بیچارے بچے...... بچے...... ان کی اوقات ہی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ کر سکیں۔ بھلا بتاؤ......؟ ایک معمولی اسکول ٹیچر کا بیٹا...... اور باتیں سن لو...... ہم زندگی میں ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں گے۔ ہونہہ......''

یہی وہ بوجھ تھا جو وہ پندرہ سالوں سے اپنے دل پر لیے پھر رہا تھا۔

''مسز تمکین نے اس طرح کیوں کیا؟ کیا امی کے ساتھ ان کے مراسم ٹھیک نہیں ہیں؟ صرف دو دن کی چھٹی مانگنے پر اتنا شدید غصہ؟'' اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ''شاید امی کی غربت کی وجہ سے وہ انہیں کمتر سمجھتی ہوں گی۔ غریب آدمی کو تو ہر ایک اپنی جوتی تلے ہی رکھنا چاہتا ہے۔''

''اُف......'' اگر وہ چاہتا بھی تو، ان باتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا، دل پر دھرا یہ بوجھ اسے ہمیشہ سوئی کی طرح چبھتا رہے گا۔ سوچ، سوچ کر اس کا دماغ تھک رہا تھا۔

وہ گھر آیا تو اس کی ماں باورچی خانے میں اس کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ آہٹ پا کر مڑی۔ اس نے دیکھا انہوں نے گھٹنے پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔

''آ گئے بیٹا کچھ کہہ تو نہیں رہی تھیں میڈم؟'' ماں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''جی نہیں کچھ بھی تو نہیں کہہ رہی تھیں۔'' اس نے لہجے کو نارمل کر کے جواب دیا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ضبط کر کے پوچھا۔

''آپ کے ساتھ ان کے مراسم کیسے ہیں امی؟''

''ٹھیک ہیں بیٹا......! دراصل ان پر کام کا بوجھ بہت ہے۔ اور بھی کئی لحاظ سے انڈر پریشر رہتی ہیں۔ اصل میں ایک پوری آرگنائزیشن کو ہینڈل کرنا آسان نہیں، کبھی کبھی ٹیمپر لوز کر جاتی ہیں، ویسے وہ بہت ہمدرد ہیں، خدا ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔'' وہ آملیٹ پلیٹ میں نکالتے ہوئے بولیں۔

''لو جلدی سے ناشتا کر لو آج تمہیں بھی دیر ہو گئی میری وجہ سے۔''

''نہیں امی......! آج مجھے ضروری کام سے خاور

کے ساتھ جانا ہے۔'' وہ بہت مشکل سے خود کو کمپوز کیے ہوئے تھا۔

مسز تمکین کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ابھی تک اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ خانۂ دل میں ایک شور سا برپا تھا۔ ''کتنی نیک ہے میری ماں...... ان پر بھی خدا کی رحمت سایہ فگن دیکھنے کی تمنا رکھتی ہے۔'' خضر کو اس وقت ایک مخلص دوست کی ضرورت تھی سو کچھ دیر بعد ہی وہ نم آنکھوں سے خاور کے پاس بیٹھا اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔ خاور نے پوری توجہ سے خضر کی بات سننے کے بعد سر اوپر اٹھایا

''خضر میری جان، جس کا خاور جیسا دوست ہو اسے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آؤ میرے ساتھ......'' اور کچھ دیر بعد ڈاکٹر کی ایڈوائس کے ساتھ ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست مسز تمکین کی ٹیبل پر موجود تھی۔ سکول سے نکل کر وہ دونوں ایک کیفے میں جا بیٹھے۔

''خضر، اماں جی کی سروس کتنے سال کی ہوگئی ہے؟'' خاور نے اچانک پوچھا۔

''کیوں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' خضر نے چند منٹ کی خاموشی کے بعد اسے غور سے دیکھ کر کہا۔

''اماں جی اب نوکری نہیں کریں گی جس کے خضر اور خاور جیسے دو جوان، جوان بیٹے ہوں اسے نوکری کی کیا ضرورت......؟ اس ایک ماہ کی چھٹی کے دوران میری پوری کوشش ہوگی کہ اماں جی کی پری میچور ریٹائرمنٹ کی تمام کارروائی مکمل کرادوں، آخر چاچا جی تعلیم کے وزیر ہیں، وہ ہمارا اتنا سا کام بھی نہیں کریں گے اور وہ بھی جائز کام اماں جی اب گھر بیٹھے پنشن وصول کریں گی۔ میں کوشش کروں گا کہ اماں جی کے واجبات بھی جلد مل جائیں۔'' خضر نے کچھ دیر کی بحث کے بعد بالآخر اپنی ماں کو راضی کرلیا۔ خاور نے اپنے رسوخ کے ذریعے ان کا کام جلد تکمیل تک پہنچادیا۔

☆☆☆

خضر نے کافی کا خالی مگ سنک میں رکھا اور پھر سے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اگرچہ ابھی رات تھی مگر سڑکوں پر تھوڑی سی چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ اخبار ڈالنے والے ہاکرز اور دودھ کی بوتلیں سپلائی کرنے والوں کی گاڑیوں کا شور فضاؤں میں گھلنے لگا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ فضا میں برف کے باریک ذرات مرغولے کھاتے نظر آرہے تھے اور وہ ایک بار پھر ماضی میں جا گھسا۔

☆☆☆

''امی...... ! چائے......'' وہ گھٹنوں کے بل اپنی ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا اس کی ماں مسہری پر سوئی دھاگے پھیلائے کچھ کام کررہی تھیں۔

''ارے بیٹا...... تم سوئے نہیں ابھی تک؟'' وہ پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔

''ارے نہیں امی، وہ کل مجھے اپنا اسائنمنٹ جمع کرانا ہے ناں تو اسی لیے جاگ رہا تھا۔ چائے کی طلب ہونے لگی باہر نکلا تو دیکھا آپ کے کمرے کی لائٹ جلی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا ہم دونوں مل کر چائے پئیں تو ایک کپ آپ کے لیے بھی بنالایا آپ اور میں مصروف بھی تو اتنا ہوگئے ہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھنے اور چائے پینے کے لیے کتنا اچھا وقت اور موقع مل گیا ہے، ہے ناں امی......؟''

''بیٹا......'' انہوں نے ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ ''بیٹا مجھے تو آج یہ معلوم ہوا کہ تم اتنی اچھی اور خوشبودار چائے بنالیتے ہو، بھئی مزہ آگیا اس وقت...... واہ۔'' وہ خوش ہو کر چائے پینے لگیں پھر بولیں۔ ''ویسے چائے کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ لب دوز ہو، لب سوز ہو اور لبریز ہو، یہ تینوں خوبیاں ہوں تو پھر چائے...... چائے ہے یعنی اپنی مٹھاس سے ہونٹ چپکانے والی اپنی حرارت سے ہونٹ جلانے والی اور کناروں سے چھلکتی ہوئی لبریز یعنی بھری ہوئی۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''تو پھر بتائیں امی میری بنائی ہوئی چائے میں یہ تینوں خوبیاں ہیں ناں......'' وہ امی کی ریشمی تار کشی سے بھری ہوئی باسکٹ میں جھانکنے لگا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

''وہ امی آپ دن میں صباحت کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں کہ فرصت میں کرنے والی بات ہے، میں اس وقت فرصت سے ہوں، بتائیں کیا بات ہے؟''

''وہ بیٹا...... دراصل تمہارے ماموں میاں صباحت کے لیے کہہ رہے تھے۔ شجیع ماشاءاللہ برسرروزگار ہوگیا ہے، وہ چاہتے ہیں اب جلد از جلد اس کا گھر بسادیں۔ مجھے بھی شجیع بہت اچھا لگتا ہے بہت پیارا اور نیک لڑکا ہے وہ۔'' وہ بہت خوش ہوکر اپنے دل کی بات خضر سے کررہی تھیں۔

''امی یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے...... مگر...... کیا ہم اتنی جلدی شادی ارینج کرنے کے قابل ہوں گے؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''بیٹا......! میں تو اپنا ہر معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کردیتی ہوں، اسی سے مدد اور رہنمائی مانگ لیتی ہوں۔ اور میرے اللہ نے کبھی مجھے مایوس بھی نہیں کیا۔'' وہ ذرا سا کھسک کر خضر کے قریب ہو کر بولیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئیں۔

''کل شجیع میرے پاس آیا تھا، وہ بہت سادگی سے صرف نکاح اور رخصتی چاہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صباحت کے لیے ضرورت کی ہر شے اور ہر خوشی فراہم کرنا اس کی ذمے داری ہے، آپ نے یہی کیا کم ذمے داری پوری کی ہے کہ صباحت کی بہترین تربیت کی ہے۔ اتنی اچھی لڑکی کی تو ہر شخص تمنا کرسکتا ہے کہ تو پھر میں کیوں نہیں، آپ تو میری پھپو ہیں آپ سے تو میں ضد بھی کرسکتا ہوں۔'' خضر کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی وہ کچھ دیر خاموش مسکراتا رہا۔

''مگر آپ نے کچھ تیاری تو ضرور کی ہوگی امی......'' اس نے جھک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

''ہاں بیٹا......'' وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹیوں کا جہیز تو ان کی پیدائش کے ساتھ ہی بننا شروع ہوجاتا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں اپنی بچیوں کے لیے پس انداز کرتی رہی، کچھ نہ کچھ بناتی رہی مگر شجیع کچھ بھی لینے کو تیار نہیں ہے، وہ کہہ رہا تھا کہ میں ان مردوں کی وجہ سے بڑی شرمندگی محسوس کرتا ہوں جو اپنا گھر بسانے کے لیے دوسروں کا سہارا لیتے ہیں یا ان پر بوجھ ڈالتے ہیں آپ صرف صباحت ہمیں دے دیں، آپ کے گھر میں صرف وہی سب سے قیمتی ہے۔'' وہ لیٹی ہوئی چھت کے پنکھے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے امی......؟'' وہ رنگ برنگے تارکشی ریشمی لچھوں سے کھیلتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھنے لگا۔

''بھئی میں نے شجیع سے یہی کہا کہ میں اپنے ولی عہد سے مشورہ کرلوں پھر تمہیں جواب دوں گی...... اب جیسے تم کہو بیٹا؟ اپنے باپ کے بعد اب تم ہی اس گھر کے مرد ہو اور بہنوں کے لیے باپ کی جگہ ہو۔ تمہارے دم سے تو میں نے زندگی کا یہ کٹھن سفر آسانی سے طے کرلیا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ہمیشہ حفاظت فرمائے۔'' بچھڑے ہوئے شوہر کو یاد کرکے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگیں۔

''امی پلیز! آپ... آپ روئیں نہیں، آپ کو پتا ہے میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، امی میں ابا جان کی کمی تو پوری نہیں کرسکتا مگر میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کی آنکھوں میں سجے ہوئے ہر خواب کو تعبیر ضرور ملے گی۔ میں...... میں دوں گا یہ تعبیر بس...... آپ میرے لیے دعا کیا کریں اور پریشان نہ ہوا کریں۔'' اس نے اپنی ماں کے گھٹنوں پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ کچھ لمحے یونہی چپ چاپ گزر گئے...... بنا آہٹ کیے، سنبھلنے کے لیے اتنا وقت تو درکار تھا ہی دونوں کو خضر نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

''امی آپ پہلے صباحت کا عندیہ لیں، وہ کیا کہتی ہے پھر ماموں میاں سے طے کریں کوئی بھی مناسب دن۔''

''ہاں بیٹا......'' انہوں نے ایک دبی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ ''صباحت سے میں پوچھ چکی ہوں، وہ میری بڑی صبر والی بچی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے، وہ کہتی ہے اماں اور بھائی جو بھی فیصلہ کریں گے اسے

قبول ہوگا۔ شجیع ،قدرت کی طرف سے اس کے صبر کا انعام ہوگا...... اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا کوئی فرمائش نہیں کی، گھر کے حالات جانتی تھی ناں...... ہر حال میں راضی رہی۔ اب اس کی زندگی میں رنگ بکھرنے والے ہیں، اللہ سب کی بچیوں کو خوش رکھے اور ان کے صدقے میں میری بچیوں کو بھی۔'' انہوں نے سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے بیٹے کو اطمینان دلایا۔

صباحت کی رخصتی اور نکاح کی تقریب اس قدر مبارک ثابت ہوئی کہ چھوٹے ماموں نے مدحت کے لیے دستِ سوال دراز کردیا۔ان کے بیٹے کو کینیڈا میں اچھی جاب مل گئی تھی، ماموں ،ممانی اسے اکیلے بھیجتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ چھوٹے ماموں نے اماں اور خضر سے یہ اقرار لے کر چھوڑا کہ مدحت ان کی ہو چکی۔

''ارے بھئی جہیز کی چنداں فکر نہ کرنا مدحت کا جہیز تو پہلے ہی ہمارے گھر میں موجود ہے، تم لوگ جو بھی دو گے وہ اضافی ہوگا۔ ویسے بھی مدحت کینیڈا چلی جائے گی۔ تم لوگ تو سیدھے سبھاؤ ہمیں وہ مبارک دن بتا دو جب ہم مدحت کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جائیں۔''

مدحت کے کینیڈا جانے کے بعد امی پھول کی طرح ہلکی اور بے فکر ہو کر اپنے رب کے آگے سجدہ ریز ہوگئیں۔

''واقعی ربِ کریم تیرا حسنِ انتظام حیران کردینے والا ہے تو بہترین منتظم اور منصوبہ ساز ہے تو نے اس دنیا اور تمام کائنات کو سنبھال رکھا ہے آخر تو مجھے کیسے بھول جاتا؟'' ان کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

☆☆☆

لندن اسکول آف اکنامکس کے لیے اسکالر شپ ملنے کی خبر سننے کے بعد امی خوش ہونے کے ساتھ رنجیدہ بھی ہوگئیں۔

''بیٹے......! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی کے بہت سارے دن تمہارے بغیر بھی گزاروں گی۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوگی مگر خیر زندگی آزمائشوں کے درمیان ہی تو گزری ہے، تمہارے عروج، ترقی اور کامیابی کے لیے میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس دنیا میں رہنے والوں کو آسمان پر ایک چاند اور نظر آئے اور وہ میرے بیٹے.. خضر کا چہرہ ہو۔'' محبت اور شفقت سے لبریز جملے ان کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

''امی میری پیاری امی......'' خضر نے ماں کے سینے میں منہ چھپالیا۔

''امی آپ کی دعائیں ہی مجھے جانے کس مقام پر لے جائیں گی۔ اپنی دعاؤں سے مجھے کبھی محروم نہیں کیجیے گا امی......'' وہ ماں کی گردن میں دونوں بازوؤں کا گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

''یہ کہنے کی ضرورت تھی بھلا؟'' وہ نم آنکھوں سے مسکرائیں۔

''بس بیٹا وہاں کے آزاد ماحول سے خود کو اس طرح بچائے رکھنا جیسے ہم پاک حالت میں خود کو گندی چھینٹوں سے بچاتے ہیں۔''

''ہوں......اور آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت تھی بھلا؟ آپ کو یہ سب کیوں کہنا پڑا امی؟ آپ نے خود ہی تو ہمیں بتایا تھا کہ آپ نے اپنی اولاد کو ہمیشہ باوضو ہو کر دودھ پلایا اور ہمیشہ لقمۂ حلال کھلایا۔ آپ کا وہ پاکیزہ دودھ زندگی بن کر آج بھی میری رگوں میں موجود ہے پھر آپ کو یہ اندیشے کیوں ہوئے امی...... اِدھر دیکھیے میری طرف۔'' اس نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آپ کی بلندی کو تو میں کبھی نہیں چھو سکوں گا، میری جگہ ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہے گی کیونکہ جنت یہیں ہے۔'' خضر نے کہتے ہوئے سوچا۔

''میرے لیے بھی امی کے بغیر رہنا کتنا دشوار ہوگا۔ کاش امی جیسا حوصلہ میرے اندر بھی آجائے، مجھے یقین رکھنا چاہیے کہ صباحت اور ماموں میاں امی کا بہت خیال رکھیں گے مگر امی ان کی نہیں میری ذمے داری ہیں، میرے معبود مجھے حوصلہ دے۔''

انسان کا ماضی اچھا ہو یا برا...... اسے یاد ضرور رہتا ہے ،ماضی کے شب و روز تکلیف دہ ہوں یا طمانیت سے بھرے۔ بچپن کے کنچوں اور کھلونوں کی

طرح ہوتے ہیں کبھی، کبھی انسان ان سے کھیلتا ضرور ہے خضر نے خاور حیات کا فون کیا ریسیو کیا ماضی کی۔۔۔ بے شمار اچھی بری یادوں نے اسے دبوچ لیا۔ اگر خاور جیسا پُرخلوص دوست اس کی زندگی میں نہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟

''خاور حیات...... اوہ خاور کے فون کا کیا جواب دوں...... اس کا فون کسی بھی وقت آجائے گا مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' وہ اپنی زندگی کے موجودہ سیٹ اپ سے بالکل مطمئن تھا۔ اگر کہیں کوئی چبھن تھی ہی تو دل پر پڑے ہوئے اس بوجھ کی تھی جسے وہ اٹھائے اٹھائے تھک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں ''شاید...... شاید قدرت مجھے اس بوجھ کو اتارنے کا کوئی موقع دینا چاہتی ہو، مجھے سوچنا ہوگا۔ بلکہ مجھے ضرور سوچنا چاہیے۔'' وہ گرم، گرم کافی کا ایک اورمگ تیار کر کے پھر کھڑکی میں آکھڑا ہوا...... لندن میں ان دنوں رات چودہ گھنٹے کی اور دن دس گھنٹے کا ہونے لگا تھا...... اس نے آنکھوں میں تھکن اترتے ہوئے محسوس کی اور اعصاب چٹختے ہوئے پائے۔ اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اس نے ریلیکس ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سوچ، سوچ کر اس کے دماغ کی چولیں ہل چکی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں اور کندھے دباتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے ماضی کے آنگن میں اتر گیا ایک اور تکلیف دہ یاد کا سامنا کرنے۔

☆☆☆

خضر کو لندن آئے ہوئے ابھی پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ اسے اطلاع ملی کہ امی کے پیروں کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے، وہ اب چل پھر بھی نہیں سکتیں۔ پیروں پر بہت ورم آگیا ہے۔ صباحت نے فون پر بتایا۔

''امی میں بہت صبر ہے بھائی، وہ اب بھی یہی کہتی ہیں جس نے تکلیف دی ہے وہی حوصلہ بھی دے گا۔ اور شفا بھی شکر الحمدللہ میرے پاؤں تو ہیں وہ جب شفا دے گا تو اپنی پیروں پر چل کر تم سب کو دکھادوں گی۔'' خضر نے بہن کو تاکید کی کہ ''سلطانہ آپا کو مستقل گھر پر بلالو'' وہ ایک بیوہ اور بے اولاد رشتے دار تھیں ویسے بھی امی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

''سلطانہ آپا ہر وقت ان کے ساتھ رہیں گی تو ان کی اچھی دیکھ بھال بھی ہو جائے گی۔ اور سلطانہ آپا کو بھی تحفظ اور سہارا مل جائے گا۔ اور میں بھی یہاں مطمئن رہوں گا۔ اجرت پر دیکھ بھال کے لیے رکھی جانے والی نرس سے کہیں زیادہ سلطانہ آپا ان کا خیال رکھیں گی اور صباحت! تم سے تو مجھے کچھ نہیں کہنا تم تو امی کی کیئر کرتی ہی ہو...... تم پیسوں کی بالکل فکر نہیں کرنا۔''

''تم اپنی امی کے لیے فوراً واکر اور وھیل چیئر منگالو۔'' اپنی ماں کی تکلیف کا سوچ کر اسے ہیڈ مسٹریس مسز تمکین کا خیال آیا اسے اپنے پاؤں میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

''امی میں آپ کے لیے ہی تو ہوں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں اب میں آپ کی دعاؤں سے اس قابل ہوں کہ بہترین طبی سہولیات کا آپ کے قدموں میں ڈھیر لگادوں...... اماں جانی میری زندگی کے سارے رنگ آپ سے ہیں، بس آپ خود کو صحیح رکھیے، میں بہت جلد آپ کے پاس ہوں گا۔ بہت جلد...... بس آپ ابھی سے انتظار شروع کردیں، آئی سوئیر امی میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ اپنی ماں کی تصویر کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی ماں کو اپنے ساتھ ہی رکھتا مگر اس کی نیچر آف جاب ایسی تھی کہ وہ کئی، کئی دن گھر سے باہر رہتا۔ پھر بھی وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے اپنی ماں کے پاس تھا۔

☆☆☆

ڈور بیل کی تیز آواز نے اسے ماضی کی بھول بھلیوں سے نکال کر ایک بار پھر لمحۂ موجود میں لا کھڑا کیا۔ میڈ کام پر آچکی تھی اور آتے ہی بکھرے ہوئے گھر کو سمیٹنے لگی۔ آسمان پر بادلوں کے غول بدمست ہاتھیوں کی طرح جھومتے پھر رہے تھے۔ برف باری کچھ دیر کے لیے رک کر پھر شروع ہو جاتی۔ لندن کے رہنے

والوں کو کبھی، کبھی طویل عرصے تک سورج دیکھنا نصیب
نہیں ہوتا۔ کبھی، کبھی بارش غیر متوقع طور پر ایسے برس
جاتی جیسے بغیر کسی وجہ کے یا معمولی سی بات پر مشرقی
لڑکیوں کی آنکھیں برس جاتی ہیں۔ بارش سے سڑکیں
گیلی ہوجاتیں اور سردی بڑھ جاتی۔ منہ سے دورانِ
گفتگو نکلنے والی بھاپ کچھ دیر فضا میں نظر آنے کے بعد
فضا میں تحلیل ہوجاتی۔

خضر کے اندر ایک بے چینی سنسناتی پھر رہی تھی۔
اسے لگا اس کی طبیعت اچاٹ ہورہی ہے۔ خاور حیات
کے فون نے اس کی ذہنی فضا کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔
اب وہ جس طرح سوچ رہا تھا خاور کا فون آنے سے
پہلے وہ اس طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ دل پر دھرے بوجھ
کی گٹھری ہر گزرتے دن کے ساتھ بھاری ہوتی چلی
جارہی تھی۔ وہ ایک مطمئن زندگی گزارنے کے باوجود
غیر مطمئن کیوں ہوجاتا تھا۔ وہ منتقم مزاج ہرگز نہیں تھا
مگر ایک قرض تھا جسے وہ ہر صورت اتار پھینکنا چاہتا تھا۔
ساڑھے چھ ارب انسانوں کے ہجوم میں سے ایک چہرہ
''مسز تمکین'' اس کی آنکھوں کے کیمروں میں محفوظ ہوچکا
تھا۔ ''مسز تمکین کا چہرہ......'' وہ جھٹکے سے اٹھا اور ریسیور
اٹھالیا۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اسے واپس جانا ہے اور
کچھ ہی دیر بعد وہ وال اسٹریٹ جنرل کی ایڈمن کو بتارہا
تھا کہ اسے پاکستان طلب کرلیا ہے۔ اسے کوئی اہم
ذمے داری سونپی جارہی ہے اسے جانا ہوگا۔ وال
اسٹریٹ جنرل کی انتظامیہ نے اسے یہ بتا کر حیرت
میں ڈال دیا کہ اگر وہ چاہے تو اس سنہری موقع سے
فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ جب بھی واپس آنا چاہے اخبار
اسے ویلکم کہے گا۔ بیسٹ آف لک......

وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے امی کے سامنے
موجود تھا۔ اپنی ماں کو اس نے آنے کی اطلاع نہیں دی
تھی، وہ اپنی اچانک آمد کی خوشی سے اپنی ماں کو محروم
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں
درختوں کے لمبے سائے لان میں بچھے ہوئے تھے۔ پنچھی
دن بھر کی تھکان کا احوال سنا رہے تھے۔ امی وہیل چیئر
پر بیٹھی سلطانہ آپا کے ساتھ شام کی چائے پی رہی تھیں۔

وہ دوڑتا ہوا ماں کے قدموں میں جھک گیا انہوں نے
ہتھیلیوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر اپنا سر اس
کے گھنے بالوں والے سر پر رکھ دیا...... کچھ دیر تک ایسا
لگا جیسے وہاں کوئی ذی روح ہے ہی نہیں...... خاموشی کی
بھی بڑی دلکش زبان ہوتی ہے وہ دونوں بغیر کچھ بولے
ایک دوسرے کو سن رہے تھے بغیر لفظوں میں اظہار کیے
دونوں نے جان لیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کتنا
بے چین رہے ہیں۔

''امی آپ ٹھیک تو ہیں ناں......؟'' خضر نے
مدھم آواز میں خود پر کنٹرول پاکر پوچھا۔

''میں اگر ٹھیک نہیں تھی تو اب ضرور ٹھیک
ہوجاؤں گی، تم جو آگئے ہو۔'' وہ مسلسل اس کے بالوں
اور پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ وہ اس کو نظر بھر کر دیکھتے
ہوئے بھی ڈر رہی تھیں۔ وہ کتنا گریس فل لگ رہا تھا۔
اس کی صحت قابلِ رشک ہوگئی تھی' اس کے گندمی رنگ
میں گلال شامل ہوچکا تھا۔ ذہانت اس کی آنکھوں میں
لو دے رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ دیکھنے لگیں خوب
صورت سڈول انگلیاں عمدگی سے تراشے ہوئے ناخن،
صحت مند ہتھیلیاں انہیں خوشی ہونے لگی کہ یہ ان کے
بیٹے کے ہاتھ ہیں۔

''بیٹا میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ اچانک
کیسے آگئے؟ میں تو بس خوش ہوں کہ تم آگئے۔ تم نے
وہاں رہ کر بھی میرا ایسے ہی خیال رکھا جیسے یہاں رہ کر
رکھتے، تمہیں دونوں جہان میں سربلندی نصیب ہو۔
سلطانہ خضر کے لیے چائے اور اسنیکس منگواؤ۔ شریف
سے کہنا اخروٹ کا حلوا بھی لے کر آئے ساتھ میں......
بیٹا رات میں کیا کھاؤ گے جو کہو گے وہی پک جائے
گا۔'' اگر وہ وہیل چیئر پر نہ ہوتیں تو خضر کے لیے اپنے
ہاتھ سے کھانا تیار کرتیں۔ وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے ہی دن وہ خاور حیات کے وسیع و عریض
ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ خاور سمیت اس کے والد

اور خاندان کے چھ افراد نے قومی اسمبلی کی نشستیں حاصل کی تھیں۔صوبائی اسمبلی میں بھی ان کی پارٹی اور خاندان کے لوگوں نے کافی نشستیں حاصل کی تھیں......

لوگوں کارش دیکھ کر خاور اسے اپنے بیڈروم میں لے آیا وہ دونوں بے تکلفی سے کارپٹ پر کشن لگا کر نیم دراز ہو گئے کچھ دیر اِدھراُدھر کی باتیں کرنے کے بعد دونوں سنجیدہ اور اصل موضوع پر آ گئے۔

''پھر تم نے کیا سوچ خضر......؟'' خاور نے خضر کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''دیکھو خاور، میں نہ جاہ وحشم کا متمنی ہوں نہ عہدوں کا متلاشی، مالی آسودگی بھی مجھے میسر ہے اثاثے بنانے کا شوقین نہیں ہوں، شہرت بن مانگے ہی مجھے بہت مل چکی ہے۔لندن اسکول آف اکنامکس سے گریجویشن کرنے کے ساتھ مشہور اور مستند اخبار میں کام کرنے کا تجربہ بھی ساتھ لایا ہوں، فنانشل ایکسپرٹ کے طور پر بڑے پیپرز میں طویل عرصے سے لکھتا چلا آرہا ہوں، مختلف موضوعات پر میری تجزیاتی اور تحقیقاتی رپورٹس بھی کتابی شکل میں پبلش ہو چکی ہیں۔پاکستان کا اس وقت اصل مسئلہ غربت، جہالت اور بنیادی سہولتوں کا نہ ہونا ہے۔ ہر پاکستانی پُرامید نگاہوں سے دوسرے کو دیکھتا ہے کہ شاید میرے دکھ کا مداوا اس کے پاس ہو۔کتنے دکھ کی بات ہے کہ پاکستان جو ایک زرعی ملک ہے یہاں کبھی آٹے کا بحران ہوتا ہے تو کبھی چینی غائب ہو جاتی ہے۔مہنگائی اور غربت کے پسے ہوئے لوگ اپنی زندگیاں ختم کر رہے ہیں، اپنے جگر گوشے فروخت کرر ہے ہیں، بیماروں کے پاس علاج کے پیسے نہیں ہیں۔ دولت کے حصول کے لیے شارٹ کٹ اختیار کیے جارہے ہیں۔ جعل سازی ،اغوا، ڈکیتی، تاوان اور نہ جانے کیا، کیا۔لوگ اپنی سات نسلوں کے لیے دولت کیوں جمع کرتے ہیں یار......؟ آئندہ نسلیں جب دنیا میں آئیں گی تو وہ کیا کریں گی؟ وہ کچھ نہیں کریں گی؟ ہمیں اپنے بچوں کو صرف اچھی تربیت اور تعلیم دے کر وقت کے دریا میں چھوڑ دینا چاہیے وہ خود

محبت

محبت مر نہیں سکتی
محبت سانس لیتی ہے
لہو میں سرسراتی ہے
محبت بین کرتی ہے
کسی کی یاد لگتی ہے
محبت چپ نہیں رہتی
محبت گنگناتی ہے
محبت کی زمینوں پر
جدا ہوں راستے گر بھی
محبت جیت جاتی ہے

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

تیرنا سیکھیں گی، اپنے راستے خود بنائیں گی، اپنا رزق خود ڈھونڈیں گی۔افسوس ہوتا ہے کہ یہاں ناانصافی ہر شعبے میں راج کر رہی ہے۔ سفارش کی وجہ سے نا اہل لوگ آگے آ رہے ہیں اور میرٹ پیچھے رہ گیا ہے اور یہیں سے عمدہ کارکردگی کے فقدان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کتنے مجھ جیسے غریب گھر کے بچے ایسے ہوتے ہوں گے جو سروائیو کر جاتے ہوں گے یا جنہیں بروقت آکسیجن مل جاتی ہوگی اور وہ اپنی منزل پا لیتے ہونگے۔شاید پچیس فیصد...... بلکہ پندرہ فیصد...... یا اس سے بھی کم...... یار خاور دس پندرہ ہزار تنخواہ پانے والا شخص اپنے بچوں کو پڑھائے یوٹیلیٹی بلز بھرے، علاج کرائے یا پیٹ بھرے۔ ظلم ہے یار......'' وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اور مسلسل بول رہا تھا۔

اور خاور حیات کراچی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اس شعلہ بیان مقرر کو دیکھ رہا تھا جس کا نام خضر تھا اور جو اصل میں خضر بننا چاہتا تھا۔ جس کی تقریریں

خون کو گرما دیتی تھیں۔ پُرجوش انداز بیان پُراثر دلیلیں اور الفاظ اس کے منہ سے لاوے کی طرح بہہ نکلتے تھے جس کے بارے میں لوگ یقین سے کہتے تھے کہ یہ چھا جائے گا۔ خاور کو خضر پر فخر تھا۔ آج سے نہیں ہمیشہ سے.....خضر نے آج اس کے فیوڈل ازم کو بھی لتاڑا تھا مگر اسے برا نہیں لگا کیونکہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

''معذرت چاہتا ہوں یار......! میں جذبات میں آکر تمہارے طبقے کو بھی برا بھلا کہتا رہا اور تم نے مجھے روکا بھی نہیں۔'' خضر نے خاور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کیوں روکتا تمہیں؟ روکنے والا ہی تو چاہیے اب۔'' خاور نے بوتل سے پانی نکال کر دو گھونٹ بھرے اور پوچھنے لگا۔

''بابا سائیں پوچھتے ہیں تم کس منسٹری کے ایڈوائزر بننے میں انٹرسٹڈ ہو.....تمہارا اسٹیٹس منسٹر کے برابر ہوگا۔ پہلے چاچا سائیں ایجوکیشن کے منسٹر تھے، اب بابا سائیں کو بنا رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

خضر نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر پاؤں سامنے صوفے پر پھیلا دیے۔

''خاور میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں مجھے عہدوں کی تمنا نہیں ہے، میں بابا سائیں کے ساتھ بلا معاوضہ کام کروں گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تم نے فون پر کہا تھا وطن کو تمہاری ضرورت ہے اسی لیے آگیا ہوں۔ میں بگڑے ہوئے اس پورے سسٹم کو بدلنے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ میری ہی طرح اور بہت سے لوگوں کو بھی سوچنا ہوگا تب ہی بات بنے گی۔ بھوک کا احساس کرنے کے لیے بھوکا رہنا مسٹ ہے۔ مجھے خود کو موبائل رکھنے کے لیے بس ایک گاڑی مع ڈرائیور چاہیے۔ پٹرول کا خرچہ میں خود اٹھاؤں گا اور مختصر مگر ضروری اسٹاف چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکوں...... میرے پاس کچھ اچھے آئیڈیاز اور تجاویز ہیں جن پر عمل درآمد شروع میں مشکل ضرور ہوگا مگر جلد ہی یہ پزیرائی حاصل کر کے پھل پھول دینے لگیں گی۔ میں جانتا ہوں اس ملک کا ایک بڑا طبقہ اس کی شدید مخالفت کرے گا مگر اس ملک کا ایک اور بہت بڑا طبقہ خوش دلی سے اس کا استقبال بھی کرے گا۔ مجھے اس کا غم نہیں ہوگا کہ میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ میرے لیے یہ اطمینان بھی کافی ہوگا کہ میں نے کوششیں تو کی...... کیونکہ وعدے تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر کوشش کوئی نہیں کرتا......اور دیکھو یار وعدے اکثر پورے نہیں ہوتے مگر کوششیں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ناکامی کی صورت میں، میں واپس چلا جاؤں گا۔ اس سوچ کے ساتھ کہ میرا نام آگ لگانے والوں میں نہیں بلکہ آگ بجھانے والوں میں لکھا جائے گا۔ وال اسٹریٹ جنرل کے دوازے میرے لیے کھلے ہوں گے۔ میرا مستقبل تو محفوظ ہی ہے مگر مجھے اپنے نہیں پاکستان کے مستقبل کی فکر ہے۔''

''چلو اٹھو پہلے کھانا کھاتے ہیں۔'' خاور حیات نے خضر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کھانے کے بعد وہ واپس بیڈ روم میں آگئے۔ ملکی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں بہت سے ہلکے پھلکے موضوعات پر باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ دونوں کافی عرصے کے بعد ملے تھے۔ خضر، خاور کے لیے کچھ تحائف بھی لایا تھا۔ کچھ دیر بعد خضر نے اچانک سنجیدہ ہو کر خاور سے پوچھا۔

''خاور تمہیں میڈم تمکین یاد ہیں؟''

''کون میڈم تمکین؟'' خاور نے الٹا سوال پوچھ لیا۔

''خاور تم انہیں بھول سکتے ہو مگر میں نہیں...... وہ میرے ماضی کی ایک بدصورت یاد ہیں۔ ان کا ایک قرض لوٹانا ہے مجھے، انہیں تلاش کرو یار...... میں پندرہ سال سے ان کے کچھ واجبات اپنے دل پر ایک بوجھ کی طرح لیے پھر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تھک کر نڈھال ہو جاؤں میں اس بار یہ قرض اتار دینا چاہتا ہوں۔ امی کی دونوں ٹانگیں دیکھ کر وہ مجھے شدت سے یاد آتی ہیں۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا خاور......'' خضر کی آواز اور لہجے میں درد اور اذیت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''اچھا...... چھا وہ میڈم تمکین......انہیں کیوں

بھولوں گا میں؟'' خاور نے یاد آنے پر کہا۔ ''انہوں نے اماں جی کے ساتھ بڑا مس بی ہیو کیا تھا۔ میں بھی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا یار......''

''خاور میں منتقم مزاج ہرگز نہیں ہوں اور نہ ہی امی نے میری تربیت اس طرح کی، کی ہے۔ میں عورت کا بہت احترام کرتا ہوں دل سے۔ اس دن میڈم تمکین کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں وہیں حساب بے باق کر دیتا کم از کم اس کے منہ پر کس کر ایک تھپڑ تو مار ہی دیتا مگر خاور ضروری تو نہیں کہ تھپڑ ہاتھ سے ہی مارا جائے، میری امی کے جن ٹانگوں کو توڑ دینے کی انہوں نے دھمکی دی تھی میں انہی پیروں پر انہیں جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں بس اسی دن میری بے چینی اور بے کلی ختم ہو جائے گی۔ میرے دل سے بوجھ سرک جائے گا۔ ان کا پتا کراؤ یار وہ اب کہاں ہیں، میرے خیال میں تو وہ اب تک ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی۔''

''ارے انہیں تلاش کرنا کون سا مشکل کام ہے اگر وہ ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی تو پنشن لینے تو آتی ہی ہوں گی انہیں ڈھونڈ نکالیں گے یار...... تم فکر ہی نہیں کرو۔'' خاور نے خضر کو تسلی دی۔ پھر خاور نے ایک ہفتے کے بعد ہی مکمل معلومات کے ساتھ خضر کو فون کیا۔

''میڈم تمکین واقعی ریٹائر ہو چکی ہیں اور اب اپنا ایک اسکول چلا رہی ہیں اور اتنی ہی بدزبان اور اکھڑ ہیں۔'' خاور نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا بعد میں خاور نے میڈم تمکین کے معاملے میں دلچسپی لے کر خضر کو بتایا کہ ''میڈم تمکین کے اسکول میں ایک فنکشن ہونے والا ہے۔ آج کل چیف گیسٹ کے لیے ناموں پر غور کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک ذریعے سے تمہارے بارے میں کہلوایا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں تم hot cake بنے ہوئے ہو اگر کوئی تم سے رابطہ کرلے تو دیکھ لینا۔ یہ موقع پھر ملے نہ ملے اوکے...... بیسٹ آف لک......''

فون رکھنے کے بعد خضر کافی دیر تک کسی سوچ میں گم رہا۔

☆☆☆

''اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔'' امی نے ایک دن اسے پکڑ ہی لیا۔

''چھوڑیں امی......! میں شادی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں پڑنا چاہتے اور میرا بہو لانے کا ارمان کیسے پورا ہوگا۔ بھئی میں تو اس دفعہ تمہاری شادی کر کے ہی بھیجوں گی۔ بس کہہ دیا ہے میں نے۔ ماشاءاللہ روزگار ہے، ذمے داریوں سے فارغ ہو چکے ہو، مالی طور پر آسودہ ہو اللہ کا کرم ہے پھر کیوں منع کر رہے ہو۔'' وہ پوچھنے لگیں۔

''امی اگر آپ کی بہو آپ کا خیال نہ رکھ پائی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ آپ مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔'' وہ پھر بدکا۔

''لو اگر ہر بیٹا ایسے ہی سوچنے لگے تو پھر بیٹوں کی شادیاں کیسے ہوں گی؟ نہ بھئی تمہاری بات میں بالکل بھی وزن نہیں ہے اور میرا خیال رکھنے کے لیے تم جو ہو۔ میں تو اب معذور ہوگئی ہوں تمہارا خیال رکھنے والا بھی تو کوئی ہو اگر کہیں تمہارا خیال ہے تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو مجھے بتاؤ۔'' وہ جھک کر رازداری سے پوچھنے لگیں۔

''نہیں امی...... دراصل میں نے کبھی اس طرف سوچا نہیں کبھی کسی خاتون کو دیکھ کر ایسا خیال ہی نہیں آیا۔'' وہ جھینپ رہا تھا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے، تم مجھے اجازت دو میں تمہارے لیے دلہن تلاش کرواتی ہوں۔ میں آج ہی صباحت کو کہتی ہوں اسے بھی تو بھائی کی شادی کا ارمان ہوگا ناں......'' انہوں نے طمانیت بھری سانس لی۔

''ٹھیک ہے امی تو پھر آپ ہی لوگ دیکھیے اس معاملے کو...... مجھے کون سا شادیوں کا تجربہ ہے۔'' وہ ماں کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا جہاں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

پندرہ سال پہلے جب وہ اسکالر شپ ملنے پر لندن آیا تھا تو چھریرے بدن کا ایک نوجوان تھا۔ بالوں کی متوالی اور شریر لٹیں اس کے ماتھے پر جھولتی رہتی

تھیں۔ اس کی ڈارک گرے کلر کی پتلیوں سے ذہانت چھلکی پڑتی تھی۔ ہونٹوں کی بناوٹ ہی کچھ ایسی تھی کہ جیسے مسکان ہمیشہ کے لیے ہونٹوں پر ٹھہر گئی ہو۔ لیکن اب اس کی پرسنالٹی میں ایک گریس آچکا تھا۔ جسم بھرا، بھرا سا ہوگیا تھا۔ مالی، آسودگی اور ذہنی بے فکری نے اس کے چہرے پر مزید رنگوں کی آمیزش کردی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے اور ملنے ملانے میں ایک وقار آگیا تھا۔ وہ خاصا بدل گیا تھا۔ خاور کے بابا سائیں کے ساتھ وہ مشیر کی حیثیت سے کام شروع کرچکا تھا۔ اس کا اسٹیٹس وزیر کے مساوی تھا۔

☆☆☆

میڈم تمکین نے چیف گیسٹ کے لیے خضر کے نام پر سنجیدگی سے غور کیا۔

''مسٹر خضر تعلیم کے مشیر ہیں، ان کا اسٹیٹس منسٹر کے برابر ہے۔ خاصے پاور فل بھی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ہمارے اسکول کے لیے کوئی عطیہ وغیرہ......'' وہ آگے کا سوچ کر ہی مسکرانے لگیں۔

''مجھے خود ہی جانا ہوگا بلکہ مجھے خود ہی جانا چاہیے، اس طبقے کے لوگ پروٹوکول کانشس بھی تو بہت ہوتے ہیں اور نخرہ وخرہ بھی بہت ہوتا ہے مزاج میں۔'' وہ جانے کی منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

☆☆☆

''آیئے مسز تمکین۔'' وہ بہت ضبط کے ساتھ احتراماً کرسی سے ذرا سا اٹھا۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور فریم لیس گلاسز آنکھوں پر لگا لیے۔

''تھینک یو سر...... تھینک یو ویری مچ...... آپ نے مجھے ٹائم دیا۔'' وہ بیٹھنے کے بعد بولیں' بالوں پر ہاتھ پھیر کر دوپٹے کو درست کرکے کاندھے پر سیٹ کیا۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے اگرچہ کسی حد تک ان کی عمر کو چھپایا ضرور تھا مگر خضر ان کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے اس دن والے رویے کی وجہ سے خضر کو آج بھی ان کا چہرہ کریہہ اور انتہائی بدصورت لگ رہا تھا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''کہیے کیسے تشریف لانا ہوا؟''

''وہ سر......! دراصل ہمارے اسکول کا اینوئل فنکشن ہونے والا ہے، ہم اسے بہت اچھے طریقے سے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ آپ تعلیم کے مشیر ہیں...... اگر آپ ایز اے چیف گیسٹ تشریف لائیں تو یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی سر...... سر دیکھیے پلیز انکار نہ کیجیے گا۔ پلیز سر......'' ان کے لہجے سے خوشامد ٹپکی پڑ رہی تھی۔ خضر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''دیکھیے...... بات دراصل یہ ہے میڈم کہ میں خاصا بزی رہتا ہوں جو تھوڑے سے لمحات فرصت کے ملتے بھی ہیں تو وہ ٹائم میں صرف اور صرف اپنی مدر کے ساتھ گزارتا ہوں' وہ میرا انتظار کررہی ہوتی ہیں۔'' خضر کی بھاری اور دلکش آواز کمرے کے پُرسکون ماحول میں ایک حسین ارتعاش پیدا کررہی تھی۔

''یہ تو ہمارے لیے اور بھی اعزاز کی بات ہوگی سر کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ آئیں۔ ایک تو آپ ہی اور پھر آپ کی بھی والدہ ہمارے لیے تو ڈبل اعزاز ہوگا سر...... پلیز انکار نہ کیجیے گا۔'' میڈم تمکین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خضر کے قدموں میں پڑ جائیں۔

''مگر اپائنٹمنٹ شیڈول چیک کیے بغیر آپ سے کوئی پرامس بھی تو نہیں کیا جاسکتا ناں......'' خضر کے اندر نفرت ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

''سر پلیز......'' وہ تھوڑا سا آگے کو جھک کر بولیں۔

''سوری میڈم! ابھی اور اس وقت تو میں آپ کو کوئی پازیٹو رسپانس نہیں دے سکتا، آپ میرے پی اے سے رابطے میں رہیے شاید وہ کوئی گنجائش نکال سکے۔ اوکے میں اس وقت تھوڑا بزی ہوں، سوری فار دیٹ......'' اس نے فون اٹھا لیا مطلب کہ آپ جاسکتی ہیں۔

''تھینک یو...... تھینک یو سو نائس آف یو سر...... میں آپ کے پی اے سے پوچھتی رہوں گی۔ تھینکس اگین کہ آپ نے مجھے ٹائم دیا۔''

''مسٹر خضر سے ملتی جلتی شکل کس کی ہے؟'' وہ

باہر نکلتے وقت اپنی ناقص یادداشت کو برا کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''خضر بیٹا آپ کے پروپوزلز تو سبھی اچھے ہیں۔ فوری طور پر سب تو نہیں پر کچھ پروپوزلز کو ضرور اپلائی کریں گے۔ کیبنٹ میٹنگ میں اس سلسلے میں سب سے مشورہ بھی کریں گے۔ میرا خیال ہے اچھی آؤٹ پٹ ملے گی۔ دراصل ایک دم سے سب کچھ چینج نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کا ذہن بدلنے میں وقت تو خرچ ہی ہوتا ہے۔ خضر بیٹا...... آپ اپنے وطن کے لیے اچھی سوچ اور جذبات رکھتے ہو، میں قدر کرتا ہوں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔'' مخدوم دلاور حیات نہایت شفیق انداز میں اپنے چیمبر (آفس) میں خضر سے بات کررہے تھے۔

''پرائم منسٹر سے دو دن بعد میری ون ٹو ون ملاقات ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ دیر کے لیے میں تمہیں بھی اندر بلاؤں، تمہارے پاس خوب صورت الفاظ، دلائل اور کنوینسنگ پاور بھی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں چاچا سائیں، آپ مجھے اپنے ساتھ موجود پائیں گے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ امی کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔'' وہ مؤدب ہوکر کرسی سے اٹھ گیا۔

''ہاں بیٹا سائیں، ضرور، ضرور ماں کی خدمت کروگے تو دنیا بھی تمہاری اور آخرت بھی تمہاری...... مجھے کوئی کام ہوا تو تمہارا سیل فون کس لیے ہے میں ٹرائی کرلوں گا۔ جاؤ بیٹا...... اللہ وائی۔'' دفتر سے گھر کے راستے تک وہ مختلف سوچوں میں گم رہا۔

☆☆☆

گاڑی سے اتر کر خضر اپنی ماں کی وہیل چیئر چلاتے ہوئے جیسے ہی اسکول کے احاطے میں داخل ہوا دونوں جانب پھول سے بچے اور مسکراتے ہوئے چہروں والی ٹیچرز پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے کے لیے کھڑے تھے بہت سے بچوں کے ہاتھوں میں استقبالیہ جھنڈیاں بھی تھیں۔ میڈم تمکین نے ایک بڑا سا ہار لپک کر خضر کے گلے میں ڈالنا چاہا مگر خضر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا اور ہار لے کر اپنی ماں کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ سفید چکن کی کڑھی ہوئی ساڑی میں ملبوس تھیں، کلائیوں میں باریک سونے کی ڈائمنڈ جڑی چوڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے پاؤں خاص جوگرز میں ملفوف وہیل چیئر کے پیڈل پر رکھے ہوئے تھے سر کے بال دودھ کی طرح سفید تھے ساڑی کا پلو سفید بالوں والے سر پر ایک خوب صورت انداز میں منعکس تھا نہ جانے کون سے جذبے کے تحت ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی مگر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھیں اور وہاں پر موجود لوگوں کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دے رہی تھیں۔ ایک طمانیت بھرا احساس ان کے چہرے پر سایہ فگن تھا انہوں نے بہت پیار سے اپنے بیٹے کو دیکھا...... بیماری اور بڑھتی ہوئی عمر نے ان کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔ خضر نے جھک کر اپنی ماں کے ورم آلود چہرے کو چوم لیا اور یہ منظر وہاں پر موجود بہت سے کیمروں نے محفوظ کرلیا جسے اگلے دن فنکشن کی رپورٹ کے ساتھ اخبارات کی زینت بننا تھا۔ مسز تمکین کچھ سوچ، سوچ کر ایک بار پھر اپنی...... یادداشت کو الزام دے رہی تھیں۔ ذہن کے کسی گوشے میں کسی یاد، کسی خیال کا جگنو ٹمٹماتا ضرور تھا مگر انہیں اس وقت کچھ بھی سوچنے کے لیے زیادہ وقت ہی کہاں مل پا رہا تھا۔ کوئی چہرہ، کوئی شکل ان کے حافظے میں ڈبکیاں کھاتی پھر رہی تھی خضر نے اپنی ماں کی وہیل چیئر کو خود چلاتے ہوئے اگلی صفوں تک پہنچایا تو کئی نگاہوں میں ستائش تھی کئی ماؤں نے رشک سے خضر کی والدہ کو دیکھا۔ خضر نے پنجوں کے بل تھوڑا سا بیٹھتے ہوئے اپنی ماں کے جوگرز اتارنے شروع کیے۔

''پلیز مسز تمکین...... ایک چھوٹی ٹیبل منگوا دیجیے میری مدر زیادہ دیر پیر لٹکا کر نہیں بیٹھ سکتی ہیں۔'' وہ پیچھے کھڑی ہوئی مسز تمکین سے مخاطب ہوا۔

''سر...... ابھی لیں۔'' وہ پیچھے کسی کو حکم دینے کے لیے دوڑ گئیں، ٹیبل آنے کے بعد خضر نے اپنی ماں کے

دونوں پاؤں پھول کی طرح اٹھا کر میز پر رکھے اور نیچے کشن رکھ دیے۔ نرم اونی شال ان کے کندھوں پر پھیلا کر وہ مڑا۔

''سوری...... اب میں فارغ ہوں...... فرمائیں اب مجھے کیا کرنا ہے۔''

''آیئے سر......'' وہ خضر کو لے کر اسٹیج پر چڑھ گئیں۔ وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہی تھیں جیسے جسم یہاں ہو مگر ذہن کہیں اور اڑانیں بھر رہا ہو۔ خضر ان کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سپاسنامے کے بعد خضر نے اپنی مؤثر اور مختصر تقریر سے تمام حاضرین کو سحر زدہ سا کیے رکھا۔

ریفریشمنٹ کے بعد تقریب کے اختتام پر خضر نے میڈم تمکین سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سوری میڈم...... میری والدہ کے جوگرز غالباً یہاں سے کسی نے اٹھا کر کہیں اور رکھ دیے ہیں۔ آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی ذرا ان کے جوگرز تو منگوا دیں بلکہ اگر آپ کو برا نہیں لگے تو کسی سے کہہ کر ان کو پہنا بھی دیں، یہ خود سے نہیں پہن سکتی ہیں یا پھر سوری! آپ منگوا دیں تو میں خود انہیں پہنا دوں گا۔'' وہ مسکراتا ہو چہکا۔

''ارے نہیں سر...... آپ کیوں پہنائیں گے، میں پہنائے دیتی ہوں۔ یہ خدمت مجھے کرنے دیں۔'' پھر ہنس کر کہنے لگیں۔ ''آخر کو وہ ایک قابلِ احترام ہستی کی والدہ ہیں۔'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ ان کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر جوگرز پہنانے لگیں...... جیسے ہی انہوں نے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی۔ ان کے دماغ میں ایک ساتھ کئی بم بلاسٹ ہوئے۔ انہیں سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ وہ انہیں پہچان چکی تھیں۔ ان کے پاؤں ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھے۔

خضر کے لیے زندگی کا یہ سب سے خوب صورت لمحہ تھا۔ وہ کافی دیر تک اس خوب صورت اور یادگار منظر کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خواہش کی کہ کئی صدیوں تک یہ منظر یونہی ٹھہرا رہے۔ وقت منجمد ہو کر خود بھی یہ منظر دیکھنے کے لیے رک جائے...... مسزِ تمکین تھکے ہوئے انداز میں جوگرز پہنانے کے بعد کھڑی ہوئیں۔

''تھینک یو مسز تمکین......'' وہ کچھ دیر تک مسکراتا ہوا انہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میں کافی دیر سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان سی ہیں۔ آپ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہیں شاید آپ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور یاد نہ آ رہا ہو تو چلیے میں آپ کی ہیلپ کیے دیتا ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ زندگی میں ایک بار پھر ہم آمنے سامنے ہوں گے مگر اس وقت ہم دونوں کی حیثیتیں جدا اور مختلف ہوں گی۔'' پھر گھوم کر اپنی ماں کی وہیل چیئر کے پاس آیا اپنی ماں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر کہا۔

''ان کو پہچانا آپ نے؟ یہ مسز امتیاز ہیں، آپ کے پرانے سرکاری اسکول کی ایک معمولی سی ٹیچر...... صرف دو دن کی چھٹی مانگنے پر آپ نے ان کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دی تھی ناں یا یوں کہیے کہ خواہش کی تھی۔ وہی ٹانگیں کہ جن ٹانگوں کے پیر اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر، ابھی کچھ دیر پہلے آپ جوگرز پہنا رہی تھیں۔'' سب مہمان سکتے کے عالم میں تھے محفل پر ایک سناٹا طاری تھا۔ مسز تمکین کو محسوس ہوا کہ وہ بے لباس کھڑی ہیں اور چاروں طرف سے نظر نہ آنے والے بے شمار چہرے ان پر قہقہے لگا رہے ہوں۔ خضر نے مڑ کر اپنی ماں کو دیکھا ان کا جسم غیر محسوس طریقے پر کپکپا رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز چھلکنے کو...... بے تاب تھیں۔ خضر نے تڑپ کر جھکتے ہوئے اپنے گال ماں کے چہرے سے ملا دیے۔ پھر مسز تمکین کو مخاطب کر کے دھیمی اور رنجیدہ آواز میں کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے میڈم میری نیک دل ماں کی آنکھوں سے یہ گوہرِ آبدار آپ کی تکلیف اور اذیت کو محسوس کر کے ہی نکلے ہیں۔'' ماں کی وہیل چیئر کو باہر لے جاتے ہوئے وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دل پر پندرہ سال سے دھرا ہوا بوجھ اتر چکا تھا۔ کافی عرصے بعد رات کو وہ ایک بہترین پُرسکون اور میٹھی نیند سویا۔



بلاعنوان

ام ایمان

آج میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا.... کم ازکم ایک سال تو ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ وہ ماہ مہر تو نہیں تھی بلکہ اس کا سایہ ہی لگی مجھے، بے حد کمزور، چہرے کی ساری شادابیاں جیسے زردیوں میں گھل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے، بہت زیادہ ڈری سہمی ہوئی، کالے رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے اس نے اپنا آدھا منہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ ساتھ میں اس کی ساس بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں رک گئیں۔ میں نے اس کی ساس سے حال احوال پوچھا

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

''بس جی کیا بتاؤں، میرے بیٹے کی تو جان عذاب میں آگئی ہے، جب سے یہ منحوس ہمارے گھر میں آئی ہے ایک کمانے والا جی ہے میرا بیٹا اور کھانے والے کئی...... اوپر سے اس نامراد کی روز کی بہانے بازیاں......'' کہتے ہوئے ساس نے دو ہتڑ بھی اس کی کمر پر رسید کیے۔ ''کبھی یہ گر پڑتی ہے تو کبھی اسے چکر آنے لگتے ہیں، باپ تو ہمارے سر منڈھ کر چلا گیا۔ اب ساری عمر اس عذاب کو جھیلیں گے۔ اب اس منحوس کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔ پاس کی ڈسپنسری سے دوا لینے تاکہ پتا تو چلے آخر ہے کیا اسے۔'' اس دوران اس کا چہرہ میں نے کئی بار کبھی سفید اور کبھی زرد پڑتے دیکھا۔

''چل مر!'' اس کی ساس بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹتے آگے لے گئی، جاتے ہوئے اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ کیا نہیں تھا ان ڈبڈبائی آنکھوں میں...... دکھ، غم، حسرت، بے بسی اور وہ گھسٹتی ہوئی چلی گئی۔ میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ وہ دونوں گیٹ کراس کر گئیں۔

میں گزشتہ پندرہ سال سے اس ہاسٹل کی وارڈن کے طور پر تعینات ہوں...... پہلے میں اس ہاسٹل سے ملحق گرلز کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے یہاں کے ہاسٹل کی وارڈن کے طور پر تعینات کر دیا گیا اور عمارت کے احاطے میں ہی رہائش کی سہولت بھی دے دی گئی۔ میرے خاوند مجھے دس سال پہلے ہی داغِ مفارقت دے گئے تھے، اولاد اللہ نے نوازی نہیں تھی سو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے اس کالج اور بعد میں ہاسٹل کی بچیوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا...... دور دراز قصبوں اور شہروں سے آنے والی بچیاں اس ہاسٹل میں مقیم ہوتیں۔ جن کی پوری ذمّے داری میرے اوپر تھی۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی ذمّے داری کو ہمیشہ فرض شناسی سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کے مردانہ و زنانہ عملے کی تعیناتی کی ذمّے داری میری تھی۔ میں نے اپنی طرف سے چھانٹ کر ایسے لوگ منتخب کیے جو میری ہی طرح اس ادارے کے ساتھ مخلص ہوں اور کافی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی...... میرے علاوہ ہاسٹل کے عملے میں سات لوگ تھے۔ دو کک، ایک مالی، چوکیدار، ایک اسٹور کیپر کامران نامی نوجوان تھا۔ جو ضرورت پڑنے پر میرے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور ہاسٹل میں کینٹین کی ذمّے داری بھی میں نے اسے ہی سونپی ہوئی تھی۔ دو سوئیپر بھی تھیں جو ہاسٹل کی صفائی کے لیے مخصوص تھیں۔

یہاں کام کرنے والوں کی بھی رہائش ہاسٹل بلڈنگ کے ساتھ ہی تھی۔ کامران بھی وہیں اپنی ماں، بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ سارے ملازمین کو دن کے وقت اپنے، اپنے وقت پر آف دے دیا جاتا تھا کہ وہ گھر چلے جائیں۔ رات کو ہاسٹل کے اندر کسی مرد کے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں خود رات کو بچیوں کے رومز جا کر چیک کرتی، ان کے ٹائم ٹیبل، روٹین اسٹڈی پر نظر رکھتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان پندرہ برسوں میں ہزاروں لڑکیاں یہاں سے تعلیم حاصل کر کے گئی تھیں، چھوٹے موٹے مسائل کے علاوہ کوئی بڑی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں پھر ہاسٹل میں داخلے ہو رہے تھے۔ میں بچیوں کے والدین سے خود ملتی، ان کو ہاسٹل کے اصول و ضوابط بتاتی اور اپنی پوری ضابطے کی کارروائی کے بعد ہی ان کو رہائش کی اجازت ملتی۔ موبائل فون جہاں رحمت وہاں زحمت...... اس سہولت کو میں بچیوں کے لیے خرافات سمجھتی تھی سو اس کی اجازت بچیوں کو نہیں تھی۔ ہاں ضروری کام یا کال کے لیے آفس کے فون سے لڑکیاں استفادہ کر سکتی تھیں جس کے ڈیوز ان سے لیے جاتے تھے۔

اس روز میں نے کافی ایڈمیشن کیے اور مس نگہت

جو میری پی اے کی خدمات انجام دیتی تھیں کو چائے لانے کو کہا اتنے میں چوکیدار ایک باریش اور بارعب بزرگ اور ان کے ساتھ ایک لڑکی کو لیے آفس میں چلا آیا کہ وہ اس لڑکی کے والد تھے اور اپنی بیٹی کو ہاسٹل میں داخل کرانے آئے تھے تاکہ وہ اپنی تعلیم آگے جاری رکھ سکے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور اس بزرگ سے تعارف لینے لگی۔ انہوں نے اپنے آپ کو کافی دور ایک قصبے کا سردار بتایا اور کہا کہ اگرچہ ان کے قبیلے میں لڑکیوں کو آگے پڑھانے کا رواج نہیں ہے لیکن چونکہ وہ اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں تو اس کے آگے پڑھنے کی خواہش کو رد نہیں کر سکتے اور قبیلے والوں کی از حد مخالفت کے باوجود وہ اسے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ اس لڑکی کا نام ماہ مہر تھا جس کی عمر تقریباً سترہ، اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ بہت ہی معصوم اور خوب صورت خدوخال کی مالک ماہ مہر مجھے بہت کم گو لگی ... اس نے صرف پوچھے جانے والے سوالات کا جواب دیا اور آدھے گھنٹے کی ضروری کارروائی کے بعد اس کے والد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماہ مہر کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور مجھ سے اجازت طلب کرنے کے بعد چلے گئے۔ میں نے ہیڈ گرل کو بلوا کر.... ماہ مہر کو اس کا کمرا دکھانے اور چوکیدار کو اس کا سامان پہنچانے کا کہا.....اور چونکہ میں بہت تھک چکی تھی سو آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد میں اپنی رہائش گاہ کی جانب چلی آئی۔

شام کو معمول کے مطابق اٹھنے کے بعد ہاسٹل کا ایک چکر لگایا، مرکزی لان میں لڑکیاں موجود تھیں۔ کچھ گروپس کی صورت میں، کچھ شام کی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔ آپا اماں جو میری ذاتی ملازمہ تھیں نے مجھے چائے کا کپ تھمایا جسے لیے میں کرسی پر بیٹھی اور شام کی حاضری کے لیے بیل بجانے کا اشارہ کیا جو کہ روز کا معمول تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی تمام لڑکیاں مرکزی لان میں جمع ہوگئیں۔ ان میں نئی پرانی ساری لڑکیاں شامل تھیں، میں نے حاضری لی۔ کچھ لڑکیوں کی ڈاک جو آئی تھی وہ تقسیم کی' ان سے ان کے مسئلے مسائل دریافت کیے اور حسبِ معمول نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ میں انہیں وقتاً فوقتاً بتایا کرتی تھی کہ لڑکیوں کی عزت کانچ سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے اس میں ذرا سی بھی ٹھیس سے جو بال آئے وہ عمر بھر کا تاوان دے کر بھی نہیں بھرتا۔ اپنے روزمرہ کے لیکچر کے دوران مجھے پچھلی لائنوں میں ماہ مہر بھی نظر آئی۔ دوپہر کی نسبت وہ اس وقت پُراعتماد اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔

یوں ہی بہت سارے دن بیتتے چلے گئے۔ بعد میں، میں نے اسے کئی بار لان میں، روم میں، حاضری کے دوران بہت بار دیکھا تھا۔ اس دوران ہر ویک اینڈ پر اس کے والد آتے اس سے ملاقات کر جاتے اور کسی، کسی ویک اینڈ پر وہ دیگر لڑکیوں کی طرح گھر بھی جایا کرتی تھی۔

باقاعدہ کارڈ اور حاضری کا رجسٹر بنا ہوا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں نے ماہ مہر کو کچھ گم صم کیفیت میں دیکھا اور اسے بلا کر اس کی خیریت بھی دریافت کی تو اس نے پیپرز کی ٹینشن ہے کہہ کر میری تشویش کو مسترد کر دیا۔ ہاسٹل کی ہر لڑکی کی غیر معمولی کیفیت میرے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی، میں ان کے ہر معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتی تھی بعض دفعہ بچیاں اپنے گھریلو مسائل بھی میرے پاس لے کر آتیں جنہیں میں اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دن میں نے صبح کی حاضری اور بچیوں کے کالج جانے کے بعد ہاسٹل کا چکر لگایا پھر آفس میں آکر بیٹھی تھی کہ کامران چلا آیا اس کے اسٹور روم سے کھیل کا کچھ سامان غائب تھا جو لڑکیوں نے ایشو کرایا تھا۔ اس نے ہاسٹل کے رومز کو چیک کرنے کی درخواست کی کہ ان ملازماؤں کو میرے ساتھ بھیج دیں تو میں نے اسے ہاسٹل رومز کی ایک، ایک ایکسٹرا لاک کی چابیاں جو میرے پاس ہوتی تھیں دیتے ہوئے کہا کہ وہ خود جا کر یہ کام کرلے اور واپس آکر آج مجھے بازار لے چلے، وہ چابیاں لے کر چلا گیا تو چوکیدار نے مجھے ماہ مہر کے والد کی آمد کا بتایا۔ میں نے ان کی آمد

پر حیران ہوتے ہوئے چوکیدار سے انہیں اندر بلانے کو کہا کیونکہ آج وزیٹر ڈے نہیں تھا سوان کا آنا نہیں بنتا تھا۔ خیر انہوں نے بتایا کہ ''ماہ مہر کے بھائی کی شادی طے پا گئی ہے وہ اسے لینے کے لیے آئے ہیں۔''
میں نے انہیں ماہ مہر کے آج کل ہونے والے امتحانات کے متعلق بتایا کہ آج کل تو وہ ان میں مصروف ہے۔ ہاں دو تین دن میں امتحان ختم ہونے کے بعد وہ اسے لے جاسکتے ہیں ابھی صرف انہیں ماہ مہر سے ملاقات کی اجازت دے دی تو وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ایک ساتھ تین دن بعد ہی وہ آکر اسے لے جائیں گے ابھی وہ شہر آئے ہیں تو ایک آدھ ضروری کام نبٹاتے ہوئے جائیں گے۔
تین دن بعد میری طبیعت ذرا ست تھی تو میں نے اپنی اسسٹنٹ مس نگہت کو فون کیا کہ وہ ویک اینڈ پر جانے والی بچیوں کو لیو کارڈ دے کر ان کے رشتے داروں کے ساتھ اپنی نگرانی میں بھیج دیں۔
موسم بدل رہا تھا۔ سردیاں عروج پر تھیں۔ دن بہت چھوٹے ہوگئے تھے، میں اپنے آفس میں اپنے روٹین ورک میں مصروف تھی کہ سیکنڈ ائیر کی ایک لڑکی اسما ایک اور لڑکی کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے بے حد سردی لگ رہی ہے۔ میں نے اس کو گرم دودھ منگوا کر اسے پلوایا۔ کالج سے ایک ملازمہ کو بلوا کر ایک ہیڈ گرل کے ساتھ اسما کو نزدیکی ڈسپنسری بھیجا۔ وہ دوائی لے کر واپس آگئیں تو میں نے ہیڈ گرل کو اس کے روم میں چھوڑنے اور جب تک اس کی روم میٹس واپس نہ آئیں اسے وہیں رہنے کو کہا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ہیڈ گرل واپس آئی اور اس نے آکر ایک عجیب بات بتائی کہ اسما کے کمرے کے سامنے جب وہ اور اسما پہنچیں تو جونہی دروازے کے پاس نزدیک ہوئیں انہیں اندر سے ہلکی سرگوشیاں سنائی دیں حیرت کی بات یہ تھی کہ انہیں اندر سے ایک مرد کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ ہیڈ گرل، اسما کو وہیں دھوپ میں چھوڑ کر واپس تیزی سے میرے پاس آئی تھی۔ میں نے چوکیدار، مس نگہت اور کالج کی پرنسپل کو فون کر کے جلد آنے کو کہا اور ان سب کو لے کر جب روم نمبر بارہ تک پہنچی تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ جن چار لڑکیوں کو وہ روم الاٹ کیا گیا تھا ان میں ماہ مہر بھی شامل تھی، ہم سب.... بے حد خاموش سے کھڑے تھے آخر میں نے ہی ہمت کی اور آٹو میٹک لاک میں روم نمبر کی چابی گھمائی اور جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ دو نفوس جو تیزی سے ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حیرت اور صدمے سے میری حالت بے حد بری ہوگئی۔ ماہ مہر کو تو پرنسپل صاحبہ نے پکڑ کر پیٹنا شروع کردیا اور کامران اس کی وہی حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... مجھے مس نگہت پتا نہیں کیسے پکڑ کر آفس تک لائیں۔
کتنی دیر میرے حواس گم رہے، ذرا حالت سنبھلی تو آفس میں ایک طرف ماہ مہر اور کامران سر جھکائے کھڑے نظر آئے۔ پرنسپل صاحبہ نے مجھے ہاتھ سے سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور بتایا کہ انہوں نے فون کر کے ماہ مہر کے والد کو فوراً یہاں پہنچنے کے لیے کہا ہے۔ وہ وہاں سے روانہ ہوگئے ہیں۔ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔
''میں ایسی لڑکی کو یہاں مزید برداشت کرنے کے حق میں نہیں ہوں جو ہاسٹل اور کالج کے ماحول کو خراب کرے اور لڑکیاں اسے دیکھ کر مزید بگڑیں۔'' اسی اثنا میں، میں نے ماہ مہر کے والد کو ان کی شکل سے ملتے جلتے ایک اور شخص کے ہمراہ داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دونوں سخت پریشانی میں تھے۔ اور آتے ہی دریافت کیا۔
''ہماری دھی رانی تو خیریت سے ہے؟'' ان کے اس سوال پر پرنسپل صاحبہ نے طنزیہ نظروں سے ماہ مہر کو دیکھا اور مختصراً سارا قصہ بیان کیا جسے سن کر دونوں اشخاص کے چہرے پہلے سرخ اور پھر سفید پڑ گئے.... ماہ مہر کے والد کی نظریں اور سر جھک گیا جبکہ دوسرے اس کے چچا جو اس کے ہونے والے سسر بھی تھے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''میڈم صاحبہ! آج سے یہ لڑکی ہمارے لیے مر

گئی۔ ہم اسے لے بھی گئے تو پنچایت میں اسے مارنے کا فیصلہ ہوگا۔ ہم وہاں یہی جا کر کہیں گے کہ ماہ مہر کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا جس میں وہ مر گئی‘ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ سفر میں لے جایا جاتا سو اسے وہیں دفن کر آئے۔‘‘ اس دوران ماہ مہر دوڑ کر باپ کے سامنے آئی اور زور، زور سے روتے ہوئے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

’’بابا جان، بابا جان! مجھے معاف کر دیں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں بھٹک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے بھٹک گئی تھی لیکن آپ کی قسم میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔‘‘

’’دفع ہو جاؤ آوارہ اور بے حیا لڑکی! مت کہو اس کو بابا جان...... تمہارا بابا اسی وقت مر گیا جب تمہارے کرتوت سنے۔‘‘ اس کے چچا نے اسے بازو سے پکڑ کر دور ہٹایا۔ جبکہ اس کے بابا دکھ اور اذیت سے کبھی روتی بلکتی ماہ مہر کو دیکھتے تو کبھی چہرے پر پتھر لیے تاثرات سجائے اپنے بھائی کو۔

’’سنیے بھائی صاحب....‘‘ آخر میں نے مداخلت کی۔

’’ماہ مہر آپ کی جوان جہان بچی ہے۔ ایسا کہہ کر کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ کس طرح اس کے وجود سے مکر سکتے ہیں۔ ہم اسے یہاں ہاسٹل اور کالج میں بھی نہیں رکھ سکتے، آپ کو اسے ساتھ ہی لے جانا ہوگا۔ اس سے غلطی ہوئی ہے اور وہ اس پر شرمندہ بھی ہے۔‘‘

’’نہیں! سردار اگر اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا تو اسے اپنا پورا گاؤں، رشتے دار، سرداری سب کچھ چھوڑنا ہوگا، اس کا اب ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم ایسی بے حیا لڑکی کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتے۔ ہماری طرف سے یہ مر گئی ہے، آپ اسے بے شک کسی دارالامان میں بھیجیں یا جہاں کہیں بھی...... ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس کے چچا نے سردار کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف جانے کے لیے کھینچا۔

سنیے جتنی قصور وار یہ ہے اتنا ہی ہمارا ملازم بھی ہے میں کامران کو حکم دیتی ہوں کہ وہ ابھی کے ابھی ماہ مہر

...سے نکاح کرے یا پھر اسے بھی استعفیٰ دے کر ہمارا ادارہ چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ ساتھ ہی اس سے یہ ساری مراعات بھی چھین لی جائیں گی جو ادارے کی طرف سے اسے ملی ہیں۔''

''نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں شادی شدہ اور بال بچوں دار آدمی ہوں۔'' وہ ایک بھڑک کر بولا۔

''بکواس مت کرو...... جب ایک معصوم لڑکی کو ورغلایا تھا تو اس وقت تمہیں بال بچے دار ہونے کا احساس نہیں تھا۔ مسز خان آپ نکاح کے انتظامات کرائیں، میں کسی طرح اس کے والد اور چچا کو روکنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اس کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے کر جائیں اور تا زندگی ان کے دل میں یہ خلش نہ رہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کو لاوارث چھوڑ دیا تھا۔ اگر یہ رسوم ورواج اور خاندانی و معاشرتی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو سردار ایک باپ بھی ہے۔'' میں نے ممنون نظروں سے پرنسپل صاحبہ کی طرف دیکھا۔

بعد کے مراحل تیزی سے طے ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ کامران نے نکاح میں بہت آنا کانی کرنے کی کوشش کی۔ آدھے گھنٹے میں نکاح کے سارے انتظامات ہوگئے تھے۔ اسی دوران ماہ مہر مسلسل روتی رہی۔ روتے، روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کیا غلطی ہوگئی۔ وہ بار، بار اپنے باپ، چچا کے آگے ہاتھ جوڑ، جوڑ کر معافی مانگتی رہی کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے چلیں وہ اس شخص سے شادی نہیں کرنا چاہتی، وقتی طور پر شیطان کے بہکاوے میں آگئی تھی لیکن اس کی التجائیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نکاح کے فوراً بعد اس کے چچا نے اس کے باپ کو زبردستی اٹھایا۔ جس نے جاتے، جاتے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں آنسو چھپاتے ہوئے تیزی سے باہر نکلتے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ماہ مہر بے ہوش ہوگئی۔ اس کے بعد کی ایک لمبی داستان ہے۔ کامران جب ماہ مہر کو گھر لے گیا تو ان کے گھر گویا قیامت ٹوٹ پڑی، اس کی ماں اپنے بیٹے کا قصور ماننے کو تیار ہی نہیں تھی اسے تو سراسر یہی لڑکی چنڈال، آوارہ اور چھچل پیری نظر آرہی تھی۔ جس نے اداؤں کے نہ جانے کون سے تیر چلا کر اس کے بیٹے کو قابو میں کرلیا تھا۔ وہ تو لڑنے مرنے کے لیے مجھ تک آئیں لیکن جب بیٹے کی نوکری چلے جانے کا احساس ہوا تو ظلم وستم کی حد ماہ مہر پر ختم کردی...... اس کے اس کام میں اس کی بھانجی یعنی کامران کی بیوی بھی شریک تھی۔ دن رات گالیوں، کوسنوں اور مار پیٹ سے کام لیا جاتا۔ سارا دن کولہو کے بیل کے مانند وہ جتی رہتی۔ کامران کے بچے الگ اسے ذلیل کرتے، ان کا کوارٹر چونکہ میری رہائش گاہ کے پاس ہی تھا۔ ان کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس کی ماں کو ایک دن اس کے ظلم کا احساس دلانا چاہا تو بولی۔

''جاؤ بی بی! اتنا بڑا ظلم جو تم نے ہمارے اوپر کردیا اس ظلم سے تو کم ہی ظلم ہے یہ۔'' کامران سے کہا تو اس نے بھی لاچاری ظاہر کی یوں شیطان کے دکھائے گئے راستے پر جہاں مرد اور عورت ساتھ چلنا شروع کرتے ہیں، مشکل پڑنے پر مرد تو ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف کھڑا ہوجاتا ہے جبکہ عورت مرتے دم تک اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرتی رہتی ہے۔ اور نہ جانے کفارہ ادا ہو بھی پاتا ہے یا نہیں۔ ماہ مہر کے گھر والوں نے اسے واقعی مرا ہوا تصور کرلیا تھا وہاں سے پھر کوئی نہیں آیا تھا یوں وہ ماہ مہر جو اپنے بابا کی لاڈلی تھی، اپنی خواہش زبردستی منوا کر کچھ خواب سجا کر شہر آئی تھی، اس نے اپنے سارے خواب رہن رکھ چھوڑے تھے۔ ایک چھوٹی سی غلطی اور وقتی کشش کے تحت...... مجھے نہیں پتا کہ کامران اور ماہ مہر کے ان تعلقات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ میں نے اپنے ہاسٹل کی بچیوں کے حوالے سے کچھ مزید سخت اصول وضوابط مقرر کردیے تھے۔ اب وقتاً فوقتاً انہیں چادر، چار دیواری، عزت وناموس کے درس دیتی رہتی ہوں تاکہ کسی اور لڑکی کو ماہ مہر بننے سے بچا سکوں۔

ناولٹ

فصلِ محبت

رفاقت جاوید



"اُف الوینا تم تو حد ہی کرتی ہو...... یہ جو گھر ہے ناں اسے عورت ہی جنت بناتی ہے۔ مرد کا پیار اور توجہ اِک عام سی عورت کو بھی حور بنا دیتا ہے۔" اس کی بڑی بہن یسریٰ نے پیشانی پر ناگواری سے ہاتھ مار کر کہا۔ "خدا کے لیے یہ ناجائز ڈیمانڈ چھوڑ دو۔"

"کیوں چھوڑ دوں؟ میں قربانی کا بکرا نہیں ہوں۔" الوینا تنک کر بولی۔

"اور میرے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟" وہ جزبز ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپا، تم تو قربانی کا خوب پلا ہوا بکرا ہو جس کی سال میں ایک بار قربانی نہیں دی جاتی بلکہ دن میں بار، بار دی جاتی ہے۔ پھر بھی اس تنومند بکرے کے گوشت میں کمی نہیں آتی۔" الوینا تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

"الوینا تم ہنستی ہوئی کتنی خوب صورت لگتی ہو...... منہ پھلائے تو کسی چڑیل سے کم نہیں لگتیں۔ بیچارہ میرا آدم بھائی تو ایک فرشتہ ہے۔ نہ جانے تمہارے ساتھ گزارہ کیسے کر رہا ہے۔" وہ بھی مذاقاً بولی۔

"آپ سب لوگ میرے دکھ اور درد کو

نہیں سمجھیں گے۔ آدم بھی تو ہر وقت یہی کہتا رہتا ہے کہ میری وینا کی مسکراہٹ مونالیزا کی مسکراہٹ سے زیادہ نمبر لے گئی۔ لیکن وہ بدتمیز یہ نہیں سوچتا کہ میری زندگی کو جہنم رسید کرنے والا۔ صرف اور صرف وہی تو ہے، میں سینے پر پتھر کی سل رکھ کر منافقت نہیں کر سکتی۔ آدم اپنے مطلب کی خاطر میری خوشامد بس کرتا ہے اکیلے میں...... کبھی ماں، بہنوں کے سامنے تو کر کے دکھائے...... تب ہی اسے مکمل مرد سمجھوں گی...... ان کے سامنے بھیگی بلی اور مجھے شیر کی کھا جانے والی آنکھ سے دیکھتا ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''بھئی تمہیں ان کے سامنے برا بھلا تو نہیں کہتا ناں، تمہاری بیہودہ حرکتوں کو برداشت کر لینا اور ان کے سامنے تمہاری عزت رکھ لینا ایک شوہر کے لیے خاصا صبر آزما کام ہے۔'' انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''آپا...... بس میں نے کہہ دیا ناں کہ میں یسریٰ نہیں بن سکتی...... میں الوینا ہوں اور اسی نام سے پہچانی جاؤں گی۔ تم کیا ہو......؟ تمہارا تو نام و نشان ہی مٹا دیا ہے بھائی جان نے، یہ بتاؤ کہ تمہاری تعلیم کا تمہیں تو رتی بھر فائدہ نہیں ہوا...... تمہیں دیکھ کر اور تمہاری باتیں اور نصیحتیں سن کر دادی کے زمانے کی کہانیاں یاد آنے لگتی ہیں۔ گھسی پٹی اور بیہودہ قسم کی۔'' الوینا بھونیں چڑھا کر بولی۔

''مثلاً کیسی کہانیاں؟ دادی اماں تو کہانی میں ہماری تربیت کی خاطر کیسے، کیسے شوخ و شنگ رنگ بھر دیا کرتی تھیں۔ جنہیں میں آج تک نہیں بھولی بلکہ میں نے شادی کے بعد وہی رنگ اپنی ازدواجی زندگی میں بھر کر اپنی زندگی کو قابلِ فخر بنا لیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''او مائی گاڈ...... تمہیں اپنی زندگی پر فخر ہے...... میں تو ایسی زندگی پر لاکھوں بار لعنت بھیجتی ہوں۔'' الوینا طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

''اور میں اپنی اس زندگی پر لاکھوں بار دعا و سلام بھیجتی ہوں۔'' یسریٰ نے بے ساختگی سے کہا۔

''او کے...... تو مجھ پر ایک مہربانی کرو...... آج کے بعد مجھے نصیحتیں اور فضیحتیں دینا بند کر دو۔ جب تم..... زمانۂ قدیم کی ایک جاہل اور نادان عورت ہو جس نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا تو پھر تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تم رشتے میں میری بڑی بہن ہو...... بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔'' الوینا خفگی سے بولی۔

''اگر میں تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں تو پھر میں تمہاری دوست بھی ہوں، ہمراز اور ہمدرد بھی ہوں...... لیکن اس وقت جانی دشمن ہوں؟ تمہیں حقیقت سے روشناس کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ جس سے میں ہرگز باز نہیں آؤں گی۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے یار......'' یسریٰ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''تو پھر آپا، تم بیٹیوں پر احسان عظیم کر دو۔ آج سے ہی اپنے بیٹیوں کو اپنی ساس کے حوالے کر دو...... دنیا جہاں کی فضول اور پارینہ کہانیاں سنا کر انہیں تمہارے جیسی الوینا بنانے میں خوب کامیاب رہیں گی۔ تم بھی خوش اور تمہاری بیٹیاں بھی ایک سود مند تربیت حاصل کر لیں گی پرائے گھر جانے کے لیے انہیں پیس پیس کر تیار کرو۔ اور وہ بڑھیا اسی کامیابی پر اتراتی پھرے گی کہ دیکھا میری تربیت کا کمال کہ پوتیاں سسرال میں ایسے بن گئیں جیسے آنکھ میں سرمہ......''

''خبردار جو میری آنٹی کو بڑھیا کہا...... تعلیم نے تمہیں یہ درس سکھایا ہے کہ بڑوں کی عزت و احترام کرنے سے تمہیں سبکی ہوتی ہے...... ان سے پیار و شفقت سے پیش آنے سے تم چھوٹی ہو جاتی ہو...... الوینا میں تم وارننگ دے رہی ہوں۔ اگر تم نے ایسا نامناسب رویہ اپنی سسرال میں روا رکھا تو بہت پچھتاؤ گی۔'' وہ فکر مند لہجے میں بولی۔

''کیا ہو جائے گا مجھے...... مر جاؤں گی؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''مرنا تو بہتر رہتا ہے میری بہن، تم جس زندگی کی طرف جا رہی ہو موت اس سے بہتر ہے۔ تم یہ مت بھولو کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس کی کچھ قدریں ہیں، قانون اور اصول ہیں۔ تم نہ جانے کس پلینٹ کی باسی ہو۔ اور کن خوش فہمیوں میں رہتی ہو۔'' اس

نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اوہو...... بچے اسکول میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارے آفس سے ہوتی جاؤں...... لیکن آج مجھے یہ سمجھ آگئی ہے کہ تم سے دماغ کھپائی کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔''

''بالکل درست سوچا ہے میری آپا نے...... آپا تم بچوں کی آیا، شوہر کی باندی اور لونڈی کے سوا کیا ہو...... کچھ بھی تو نہیں...... کوئی حیثیت نہیں ہے تمہاری...... آج میری نصیحت کان کھول کر سن لو...... آج گھر جاتے ہی تمام ڈگریوں اور گولڈ میڈلز کو لان کے درمیان رکھ کر آگ لگا دینا۔ تا کہ اڑوس پڑوس بھی تمہاری اس عقلمندی پر مدح سرائی کر سکیں۔'' وہ طنزیہ قہقہہ لگا کر بولی۔ تو یسریٰ سر ہلاتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور الوینا پر تاسف سے بھرپور نظر ڈال کر بڑبڑاتی ہوئی آفس کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

الوینا فائلوں میں الجھی ہوئی تھی۔ آفس بوائے کافی کا مگ آدھے گھنٹے پہلے اس کے سامنے رکھ کر جا چکا تھا۔ لیکن اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ کام میں ہر وقت مصروف رہنے کے باوجود باس کی ڈانٹ ڈپٹ نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ اسی پریشانی اور بار، بار باس کے طلب کرنے اور اس کے ہر کام میں نقص نکالنے کے بعد فائل اس کے منہ پر دے مارنے کا مقصد وہ بخوبی جانتی تھی...... کیونکہ یہ نیا باس کچھ وکھری ہی طبیعت کا مالک تھا۔ خواتین سے دبا کر کام لینا اور پھر بھی خوش نہ ہونا بلکہ لعن طعن سے نوازنا اس کا وتیرہ تھا۔ یک دم بیل کی آواز پر وہ چونکی...... اور اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے فائل کو میز سے اٹھایا اور باس کے آفس میں چلی گئی۔

''بی بی گھر جاؤ، چولھا جھونکو، بچے پالو، یہ ہے تمہارا رول...... یہاں جھک مارنے آئی ہو......'' وہ فائل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے۔

''سر اسے پڑھ تو لیجیے۔'' وہ منمنائی۔

وہ شہادت کی انگلی سے کان کو کھجلاتے ہوئے اسے غور سے دیکھنے لگا۔ الوینا نے اس کی اس بیہودہ حرکت پر نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

''بی بی! میں پہلے دن ہی پہلی نظر میں کام چور لوگوں کو پہچان جاتا ہوں۔'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ''میری بات پر غور ضرور کرنا، سمجھ دار ملازم خاتون بہت جلد اپنے باس کے تیور جان جاتی ہے۔ میں اس آفس میں دو مہینے سے ہوں...... مجھے بہت ساری عقلمند دور اندیش لڑکیوں نے پہچان لیا ہے۔ جو بوقتِ ضرورت خطرے کی بُو کو سونگھنے کی قوت رکھتا ہو...... وہ تو ہوا کامیاب اور جو تمہارے جیسی نابلد اور انا پرست ہو وہ آفس کا کام کیا خاک کرے گی، سنو ہم انسانوں سے ہی تو سبق سیکھتے ہیں۔ عقلِ کُل تو کوئی بھی نہیں ہوتا...... بلکہ ہم ایک دوسرے سے بہت جلد زندگی کو کامیاب بنانے کے گر سیکھ سکتے ہیں۔ جیسے تم مجھ سے...... اگرچہ تمہارے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو جب ایک مرد باس کے ماتحت نوکری کرنی مجبوری ہے تو پھر انا، غیرت اور خودداری کیسی......؟ اس کی لو کو ذرا مدھم رکھو...... اس لیے کہ یہاں پہلے کام دیکھا جاتا ہے۔'' وہ اسے اچھی خاصی سرزنش کر چکا تھا۔

''جی سر...... میں دوبارہ فائل کو دیکھ لیتی ہوں۔ میں نے اس میں ایک غلطی بھی نہیں چھوڑی......'' وہ احتیاط سے ایسے لفظ چن رہی تھی۔ جیسے کانچ کے باریک ذرے جن سے معمولی سی بے احتیاطی بھی برتی تو ہاتھ لہولہان ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

''بہت عجیب لڑکی ہو...... شادی شدہ ہونے کے باوجود ناتجربہ کار، میں بات مشرق کی کر رہا ہوں تم مغرب کی طرف رواں دواں ہو۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم شوہر کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہو۔ یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں میری باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔''

وہ عجب مکروہ مسکراہٹ سے بولا اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

''یہ حجاب قید نہیں کہ بات کرنا تک گوارا نہیں۔ حجاب تو آزادی ہے عورت کی...... کیونکہ عزت و کروفر

اور پہچان بتا دیتا ہے۔ جس عورت پر اس کی مہر ثبت ہو جاتی ہے نامحرم اس کے سائے سے بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔"

"سر آپ نے مجھے سمجھنے اور پرکھنے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔" وہ اپنی آشفتہ ہمت کو بحال کرتے ہوئے بولی۔

باس نے اچنبھے سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا......اسے نتیجے تک پہنچنے میں ذرا سی دیر نہ لگی تھی۔

"تم سچ کہتی ہو۔" وہ ایک دم سے کندھے اچکا کر بولا۔ "میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے، تم کہاں سے آئی ہو، کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنا چاہتی ہو، کچھ تو فیصلہ کیا ہوگا اس فیلڈ میں قدم رکھتے ہوئے۔" وہ زہر آگیں لہجے میں بولا۔ "حجابی عورتوں کا نامحرم مردوں میں کیا کام؟ جاؤ اپنا رستہ ناپو......" وہ جواب بالصواب سے قاصر اس کھسکے ہوئے باس کی طرف دیکھنے لگی۔ جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تو ضرور تھی۔

وہ بری طرح (ریزہ ریزہ ہونا) disintegration کے جان لیوا عذاب میں گرفتار ہوتی آفس سے باہر نکل گئی۔

"یہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ یہ نہیں جانتی کہ ہمارے ساتھ کام کرتے وقت ایک گولڈن رول کو......مدِنظر نہ رکھیں تو نوکری سے چھٹی...... acceptance میں ہی تمہاری کامیابی ہے۔ بے وقوف عورت سمجھ جاؤ کہ یہ نوکریاں کیسے کی جاتی ہیں۔ ترقی کیسے ممکن ہے؟" وہ اس کے ردِعمل پر گویا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

☆☆☆

آج نرم و گداز بستر کس قدر سخت محسوس ہو رہا ہے جیسے پتھر کی چٹان کے اوپر کانٹوں کی چادر...... یہ بے وجہ نہیں...... ایسے ہی تو نیندیں نہیں اڑتیں آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ اپنی سانس روکتی اور پھر اسے کمرے کے اندھیرے میں تحلیل کرنے لگتی۔

"لوگ مجھے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ میں بے حد مطمئن عورت ہوں، ہر وقت ہنستی مسکراتی نظر آتی ہوں۔ لوگو! درحقیقت، ایسا نہیں ہے۔ جب محبت غیر مستحکم اور بے یقینی کے عالم میں گرفتار ہو جائے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور لبوں پر خون میں لبریز مسکان بکھری رہتی ہے۔ ظاہر اور باطن کے تصادم کا شور شرابا کسی کی سماعتوں تک نہیں پہنچتا......یہی تو خوش قسمتی ہے میری کہ کسی کو میرے اصل حالات کی خبر نہیں۔" وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے نکلی اور لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ تاریکی میں اس کے من کی مشعل روشن ہوئی......اور ذہن میں ماضی کے نقوش ابھرنے لگے۔

☆☆☆

آدم کے غیر متوقع سوال پر وہ چونکی اور اسے حیرت سے دیکھنے لگی......تو وہ گویا ہوا۔

"سچ کہوں گا۔ اس رب کی قسم سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ I love you, I love you"

"گھسا پٹا اظہار...... بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کوئی نئی بات کرو...... کسی نئے انداز سے۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

"اوکے تو سنو...... ذرا غور کرنا میری سچائی پر کہ جب میں نے تمہیں یونیورسٹی میں پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کے اندر کسی نے ایک بیج پھینک دیا ہے......اور ذہن ماؤف ہونے لگا ہے۔ سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔" وہ سرشار انداز میں بولا۔

"گڈ ون...... پھر اس کے بعد کیا ہوا؟" وہ پُراشتیاق لہجے میں بولی۔

"پھر دل کی نرم ملائم زمین میں بیج کھبتا چلا گیا اور پھر بہت جلد اگلے ہی لمحے میرے وجود کی حرارت اور گرمائش سے بیج سے ننھی منی کونپل نے ذرا سا سر نکالا...... کیونکہ جب زمین میں کاشت کی جاتی ہے تو پھر پانی کے ساتھ روشنی، ہوا اور دھوپ کی اشد ضرورت ہوتی ہے ناں...... جو بیج دل کی زمین پر گرتا ہے۔ اسے

جسم کی حرارت اور مثبت سوچ کی بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمجھیں کہ نہیں۔''

''نہیں سمجھی' ارے بھائی...... کاشتکاری کس فصل کی...... گندم یا چاول کی یا کسی اور اناج کی۔ کھل کر بتاؤ...... پہیلیاں بوجھنے سے مجھے بہت نفرت ہے۔''

''لو سنو...... کاشتکاری، فصلِ محبت کی...... جب محبت کی فصل تیار ہو جاتی ہے ناں تو روح کو طمانیت مل جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی بتائے دیتا ہوں...... کہ اس کی جڑیں کتنی گہری ہوی ہیں اس کا تمہیں اندازہ ہے کہ نہیں سچ، سچ بتانا۔'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

''نہیں جانتی بابا......'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''میں بتاتا ہوں۔ الوینا بیگم، گندم اور چاول کی فصل کی جڑیں مضبوط اور گہری نہیں ہوتیں۔ فصل اٹھتے ہی کسان ہل چلا دیتا ہے۔ اور جڑوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے مگر فصلِ محبت کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ کاٹو تو پھر سے کونپل پھوٹ پڑتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اِک تناور درخت بن جاتا ہے جس پر خوشبو دار پھول کھلتے ہیں اور خوش ذائقہ پھل بھی...... اور جب ہم اس سرسبز سایہ دار تناور درخت کے نیچے ستانے بیٹھتے ہیں تو پھر دو دل خوشبوؤں میں نہا جاتے ہیں۔'' وہ اس کی خوب صورت نشیلی آنکھوں میں گم ہوتے ہوئے بولا۔

''فصلِ محبت کے پھولوں کی مہک کا کیا کہنا؟''

''اوکے یہ ہے فصلِ محبت...... یعنی اِک تناور درخت کا نام ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ بھئی ہمارے لان میں ایسے تناور درختوں کی کمی نہیں۔'' وہ چھیڑنے کے انداز میں بولی۔ ''کسی دن تشریف لانا...... دونوں ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر لطف اندوز ہوں گے۔''

''ہاں...... وہ لوگ بہت خوش بخت ہوتے ہیں جنہیں اس درخت کے نیچے ستانے کا موقع مل جاتا ہے۔'' وہ کیفے ٹیریا میں کرسی اس کے قریب گھسیٹتے ہوئے پُرامید لہجے میں بولا۔ تو الوینا نے اپنی کرسی اس سے دور کرتے ہوئے کہا۔

''بات ہو رہی تھی کاشتکاری کی، فصلِ محبت کی اور تم کس لیے کچھ زیادہ ہی فری ہو رہے ہو...... ذرا درخت کو تناور تو ہونے کا موقع دو۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی...... اور موبائل پر نظریں جھکا دیں۔ میسج کرتے ہوئے اس نے کافی کا آرڈر دیا پھر اس کی طرف دیکھ کر ہنس دی۔

''اتنی آسانی سے درخت کا سایہ نصیب نہیں ہوتا۔ ذرا اس کی پرداخت کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بعض باتیں اشاروں کنائیوں میں کی جاتی ہیں لیکن حقیقت کچھ اس انداز سے وارد ہوتی نظر آتی ہے کہ یقین کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔''

''تم نے سو فیصدی سچ بولا ہے۔ لیکن اب ذرا دلچسپی سے سنو...... سو فیصدی سچ کہنے جا رہا ہوں...... تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔ اور ڈگری کے ساتھ ہی شادی کی ڈگری بھی حاصل کرنے کا پروگرام خاصا روشن ہے۔ بس صرف دیر ہے بیج پھینکنے والی ہستی کی رضامندی کی۔ پھر دونوں کا فیصلہ امی کے گوش گزار اجائے گا......'' الوینا کے چہرے کا رنگ ذرا کی ذرا بدلا لیکن سنبھل گئی۔

''شادی کا پروگرام گاڑی خریدنے کے مترادف لگ رہا ہے جیسے شوروم جا کر گاڑی کو ٹھوک بجا کر دیکھا...... رنگ اور ماڈل پر لمحے بھر کو سوچا...... اور ماڈل کی ساکھ اور مقبولیت پر بھروسا کرتے ہوئے اس میں سواری کر لی؟''

''تم نہیں سمجھوگی...... میں جب سے اس یونیورسٹی مین آیا ہوں تب سے دل میں اِک دیرینہ خواہش پھڑ کنے لگی ہے کہ تمہاری ہمراہی میں ورلڈ ٹور پر نکل جاؤں...... ایسی بے انت چاہ...... اوہ مائی گاڈ...... اب یہ بتاؤ کہ اپنی سچی، وکھری محبت کو اور کس نئے انداز میں پیش کروں...... لفظوں کو تو خوب چنا ہے میں نے...... یہ تو مان جاؤ ناں......''

''نیا انداز تھوڑا بہت دل کو بھا ہی گیا ہے۔'' وہ پھر مذاقاً بولی۔

''لیکن لفظوں سے بیج کی پرداخت کیسے ممکن ہے؟''

''الوینا آئی ایم سیریس...... اور تم ہو کہ اس فصلِ

محبت کے بیج کو میرے دل سے کھرچ کر نکالنے کے درپے ہو...... وری بیڈ......کبھی تو سنجیدگی سے بات سن لیا کرو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "ہر بار اس اہم موضوع کو مذاق میں اڑا دیتی ہو۔"

"ایسی بات نہیں دراصل آج کل محبتیں اور چاہتیں دل کی زمین میں نہیں اگتیں۔ تم کس دور کی بات کرتے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کوئی نئی بات کرو نئے زمانے کی۔"

"تو تم تھوڑی وضاحت کردو...... ذرا میں بھی تو سنوں......" وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں بیرے نے کافی کے دو کپ اور دو عدد پیسٹری ان کے سامنے رکھ دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کپ اٹھا کر سوچتے ہوئے ایک چسکی لی۔

"مجھے پارینہ قواعد وضوابط پر قطعاً یقین نہیں...... کیونکہ آج کے ماڈرن دور میں عورت نے خود کو بدلا تو زمانہ بدل گیا۔ اس کریڈٹ سے مرد تو فارغ ٹھہرے۔"

"اب ہیر رانجھا والی سسکتی تڑپتی ناکام محبت کرنا تو ہے ہی بے وقوفی اور جہالت......" وہ فخریہ انداز میں بولی۔

"اوہو میں ہار مانتا ہوں...... ناممکن، حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ تمہاری طرزِ سوچ ہے۔ تمہارا رویّہ اور سلوک ہے۔ محبت کو ممکن بنانا بھی تمہارے اختیار میں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اور ناممکن بنانا بھی تمہارے لیے قطعاً مشکل نہیں۔"

"منطقی باتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اور سیدھی باتیں تمہیں دقیانوسی لگتی ہیں۔ نیا اندازِ بیاں منطقی لگتا ہے، کچھ سمجھا نہیں۔" وہ جز بز ہو کر بولا...... "بہت مشکل پسند لڑکی ہو۔"

"میں نے آج کی نوجوان نسل کو بھی پرانے دور کی پزیرائی اور مدح سرائی میں زمین، آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہے۔ میرے اپنے خاندان میں بھی ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں اور سب سے بڑھ کر میری اپنی آپا...... وہ تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ ہر وقت میرا موبائل چیک کرتی رہتی ہیں۔ جب موقع ملتا ہے آئی پیڈ پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ جبکہ وہ جانتی ہیں کہ میں محبت کے گھن چکر میں پھنسنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ انہوں نے خود تو اپنے کزن سے ہنستے مسکراتے شادی رچالی...... نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔ اور تین بچے بھی پیدا کر دیے...... اور اب شوہر کی ہاتھ بندھی غلام بننے پر فخر سے تنی رہتی ہیں۔ تمام آزمائشیں میرے لیے کھڑی کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ گھر والے مجھے انقلابی کہہ کر ہر وقت میرا دماغ کھاتے رہتے ہیں۔" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔ "وہ اس حد تک فرمانبردار...... اور میں پرلے درجے کی انصاف پسند لڑکی...... انقلابی ہی تو ہوئی ناں......"

"اس میں فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں جو سامنے ہے اس کے بارے میں سوچو اور جلد از جلد فیصلہ کرو...... آخر نئے دور کی نمائندگی کرنے میں ہمیشہ پیش، پیش رہتی ہو۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"خواہ مخواہ تم نے اپنی زندگی میں مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔ ایک تابعدار بیٹی ہو کر سچی محبت کرنے والے کی زبان پر یقین کرو اور اپنا گھر بسا لو...... جیسے سب بساتی ہیں ویسے...... اگر اجازت دو تو کل ممی کو تمہارے گھر بھیج دوں؟ یونیورسٹی بھی تو ہمیں نکالنے پر تلی ہوئی ہے۔ نوکری ہماری منتظر ہے اور اس کے بعد کا قدم ہے، شادی خانہ آبادی...... ڈھول باجے، مہندی، مایوں، رخصتی، ولیمہ، ہنی مون، آہا مزے کے دن آنے والے ہیں۔"

"وہی پرانے رسم ورواج کہ لڑکی دیکھنے لوگ آرہے ہیں بن سنور کر نمائش کے لیے تیار ہو جاؤ...... یہ سب ڈراما میرے ساتھ نہیں ہوگا...... تم سن لو......" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کس طریقے سے حاصل کیا جائے۔" وہ پیسٹری کھاتے ہوئے بولا۔

''شادی تو ہوگی نہایت سادگی سے نہ اعلیٰ ملبوسات، نہ قیمتی جیولری، نہ جوتے، پرس لاکھوں کے۔ مسجد میں نقد حق مہر پر نکاح، براتیوں کو شربت کا گلاس اور ایک کھجور دیٹس اِٹ...... بیہودہ رسم ورواج کو خیر باد اور اسلامی قانون کے مطابق نئی زندگی کا جہاں آغاز ہو، شادی وہاں ہی کروں گی۔ یہ محبت وغیرہ سب بکواس شے ہے۔ میں اس بے وقوفانہ عمل پر قطعاً بھروسا نہیں کرتی۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی...... تو وہ خاموش ہوگیا......اور کافی پیتے ہوئے اس نے خاصا وقت لگادیا جو لڑکی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے وہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام ہی رہتی ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ اسے سوچ کی گہرائی میں دیکھ کر بڑی اپنائیت سے بولی تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''الوینا آئی لو یو...... لیکن تمہارے خیالات سے مجھے اتفاق نہیں۔ میرا اور تمہارا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ اپنا گھر اور کچھ نہ کچھ شہری پراپرٹی بھی ہے۔ گزر اوقات اللہ کے فضل سے بہترین ہے۔ یہ ہماری کلاس ہی تو ہے جو اپنے کلچر کو قائم رکھنے میں کمال کا کردار ادا کرتی ہے۔'' وہ فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

''میری یہ بات اپنے پلے خوب کس کر باندھ لو الوینا۔ تمہارے اس رویے اور خیالات سے کوئی بھی ایگری نہیں کرے گا۔''

''نہ کرے...... میں کون سا کسی کی منت سماجت کرنے جارہی ہوں، تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ قرآن کریم میں کلاس کی تفریق نہیں کی گئی۔ عورت کے بے تحاشا حقوق کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ عورت مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہو، لوئر کلاس سے یا اپر کلاس سے...... عورت کے حقوق برابر ہیں۔ پہلے سورۂ نسا اور سورۂ نور پڑھو۔ اس کے معنی اور ان کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرو پھر محبت کا اظہار کرنا...... اور شادی کا فیصلہ کرنا...... ایک تو پاکستانی مرد کو حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کی رتی بھر شد بد نہیں

غزل

مشکل پڑی تو لوگ بھی سارے جدا ہوئے
آنکھوں سے اس لیے بھی ستارے جدا ہوئے
غربت جو میرے آنگن میں آکر ٹھہر گئی
مشکل گھڑی میں ہم سے ہمارے جدا ہوئے
تم کو بھی زخم شاید ہماری طرح لگے
تم پہ بھی وقت آیا تمہارے جدا ہوئے
دریا کے پار ہم بھی تو ٹھہرے تھے اس گھڑی
دیکھے تھے ہم نے جب بھی کنارے جدا ہوئے
گھر سے نکل کے روزی کمانے گئے فری
واپس کبھی نہ آئے وہ پیارے جدا ہوئے

کلام: فریدہ جاوید فریؔ، اسلام آباد

ہوتی اور چلے ہیں محبت کی پینگیں جھولنے اور شادی رچانے...... شادی لطیفہ نہیں کہ پل بھر کو پاگلوں کی طرح ہنس لیا اور پھر اس لطیفے کو بھول گئے۔'' وہ نخوت سے بولی اور وہاں سے اٹھنے لگی تو آدم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گردوپیش بیٹھے ہوئے کئی لڑکے، لڑکیاں... چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔ جب ایک زہر کے نشتر میں ڈوبی ہوئی آواز الوینا کے کان میں پڑی تو وہاں رک گئی۔

''یہ کون ہے، جس نے کہا کہ ''حجاب کے درپردہ محبت کی رنگ رلیاں۔'' کانوں کو چیرتی اس کی آواز پر سب کھسیانے ہوگئے......اور وہ ان سب کو ایسے گھورتی رہی گویا کھا ہی جائے گی۔

☆☆☆

''ممی میں شادی اس وقت تک نہیں کروں گی جب تک آپ پراپرٹی میں میرا حصہ میرے نام ٹرانسفر نہیں کرائیں گی۔'' وہ مستحکم انداز میں بولی۔

''بیٹا آرام سے میری بات سنو...... تمہاری بڑی بہن کی شادی ہماری مرضی کے مطابق ہوئی۔ اپنی حیثیت و بساط کے مطابق اسے جہیز دے کر رخصت

کر دیا۔ اس نے تو ایسی بیہودہ ڈیمانڈ کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ تم تو بہت ندیدی ہو کر حصے پر اتر آئی ہو۔ بھول جاؤ حصے وصے کو۔'' ماں اس کے خیالات سن کر دہل گئی۔

''وہ ہے یسریٰ اور میں ہوں الوینا۔ دو مختلف قسم کی شخصیات ایک دوسرے سے نوے ڈگری فرق...... پلیز مجھ سے اس قسم کی توقع رکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں...... میں جو بھی ڈیمانڈ کر رہی ہوں جائز ہے...... میں اپنے ہاتھ پیر کٹوا کر پرائے گھر چل پڑوں گی۔ یہ آپ کی سوچ ہے۔''

''ایک طرف تو نئے زمانے اور نئے خود ساختہ قوانین کی بات کرتی ہو۔ دوسری طرف ہزاروں سال پیچھے چلی جاتی ہو۔ مجھے تمہاری پرسنیلٹی کا یہ تضاد سمجھ نہیں آتا۔ ہمیں پاگل کر دیا ہے تم نے...... خبردار جو جائیداد کی تقسیم کی بات بھائیوں کے سامنے کی۔ وہ تمہیں لان میں دبا کر اوپر درخت لگا دیں گے۔ میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی۔''

''ممی میں نے جو درس سیکھا ہے ناں وہ ہے حقوقِ نسواں کے لیے بھائیوں کے دو بدو کھڑے ہو جانا۔ اس نئے دور میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے احکام کی پزیرائی نہ ہو تو کیا فائدہ ان درس و تدریس کا...... میں نے قرآن کریم کا ہر لفظ سمجھ کر پڑھ لیا ہے۔ اب.... بے وقوف نہیں بنوں گی۔ ہمیں حقوق کے لیے ثابت قدم ہونے کا جو درس قرآن کریم کے احکامات کو مدِنظر رکھ کر دیا ہے۔ سو فیصدی درست ہے۔ ذرا اس پر غور تو کریں اور اپنے حقوق کے لیے آپ بھی کھڑی ہو جائیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ پھر دیکھیں کہ اپنے ہی گھر میں ڈر و سہم کر زندگی کے دن پورے نہیں کریں گی۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ''ممی زندگی کو مزے میں سکون سے گزاریں۔''

''میں تمہاری طرح پاگل نہیں ہوگئی ہوں...... خالہ کے گھر رشتے سے تم نے انکار کیا۔ ہم نے مان لیا۔ اب شادی کرنے کی شرط ہے کہ پراپرٹی سے اپنا حصہ بٹورنا، ہمارے خاندان میں اس قسم کے رواج نہیں ہیں۔ اس لیے اس انقلابی آواز کو اپنے من میں ہی دفن کر دو۔''

''میں معاشرے، خاندان اور اس گھر کے رواجوں اور اصولوں کی بات نہیں کر رہی۔ میں رب العزت کی اس کتاب کی بات کر رہی ہوں۔ جس میں آپ کو اور مجھے گوشت پوست، خون، پانی اور جذبات و احساسات سے بھرپور انسان سمجھ کر قوانین کے مطابق چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان احکامات سے انکار کا مطلب ہے کفر، گستاخی اور زیادتی......'' وہ نرماہٹ سے بولی۔ ''ممی ذرا سوچیے کہ ہمارے رب نے ہم پر زندگی تنگ نہیں کی...... بلکہ اسے آزادی اور وسعت بخشی ہے۔ اور ہم کس قدر جاہل اور اناڑی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے خود ساختہ پابندیوں اور قید و بند کی صعوبتوں میں زندگی گزارنے کے لیے تیار ہیں۔ وہاں اس مرد کی پکڑ نہیں ہوگی بلکہ ہمیں جہنم رسید کر دیا جائے گا کیونکہ ہم نے اپنی زندگی کے ساتھ انصاف نہیں کیا...... آپ کو اپنی بہن کا بیٹا پسند ہے تو سو بار ہو اور بار، بار ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے آدم پسند ہے، یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھا۔ اس نے آخری دنوں میں مجھ سے رشتے کی بات کی تھی...... لیکن میں نے ٹال مٹول سے گلوخلاصی حاصل کر لی تھی۔ دو سال تک اس کا مجھ سے رابطہ رہا۔ میں قرآن کریم با ترجمہ پڑھ کر عورت کے تمام حقوق اسے گوش گزار کرتی رہی...... اور وہ سنتا رہا۔ اگر میں غلطی پر ہوتی تو وہ مجھے کب کا بھول چکا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا...... اس نے بھی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا۔ بند ذہن کی گرہیں کھول کر تمام شرائط ماننے کے لیے تیار ہو گیا ہے جو ناجائز اور غیر مناسب نہیں ہیں۔ آج کل میں وہ آپ سے بات کرنے آ رہا ہے۔ اسے پہلے چکر میں ہی ہاں کر دیجیے گا اور شادی مسجد میں نقد حق مہر کے عوض نکاح اور شربت کے گلاس پر...... میں مجبوراً اور ہاری ہوئی مسکراہٹ کے ہمراہ رخصت نہیں ہونا چاہتی۔ اس میں کردار کی مضبوطی پہلی اولین شرط ہے۔ اس میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ لمبی چوڑی

تمہید باندھ کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔
''ہاں ممی اس سے پہلے میرا حصہ میرے حوالے......ٹھیک ہے ناں......؟''
''میں تمہاری تمام بکواس سن رہی ہوں......اس قدر باغیانہ سوچ اور لالچ میں تو حیران ہوں کہ تم میری بیٹی کیسے کہلا سکتی ہو......نازونعم میں پالنے کے نتیجے ہیں سب' تم تو خاندان بھر میں ناک کٹوا کر ہی دم لوگی اور یہ جو دو بھائی ہیں ناں تمہارے جن کی تم چہیتی اور لاڈلی بہن ہو، ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جائیں گے۔ ان کے سامنے یہ منطقی اور حقیقت پسندانہ دلائل ناکام ہی رہیں گے اس لیے چپ کا روزہ رکھو اور اپنے گھر جاؤ۔''
''ممی، آدم حق مہر میں تھری بیڈ روم فلیٹ میرے نام کررہا ہے جس کے کرایے پر میرا حق ہوگا۔ جن کی میں چہیتی اور لاڈلی بہن ہوں ان سے کہیں کہ شریعت کا احترام کرتے ہوئے مجھے مضبوط اور پائیدار بنا کر غیروں کے حوالے کریں نہ کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کے آگے ڈال دیں۔'' وہ ماں کے ہاتھ پر بوسہ دے کر بولی۔
''یہ جو تم نے تعلیم حاصل کی ہے، لاکھوں کا جہیز اور شادی کا خرچہ الگ...... یہ سب کیا ہے؟ تمہارے حصے کے پیسوں سے ہی تو ہوا۔ مزید کون سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ایک لاکھ تنخواہ اور یہ گاڑی، یہ بھی تو اسی تعلیم پر خرچ کرنے کی وجہ سے تمہاری آسانی اور سہولت کا سامان نہیں۔'' ماں نے تڑی سے احسان جتلانے کی کوشش کی۔
''ممی تعلیم و تربیت تو آپ کے فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ باقی جہیز جیسی لعنت آپ اپنا نام و ناموس اونچا کرنے کے لیے میری زندگی میں داخل کررہی ہیں۔ مجھے یہ شوبازی نہیں چاہیے۔ اگر رسول اکرمؐ کی بیٹی کا جہیز صرف لوٹا اور جانماز ہوسکتی ہے تو کیا میں حضرت فاطمہؓ سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہوں......نعوذ باللہ......مجھے جہیز میں قرآن کریم، جانماز اور لوٹا ہی چاہیے۔ میں جس کے گھر جارہی ہوں ناں وہی میرے نان ونفقے کا ذمے دار ہے۔ اپنی بساط کے مطابق وہ جو بھی مجھے دے سکتا ہے سو بسم اللہ میں راضی برضا ہوں۔'' وہ ماں کے گلے میں بازو حمائل کرکے بولی۔
''ممی بی پریکٹیکل آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں اگر آپ میں سے کسی نے کسی قسم کی کوئی جاہلانہ حرکت کی تو میں حیرت اور تاسف سے ہی مرجاؤں گی۔''
''کرتی ہوں تمہارے بھائیوں سے بات دیکھنا کہ تمہاری ڈولی میں مجھے بھی بٹھا کر رخصت کردیں گے۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔ ''عورت کی تو تڑاخ ہمارے معاشرے میں نہیں چلتی۔''
''ذرا تجزیہ کریں اس صورتِ حال کا کہ آپ کو گھر سے نکالنے کی نوبت کیوں آئے گی؟'' وہ المناک لہجے میں بولی۔ ''جبکہ آپ میری جائز خواہش کا اعتراف کریں گی۔''
''مجھے نہیں معلوم......'' وہ منمنائیں۔
''میں آپ کو بتاتی ہوں کیونکہ آپ دو بیٹے، دو بیٹیاں پیدا کرکے بھی تہی درست ہیں۔ آپ نے تمام عمر ڈیڈی کی خدمت کی اور سسرالی رشتوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ پھر بھی غیر محفوظ رہیں۔ آپ کا ساتھ کوئی بھی پیارا نہیں دے گا کیونکہ یہ گھر آپ کا نہیں......عورت کا پیدائش سے لے کر مرتے دم تک کوئی گھر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا فرمان نہیں ہے۔ یہ اس کے بندوں کے فیصلے ہیں ممی...... آپ ایک زمیندار گھرانے کی اولاد ہونے کے ناتے کل ڈیڈی کی اور آج بچوں کی محتاج کیوں ہیں......؟ نہ چھت ہاتھ میں، نہ کوئی ہنر اور نہ ہی جیب میں پھوٹی کوڑی...... ذرا سوچ کر بتائیں ممی......'' وہ نہایت نرمی سے بولی۔
''ہاں بیٹا...... کیونکہ میں نے نہ تو حق مہر نقد لینے کی ضرورت محسوس کی تھی نہ ہی سیکڑوں مربعوں پر مشتمل ابا کی جائداد سے شرعی حصہ مانگا تھا۔ تہی دست ہی اس پرائے گھر میں آگئی اور تہی دست ہونے کے احساس میں عمر بھر ہر زیادتی اور بے انصافی پر مرنجاں مرنج ہونے میں عافیت سمجھتی رہی۔ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی؟'' ماں نے اسے گلے لگا کر کہا۔

"ممی، قرآن کریم اس دین و دنیا کے تمام اصولوں سے آگاہی دیتا ہے۔ یقین جانیں اگر عورت اللہ کی اس مقدس کتاب کی صرف دو سورتوں کے ہر لفظ کو سمجھ لے تو زندگی آسانی اور خوشحالی میں بیت جائے۔ گھروں میں ہر وقت کا کھچاؤ اور تناؤ ہمیشہ کے لیے رفو چکر ہو جائے اور ہمارے گھر جنت کا گہوارہ کہلانے لگیں۔ بس اب ہمت ہم نے پکڑنی ہے ممی...... ہم غلطی پر نہیں ہیں۔"

☆☆☆

شادی الوینا کی پسند و خواہش کے مطابق سر انجام پائی۔ والدین کی طرف سے بھائیوں نے طوعاً و کرہاً اسے شرعی حصہ سونپ دیا لیکن قبضہ اپنا ہی برقرار رکھا۔ آدم نے فلیٹ اس کے نام کر دیا تھا لیکن کرایہ امی کی جیب میں جاتا رہا۔ سسرال میں اسے جوائنٹ فیملی سسٹم میں گزارہ کرنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی لحاظ داری میں دو سال گزر گئے۔ آخر ایک دن اس نے اپنے فلیٹ میں شفٹ ہونے کا اعلان کر دیا تو گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ الوینا نے اس سب کے لیے کیا کیا سہا یہ الگ داستان ہے کرایے دار کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا گیا تھا۔ جونہی فلیٹ کی چابی اس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے اپنے آفس میں کام کرنے والوں کی خدمات حاصل کیں اور فلیٹ ایک ہفتے کے اندر وائٹ واش بھی ہو گیا اور سج دھج بھی گیا۔ اپنے فلیٹ میں پہلی رات گزارنے سے قبل اس نے آدم کو ایک محبت بھری ای میل بھیجی۔

"آدم آج ہم دونوں اپنے فلیٹ کی انسپکشن کے لیے جا رہے ہیں۔ کرایے دار، چابی میرے آفس پہنچا گیا ہے۔ آئی لو یو آدم! چھٹی کے بعد میرے آفس ہی آ جانا۔ ہائی ٹی کے لیے کسی فائیو اسٹار چلیں گے۔ اور پھر ہم اپنے فلیٹ پر جائیں گے۔" آدم ہائی ٹی کا پڑھ کر چونکا کہ وہ تو اس قسم کی فضول خرچیوں کے اس قدر خلاف ہے کہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔ آج اتنی مہربانیاں اور نوازشیں کیوں؟ یہ سوچتے ہوئے وہ معمولی سا فکر مند ہوا کہ پراپرٹی ڈیلر سے آج تو نہیں کل بات کروں گا...... نہ جانے کتنے مہینے فلیٹ خالی پڑا رہے۔ اس کا کرایہ تو امی کی جیب میں جاتا تھا۔ اب مجھے اپنی تنخواہ میں سے امی کو خوش کرنا پڑے گا۔ خیر جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا سب سے پہلے تو اپنی بیگم کی دعوت کو خوب انجوائے کروں...... جو شادی کے بعد پہلی بار مجھے دی جا رہی ہے۔ اسے یہ سوچ کیسے آ گئی کہ کبھی کبھار میاں، بیوی بھی تو مل کر ریسٹورنٹ جاتے ہیں۔ ذائقہ بدلنے کے لیے ہی سہی۔ ماحول بدلنے کے لیے ہی سہی، چلو کچھ بھی ہے شاید میری صحبت کا اثر ہے کہ اس کی خشک مزاجی دھیرے، دھیرے کافور ہونے لگی ہے۔ وہ گنگناتا ہوا اپنے آفس سے نکلا تو کئی کولیگز نے اس کی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔

☆☆☆

فلیٹ کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی آدم نے اچنبھے سے سلیقے و قرینے سے سجے ہوئے کاریڈور کی طرف دیکھا۔ تو الوینا نے اِک خوشگوار قہقہہ لگایا۔ "کیسا لگا سرپرائز......؟"

"بہت زبردست لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم نے نئے کرایے دار کے لیے اسے اتنا سجا دیا۔ یہاں فرنشڈ گھروں کا رواج نہیں...... جس نے بھی یہ بے وقوفی کی وہ ہمیشہ ہی پچھتایا۔" وہ حیرت و افسوس سے کمروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا...... تو وہ پھر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر بولی۔

"آج سے ہم اسی گھر میں رہیں گے مائی لو۔"

"وہ کس لیے...... امی کی اجازت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ بے ساختگی سے بولا۔ "اور اس فلیٹ کا کرایہ بھی وہی وصول کیا کرتی تھیں۔ آخر انہوں نے رشتے داروں میں لین دین بھی رکھنا ہے، بیٹیوں کی ضروریات کا خیال رکھنا ہمارے ہی فریضے کے زمرے میں آتا ہے۔ گھر میں پوتے، پوتیوں کی ڈیمانڈز، دادی پوری نہ کرے تو تم کرو گی۔"

"یہ تو ناممکن ہے آدم کہ وہاں رہوں۔ کہاں لکھا ہے کہ مجھے سسرال میں ہی جل بھن کر زندگی گزارنی

ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑنے لگی تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ سٹ پٹا کر پرے ہٹ گئی۔ اب وہ انگریزی جھاڑنے پر آگئی۔ ”کہاں گئے تمہارے وعدے اور میری شرطیں......“

”مجھے تم سے والہانہ محبت ہے۔ اس لیے میری اس بات پر یقین کرو کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم سے شادی کر کے عمر بھر تمہارے سنگ رہنا چاہتا ہوں۔“

آدم کی آنکھوں میں انتہائی حیرت سے سرخی دوڑ گئی۔ وہ لحظہ بھر اسے دیکھتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ حقارت و نفرت کا اِک طوفان اٹھا اور اس نے چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کو فرش پر دے مارا......

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ اس نے فریج کھولا تو وہ بھی کھانے پینے کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔

”خبردار جو کسی ایک شے کو بھی ہاتھ لگایا۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ فریج بند کرتے ہوئے چیخی۔

”اس وقت تم ہوش میں نہیں ہو۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس میں قصوروار تم نہیں ہو، میں ہوں۔ میری بات غور سے سنو کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ اپنے تمام رشتے داروں سے کٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی جائے۔ اس زندگی میں انسان مل جل کر نہ رہے تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ بے شک ہم سب کے مزاج اور طبیعتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کچھ شکایات واعتراضات بھی لازماً ہوں گے۔ لیکن ان کو نظر انداز کر کے خوش اسلوبی سے تمام رشتوں کو نبھانا ہمارا فرض ہے۔“ وہ لاؤنج میں نرم گداز صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تم پانی پیو...... غصے کو ٹھنڈا کرو پھر میں تم سے بات کروں گی۔“ وہ پانی کا گلاس اسے تھماتے ہوئے بولی۔ ”اگر میں نے شریعت سے ہٹ کر الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے تو مجھے سزا دینے کے تم حقدار ہو۔ لیکن سزا سوچ کر دینا جو قانون کے مطابق ہو نہ کہ قانون سے آزاد ہو کر۔ مجھے مجرم ٹھہرانے لگو۔ عدل سے کام لو آدم...... عدل، ظلم، زیادتی اور زور آوری میں نہیں۔“

وہ اس کے قریب بیٹھ کر نرماہٹ سے بولی۔ ”تم ایک اچھے انسان ہو۔ اپنے عہد کی خلاف ورزی مت کرو۔“

”بھئی الگ تھلگ رہنے کا عہد میں نے کب کیا تھا؟ تم نے حق مہر میں فلیٹ کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے فوراً یہ شرط پوری کردی جبکہ امی اور تمام رشتے دار اس کے خلاف تھے۔ ہمارے خاندان میں ایسا آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور نہ ہی تمہارے خاندان میں ایسا ہوا ہوگا۔“ لہجہ ہنوز غصیلہ ہی تھا۔

”اب میں نے اس قرآنی حکم کی شروعات کردی ہے۔ اب دیکھنا کہ ہر لڑکی اپنے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو جائے گی۔ بھائیوں نے طوعاً و کرہاً دس دکانوں میں سے ایک دکان میرے نام کردی ہے۔ جبکہ میرا حصہ زیادہ بنتا تھا۔ اس پر بھی قبضہ تو ان کا ہی ہے۔ میں نے اپنی دکان خالی کرا کر نئے کرایے دار کو دے دی ہے۔ اب کرایہ میرے ہاتھوں میں آئے گا۔ اسی کی پگڑی کی رقم سے میں نے اپنا گھر سیٹ کرلیا ہے۔ گھر کی چار غیر ضروری چیزیں جہیز کی صورت دے کر بہت بے وقوف بنالیا، ان میکے والوں نے۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”تمہیں اب اپنے اس رویے سے سمجھ تو آگئی ہوگی کہ عورت کو مالی طور پر کمزور کیوں رکھا جاتا ہے؟“ وہ غصے سے لال بھبوکا ہوتے ہوئے بولا۔

”اس لیے کہ وہ خود مختار ہو کر اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کے خود قابل نہ ہو جائے۔ آدم میں نے کوئی بھی نیا کام نہیں کیا بلکہ کوئی غلط کام نہیں کیا...... ہم نے ہی احکامات الٰہی کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنے، اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے جن کے نتائج بھی بھگتتے ہے۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے قانون کے مطابق چل رہی ہوں۔ میں نے تمہارے گھر والوں کی عزت و احترام کرنے سے انکار تو نہیں کیا ہے۔ پھر اعتراض کیوں۔ آدم تم بتاؤ کہ میں ان قوانین سے ایک انچ بھی آگے پیچھے ہوئی ہوں۔ پردہ، حجاب، شرم وحیا اور کردار کی مضبوطی میں تم نے مجھے کہیں بھی کمزور دیکھا ہو تو

بتاؤ......'' وہ باوثوق لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے کسی بات اور عمل پر پکڑ نہیں سکتے۔ میری ساکھ کے بارے میں ہر جگہ سے پوچھ سکتے ہو۔''

''تم درست کہہ رہی ہو لیکن یہ قانون ہمارے معاشرے میں نہیں چل سکتے کیونکہ صدیوں سے خود ساختہ رواج لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہو چکے ہیں، وہ ان کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتے۔ اپنے مانوس طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقے اپنانا ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تم اس معاشرے میں انقلاب نہیں لا سکتیں۔ بھول جاؤ ایسی باتیں...... یہ سامان کل ہی اٹھوا کر امی کے گھر پہنچا دینا۔ امی بھی خوش ہو جائیں گی۔ وہ اس گھر کے سال خوردہ بوسیدہ سامان کی جگہ تمہارے جہیز کا سامان سجانا چاہتی تھیں...... وہ خواب تو ادھورا ہی رہ گیا تھا۔'' وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔

''یہ ناممکن ہے آدم! میں آج کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہوں۔ اپنے دین کے اصولوں سے بھی نابلد نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں، نہ ہی میری سوچ پر تمہارا پہرہ ہے۔ میں انسان ہوں تمہاری طرح کی، مجھے بھی آزادی چاہیے۔ اپنی زندگی کے ساتھ انصاف کرنے کا مجھے بھی حق حاصل ہے۔ میرے پاس جو بھی پیسہ آتا ہے۔ وہ شریعت کے مطابق کسبِ معاش کا صحیح ذریعہ ہے۔ اس میں چوری، دھوکا، جھوٹ، رشوت اور سود کی ایک پائی بھی شامل نہیں...... رزقِ حلال سے ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کیوں نہ کریں۔ اس کا جواب دو۔''

''کیا یہ بھول گئی ہو کہ مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے اور جو عورتیں سرکشی پر اتر آئیں شوہر کی بات ماننے سے انکار کرتی رہیں تو ان کے احکامات بھی تو دُہراؤ۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ اور طنز کے نشتر چلاتے ہوئے طنزیہ ہنسا۔

''سورۂ نسا میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کیے جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرمانبرداری کرنے والی، پیٹھ کے پیچھے نگہبانی کرتی ہیں، اللہ کی حفاظت سے اور جن عورتوں سے تمہیں اندیشہ ہو کہ سرکشی کا۔ تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستروں پر تنہا چھوڑ دو۔ اور ان کو سزا دو۔''

''آدم، تم مجھے کس گناہ کی سزا دینے کے حقدار ہو۔ میں نے اپنے سسرالی اور میکے کے کسی رشتے دار کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا۔ فقط اپنے لیے ایسی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں جس پر میرا حق ہے اور تم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر امی اس گھر میں تنہا ہوتیں تو پھر میں الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کے گھر میں ماشاءاللہ دو بیٹے اور بہویں، چار پوتے اور دو پوتیاں ان کا دل بہلانے کے لیے کافی ہیں۔ ہم سنڈے کا دن ان سب کے ساتھ گزار لیا کریں گے۔ مہینے کے ایک سنڈے ان سب کو اپنے گھر میں کھانے پر مدعو کر لیا کریں گے۔ وہ بھی خوش اور ہم بھی شاداں و فرحاں...... ہے ناں درست...... کبھی کبھار ملنا محبتیں بڑھاتا ہے آدم! اور میں ان کے مسائل سے بے پروا ہونے کو تھوڑی کہہ رہی ہوں۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولتے ہوئے اس کے کندھے پر سر ٹکا کر بیٹھ گئی...... اور وہ گہری سوچ میں چلا گیا۔

الوینا وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ خوشیوں کے ہلکورے لیتے ہوئے اس نے چائے دم پر رکھی اور فریج سے کباب نکال کر فرائی کرنے لگی۔ مشہور و معروف بیکری کے عمدہ سینڈوچز اور بسکٹ پلیٹ میں رکھ کر ٹرالی لگائی اور گنگناتی ہوئی ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر نکلی تو آدم کو غائب پا کر اس نے آواز دی کمروں اور باتھ رومز میں جھانکا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ باہر کے دروازے کی طرف بھاگی، دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کاریڈور سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر آدم کی گاڑی زیرو کی رفتار سے چل رہی تھی۔ بالکل ایسے گمان ہو رہا تھا جیسے اس سے گاڑی چلانا مشکل ہو گیا ہو۔

''یہ تھی تمہاری محبت...... جس کے تم راگ الاپا کرتے تھے۔ وعدے وعید کانچ کی چوڑیاں نہیں کہ

ٹوٹ گئیں تو نئی خرید لائیں گے اور نہ ہی نکاح نامے کی حیثیت واہمیت کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے کہ پھٹ گیا تو پھر سے نیا بھرلیں گے۔ یہ ایسا ورق ہے جس پر ہم دونوں نے اللہ کے مقدس گھر میں ایک ساتھ جینے مرنے کا وعدہ کرتے ہوئے سب کے سامنے دستخط کیے تھے۔‘‘

چند ثانیے کی پریشانی نے اسے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ فلیٹ جو ہنگامی طور پر خوب سج گیا تھا۔ اس کی ہر شے سے اب نحوست ٹپکنے لگی تھی۔ اپنا بنا بنایا تلپٹ ہوتا ہوا پروگرام اسے اضطرابی کیفیت میں مبتلا کرتا گیا۔

’’میرے مالک! میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ تو میری راہنمائی فرما۔ آدم کو میں بھی تو دل وجان سے چاہتی ہوں لیکن مجھے اپنی زندگی سے بھی پیار ہے جو تو نے تحفے کی صورت میں مجھے بخشی ہے جو انسان تحفے کی اہمیت کو نہیں جانتا اس کی تقدیر کی لوح پر کالے حروف سے۔۔ بدنصیب، نامراد لکھ دیا جاتا ہے۔ یا اللہ میری مدد فرما۔ کیا میں غلطی پر ہوں۔‘‘ صوفے پر سر جھکائے بیٹھی وہ رات گئے تک سوچتی رہی۔

☆☆☆

اپنے فلیٹ میں جہاں وہ سمجھتی تھی کہ خوشیاں اس کا انتظار کررہی ہوں گی۔ چند دن میں ہی بولائی، بولائی سی پھرنے لگی۔ نہ آدم کا فون آیا نہ ہی کسی سسرالی رشتے دار کا۔۔۔۔ نہ آپا نے چکر لگایا نہ ممی نے۔ بھائی اور بھابیاں تو مرنا جینا اس سے پہلے ختم کرچکی تھیں۔ وہ صبح آفس جاتی، کام میں دل نہ لگتا۔۔۔۔ کولیگز سے بات کرنا تو درکنار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔۔۔۔ اس کی روشن پیشانی پر اب بیزار کُن سلوٹیں ہر وقت نمایاں رہتیں۔ اس کی سوچ کے مطابق کہ آدم تو اپنی ہی دُھن میں سرشار ماں اور بھابیوں سے خوب خاطر مدارات کروار ہا ہوگا لیکن ایسا ہرگز نہ تھا۔ وہ آفس سے فارغ ہو کر دوستوں میں جا بیٹھتا۔۔۔۔ انہی کے ساتھ کھانا کھاتا اور انہی کے ساتھ رات گئے تک ڈرنک کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر جو طمانیت سے بھرپور سرخی پھیلی رہتی تھی اس پر زردی کی تہ جمنے لگی تھی۔ دن، ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہوتے گئے۔ تعلقات میں سکوت چھا چکا تھا۔ انہی دنوں آفس میں نئے باس کی آمد ہوئی تو اِک تبدیلی کا احساس بلڈنگ میں قدم رکھتے ہی ہوجایا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی تخلیق میں ہر طرح کی فطرت کے انسان بنائے ہیں۔ پہلا باس پانچ وقت کا نمازی‘ پرہیزگار انسان تھا۔ اور آفس کے اس فرحت بخش ماحول میں خواتین کا کام آنا آسان ہوگیا تھا۔ خصوصاً جو حجاب لینے والی خواتین تھیں ان کے لیے تو کافی سہولت تھی۔ اور یہ نئے صاحب ان باپردہ خواتین کے پیچھے ہاتھ دھو کر ایسے پڑے کہ الامان۔۔۔۔ صاف محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان خواتین کی پاکیزگی کے پرخچے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اڑنا چاہتے تھے۔ دو تو کمپنی ہی چھوڑ گئیں۔ کچھ اسے خوش کرنے کی خاطر اس کے آگے پیچھے منڈلانے لگیں۔ لیکن کچھ خواتین اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کی پروا کیے بغیر اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے نبھاتی رہیں۔۔۔۔ جاب کچھ کی مجبوری تھی اور کچھ کا شوق۔۔۔۔۔

الوینا نے باس کی آج کی بیہودہ گفتگو کے بعد کمپنی کو خداحافظ کہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک اور جگہ کی خالی ویکینسی پر غور وخوض کرنے لگی۔ آخر ایک دن ہمت بحال کرتے ہوئے اس نے لیٹر تیار کیا اور باس کے آفس میں چلی گئی تو اس کا لیٹر پڑھ کر وہ چونکا۔

’’کوئی مسئلہ ہے کیا؟ میں بہت حیران ہوں۔۔۔۔۔ اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔‘‘ وہ پہلے تو کھڑا ہوگیا پھر فوراً ہی کرسی پر واپس بیٹھ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ تیری یہ مجال کہ جس نے نوکری کی پروا کی نہ اپنے باس کی۔۔۔۔۔

’’سر مسئلہ ہی تو نہیں۔۔۔۔۔ ورنہ مجبوراً یہاں رکنا پڑتا۔‘‘ وہ خوداعتمادی سے بولی۔

’’تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں۔ خاتون مجھے پہیلیاں بوجھنے والی عورتوں سے بہت چڑ ہے۔ اپنا مدعا بیان کرو سیدھے سادے لفظوں میں۔۔۔۔۔ میرا وقت ضائع مت کرو۔‘‘ وہ بھویں چڑھا کر بولا۔

''آپ کا وقت بہت قیمتی ہے، میں جانتی ہوں سر......دراصل آپ کا کارآمد اور دلکش مشورہ میرے دل کو جا لگا......میں گھر میں ہانڈی چولھے کو اس غلیظ نوکری سے ہزار ہا درجے باعزت اور قابلِ ستائش سمجھنے لگی ہوں۔ آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی......میں اس تنخواہ کے بغیر بھی گھر میں بیٹھ کر قابلِ عزت زندگی گزار سکتی ہوں، مجھے نہ تو شوہر کی تنخواہ کی ضرورت پڑے گی نہ ہی میکے، سسرال کی کسی قسم کی مالی امداد کی حاجت محسوس ہوگی۔'' وہ نہایت کاٹ دار لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ میری ڈیمانڈ زندگی میں بہت کم ہیں جن کے بغیر گزارہ ناممکن ہے۔ بس وہی اہم ہیں......''

''بیٹھو......اور کھل کر بات کرتے ہیں......ایسی جلدی بھی کیا ہے۔'' باس کی تمسخرانہ ہنسی اسے زہر کے نشتر کی طرح لگی۔ وہ تلملا کر میز سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اسے تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''میں آپ کو ایک آخری بات سمجھانا چاہتی ہوں، شرافت اور آدمیت کو صرف چہرے پر سجانے سے فطرت نہیں بدلتی جناب......جس کا آپ سے پالا پڑا ہے ان سے اپنی شرافت کے قصے سنیے......ایسے اوباش انسان کے زیرِ سایہ میرے نزدیک تو نوکری کرنا ہی حرام ہے۔ آپ جیسے دوغلی فطرت رکھنے والے افسروں کو صرف اپنی ذات سے پیار ہوتا ہے۔ انہیں نہ تو کسی کی عزت و تکریم سے سروکار ہوتا ہے نہ ہی ان کے جذبات کی پروا ہوتی ہے۔'' الوینا کی مردنی آنکھوں میں یہ فقرے بولنے کے بعد بجلی کوندی اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ ہق دق اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اسی لمحے اس نے میز پر رکھے ہوئے لیٹر کو اٹھایا اور اس کے بیسیوں ٹکڑے کر دیے۔

☆☆☆

موبائل پر الوینا کا نمبر دیکھ کر آدم کے لبوں پر فتح مندانہ مسکان پھیل گئی۔ اس نے کال ریجیکٹ کر دی۔ ''دماغ ٹھکانے پر آگیا ہوگا محترمہ کا......خود کو تیس مار خان سمجھتی ہے کیا......اگر ایسا ہے تو سال بھر اور گزر جانا چاہیے پھر دیکھو آدم کہ وہ سر کے بل چل کر آئے گی۔ وہ جو وقت تھا جب میں اس کی خوشامدیں کرتے نہ تھکتا تھا، وہ گزر گیا۔ اور اب میں آزادی میں شاداں و فرحاں رہنے لگا ہوں۔ یہ طوقِ غلامی بھی ایک عذاب ہی ہے۔'' پھر بیل بجی......اور بار، بار بجی لیکن آدم نے اسے سبق سکھانے کے لیے کال کو بار ہا بند کیا......تو آدھے گھنٹے بعد الوینا کا میسج آگیا۔ وہ قطعی لاعلمی کی کیفیت میں الوینا کا میسج پڑھنے لگا۔

''اے ایمان والو تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث میں لے لو......نہ ان کو اس غرض سے روکے رکھو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ ان سے لے لو......مگر اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں......اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو......اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بھلائی رکھی ہو اگر ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس کو بہت سا مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ واپس نہ لو......پھر اگر وہ اس میں سے کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اسے ہنسی خوشی سے کھاؤ۔ سورۂ نسا......

''آدم! تمہیں گئے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا۔ تم نے پلٹ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ کیا میں تمہاری بیوی نہیں کوئی رکھیل تھی۔ جس کے ساتھ دو سال تک دل بہلایا اور پھر ناکردہ گناہ کی پاداش میں اسے جدائی اور دوری کی سزا دے ڈالی۔ تم نے مجھے خود سے الگ تو کر ہی دیا ہے ناں......صرف ایک پیپر پر مہر اور تمہارے دستخط لگانے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ میں تمہیں اس فلیٹ کی قیمت ادا کر کے ہمیشہ کے لیے اس رشتے سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ جس مرد پر میرا کوئی حق نہیں رہا......میں اس کے پیسے پر اپنا حق کیونکر جتاؤں......مجھے جلد از جلد آزاد کر دو تاکہ میں انتظار کی جان لیوا......گھڑیوں سے چھٹکارا حاصل کروں۔ مجھ جیسی عورتیں جو فضول خرچی کو گناہِ کبیرہ

سمجھتی ہیں اور شرعی اصولوں کو اپنی عزت و تحریم گردانتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کی قربت اور دوستی کی محتاجی نہیں ہوتی۔ وہ جنگل میں گھر بسا کر بھی بھیڑیوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ میرے باس نے میرے اندر کی عورت کو بہت مشکل سے پہچانا۔ وہ میرے من سے کمزور عورت کے کردار کا بیج ڈھونڈتے ہوئے ناکام ہوگیا۔ اور جب میں نے ریزائن کیا تو اس کے بدلے میں میری پروموشن کردی...... آدم ایک شریف النفس اور مضبوط و بلند کردار کی مالک عورت کو عزت، جان کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ہم میرے بھائیوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ میں نے ان کی طرف پلٹ کر اس لیے نہیں دیکھا کہ انہوں نے تو مجھ سے دھوکا کیا تھا۔ مجھے شرعی حصے میں سے بہت کم دیا۔ اس پر بھی ناراضی اور گلے شکوے مجھ سے جبکہ میں نے صبر کا کڑوا گھونٹ پی لیا۔ ممی کو ملنے نہیں دیا۔ لیکن میں نے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ برادری نے بھائیوں سے بائیکاٹ کردیا۔ اپنے خاندان اور رشتے داروں کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انصاف دلانے پر ضرور اتر آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرا پورا حصہ مجھے دلایا بلکہ بھائی مجھے ہاتھ جوڑ کر راضی کرنے بھی چلے آئے.... تم کو اپنے رشتے داروں پر بہت مان تھا۔ انہوں نے بھلا تمہارے لیے کیا، کیا...... تم کو شراب اور جوئے کی طرف مائل کرنے والے یہی رشتے دار ہیں۔ میں تمہاری ہر خامی اور برائی کو معاف کرسکتی ہوں لیکن اس جہنمی علت کو برداشت کرسکتی ہوں نہ معاف کرسکتی ہوں۔ تمہارا اور میرا رشتہ تو اس وقت ہی ٹوٹ گیا تھا جب تم نے رب کے احکامات کی خلاف ورزی کی تھی۔ اسی نشے میں تم اس عورت کو بھول گئے۔ جس نے اس معاشرے سے مقابلہ کر کے اپنی ہم جنس کے لیے رستہ کھول دیا ذرا سوچو کہ یہ تھا تمہارا پیار اور فصلِ محبت کی گہرائی۔"

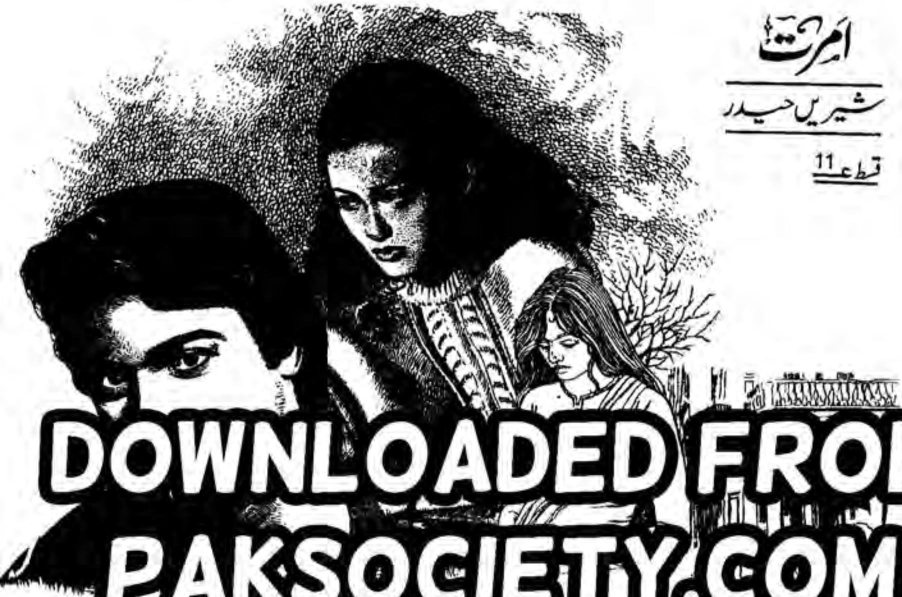
وہ میسج پڑھ کر حیران و سراسیمہ لیٹا رہا۔ اس نے جو کچھ پڑھ لیا تھا اسے یقین نہیں آیا تھا وہ آنکھیں کھول، کھول کر بار، بار عبارت پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اسے الوینا سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اب جو وہ چپ ساڈھے سال گزار چکا تھا اس کا سامنا کیسے کرتا۔ وہ تو اپنا منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں تھا۔

وہ یہ سچ کہا کرتی تھی کہ نئے انداز سے نئی نویلی بات کرو...... وہ بڑبڑایا۔ عجیب میسج تھا کہ بیڈ ایسے ہچکولے کھا رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اترا۔ اسے زمین اپنے پیروں تلوں سے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ریفریجریٹر کی طرف بہ مشکل بڑھا۔ اس کا دروازہ کھول کر بیئر کے کینز نکالے اور سیدھا باتھ روم کی طرف چل دیا۔ تمام کینز کھول کر اس نے مشروب بیسن میں بہا دیا اور خالی ٹن ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ کمرے میں آکر اس نے سیف کھولی اور کل رات جوئے میں جیتی ہوئی رقم نکالی اور گیراج کی طرف چل دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس کے دل کو سکون اور ذہن کو قرار سا آ گیا۔ وہ فلیٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور ہزار، ہزار کے نوٹ نزدیکی کچی آبادی میں پھینکتا گیا۔ فلیٹس کی پارکنگ میں پہنچ کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا...... جگمگاتے ہوئے ستاروں سے بھرا ہوا آکاش اور اس کے درمیان دودھیا کہکشاں دیکھ کر وہ لحہ بہ لحہ نشے میں بھیگتا ہوا الوینا سے عفو و درگزر کی عرضداشت تھامے ڈور بیل پر انگلی رکھ کر صبر و تحمل سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا...... الوینا میسج لکھنے کے بعد پُرسکون نیند میں جا چکی تھی۔ بیل کے مسلسل بجنے سے وہ چونک کر اٹھی اور تیزی سے مین ڈور کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اندر سے ہی آنے والے کا نام بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں فصلِ محبت کا کاشتکار...... ہر بڑی علت کو چھوڑ کر تمہارے در پر آیا ہوں...... دروازہ کھول دو......" الوینا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ دروازہ کھول کر سر جھکا کر بولی۔

"زہے نصیب......"



امرت

شیریں حیدر

قسط 11

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......



زندگی جزو خواب ہے گویا

شامیر کا اپنی یونٹ میں تبادلہ ہوا تھا...... اموجان کو کال کرتے ہوئے میرا دل بھر آیا کہ اس کا تبادلہ ایک مشکل محاذ پر ہوگیا تھا، اموجان اس کی طرف سے متفکر تھیں۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک بڑی جنگ لڑنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ان کے دل میں انجان اندیشوں نے گھر کرلیا تھا، ماؤں کے لیے اپنے بچوں کی صورت میں طرح، طرح کی فکریں ہی تو ہوتی ہیں۔ جتنے بچے اتنی ہی اقسام کے مسائل، اسی لیے تو وہ کبھی سکھ کی سانس نہیں لے پاتیں۔ فوجیوں کی مائیں، بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں ہونا اور بھی مشکل کام ہے۔ انہیں دعائیں بھی دیتی ہیں، ان کی سلامتی کے لیے جھولیاں پھیلا، پھیلا کر رب سے مانگتی ہیں۔ ان کا مادرِ وطن کا محافظ ہونا ہمارے لیے باعثِ فخر بھی ہوتا ہے اور خوف کا موجب بھی......

مرنے سے کون نہیں ڈرتا، پیاروں سے بچھڑ جانے کا خوف کسے نہیں ہوتا؟ شاید سب کو مگر ہمارے فوجیوں کے سوا جو ہمہ وقت عزت کی موت کی خواہش دل میں رکھتے ہیں، اس دنیا سے اور اس دنیا کے رشتوں سے محبت فطرت سہی مگر ان کے دل شاید بہت خاص مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ وہ مٹی جس میں ماں سے وفا ہے، حب الوطنی کی تڑپ ہے، مادرِ وطن کی حفاظت کا خیال ہے۔ وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرنے والے پروانے ہیں، جن کے دلوں میں وہ شمع محبت فروزاں ہوتی ہے، جو اُن سے دوسروں کی تاریک زندگیوں میں اجالے بھرنے کا کام کرواتی ہے۔

”آپ اس کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا کیا کریں اموجان......“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”تم تو ٹھیک ہوناں بیٹا؟“ انہوں نے تشویش سے میری خیریت پوچھی۔

”میں ٹھیک ہوں اموجان...... بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہیں تسلی دیتے ہوئے مجھے اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑا تھا۔

”اب مجھے تمہاری طرف سے سب سے زیادہ فکر رہتی ہے......“ میں جانتی تھی کہ اس وقت وہ سب سے زیادہ فکر مند شامیر کی طرف سے تھیں مگر پھر بھی وہ مجھے کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی پریشانی میں شریک کر کے مجھے ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھیں، جانتی تھیں کہ مجھے خوش اور سکون میں رہنے کی ضرورت ہے۔ شاید ترازو کے پلڑوں میں ماؤں کی ساری اولادیں ایک جیسی تلتی ہیں...... بالخصوص جب وہ تکلیف میں ہوں۔

”وہ کیوں اموجان؟“ میں نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔ ”میری فکر کیوں رہتی ہے، میں کوئی جنگ لڑ رہی ہوں کیا؟“

”ہر انسان اپنی، اپنی جنگ ہی تو لڑ رہا ہے، کسی کی جنگ آسان ہے اور کسی کی مشکل۔ تم بھی ایک مشکل محاذ پر جنگ لڑ رہی ہو۔“ اموجان نے گہری بات کی۔ ”ایک تو تمہاری حالت......“ وہ گویا ہوئیں۔ ”پھر تم لاکھ کہو کہ تم خوش ہو، میں جانتی ہوں کہ تمہارے لہجے کی گہرائی میں کچھ ٹوٹتا ہے، تم نے باپ کی بات کا مان رکھنے کو مصالحت اور مفاہمت تو کرلی مگر میں جانتی ہوں تم خوش نہیں ہو......“

”ایسا نہیں ہے اموجان...... میں خوش ہوں، میں نے ابوجان کے اس فیصلے کو ان کی خوشی کے علاوہ اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کیا ہے اس لیے مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”بس آپ میرے لیے آسانیوں کی دعا کیا کریں۔“

”میں زیبا کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اس کا رویہ بھی میں نے اس گھر میں رہ کر دیکھا ہے......“ وہ فکر میں مبتلا تھیں۔

”ان کے رویے سے اتنا فرق نہیں پڑتا اموجان!“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”ان کے علاوہ بھی گھر میں بہت لوگ ہیں، جو مجھے پیار کرتے ہیں، توجہ دیتے ہیں، مجھے چاہتے ہیں اور میرا خیال رکھتے ہیں۔“ انہیں تسلی دے رہی تھی مگر میرا دل تو جانتا تھا کہ چاچو کے علاوہ شاید ہی کسی کو میری فکر ہوتی ہوگی...... کسی کو میرے ہونے یا نہ ہونے سے

کوئی فرق پڑتا ہوگا یا کسی کو علم ہوگا کہ میں اس گھر میں کیوں تھی اور کس حوالے سے؟ اگرچہ زین کی وجہ سے میں وہاں تھی، جو بھی تولہ اور کبھی ماشہ والی شخصیت کا حامل تھا۔ زائنہ اور حسنہ پر اپنی ماں کی سوچ اور تربیت کا پورا اثر تھا۔ عارب اور حسن غیر جانبدار تھے، جیسے انہیں اس سے کم ہی غرض تھی کہ ان کے گھر میں کسی ایسے فرد کا اضافہ ہوا ہے جس کی ان کی زندگیوں میں کوئی اہمیت بھی تھی۔ صرف یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں غیر جانب دار رہتے تھے اور بولتے کم ہی تھے، نہ کسی کی حمایت میں، نہ مخالفت میں۔ بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ کے بولنے کا حق اس گھر میں صرف ماما کو تھا، وہ سامنے والے کو رگید دیں، جوتوں سمیت کسی پر چڑھائی کر دیں تو بھی کوئی انہیں منع نہیں کر سکتا تھا، چاچو سمیت...... سب کو اپنی عزت پیاری تھی۔

''جمال کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے بھی بات بدلی۔ ''اور باقی سب لوگ؟''

''چاچو ٹھیک ہیں...... کہہ رہے تھے کہ آپ سے پھر آنے کا کہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''باقی لوگ بھی ٹھیک ہیں۔''

''اب ایک ہی بار آؤں گی۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب تمہارا وقت آئے گا۔'' میں تصور میں انہیں اس وقت کا سوچ کر مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''اموجان، شامیر آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آئے گا ناں اپنی نئی یونٹ میں ڈیوٹی پر جانے سے پہلے؟'' میں نے سوال کیا۔ سوچ رہی تھی کہ وہ آتا تو میں اس سے ملنے کے بہانے ایک بار گاؤں کا چکر لگا لیتی۔ اس سے میری بھی ملاقات ہو جاتی اور ذرا چار دن اس ماحول سے دور گزر جاتے، اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو میں اسے کہتی کہ مجھے ملتا ہوا چلا جائے۔ زندگی کی بساط بھی کیا بساط ہے، ایک ہی گھر میں سے کھیل شروع ہوتا ہے، ایک جوڑا نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے، وہ ایک مکان ہوتا ہے جس کے مکین اسے گھر بناتے ہیں۔ اس گھر آنگن میں وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ نئے نفوس کا اضافہ ہوتا ہے، پیار بانٹنے کو کئی پیارے، پیارے بچے آ جاتے ہیں۔ ایک ماں کے جنے وہ بچے ماں باپ کی گود اور ہاتھوں پل کر بچپن اور لڑکپن کی حدود سے نکلتے ہیں۔ وقت کی ہر چال کے ساتھ یوں بکھر جاتے ہیں کہ دوبارہ سب کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا خواب ہو جاتا ہے۔

''کچھ علم نہیں بیٹا...... میرا خیال ہے کہ وہ جانے سے پہلے نہیں آ سکے گا کیونکہ اسے فوری طور پر یونٹ میں رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔'' وہ پھر اداس ہونے لگی تھیں۔

''کمیل کا کیا حال ہے؟'' ان کے لہجے میں اداسی محسوس کر کے میں نے بات ان کے پسندیدہ موضوع کی طرف بدلی۔

''بہت تیز ہو گیا ہے اب وہ...... پہچانتا ہے ہم سب کو!'' کھنکتا ہوا اور ناز بھرا لہجہ۔

''اسے اپنے ساتھ بھینچ کر میرا پیار کہیں اموجان...... اس سے کہیں پھپھو اسے بہت یاد کرتی ہیں۔'' میں نے جذب سے کہا۔

''کہہ دوں گی پیاری...... تم نہ کہو تب بھی اسے علم ہے۔''

''ایسے کیسے علم ہو سکتا ہے اموجان، بچوں کو کہنا پڑتا ہے تو انہیں یقین ہوتا ہے۔''

''پیار اپنے آپ کو اپنی طاقت سے منواتا ہے۔''

''رانی کا کیا حال ہے، اموجان؟'' مجھے اچانک اس کی یاد آئی۔

''بہت خوش ہے...... ٹھیک ہے، آج کل میں اس کی ڈلیوری ہونے والی ہے، ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچہ آپریشن سے ہوگا......'' وہ کہہ رہی تھیں۔ ''اور ہاں ایک اور اچھی بات، اس کے ہاں بیٹے کی ولادت متوقع ہے۔ اللہ کا لاکھ،

لاکھ شکر ہے، شہر بانو نے تو اتنی منتیں مانی تھیں کہ اس کے ہاں پہلا پوتا ہو۔''
''چلیں اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے اموجان کہ ان کے دل کی مراد پوری ہوئی...... اللہ انہیں مکمل.. صحت منداور لمبی زندگی والا پوتا دے۔'' میں نے دل سے دعا دی۔
''ارے ہاں...... اب تو تمہیں بھی ڈاکٹر نے بتا دیا ہو گیا کہ تمہارے آنے والے بچے کی......''
''پلیز اموجان......'' میں نے ان کی بات کاٹی۔ ''مجھے اس کے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہے، جو اللہ کی رضا ہے میں اس پر خوش اور راضی ہوں گی۔''
''چلو ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی...... بس اس لیے پوچھا تھا کہ ذرا تیاری میں سہولت ہو جاتی ہے اس لیے پوچھا تھا بیٹا!'' انہوں نے رسان سے کہا۔
''آپ کوئی تیاری نہ کریں اموجان، اپنے گھر اور اپنے باقی اہم کاموں پر دھیان دیں، وقت آنے پر تیاری کو بھی دیکھا جائے گا۔''
''تم سوچ رہی ہو گی کہ زیبا کوئی تیاری کرے گی؟''
''میں ان سے کوئی توقع وابستہ ہی نہیں کرتی اموجان!'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ کیا چاہتی ہیں، نواسہ یا نواسی؟''
''جو بھی ہو...... خیریت اور سلامتی والا ہو، تم بالکل ٹھیک رہو...... مجھے تو سب سے زیادہ تمہارے بارے میں فکر رہتی ہے بیٹا!''
''آپ میری طرف سے بالکل فکر مند نہ ہوا کریں اموجان...... انسان کے اختیار کی کوئی حد ہوتی ہے...... بے نیاز اور حد سے زیادہ اختیار والا صرف وہی ہے جو ہماری حدود کو متعین کرتا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''جب تم یوں قنوطیت سے بات کرتی ہو پیاری تو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے......''
''ہاہا...... اموجان، ایک تو آپ اتنی مشکل اردو بولتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''قنوطیت کیا ہوتی ہے؟''
''خوش رہا کرو تم...... حالات سدا ایک سے نہیں رہتے پیاری!''
''خوش رہتی ہوں امو!'' میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کر کے کہا۔ 'کم از کم کوشش تو کرتی ہوں۔' میں نے دل میں سوچا۔
''اللہ تمہیں ہمت دے میری جان!''
''اچھا اگر شامیر کے پروگرام کا علم ہوا تو بتائیے گا مجھے اموجان، اسے ملنے کے لیے آنے کا پلان بنا لوں گی میں۔''
''تمہارے لیے اس حالت میں بار، بار سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے...... وہ اگر آیا۔ پھر تو اسلام آباد کے راستے ہی واپس جائے گا تو میں اسے کہوں گی کہ تمہیں ملتا ہوا چلا جائے۔''

☆☆☆

''اوہ میرے پیارے بھائی......'' میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ میں اپنی حالت کو بھی بھول گئی اور بالکل بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی۔
اموجان نے بتایا تھا کہ وہ فقط دو دن کے لیے گھر گیا تھا اور واپسی پر اسے جی ایچ کیو میں دو دن کا کام تھا، اس نے اموجان سے کہا تھا کہ وہ ان دو دنوں میں مجھے ملنے کی کوشش کرے گا۔ اگرچہ میں اس کے آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی مگر دل میں خواہش تو تھی کہ وہ مجھے ضرور ملنے آتا۔ وہ اپنے کام سے ہی چھٹی کر کے آیا تھا اس لیے وردی میں

تھا اور ایسا پیارا اور بانکا لگ رہا تھا کہ میری نظر نہ ٹھہر رہی تھی، میں نے اپنی آنکھوں کو اسے نظر بھر کر دیکھنے سے روکا کہ کہیں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔ جونہی مجھے یاد آیا کہ میری حالت کیا تھی، میں سمٹ کر اس سے علیٰحدہ ہوئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرا، اسے درازیِ عمر کی دعا دی۔

''کیسی ہو؟'' اس نے اتنے پیار سے پوچھا کہ میرے دل سے غبار اٹھا۔ ہم دونوں کی عمروں میں تھوڑا ہی فرق تھا، سال سوا سال کا...... میں نے کبیر بھائی کو اسے نام سے بلاتے سنا تو بچپن سے ہی اسے نام سے بلایا۔ وہ احترام جو ہم دونوں بہنیں کبیر بھائی کو دیتی تھیں وہ شامیر کو نہیں ملا۔ ایسا نہیں کہ ہم اس سے کوئی بدتمیزی کرتے تھے...... ہم میں ذہنی ہم آہنگی تھی، عزت کرتے تھے کہ تو تڑاق سے بات نہ کرتے تھے مگر آپ جناب کا سلسلہ بھی نہ تھا۔

''ٹھیک ہوں...... بھلی چنگی ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''زبردست بھئی جوان...... ماشاء اللہ!'' چاچو نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا، اسے بھینچ کر ملے، اس کی وردی پر ہاتھ پھیرا۔ ''آج بھائی صاحب زندہ ہوتے تو تمہیں دیکھ کر اُن کا سیروں خون بڑھ جاتا۔''

شامیر کے آنے کی خبر سن کر دن کے کھانے کے بعد اپنے کمروں میں محوِ استراحت گھر کے باقی سب لوگ باری، باری لاؤنج میں آنے لگے تھے۔ چاچو اور مما آگے پیچھے اپنے کمرے سے نکلے، چاچو نے شامیر کو لپٹا لیا تھا جبکہ مما نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عارب اور حسن بھی آکر اس سے گلے ملے اور اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''کوئی چائے پانی کا بندوبست کروایا ہے تم نے بھائی کے لیے؟'' انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ مجھے اپنی سماعت پر شک ہوا۔ ''بہت اسمارٹ لگ رہے ہو۔'' انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر پھر اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ ''کتنے دنوں کی چھٹی پر آئے ہو بیٹے؟''

''بس تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں چچی جان......'' اس نے جواب دیا۔ ''مشکل سے وقت نکال کر...... گل کو'' وہ کہتے، کہتے کچھ سوچ کر رکا۔ ''میرا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو ملنے کے لیے آ گیا۔'' اس نے بھی الفت کے تقاضے نبھائے۔

میں نے کچن میں جا کر خانساماں کو چائے کے ساتھ لوازمات کا بتایا اور واپس لوٹی تو حسنہ بھی وہیں بیٹھی تھی اور شامیر سے مسکرا، مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ مجھے اچھا لگا کہ کم از کم میرے بھائی کو اس گھر میں کچھ تو پروٹوکول مل رہا ہے، اتنا پروٹوکول اور توجہ تو اموجان کو بھی نہیں ملی تھی۔

''آج تو تم یہیں رکو، یونٹ میں بتا دو بیٹا کہ تم صبح آ جاؤ گے...... جانا تو تمہیں کل ہی ہے ناں!'' چاچو نے اسے رکنے پر اصرار کیا۔

''نہیں چاچو، ایسا ممکن نہیں!'' اس نے معذرت کی۔ ''ممکن ہے کہ ہمیں رات کو ہی نکلنا پڑ جائے اور یوں بھی میرا سارا سامان میس میں ہے، وہاں تک کافی فاصلہ ہے، صبح میں لیٹ ہو جاؤں گا۔''

''زیادہ دنوں کے لیے آتے ناں بیٹا!'' مما نے کہا۔ ''آئندہ زیادہ دنوں کے لیے آنا، بچے تو تمہیں دیکھ کر کیسے خوش ہو گئے ہیں...... وردی تم پر بہت سج رہی ہے۔'' انہوں نے تعریف میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔

''جی شکریہ چچی جان! اصل میں پہلی بار یونٹ میں رپورٹ کر رہا ہوں، چھٹی اتنی آسانی سے نہیں ملتی...... بہرحال آئندہ کوشش کروں گا۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔ ''چلتا ہوں ابھی!''

''کس طرح جاؤ گے بیٹا؟ بچے چھوڑ آتے ہیں تمہیں......'' انہوں نے پیش کش کی۔

''نہیں، میں جیپ پر آیا ہوں چچی جان...... یونٹ کے کام سے نکلا تھا اس لیے۔''

''اوہو...... پھر تو تمہارے ساتھ ڈرائیور بھی ہو گا؟'' چاچو نے کہا۔ ''کسی نے اسے چائے پانی دیا ہے کہ

نہیں...... چیک کرو!''

''تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ بیٹا!'' مما نے اتنی شائستگی سے کہا کہ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اسے روک کر وہ کچن کی طرف لپکیں، میں شامیر کے پاس بیٹھ گئی، جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چلا جائے...... میں خود اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکی۔

''اپنا خیال رکھنا پیاری!'' جاتے ہوئے اس نے اپنے بازو میرے شانوں کے گرد حمائل کیے اور میرے سر پر بوسہ دیا۔ اس طرح ابو جان ہم بیٹیوں سے ملا کرتے تھے۔ میری آنکھیں بھر آئیں، میں نے سیلاب بھری آنکھوں سے اسے باہر نکلتے، ڈرائیور کو اسے سیلوٹ کرتے اور آگے بڑھ کر اس کے لیے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا۔

''اللہ تمہیں سلامت رکھے اور نظر بد سے دور رکھے میرے پیارے!'' دل ہی دل میں میں نے کتنی آیات کا ورد کر کے دور جاتی ہوئی اس کی جیپ کی طرف پھونک ماری۔

☆☆☆

''ایک اور ٹسٹ کروانا پڑے گا امرت!'' ڈاکٹر یاسمین نے لکھتے ہوئے کہا۔ ''عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے جیسا کہ تم بتا رہی ہو۔''

''پہلے تو میں سمجھی کہ سیڑھیاں وغیرہ زیادہ چڑھنے کی وجہ سے اس نوعیت کا درد ہوتا ہے مگر اب تو جب سے آپ نے کہا ہے تب سے میں نیچے کے کمرے میں شفٹ ہوگئی ہوں۔''

''میں بھی اسے تھکاوٹ کا نتیجہ ہی سمجھ رہی تھی مگر لگتا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسے ٹسٹ ہیں جو ہم عموماً اس حالت میں نہیں کرواتے مگر اب چونکہ مجھے اپنا شک رفع کرنا ہے اس لیے مجبوراً مجھے یہ ٹیسٹ کروانا پڑے گا۔''

''کوئی تشویش والی بات ہے؟'' میں واقعی پریشان ہوگئی تھی۔ ''اور ان ٹسٹوں سے آنے والے بچے کو کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟''

''ٹسٹ کروانا لازمی ہے...... تشویش کی بات ہونا یا نہ ہونا، اس کا فیصلہ ٹسٹ کا نتیجہ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔'' میرے لہو کے اندر کچھ رینگنے لگا، پیٹ میں بھنور سے پڑنے لگے۔

''کچھ بہت برا تو نہیں ہونے والا میرے ساتھ؟'' میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''اللہ خیر کرے......'' ان کے لہجے میں یقین کا فقدان تھا۔

''میرے بچے کو تو کچھ نہیں ہوگا؟'' میں نے اپنے اندیشے کو زبان دی۔

''تم اگر اسی طرح پریشان ہوگی تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''اگر ریلیکس رہو دعا کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ!''

''میں بہت بہادر ہوں ڈاکٹر یاسمین، جو کچھ سچ ہے مجھے بتا دیں، میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔'' میرا لہجہ میرے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ ''سب سے برا کیا ہو سکتا ہے؟''

''ایک تو اب تم بالکل اکیلی آتی ہو اس لیے ہر بات تم سے براہِ راست اور بغیر کسی لگی لپٹی کے کرنا پڑتی ہے......'' ڈاکٹر صاحبہ نے کہا۔ ''تمہاری ساس کیوں نہیں اب تمہارے ساتھ آتیں؟'' انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''وہ مصروف ہوتی ہیں......'' میں نے فوراً کہا۔ ''آپ کو علم تو ہے کہ وہ سوشل ورک وغیرہ کرتی ہیں۔''

''سوشل ورک گھر سے شروع کیا جائے تو سب سے بہتر ہوتا ہے ناں......'' وہ ہنسیں۔ ''وہ کیا کہتے ہیں۔ ''charity begins at home

''ممکن ہے کہ گھر سے باہر کے لوگ ان کی توجہ کے زیادہ مستحق ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''یہ ٹسٹ جس قدر جلد ہو کروالینا......'' انہوں نے پرچہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ ''تین دن میں اس کی رپورٹ آئے گی، جونہی رپورٹ ملے، مجھے دکھانا۔'' اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہی ہوں کہ اب میں جاسکتی ہوں۔

☆☆☆

''تم اکیلی کیوں ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھیں آج؟'' مما نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ میں آرام کر رہی تھی، اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال کیا۔

''وہ میں......'' میں ہکلائی، سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ان کے اس سوال کا مطلب کیا تھا۔ ''اصل میں، میں اب اکیلی ہی تو جاتی ہوں مما......''

''کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ میں نہ جاسکی ہوں گی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ہر بار اکیلے جانے لگو۔'' انہوں نے میرے قریب بیٹھ کر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھوں میں آنسوؤں کو امڈتے ہوئے محسوس کیا۔ ''ویسے کیا بتاتی ہے ڈاکٹر یاسمین، سب ٹھیک تو ہے ناں......اب تک تو اس نے بچے کا gender (جنس) بھی بتا دیا ہوگا؟'' ان کی استفہامیہ نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

''جی سب ٹھیک ہے......'' میں نے خود پر قابو پایا۔ ''میں نے ان سے بچے کی جنس نہیں پوچھی۔''

''ارے آج کل کی بچیوں کو تو سب سے پہلے یہی جاننے کا شوق ہوتا ہے......کیونکہ نام سوچنا ہوتا ہے، بچے کے لیے خریداری کرنا ہوتی ہے!''

''جی......'' میں اور کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

''چلو میں خود ڈاکٹر یاسمین سے پوچھ لوں گی۔'' انہوں نے میری مشکل آسان کی۔ ''ویسے کوئی نام وام تو سوچے ہوں گے تم میاں، بیوی نے؟''

''نہیں مما، آپ اور چاچو ہیں ناں!'' میں فوراً بولی۔

میں یہی سوچتی تھی کہ وہ لوگ اس بچے کا نام رکھیں گے کیونکہ زین تو ابھی تک شاید اس حقیقت کو ہی تسلیم نہ کر پایا تھا کہ وہ باپ بن رہا ہے اور اگر بن رہا ہے تو کیوں۔ اسے ناموں کے بارے میں بھی کچھ علم نہ تھا۔ اس کے ساتھ مل کر نام سوچنا ایک ایسا خواب تھا جو صرف میں دیکھ ہی سکتی تھی اس کی تعبیر نہیں پاسکتی تھی، ہمارے بیچ ویسی محبت پروان نہ چڑھی تھی۔ ''جو بھی نام آپ لوگوں کو اچھا لگے گا، جو فیصلہ آپ کریں گے۔''

''لو بھئی یہ عجیب کہی، فیصلہ ہم کریں گے بھی تو انہی ناموں میں سے جو تم اور زین سوچ کر ہمیں بتاؤ گے......بہت سستی کر لی تم لوگوں نے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''زائنہ نے تو اپنی بیٹی کا نام سوچ بھی لیا اور اس کی خریداری بھی کر لی، ڈھیروں ڈھیر گلابی چیزوں کی۔'' انہوں نے ہنس کر بتایا۔

''اچھا......ماشاء اللہ!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اللہ نیک اور نصیبوں والی کرے مما!'' اس سے زیادہ میں کچھ کہہ بھی نہ سکی، جانے کس وقت وہ کس بات کا الٹا مطلب نکال لیں۔

''اگلی دفعہ ڈاکٹر یاسمین سے ہم بھی پوچھ لیں گے......''

''یہ اچھا نہیں ہے مما کہ اسے سرپرائز رہنے دیا جائے...... آپ اور چاچو دونوں طرح کے نام سوچ لیں!''

''اور خریداری کا کیا ہوگا؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

''خریداری تو بعد میں بھی ہوسکتی ہے مما......'' میں نے رسان سے کہا۔ ''اگر پہلے کرنا ہو تو ہم ایسے رنگ خرید سکتے ہیں جو لڑکے اور لڑکیاں دونوں پہن سکتے ہیں......''

''ہاں...... یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

''ویسے اگر لڑکیاں نیلا یا لڑکے گلابی رنگ پہن لیں تو کیا ہو جائے گا مما؟'' میں نے ان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر سوال کیا۔

''ہوگا تو کچھ نہیں...... بس ذرا عجیب لگے گا لڑکا گلابی رنگ پہنے ہوئے یا لڑکی۔''

''آج کل تو سارے جوان اور ادھیڑ عمر کے لڑکے تھری پیس سوٹ کے ساتھ کاسنی اور گلابی رنگ کی شرٹ پہنتے ہیں اور نیلا رنگ...... وہ تو اس وقت میں نے بھی پہنا ہوا ہے۔''

''سو تو ہے......'' انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔ ''مگر بچوں میں ذرا پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔''

مجھے ان کی بات پر دل ہی دل میں ہنسی آئی۔

''اچھا...... چلتی ہوں، تم آرام کرو، میں خریداری کی لسٹ بنانا شروع کر دوں گی اب!'' وہ اٹھیں، گویا کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھ سے بحث نہ کرو۔ ''عائشہ کب آ رہی ہیں؟'' انہوں نے باہر نکلتے ہوئے مڑ کر سوال کیا۔

''امو تو وقت پر ہی آئیں گی مما...... کہہ رہی تھیں کہ جب اسپتال جانے کا وقت آئے تو انہیں بتا دیں وہ چند گھنٹوں میں پہنچ جائیں گی۔'' میں نے انہیں اسی طرح بتایا جس طرح امو جان نے مجھ سے کہا تھا۔

''لو بھلا...... یہ کیا بات ہوئی، انہیں اسپتال جاتے ہوئے بتائیں؟'' وہ حیرت سے گویا ہوئیں۔ ''وہ کیا اُڑ کر پہنچیں گی اتنے وقت میں اور اتنی غیریت کیوں برت رہی ہیں وہ؟''

''جی میں کہہ دوں گی اُن سے۔'' میں نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اگلی بار کب جانا ہے ڈاکٹر کے پاس؟'' آخری سوال۔

''جی دو دن کے بعد......'' میں نے بتایا۔ ''ایک ٹسٹ لکھ کر دیا تھا انہوں نے، وہ میں لیبارٹری میں سیمپل دے آئی تھی، جونہی اس کی رپورٹ ملے گی تو انہیں دکھانا ہوگی۔''

''ڈاکٹروں کو تو موقع چاہیے ہوتا ہے پیسے کمانے کا...... کبھی کوئی دوا بے مقصد لکھ دیتی ہیں کبھی ٹسٹ...... سب آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں، لیبارٹریوں والے، میڈیکل اسٹور والے...... دوا ساز کمپنیاں اور ڈاکٹر۔''

''جی!'' اس سے بہتر کوئی جواب مجھے کبھی ان کے سامنے ..سوجھا ہی نہ تھا۔

''چلو اسی دن واپسی پر کچھ خریداری بھی کر لیں گے اپنے پیارے سے بے بی کی۔'' انہوں نے اس ان دیکھے بچے سے لاڈ کیا۔ وہ باہر نہ نکل جاتیں اور ایسی ہی کوئی ایک بات اور کرتیں تو میں یقیناً بے ہوش ہو جاتی۔

☆☆☆

جب سے میں مہمان خانے میں منتقل ہوئی تھی تب سے زین اور بھی بے قاعدگی سے گھر آنے لگا تھا۔ کبھی کبھار تو مجھے یہ بھی علم نہ ہو پاتا کہ وہ رات کو آیا یا صبح، میں تو اپنے ہی مسائل میں الجھی ہوئی تھی، مما کا بدلا ہوا رویہ میرے لیے ایک خوشگوار تبدیلی کا حامل تھا اس لیے مجھے اور چیزوں کی پروا کم ہی تھی۔ زین جن عادات کے ساتھ پروان چڑھا تھا اسے میں اتنے کم عرصے میں تو تبدیل نہیں کر سکتی تھی، امید ہی کر سکتی تھی کہ آنے والا بچہ اس کی توجہ حاصل کر سکے گا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں پیاری......؟'' اس نے میرے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔

''ہوں......'' میں نے مختصراً کہا۔

''ڈاکٹر کو باقاعدگی سے دکھا رہی ہو...؟'' اگلا سوال، مشینی سا انداز۔

''جی......'' اتنا ہی میکانکی سا جواب۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' پھر سوال۔

''اگر ہوتو؟'' میرے منہ سے پھسل گیا۔
''کیا مسئلہ ہے؟'' بازوؤں کی گرفت نرم ہوئی۔ ''پیسوں کا ہی مسئلہ ہوگا...... مما سے لے لیا کرو۔''
''پیسہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے زین!'' میں نے گہری سانس لی۔ ''چاچو دے دیتے ہیں کچھ رقم مجھے ہر ہفتے اور جب ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا ہے تب بھی۔''
''اچھا...... گڈ!'' وہ بشاش ہوا۔ ''پھر تو کوئی مسئلہ نہ ہوا ناں!'' اس نے مجھے سمیٹا۔
''مسئلہ تو پھر بھی ہے۔''
''اور کیا مسئلہ ہے؟'' حیرت سے اس نے سوال کیا۔
''زین میرا دل چاہتا ہے کہ تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جایا کرو......'' میں نے جی کڑا کے کہا۔ ''سب عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں...... میرے ساتھ پہلی دو دفعہ مما گئی تھیں، اس کے بعد سے میں تنہا جاتی ہوں، خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔''
حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ اسپتال کی انتظار گاہ میں ساری عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ہوتیں، ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کا انداز ہی فاخرانہ ہو جاتا۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر پوچھتے کہ وہ تھک تو نہیں گئیں۔ ان کے لیے کبھی کچھ کھانے کو لاتے، کبھی جوس اور کبھی پانی۔ جن کی گود میں پہلے سے کوئی بچہ ہوتا تھا وہ پہلے بچے کو بھی سنبھالتے۔ ڈاکٹر کے کمرے میں بیویوں کے ساتھ جاتے اور یقیناً ڈاکٹر کے ساتھ اس کی صحت کے بارے میں بات بھی کرتے ہوں گے۔
''اچھا......'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''اور جن کے خاوند نہیں ہوتے؟'' اس نے سوال کیا۔
''نہیں ہوتے...... کیا مطلب؟'' میں نے سمجھ کر بھی سوال کیا۔
''میرا مطلب ہے کسی کی کوئی مصروفیت ہو...... کوئی پردیس میں ہو یا کوئی مر ہی گیا ہو تو؟''
''مجھے اس طرح کے خاوندوں کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے زین!'' میں نے بحث کی۔ ''جب میرا خاوند ہے...... میرے پاس ہے...... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ چاہے تو میرے ساتھ جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک ایسی ملازمت کرتا ہے جس میں اسے ایسے اہم کاموں کے لیے سہولت سے چھٹی مل سکتی ہے۔''
''یہ تو تم سمجھتی ہو ناں امرت......'' اس نے دو بدو کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ کون سا کام اہم ہے اور کون سا نہیں۔''
''تم میرے ساتھ جانے کا بہانہ کر کے بھی تو چھٹی لے لیتے ہو......'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کیا۔
مجھے یاد آ گیا کہ چند دن پہلے مما نے مجھے اس وقت کال کی جب میں لیبارٹری میں خون کے ٹسٹ کا نمونہ دینے کے لیے انتظار کر رہی تھی۔
''اگر جمال تمہیں کال کر کے پوچھے کہ زین تمہارے ساتھ ہے تو کہہ دینا کہ وہ تمہارے ساتھ ہے۔''
''مگر وہ تو میرے ساتھ نہیں ہے مما......'' میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا۔
''میں کہہ رہی ہوں کہ ایسا ہی کہنا تو ایسا کہہ دینا سمجھیں!''
''اگر چاچو نے کہا کہ بات کرواؤ تو؟'' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کس کھیل کا حصہ بنانا چاہ رہی تھیں۔
''کہنا کہ......'' وہ سوچ رہی تھیں شاید۔ ''کوئی بہانہ کر دینا!''
''مگر زین ہے کہاں مما...... اور چاچو کے ساتھ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''
''تمہیں تو کوئی بات سمجھانا اتنا مشکل کام ہے امرت......'' وہ جھنجلائیں۔ ''اس کے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، اسے لے کر اسے اسپتال جانا پڑا...... اسے بھول گیا کہ کسی پارٹی کے ساتھ کوئی اہم میٹنگ تھی، جمال نے

اسے نہ پا کر فون کیا تو میں نے فوراً ہی تمہارے ساتھ ہونے کا بہانہ کر دیا۔''
''آپ چاچو کو سچ بتا دیتیں مما...... جانے ہمیں ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کتنے جھوٹ بولنا پڑیں گے۔''
''جمال کو تو اس کے دوستوں سے اللہ واسطے کا بیر ہے اس لیے اسے سچ نہیں بتایا جا سکتا۔''
''مگر چاچو اگر اس سے ڈاکٹر کے بارے میں کچھ پوچھیں گے تو زین کے پاس کیا جواب ہوگا؟''
''تم اتنا دور کا نہ سوچو...... فی الحال جو مصیبت گلے پڑی ہوئی ہے اس سے چھٹکارا مل جائے، جمال کا پارہ ہائی ہے، تم انہیں مطمئن کر دو، باقی میں بعد میں دیکھ لوں گی۔''
ان کا فون بند ہوتے ہی چاچو کا فون آ گیا، مجھے وہی کہنا پڑا جو مما نے کہا تھا...... ''کتنی دیر میں فارغ ہو کر آ جائے گا وہ؟'' انہوں نے اس سے بات کروانے کو تو نہ کہا البتہ اس سے بھی مشکل سوال کر دیا۔
''دیر ہی ہو جاتی ہے چاچو ویسے تو...... لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو میں اس کو واپس دفتر بھجوا دیتی ہوں، ڈاکٹر کو میں اکیلے ہی......'' میں یہ فقرہ کہتے ہوئے کتنی خوفزدہ تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔
''نہیں تم رہنے دو، اگر وہ نا ہنجار تمہارے ساتھ پہلی بار ڈاکٹر کے پاس چلا ہی گیا ہے، اسے اپنی ذمے داری کا احساس ہو گیا ہے تو رکنے دو اسے وہیں...... میں خود ہی میٹنگ اٹینڈ کر لیتا ہوں۔'' چاچو نے کہا۔ ''تم اپنا خیال رکھنا میری بیٹی!'' فون بند کر کے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، میں نے اپنے اتنے پیارے چاچو کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔
''کب میں نے تمہارا بہانہ کر کے چھٹی لی ہے؟'' وہ اتنی زور سے بولا تھا کہ میں اپنے خیالات سے چونک گئی۔
''جس روز تمہارے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور تم جلدی میں اسے اسپتال لے کر گئے تو یہ بھی بھول گئے کہ تمہیں دبئی سے آنے والی ایک پارٹی کے ساتھ میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی۔'' میں نے اسے یاد دلانا چاہا۔
''دوست کا ایکسیڈنٹ؟ کون سے دوست کا ایکسیڈنٹ؟'' اس نے پُرخیال نظروں سے مجھے گھورا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔''
''مجھے مما نے کال کر کے کہا تھا کہ میں چاچو سے کہوں کہ تم میرے ساتھ ہو۔'' میں نے اسے تاریخ کے حوالے سے یاد کروایا۔
''اوہ...... وہ!'' اسے یاد آ گیا۔ ''مما نے تمہیں کیا بتایا تھا؟''
''جو میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے......'' میں نے دُہرایا۔ ''کیا کوئی اور بات تھی؟ تم اپنے دوست کے ساتھ نہیں تھے؟ کہاں تھے تم، مجھے سچ بتاؤ زین!''
''سو جاؤ ابھی میری جان......'' اس نے لیٹتے ہوئے کہا۔
''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟''
''تمہارا نہ جاننا ہی بہتر ہے پیاری......'' اس نے میرا ہاتھ تھپکا۔ ''اس حالت میں تم سہار نہ پاؤ گی۔'' وہ کروٹ بدل کر سو گیا اور میں خیالوں میں زین کے حوالے سے ہر وہ بات سوچنے لگی جو مجھے اس حالت میں کسی بڑے صدمے سے دوچار کر سکتی تھی۔ ان باتوں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ میں ان میں سے ترجیحات متعین کرتے، کرتے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

وہ مجھ سے لڑ رہی تھی...... چیخ، چیخ کر بات کر رہی تھی۔ میں نے اس سے قبل اسے کبھی نہ دیکھا تھا، وہ ایک انجان مگر بے حد حسین چہرہ تھا۔ مجھ سے یوں چلا، چلا کر بات کرنے کی کیا وجہ تھی، وہ بھی میں نہیں جانتی تھی۔

''اپنے جوتے مجھے دے دو تم!'' وہ چیخ رہی تھی۔

''اگر میں اپنے جوتے تمہیں دے دوں تو پھر میں کیا پہنوں گی؟'' میں نے اپنے جوتے مضبوطی سے اپنے پیروں تلے جما لیے۔ ''نیچے بہت کانٹے ہیں اور میں ننگے پاؤں نہیں کھڑی ہو سکتی۔'' میں نے بیچارگی سے کہا۔

''دیکھو پلیز...... مجھے تمہارے جوتوں میں کھڑے ہونا ہے۔'' اس نے انگریزی میں کہا تھا۔

''تم صرف میرے جوتے پہننا چاہتی ہو یا اس بات سے تمہارا وہی مطلب ہے جو میں سمجھی ہوں؟'' میں نے بھی انگریزی میں سوال کیا تھا۔

''ایک بار...... فقط ایک بار، مجھے اپنے جوتے پہننے دو۔'' وہ التجا کر رہی تھی۔

میرا دل پسیج رہا تھا، میں نے نیچے جھک کر اپنے جوتے دیکھنا چاہے، کون سے ایسے خاص جوتے تھے جو اسے چاہئیں۔ مگر اپنی جسمانی حالت کی وجہ سے مجھے جوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اور اس کے لباس تو رنگدار تھے مگر جب میں نے زمین پر دیکھا تو مجھے سب کچھ سفید اور سیاہ نظر آیا تھا، پتھر، گھاس، کنکر اور زمین پر کچھ گاڑھا سا بہتا ہوا سیاہ سیال مادہ نظر آیا۔ اب میں اپنے جوتے اتار کر اسے دیتی تو میرے قدم اس سیال مادے پر ہوتے۔ جانے وہ سیال مادہ گرم تھا، چپچپا یا کیسا؟

''میں جوتے اتار کر تمہیں نہیں دے سکتی، زمین پر کچھ گندا سا بہہ رہا ہے، جانے کیا ہے یہ......''

''میں بھی تو اسی گندگی میں کھڑی ہوں، برداشت کر رہی ہوں...... بس تھوڑی دیر کے لیے دے دو۔'' اس کا لہجہ حکمیہ سے التجائیہ ہو گیا تھا۔

''اگر تمہارے پاؤں گندے ہیں تو پھر میرے جوتے بھی گندے ہو جائیں گے...... اور میں تو کسی کے صاف جوتے بھی نہیں پہن سکتی اور نہ اپنے جوتے کسی کو پہننے کو دیتی ہوں۔'' میں نے سختی سے کہا تھا۔

''اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو میں کھائی میں چھلانگ لگا دوں گی۔'' اب اس نے غصے سے کہا تھا۔

''کھائی بہت گہری ہے......'' میں نے خوف سے کہا، مجھے نیچے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کھائی بہت گہری ہے۔

''تمہیں اس سے کیا!'' وہ کھائی کے کنارے کی طرف الٹے قدموں سے جا رہی تھی۔ میں لرز رہی تھی، تبھی مجھے زین اس کے عقب میں نظر آیا۔ زین نے اپنے بازو پھیلا رکھے تھے جیسے وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر قابو کرنا چاہ رہا ہو، زین نے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں خاموش رہوں یعنی اسے اندازہ نہ ہو کہ زین اس کے پیچھے تھا۔

''تم ہی اپنی ضد چھوڑ دو امرت، اپنے جوتے اتار کر اسے دے دو۔'' مجھے اپنے کان میں زین کی آواز آئی، زین نے مجھ سے کیسا عجیب مطالبہ کیا تھا۔ میں اس بات کا کیا جواب دیتی؟

''میں چھلانگ لگا رہی ہوں زین!'' اس نے مڑ کر زین سے کہا تھا، زین اسے سمیٹنے کو لپکا۔ اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، اگلے ہی لمحے اس نے زین کے بازوؤں کے حلقے سے جھونک دے کر، بھاگ کر کھائی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

زین نے خوفناک چیخ ماری تھی...... زین نے چیخ کر اس کا نام لیا تھا۔ خوف سے لرزتے ہوئے میری آنکھ کھلی، میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا تھا؟ میں خود سے پوچھ رہی تھی۔ زین بھی جاگ گیا تھا کیونکہ میں نے حقیقت میں چیخ ماری تھی۔

''تم خواب میں ڈر گئی تھیں کیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا اور میں نے خود کو سنبھالا۔ کہیں میں بے وقوفی میں کوئی غلط بات نہ کہہ دیتی۔

''شاید!''

''کیا خواب دیکھا تم نے؟'' اس نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیر کر پسینے کے قطرے صاف کیے۔

''مجھے خواب کبھی یاد نہیں رہتے زین!'' کہہ کر میں اٹھی۔ جس لڑکی کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، اسے تو میں جانتی تھی، وہ ایسی لڑکی تو نہیں لگتی تھی کہ یوں اپنا خاتمہ کر لے...... میں نے ایسا سوچا تھا کبھی اس کے بارے میں کیا؟ کیوں؟ وہ تو ایک بے ضرر سی دوست تھی زین کی۔ غسل خانے میں جا کر اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپا کے مارتے ہوئے میں سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''مبارک ہو بھئی امرت...... رانی کے ہاں بیٹا ہوا ہے، شہر بانو کا پوتا...... پہلا پوتا!'' مما کے چہرے پر خوشی یوں ہی لگ رہی تھی جیسے کسی اناڑی میک اپ آرٹسٹ کا کیا ہوا میک اپ۔ وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر اداکاری اتنی اچھی نہ تھی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو مما......'' میں نے جواب دیا۔ ''چاچو چلے گئے دفتر؟'' میں نے جوش سے سوال کیا۔

''ہاں وہ چلے گئے......'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''میں فون کر کے چاچو کو بتاؤں؟'' میں نے جوشِ جذبات سے پوچھا۔

''انہوں نے ہی تو بتایا ہے مجھے......'' مما نے مسکرا کر کہا تھا۔

''چلو...... تیار ہو جاؤ، یاد ہے ناں کہ آج تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

''اوہ یاد آ گیا۔'' میں واقعی بھول گئی تھی۔

''کتنے بجے کا وقت ہے...... میں شاور لے کر تیار ہو جاتی ہوں۔'' مما نے کہا۔

''اصل میں مجھے پہلے لیبارٹری سے اپنی بلڈ رپورٹ لینا ہے مما!'' میں نے بتایا۔ ''ڈاکٹر نے آج صرف رپورٹ دیکھنی ہے۔''

''اچھا...... چلو پھر بھی چلتی ہوں میں۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''میں تیار ہو جاتی ہوں، بارہ بجے تک نکل جائیں گے...... رپورٹ لے کر ڈاکٹر کو دکھا لیں گے۔ پھر باہر لنچ کر کے کچھ خریداری کرتے ہوئے شام تک لوٹ آئیں گے۔'' وہ پروگرام بتا رہی تھیں۔

''میں چلی جاؤں گی مما ڈرائیور کے ساتھ، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے تکلف سے کہا۔

''بڑی عجیب بات ہے بیٹا...... تم مجھے ساتھ نہیں لے کر جانا چاہتیں؟''

''ارے نہیں مما...... میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کو زحمت ہو گی۔'' میں شرمندہ ہو گئی۔

''ایسی غیریت والی بات کیوں کرتی ہو تم؟'' اپنے خلوص بھرے فقرے کی مار دے کر وہ چلی گئیں۔

☆☆☆

''آپ نے دیکھا ہے اموجان اسے؟'' میں نے اموجان کو مبارک باد کے لیے کال کی تھی کیونکہ بڑی پھپو کی کال تو مل ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً ان کا نمبر مبارک باد کی کالوں کی وجہ سے مصروف ہو گا، سرمد بھائی کو کال نہ کرنے کی میرے پاس ٹھوس وجہ تھی، اس لیے اموجان کو کال کر لی۔ ''کس کی طرح لگتا ہے؟''

''اتنے چھوٹے بچے کی شکل کا کیا اندازہ ہو گا بیٹے!'' وہ ہنسیں۔ ''البتہ ماں، بیٹے کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔''

''اچھا اس کا نام کیا رکھیں گے؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بھئی تم تو سب سے زیادہ اتاولی ہو رہی ہو...... نام بھی رکھ ہی لیں گے وہ لوگ۔''

''کچھ نہ کچھ سوچا تو ہو گا ناں؟''

''ہاں جنہوں نے سوچا ہوگا وہ رکھ لیں گے تو بتا دیں گے۔''

''اموجان......'' میں نے یونہی پوچھا۔ ''آپ کو کون سے نام پسند ہیں؟''

''ہاں جیسے وہ مجھ سے پوچھ کر ہی تو نام رکھیں گے ناں......'' وہ ہنسیں۔

''ان کا نہیں کہہ رہی......'' میں نے کہا۔ ''میں تو سوچ رہی تھی کہ اگر آپ کو میرے بچے کا نام رکھنا پڑے تو......!''

''تمہارے بچے کا نام اور میں رکھوں گی؟'' انہوں نے اداسی سے کہا۔ ''جن کا پوتا یا پوتی ہوگی وہ رکھ لیں گے۔'' میں جانتی تھی کہ انہوں نے بات پلٹی تھی۔

''وہ رکھیں یا نہ رکھیں...... میں تو خود جاننے کے لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''انہیں سوچنے دو پیاری......'' اموجان نے کہا۔ ''دماغ کو ان کاموں میں ضائع نہ کیا کرو جو تمہارے کرنے کے نہیں۔''

''کیا پتا اموجان...... وہ مجھ سے کہیں کہ تم اپنے بچے کا نام خود رکھو۔'' میں نے مذاق سے کہا۔

''ہاں ہو بھی سکتا ہے...... مگر زیبا کو جانتے ہوئے اس کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔''

''کیا پتا وہ کہیں کہ بچے کا نام اس کی نانو رکھیں گی پھر......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تمہیں دن میں خواب دیکھنے کی عادت ہوگئی ہے کل......'' وہ بھی کھل کر ہنسیں۔

''خواب دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں اموجان...... چاہے دن میں دیکھیں یا رات میں۔'' میں نے کہا تو میری یاد میں وہ خواب چمکا، دل چاہا کہ اموجان کو وہ خواب سناؤں مگر اچھی عادت میری کہ میں اپنے خواب کسی کو بھی نہیں سناتی تھی۔

☆☆☆

''کہاں کھانا کھانا چاہو گی؟'' مما نے مجھ سے پوچھا تھا۔ گاڑی وہ خود ہی چلا رہی تھیں، پہلے ہم لیبارٹری گئے تو علم ہوا کہ ان کی کسی مشین میں خرابی کے باعث ٹسٹ نہ ہو سکا تھا، میرا خون کا سیمپل بھی ضائع ہو گیا تھا، اس لیے میں نے دوبارہ ایک اور لیبارٹری میں سیمپل دیا، اس کی رپورٹ دو دن بعد ملنا تھی۔ مما نے اس لیبارٹری کے استقبالیہ پر نوٹ کروایا کہ اس ٹسٹ کی رپورٹ ڈائریکٹ ڈاکٹر یاسمین کو بھجوا دی جائے۔ ڈاکٹر یاسمین کو کال کر کے انہوں نے پوچھا تھا کہ بغیر بلڈ رپورٹ کے ہمیں ان کے پاس جانے کی ضرورت تھی یا نہیں، اس پر انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے فی الحال صرف بلڈ رپورٹ ہی دیکھنا تھی، معمول کا چیک اپ پندرہ دن کے بعد ہونا تھا۔

رپورٹ نہ ملنے اور ڈاکٹر کو نہ دکھانے کے باعث ہمیں کھانے کے وقت سے پہلے خریداری کا وقت مل گیا تھا۔

ایک بڑے مال میں بچوں کے ایک بہت مشہور اور بڑے برانڈ کے اسٹور میں جا کر مما نے کئی ایک چیزیں خرید ڈالیں، میں خریداری کرنے جاتی تو سو، سو بار سوچتی مگر وہ کھلے دل سے بچوں کے استعمال اور ضروریات کی اشیا لیتی چلی جا رہی تھیں۔

سامان اٹھا کر لانے والے لڑکے کو مما نے ہرے رنگ کا نوٹ ٹپ میں دیا تو وہ انہیں ماتھے تک ہاتھ لے جا کر مشکور انداز میں سلام کر کے چلا گیا۔

گاڑی کی ڈکی اور پچھلی سیٹ بھی سامان کے تھیلوں اور ڈبوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنا سامان دیکھ کر مما کے خلوص اور پیار پر مجھے یقین آنے لگا تھا، میں چشم تصور میں ایک ننھے سے گل گوتھنے وجود کو ان چھوٹے، چھوٹے ملبوسات میں ملبوس دیکھنے لگی۔ اس سے قبل میری چشم تصور کے لیے کوئی ٹھوس چیز نہ تھی، ایک دم مجھے وہ نرم، نرم کمبل میں لپٹا ہوا، نہا کر تولیے میں لپیٹا ہوا وجود اپنے پاس محسوس ہونے لگا۔ بچوں کے ننھے وجود سے جن قدرتی خوشبوؤں کو میں

نے کبھی محسوس کیا تھا، وہ خوشبو مجھے اپنے اردگرد پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''جہاں آپ کا دل چاہے مما......'' میں نے اپنے خیالوں سے چونک کر کہا۔ ''مجھے تو اسلام آباد میں کھانے پینے کی اچھی جگہوں کا اندازہ نہیں ہے۔''
''اچھا تو تمہیں کیا نور پور میں کھانے پینے کی اچھی جگہوں کا اندازہ ہے؟'' اپنی طرف سے انہوں نے مذاق کیا تھا مگر اتنا بھونڈا مذاق کہ میرا دل چاہا کہ میں ان سے گھر واپس چلنے کو کہوں۔ مصلحتاً خاموش تھی، ان کا موڈ اگر کچھ دنوں سے اچھا چل رہا تھا تو میں اسے اچھا ہی رہنے دینا چاہتی تھی۔
''سوری مذاق کررہی تھی۔'' میری خاموشی سے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھے ان کی حسِ مزاح پسند نہیں آئی تھی۔
''کوئی بات نہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''میرے لیے نور پور سے تعلق ہونا کوئی طعنہ نہیں ہے۔''
''اچھا بتاؤ کہ تمہیں کہاں کے باہر کے کھانوں کا اندازہ ہے؟'' انہوں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔
''کالج کے بعد زیادہ تر لاہور میں رہے مما...... پھر پڑھائی ختم ہوئی تو بھی لاہور جانا آنا زیادہ رہا، وہاں مہر پھپھو اور گل پھپھو ہیں...... اسلام آباد تو ہم صرف زائنہ کی شادی پر آئے تھے یا بہت پہلے چاچو کو جب ہارٹ اٹیک ہوا تھا پھر جب دادا جان اسپتال میں تھے۔''
''اچھا......'' انہوں نے کہا۔ ''چلو بعد میں تم سے پوچھوں گی کہ تمہیں لاہور میں کون سی جگہ کا کھانا پسند ہے کیونکہ مجھے لاہور کا بالکل آئیڈیا نہیں ہے۔ پہلے بتاؤ کہ کس طرح کا کھانا کھایا جائے......''
''سب کھالیتی ہوں مما......'' میں نے کہا۔ ''جو آپ کا دل چاہ رہا ہے وہ کھاتے ہیں آج!''
''چائنیز کھائیں؟''
''جی ٹھیک ہے......'' میرے اثبات میں سر ہلانے پر انہوں نے گاڑی کا رخ میریٹ کی طرف موڑا۔ حالت تو میری کوئی نہیں تھی یوں لور، لور پھرنے والی، کوئی واقف مل جاتا تو میں شرمندہ سی ہوجاتی تھی۔ ایسے حلیے میں آرام سے گھر بیٹھنا چاہیے۔
''اچھا...... تو لاہور میں تمہیں سب سے زیادہ کیا پسند ہے مطلب کہاں کا کھانا؟'' کھانے کا آرڈر دے کر انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ ویٹر انگور کا تازہ جوس میز پر کرسٹل کے خوب صورت گلاسوں میں رکھ کر گیا تھا۔
''سچ پوچھیں تو...... مجھے اپنی یونیورسٹی کی کینٹین کے سموسے اور چاٹ ابھی تک سب سے اچھے لگتے ہیں۔'' انہیں بتاتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں کچھ اتار چڑھاؤ آئے۔
''بھئی میں وہاں جاکر تو سموسے اور چاٹ نہیں کھاسکتی بیٹا......'' انہوں نے ہنس کر کہا۔
''کیوں نہیں کھاسکتیں؟'' میں نے بھی ہنس کر کہا۔ ''میں اور تمنا جاکر لے آئیں گے۔''
''اصل میں میں ایسی الا بلا چیزیں کھاتی بھی نہیں...... یہ ٹھیلوں اور ریڑھیوں والی چیزیں......!'' انہوں نے الفاظ کے پتھر پھینکے۔ ''کوئی اچھی جگہ بتاؤ لاہور کی؟'' جوس کا گلاس خالی کرکے انہوں نے نزاکت سے اپنے منہ کو ٹشو پیپر سے صاف کیا۔
''لاہور تو گڑھ ہے مما...... کھانے پینے والی چیزوں کا! آپ جیسے sophisticated لوگوں سے لے کر ہم جیسے ٹھیلوں اور ریڑھیوں سے کھانے والے لوگوں تک کے لیے...!''
''ارے تم برا مان گئیں......'' انہوں نے میرے گال کو تھپکا۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں خاموش رہی۔
کھانا میز پر لگا دیا گیا تھا، اس کی ورائٹی اور مقدار اس سے کہیں زیادہ تھی جو ہم کھاسکتے تھے۔ اس سے قبل یہاں کا کھانا میں نے اپنی شادی کے بعد کی دعوتوں میں ہی کھایا تھا۔ کھانا اچھا تو تھا مگر اس کی مقدار...... بہت سا

کھانا بچ گیا تھا۔

''ہم بچا ہوا کھانا پیک کروالیں مما؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''ارے نہیں بیٹا...... ہم بچا ہوا کھانا پیک نہیں کرواتے......'' انہوں نے نخوت سے کہا۔

''کیوں مما؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کھانا آپ نے خریدا ہے...... اس کے لیے آپ بھاری رقم ادا کریں گی، اگر آپ کھانا پیک کروا کے ساتھ نہیں لے جائیں گی تو کیا یہ آپ کی وہ رقم واپس کردیں گے؟'' ہم نے تو میز پر پڑے کھانے کا پچیس فیصد بھی نہ کھایا تھا۔

''بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کہیں...... کھانا نہ کھانے پر رقم کہاں واپس ہوتی ہے؟''

''بہت سا کھانا تو ہم نے چھوا بھی نہیں مما......'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''اس کھانے کو یہ لوگ کیا کریں گے؟''

''بھئی جھوٹے کھانے کو پھینک دیں گے اور جو کھانا ہم نے چھوا بھی نہیں اسے کسی اور کے آرڈر پر سرو کردیں گے...... یا ممکن ہے کہ یہ ویٹر وغیرہ کھالیتے ہوں۔''

''یہاں دن بھر سب میزوں پر جانے کتنا کتنا کھانا بچتا ہے مما...... ویٹروں کو کمی نہیں ہوگی مگر یہ کھانا دو بار بیچا جائے اور ہوٹل کو اس کی قیمت دو بار ملے مگر ان کے ریکارڈ میں ایک بار لکھا جائے...... یا اسے کوڑے دانوں میں پھینک کر ضائع کردیا جائے، مجھے دونوں طرح سے دکھ ہوگا۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''کاش یہ کھانا کسی مستحق کو مل جائے۔''

''گھر پر سب کو تازہ کھانا کھانے کی عادت ہے امرت......'' انہوں نے حتمی انداز سے کہا۔ ''پیک کروا کے لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کوئی نہ کوئی مستحق مل جائے گا مما...... آپ پلیز مجھے یہ کھانا پیک کروالینے دیں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میں ذرا واش روم تک جارہی ہوں۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو میرا والٹ...... میری غیر موجودگی میں جو کرنا ہے وہ کرلو اور پے منٹ کرکے گاڑی میں آجانا، میں واپس یہاں ٹیبل پر نہیں آؤں گی۔ تم اپنی ضد پر قائم ہو لیکن میرے لیے یہ کروانا ناممکن ہے اور اگر تم میری یہاں موجودگی میں ایسا کرواؤ گی تو میرے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔'' اپنا والٹ میز پر رکھ کر وہ واش روم چلی گئیں، میں نے شکر کیا کہ انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

کھانا پیک کروا کے میں نے بل ادا کیا۔ کچھ ٹپ ویٹر کو دی، پیک کیا ہوا کھانا لیا اور گاڑی کی طرف چل دی۔

راستے میں سوچ رہی تھی کہ جیسے دو براؤن نوٹ میں نے اس کھانے کے بل کے دیے تھے، ویسے چار نوٹ ...... مہینہ بھر محنت کرکے، موسموں کی شدتیں اور تین، تین باس کے مزاج برداشت کرکے کبھی میں کمایا کرتی تھی۔ اتنے ہی نوٹ ساجدہ اور مقبول چاچا کو مہینہ بھر اپنا خون پسینہ ایک کرکے اور مما جیسی سخت مزاج مالکن کی جھڑکیاں اور سختیاں برداشت کرکے ملتے ہیں۔ باقی ملازمین کی بھی کئی بار گھر کے سب لوگوں کے ہاتھوں معمولی غلطیوں پر درگت بنتے دیکھ چکی تھی۔ صرف انہیں زدوکوب کرنا باقی رہ جاتا تھا، کئی بار تو غلطی اتنی معمولی ہوتی کہ صرف ایک آواز پر وہ دوڑتے ہوئے کیوں نہ چلے آتے تھے۔

☆☆☆

''باجی...... ایک درخواست کروں آپ سے؟'' اس دن میں کچن میں گئی تھی کہ مقبول چاچا سے ذرا بھاری روٹی پکوا کر امو جان کی ہدایت کے مطابق، چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے کرکے باہر پرندوں کو ڈالوں، (ان کا کہنا تھا کہ یوں صدقہ کرنے سے اللہ تعالیٰ بچے کی پیدائش میں آسانی فرماتا ہے) ساجدہ وہاں ایک ملازم لڑکے کے ساتھ مل کر رات کے کھانے کے برتنوں کی تیاری کروا رہی تھی، مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''ہاں، ہاں کہو ساجدہ!'' میں نے مقبول چاچا کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ ''چاچا جانے کہاں گئے ہیں، روٹی پکوانا تھی۔'' میں بولی۔

''آپ سے درخواست کرنا تھی جی ایک......''

''ہاں......'' میں نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ جی...... آپ جو تازہ روٹی پکوا کر باہر دن میں تین دفعہ پرندوں کو ڈالتی ہیں ناں اگر اس کے بجائے بچی ہوئی باسی روٹیاں بھگو کر پرندوں کو ڈال دیں۔ وہ باہر وہاں ٹوکری میں ہر روز کی بچی روٹیاں رکھی جاتی ہیں...... اگر کوئی نہ لے کر جائے تو اگلے دن بڑے کوڑے دان میں چلی جاتی ہیں۔''

''اوہو......'' میں نے باہر جا کر ٹوکری میں سوکھی روٹیاں دیکھ کر تاسف سے کہا۔ ''کتنا رزق ضائع جاتا ہے اس طرح، روٹی حساب سے کیوں نہیں پکاتے، جتنی کھائی جاتی ہے؟'' رزق کی ناقدری پر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا کیونکہ ہم نے بچپن سے یہ دیکھا تھا کہ ایک نوالہ رزق بھی ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔

''اصل میں جی بیگم صاحبہ کا آرڈر ہوتا ہے...... روٹیاں پکتی تو حساب سے ہی ہیں مگر کوئی کھاتا ہے کوئی نہیں کھاتا۔ کوئی میز سے ادھورا کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے، کوئی ناپسندیدہ سالن دیکھ کر پڑا ایا برگر آرڈر کر دیتا ہے اور یوں یہ روٹیاں ضائع چلی جاتی ہیں۔''

''ان روٹیوں کا کوئی نہ کوئی مصرف تو ہو سکتا ہے...... ضائع کیوں جاتی ہیں، ملازمین کیوں نہیں کھاتے یہ روٹیاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ملازمین کھانا مغرب کے فوراً بعد کھا لیتے ہیں، ان کے لیے روٹیاں تنور سے آتی ہیں کیونکہ اتنی زیادہ روٹیاں پکانا ایک بندے کے بس کا کام نہیں۔'' ساجدہ نے بتایا۔ ''اگر آپ لوگوں کا کھانا ختم ہونے کا انتظار کریں تو نصف رات ہو جاتی ہے......'' واقعی وہ درست کہہ رہی تھی، ہمارے رات کے کھانے کے اوقات میں بڑی بے ترتیبی تھی۔

''تو کیا ہر روز اتنی ہی روٹیاں ضائع جاتی ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ جی......'' وہ ہچکچائی۔ ''کچھ تو میں لے جاتی ہوں اور کچھ کوڑے میں ضائع چلی جاتی ہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں توبہ کی۔ رزق...... جسے اللہ کی کوئی بھی مخلوق کھا سکتی ہو اسے کوڑے کی نذر کر دینا، ہم نے تو یہی سنا تھا کہ جہاں رزق کی قدر نہیں کی جاتی وہاں رزق سے برکت اور خیر اٹھ جاتی ہے۔

''آپ ان روٹیوں کا کیا کرتی ہو ہر روز؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''کچھ روٹیاں کیوں لے کر جاتی ہو، ساری کیوں نہیں لے جاتی ہو؟''

''رات کو جو روٹیاں لے کر جاتی ہوں وہ صبح تک ذرا سخت ہو جاتی ہیں، پانی اور تیل لگا کر بچوں کو پراٹھے بنا دیتی ہوں اور کبھی ان پر بیسن کا مسالا چڑھا کر تل کر اسکول کے لیے انہیں ہمراہ بھی کر...... دیتی ہوں۔ زیادہ سخت ہو جائیں تو بیچ کر چار پیسے آ جاتے ہیں۔'' اس کی بات سے میرے اندر دکھ بھر گیا۔ اس گھر میں میرے اختیار کی ایک حد تھی ورنہ میں جو روٹی پکوا کر پرندوں کو ڈالتی تھی، وہ تو میں اسے دے دیتی۔ میرے ذہن میں جھما کا ہوا...... ہاں میں ایسا کر تو سکتی ہوں! تین روٹیاں...... بھاری سی میں ہر روز پکواتی تھی، اس بات کا تو مما کو علم تھا۔ اگرچہ انہیں معلوم نہ تھا کہ ہر رات کو گھر میں بچنے والی روٹیوں کا کیا مصرف ہوتا تھا۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے ساجدہ؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''جی تین ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''چلو میں چاچا کو بتاؤں گی کہ تین چار پراٹھوں کے لیے گوندھا ہوا آٹا ہر روز رات کو جاتے ہوئے تمہیں

دے دیا کریں گے...... پرندوں کو میں سوکھی روٹیاں بھگو کر ڈال دوں گی۔''

''وہ جی...... میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔'' وہ گھبرا کر بولی، غالباً ڈر گئی تھی۔

''جانتی ہوں کہ تمہارا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے ساجدہ!'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم فکر نہ کرو، پرندوں سے زیادہ تمہارے بچے پیارے بھی ہوں گے، اللہ کی بہتر اور زیادہ ضرورت مند مخلوق بھی اور نرم روٹی کے مستحق بھی!'' وہ ممنون ہوئی۔ خوشی تو تب ہوئی جب چاچا کو میں نے ایسا کہا تو وہ بھی مشکور ہوئے اور مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

''ساجدہ میری سگی بھانجی ہے جی...... اور بڑی تنگی اور غربت سے جواں عمری کی بیوگی کے ساتھ اپنے بچے پال رہی ہے، انہیں پڑھا رہی ہے...... کوارٹر تو ملا ہوا ہے مگر اور بڑے اخراجات ہوتے ہیں غریب کے، میں بھی اپنی تنخواہ میں سے اس کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا ہوں۔'' میں دل سے مطمئن ہوئی تھی۔

اس روز ہوٹل سے جو کھانا میں نے پیک کروایا تھا، اس کا ایک مقصد تھا، وہ بلاشبہ ساجدہ کے گھر جانا تھا، اس کے بچوں کو بھی کبھی کبھار اچھا کھانا کھانے کا حق تھا ناں! جب سے مجھے ساجدہ کے حالات کا علم ہوا تھا میں کسی نہ کسی طرح اس کے بچوں کے لیے کچھ کھانے کو بھجوا دیتی تھی۔

☆☆☆

''باجی میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ وہ کھانا میرے بچوں کے لیے کتنا زیادہ اور کس نعمت جیسا تھا......'' ساجدہ مجھے اگلے روز بتا رہی تھی۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے......''

''بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو مجھے ساجدہ! اللہ تعالیٰ میرے لیے آسانیاں کرے۔ جوں، جوں وقت قریب آ رہا ہے مجھے زیادہ ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے باجی!'' وہ ہنسی۔ ''بچے پیدا کرنا تو عورت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے......''

''اتنا بھی آسان نہیں ہے......'' میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے لیے یہ پہلا، پہلا تجربہ تھا مگر وہ تو تین بچے بہت پہلے پیدا کر کے بھول بھی چکی تھی، اسی لیے اس طرح کہہ رہی تھی۔

''آپ اتنی اچھی ہیں، بہت سے لوگ آپ کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں۔'' وہ خلوص سے کہہ رہی تھی۔ ''گھر کے سارے ملازمین آپ کی اچھی عادتوں کی تعریف کرتے ہیں، صرف آپ ہیں اس گھر میں جو ہم سب کو ملازمین کے علاوہ انسان بھی سمجھتی ہیں۔''

''تم سب اس گھر کے لوگوں کی خدمت کرتے ہو، اس کے صلے میں ہماری طرف سے بھی کچھ نہ کچھ کرنا تو بنتا ہے ناں۔'' میں نے اسے کہا۔ ''بعض اوقات تو چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ہی بہت زیادہ ڈانٹ پڑ جاتی ہے تم لوگوں کو۔''

''ارے نہیں باجی...... ہم خدمت گار کیا، تنخواہ کے عوض کام کرتے ہیں اور جو ہمیں تنخواہ دیتے ہیں، سر چھپانے کو ٹھکانے دے رکھے ہیں، ان کی ڈانٹ ہمیں بری نہیں لگتی۔'' وہ کہہ رہی تھی مگر میں سوچ رہی تھی کہ وہ ہمارے تنخواہ دار ملازم تھے، زر خرید غلام تو نہیں...... ''بڑے صاحب تو بہت اچھے ہیں، ہم سب لوگوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں، وقت بے وقت تنخواہ کے علاوہ بھی مدد کر دیتے ہیں اور کیا چاہیے ہمیں اس کے علاوہ...... کہیں اور جانے کا سوچتے ہی نہیں، کیا معلوم وہاں اس سے برے حالات کا سامنا ہو۔'' باتوں ہی میں وہ کہہ تو گئی تھی ناں کہ یہاں حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ شاید اس کا سبب یہی تھا کہ اس گھر میں انسانوں کے انسان ہونے کا معیار مختلف تھا اور ملازمین ایسی کیٹیگری میں نہیں آتے کہ ان کے ساتھ انسانوں کی طرح بات چیت کی جائے۔

''اچھا...... بچے تو خوش ہوئے ناں تمہارے؟'' میں نے بات بدلی۔
''بہت زیادہ باجی! آپ سوچ نہیں سکتیں باجی......'' اس نے آنکھیں میچ کر کہا۔ ''اور ہاں آپ کو ایک زندہ لطیفہ سناؤں؟''
''ہائیں...... یہ زندہ لطیفہ کیا ہوتا ہے بھئی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''آپ کو نہیں پتا؟'' وہ سٹپٹائی اور حیرت سے سوال کیا۔
''نہیں بھئی...... تم بتاؤ!''
''کچھ لطیفے تو بنائے جاتے ہیں، جھوٹ پر مبنی، یوں ہی کسی بے عزتی کرنے کے لیے!'' اس نے وضاحت کی۔ ''کسی کی دل آزاری کر کے دوسروں کے ہنسنے کا سامان کیا جاتا ہے۔''
''ہوں......'' میں نے ہنکارا بھرا۔
''مگر زندہ لطیفہ وہ ہوتا ہے جو کوئی مزاحیہ بات کوئی اپنی معصومیت یا سادگی میں کہہ جائے...... مثلاً جیسے میں آپ کو اپنے بیٹے کا لطیفہ سنانے لگی ہوں۔''
''تم پڑھی لکھی ہو ساجدہ؟'' میں اس کی وضاحت سے متاثر ہوئی تھی۔
''جی باجی...... میٹرک کیا ہے میں نے۔ پھر ماں باپ مر گئے اور ماموں نے اپنے جیسے کسی کے ساتھ بیاہ دیا، بہت اچھا تھا، میری بہت پروا کرتا تھا...... زین صاحب جیسا بے پروا نہیں تھا......'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا مگر اس کے اس بیان کو اہمیت نہ دی، اسے نظر انداز کیا تاکہ وہ اس بات کو نہ اہم سمجھے اور نہ دُہرائے۔ مجھے یک دم سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کی اس بات پر کیا ردِعمل ظاہر کروں، کیا کہوں۔ ''تھا بیچارہ دل کا دائمی مریض، انہی حالات میں پستے، روتے پیٹتے اور غربت سے جنگ لڑتے، تین بچے بھی پیدا ہو گئے۔ ان بچوں کو بھی کوئی خوشی دینا ہمارے بس میں نہ تھا، خود تنگی سے گزارہ کرتے تھے۔ اس کے علاج کی سکت نہ تھی، سرکاری اسپتالوں میں تو آپ جانتی ہیں کہ کیسا علاج ہوتا ہے، بس جی اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اب میری ساری زندگی اور اس کا محور میرے بچے ہیں......'' وہ اداسی سے بولی۔
''تم کوئی زندہ لطیفہ سنانے والی تھیں ساجدہ؟'' میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔
''آپ کو برا لگا زین صاحب والی بات کا ناں...'' کیسی کائیاں تھی وہ۔ ''سوری باجی! اصل میں مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں یہ سب دیکھتی ہوں، کیسے ناقدرے لوگ ہیں۔''
''ساجدہ......'' میں نے اسے گھُرکا۔
''وہ اصل میں، جب میں گھر کھانا لے کر گئی تھی ناں باجی!'' وہ شروع ہوئی۔ ''تو وہ ناں، نوڈلز (چاؤمن) دیکھ کر میرا بیٹا ڈر گیا!'' وہ کھی، کھی کر کے ہنسی۔
''ڈر گیا وہ کیوں بھئی؟''
''کہنے لگا...... بڑی کوٹھی والے لمبے، لمبے کیڑے کیوں پکا کر کھاتے ہیں؟'' اس کی ہنسی ہی نہ رک رہی تھی۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی، میں تو یہ سوچ کر ڈر گئی تھی کہ کہیں کھانے میں کوئی کیڑا نہ نکل آیا ہو اور وہ غریب پوری پلیٹ کو ہی کیڑوں کی پلیٹ سمجھ گیا تھا۔ ''مگر جی اس نے کیڑے سمجھ کر نوڈل تو نہ کھائے مگر ندیدے نے ان میں سے چکن کی بوٹیاں ساری چن، چن کر کھا لیں......''
''اور تم نے کیڑوں کا کیا، کیا؟'' میری بھی ہنسی نہ رک رہی تھی۔
''وہ جی میں نے خود کھا لیے......'' اس نے ہنستے، ہنستے کہا۔ ''اتنے سارے تو نہیں کھا سکتی تھی، اس لیے باقی کو

مسل کر ان میں آلو ابال کر ڈالے اور مسالے وغیرہ ڈال کر ان کے کباب بنا لیے...... آج رات کو کھانے میں انہی کیڑوں کے کباب کھائے گا مگر اسے علم بھی نہ ہوگا کہ وہ کیڑوں کے کباب کھا رہا ہے......'' وہ اور زور سے ہنسی۔

''جب کھا چکے گا تو پھر اسے بتاؤں گی!''

''ایسے نہ کرنا ساجدہ...... بچوں کو ایسے چھوٹے، چھوٹے دھوکے سے کر اگر ان کی تربیت کرو گی تو وہ بھی یہی سیکھیں گے۔'' میں نے اسے روکا۔ ''میں تمہیں کچے نوڈلز کا ایک پیکٹ دوں گی، وہ لے جانا اور اسے تفصیل سے بتانا کہ نوڈلز کیا ہوتے ہیں، کچے اور پھر ابال کر اسے دکھانا۔'' اس کے لطیفے کو تو میں نے انجوائے کیا مگر اس بچے کو علم تو ہونا چاہیے کہ نوڈلز کیا ہوتے ہیں۔ غربت کے بھی کیا، کیا درجے ہیں۔

☆☆☆

''ہمیں گاؤں نہیں جانا چاہیے کیا زیبا......؟'' چاچو نے کھانے کی میز پر کہا تھا۔ ''سرمد کا بیٹا، بڑی آپا کا پہلا پوتا، ان کے گھر کا پہلا چشم و چراغ، اسے ملنے اور انہیں مبارک باد دینے کو جانا چاہیے ناں!''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں، میں تو خود سوچ رہی تھی اور میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ وہ کل اس بچے کا عقیقہ کر رہی ہیں، ساتھ ہی ارد گرد کے سارے گاؤں اور اپنے گاؤں میں بھی مٹھائی تقسیم ہوگی، ہمیں بھی دعوت دی ہے انہوں نے...... اور تو کوئی نہیں جا سکتا، میں اور آپ چلتے ہیں۔ ویسے بھی میں سوچ رہی تھی کہ کتنے عرصے سے ہم عائشہ بھابی کی طرف نہیں گئے۔'' مما کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا تو لگا ہی مگر ساتھ ہی دل ہمکنے لگا کہ میں بھی چلی جاتی، سب سے ملاقات ہو جاتی۔ میں دیکھتی کہ رانی پر ماں بن کر کیسا روپ آیا تھا اور سرمد بھائی کے ساتھ وہ خوش بھی ہے کہ نہیں مگر ظاہر ہے کہ کمر کے درد کی وجہ سے سفر کی اجازت نہ تھی، اس لیے تڑپ کر رہ گئی۔

''میں چلوں ساتھ مما؟'' حسنہ کے سوال پر میں نے ہی نہیں بلکہ سب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''تم...... تم کیا کرو گی وہاں؟'' مما نے فوراً کہا۔

''اگر بچی جانا چاہتی ہے تو اسے کیوں منع کرتی ہو؟'' چاچو نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''ویسے بیٹا تمہیں گاؤں جانے کا شوق تو کبھی نہیں رہا تو آج کیسے؟''

''پاپا مجھے گاؤں برا نہیں لگتا مگر اب تو میں چھوٹے سے بے بی کو دیکھنے جانا چاہتی ہوں...!''

''چلو بھئی تیاری کرو، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' چاچو نے خوش دلی سے کہا۔ ''اور ہاں...... رات رکنا ہو گا، اپنا سامان اسی حساب سے ساتھ رکھ لینا!''

''رات رکنے کی کیا ضرورت ہے؟'' مما نے اعتراض کیا۔ ''سویرے نکلیں تو شام تک آرام سے واپس آ سکتے ہیں!''

''بھئی میں گاڑی خود چلاؤں گا اور میں ایک دن میں جانے اور آنے کا سفر نہیں کر سکتا!''

''گاڑی خود کیوں چلانی ہے...... ڈرائیور جو ہے۔''

''گھر پر گاڑی اور ڈرائیور کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے، امرت کے لیے، اس لیے اسے گھر پر چھوڑوں گا۔'' چاچو کی بات پر میرا چہرہ لال ہو گیا، یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔

''زین ہے ناں یہاں پر کسی ایمرجنسی کے لیے جمال!''

''جیسے میں زین کو جانتا نہیں...... اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے، اسے اتنی پروا ہوتی تو مسئلہ ہی کیا تھا۔'' چاچو اور مما کے درمیان معرکہ شروع ہو چکا تھا، حسنہ اٹھ کر چلی گئی اور باقی لوگ تماشائی بنے خاموشی سے کھانا ٹونگتے رہے۔

☆☆☆

''پاپا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں لے کر علیحدہ ہو جاؤں۔'' زین نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے انکشاف کیا۔

''چاچو نے؟'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔

''تمہارے چاچو کو میں پاپا کہتا ہوں اور تمہیں علم ہے کہ میرے ایک ہی پاپا ہیں۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''سوری...... میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔'' مجھے اس کا موڈ غارت کرنے کا شوق کبھی نہیں رہا تھا۔ ''اصل میں مجھے حیرت ہوئی کہ چاچو ایسا کیوں کہیں گے۔''

''یہ تو انہی کو علم ہوگا میری جان......'' اس نے لاڈ سے کہا۔ ''میں تو جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کیسا لگا سن کر، اگر ایسا ہو جائے تو؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کسی بھی حال میں اور کسی بھی جگہ پر تمہارے ساتھ رہنے میں مگر......''

''مگر کیا؟'' اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہم کہاں جائیں گے...... کس طرح گزارہ ہوگا اور کل کلاں کو بچے کے ساتھ، میں کس طرح تنہا بچے کو سنبھالوں گی؟''

''بچے تو دنیا کی ساری مائیں سنبھالتی ہیں...... تمہیں ماں بننے کا اتنا شوق تھا تو یہ علم ہونا چاہیے کہ بچوں کو مائیں ہی سنبھالتی ہیں۔''

''ہوں......'' میں اس کے اسی فقرے میں الجھ گئی کہ مجھے ماں بننے کا شوق تھا۔ جیسے مجھے ماں بننے کا بچپن سے شوق تھا اور میں نے اب تک کی ساری محنت ماں بننے کے لیے ہی کی تھی۔

''رہی بات گزارہ کرنے کی تو وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو پاپا کو علم ہوگا، وہی تو یہ تجویز دے رہے ہیں بلکہ شاید جلد ہی فیصلہ صادر کر دیں گے...... انہیں ہی سب کچھ دینا ہوگا۔ میں اپنی تنخواہ میں تو کچھ نہیں کر سکتا، میں تو اب بھی مما سے ہر مہینے پیسے ادھار لیتا ہوں......'' وہ ہنسا۔ ''وہ ادھار جو کبھی واپس ہوئے نہ ہوں گے۔''

''تو ایسا کیسے اور کب تک چلے گا؟''

''یہی تو مسئلہ ہے جو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، میری کم عقل اور پیاری، پیاری بیوی......'' طنزیہ لہجہ۔

''مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟'' میں نے بیچارگی سے کہا۔ ''اگر چاچو نے فیصلہ کر لیا ہے تو۔''

''چاچو کے فیصلوں کو اس گھر میں دھونس سے مما اور پیار سے تم تبدیل کروا سکتی ہو۔''

''چاچو کے بچوں میں سے جو چاہے ان سے فیصلوں میں لچک پیدا کروا سکتا ہے...... والدین کا ہر فیصلہ اولاد کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ ہر وہ اولاد جو ماں باپ کی فرمانبردار اور اطاعت گزار ہوتی ہے۔ ان سے پیار کرتی ہے، وہ اپنے والدین سے جو چاہے منوا سکتی ہے۔ اولاد ہی تو ماں باپ کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے!'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اس کے لیے اولادوں کا تمہاری طرح خوش قسمت ہونا ضروری ہوتا ہے، میرے جیسے بچے تو صرف لعن طعن ہی پا سکتے ہیں والدین کی، بالخصوص باپوں کی۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو زین؟'' میں نے حیرت سے پلٹا کھایا۔

''ایسا ہی ہے امرت...... میری کوئی خواہش پاپا نے آج تک پوری نہیں کی۔''

''تم یقیناً مذاق کر رہے ہو زین، تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا، اس کے بات کرنے کے

انداز سے مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سنجیدہ ہوتا تھا یا طنز کر رہا ہوتا تھا۔

''تم بتاؤ...... کیا دیا ہے انہوں نے مجھے، کیا، کیا ہے میرے لیے انہوں نے؟'' وہ چبا، چبا کر بول رہا تھا، ایسا وہ مذاق کی حالت میں بھی کبھی نہیں کرتا تھا۔

''تم نے جو چاہا اور جہاں سے چاہا پڑھا...... اس کے لیے چاچو نے تم پر لاکھوں نہیں کروڑوں خرچ کیے ہیں......'' میں نے دوبدو کہا۔ ''تم نے چھ سال تک ملک سے باہر رہ کر پڑھا ہے، ایک دن بھی تم نے کہیں کام نہیں کیا اور تمہاری تعلیم کے علاوہ رہائش اور باقی تمام اخراجات چاچو نے یہاں بیٹھے ہوئے اٹھائے ہیں...... تم دیکھ لو۔ ابھی عارب نے باہر جانے کا کہا ہے تو چاچو نے اسے انکار کر دیا ہے کہ وہ چار سال یہاں پر پڑھ کر بیچلر کرے اور پھر ماسٹرز کرنے کے لیے باہر جائے۔ تم تو چاچو کی سب سے پہلی اور بڑی اولاد ہو، ان کا پیارا سا بیٹا، ان کی چاہتوں اور امیدوں کا مرکز......''

''ہونہہ...... ان کی پھٹکاروں اور جھڑکیوں کا واحد نشانہ!'' اس کے لہجے میں کتنی حقارت تھی، چاچو دیکھ لیتے تو... سن لیتے تو پریشان ہو جاتے۔

''کون سی چیز ہے جو تم نے مانگی اور انہوں نے نہیں دلوائی...... تمہارے کس دوست کے پاس تمہارے جیسی گاڑی ہے، تم جیسے لباس کوئی خریدنا افورڈ کر سکتا ہو، تمہارے ہاتھ پر باندھی ہوئی گھڑی جیسی گھڑی خریدنے کی اوقات رکھتا ہو اور تم جیسا موبائل رکھتا ہو؟ جو نیا ماڈل آتا ہے اسے خریدنے والوں میں ملک بھر میں چند پہلے لوگوں میں تمہارا اشمار ہوتا ہے۔'' میں نے اسے آئینہ دکھایا۔ ''اور تم سمجھتے ہو کہ ہر ماہ جو رقم تم اپنی تنخواہ کے علاوہ ماما سے لیتے ہو وہ ماما کہیں اور سے لے کر آتی ہیں؟ یقیناً وہ چاچو سے لیتی ہیں اور وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں جتلاتے...... تمہاری بیوی اور آنے والے بچے کے سارے اخراجات بھی چاچو ہی بالواسطہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھائیں گے، تم نے تو کبھی خود ان پر کچھ خرچ نہیں کیا۔''

''ہونہہ...... گاڑی، گھڑی، موبائل فون، لباس اور جوتے...... تمہیں لگتا ہے کہ یہی سب کچھ زندگی ہے؟'' اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''اور کیا ہوتا ہے زندگی میں؟ اور کیا خواہشات ہوتی ہیں نوجوانوں کی؟''

''انہوں نے مجھے کبھی اپنی خوشی سے جینے نہیں دیا...... مجھے وہ نہیں دلایا جو میں چاہتا تھا۔''

''رئیلی؟'' اب طنز سے ہنسنے کی باری میری تھی۔

''تم نے سب کچھ اپنی خوشی اور مرضی سے کیا زین...... پڑھائی سے لے کر شادی تک، سب کچھ تم نے اپنی خوشی سے کیا!''

''انہوں نے مجھے کہا کہ بزنس پڑھو تو میں نے بزنس پڑھا حالانکہ میری خواہش اداکار اور ماڈل بننے کی تھی، انہوں نے کہا کہ شریف گھروں کے بچے ایسے کام نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ پڑھنے کے لیے باہر چلے جاؤ، میں اٹھارہ برس کی عمر میں گھر سے نکال دیا گیا۔ پڑھ چکا تو میرے لیے اس ملک میں درجنوں آفرز اور بہترین آفرز تھیں جہاں سے میں نے جان مار کر اچھے گریڈز کے ساتھ ڈگری لی تھی۔ مگر انہوں نے کہا کہ مجھے لوٹ کر واپس آنا ہے...... میں واپس آ گیا۔ میں اس ماحول میں خود کو مس فٹ پاتا ہوں امرت جہاں سے میں اتنی کم عمری میں ہی نکالا گیا تھا۔ انہیں میرے طور طریقوں، میرے دوستوں، میری عادتوں پر اعتراضات ہیں امرت، میں یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتا، یہ سب کچھ میرے لیے اہم ہے، یہ چیزیں میری فطرت ثانیہ بن چکی ہیں۔ میں جس عمر میں گھر سے نکالا گیا اس عمر میں نوجوانوں کو ماں باپ کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے نہیں ملی تو مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ سگریٹ،

شراب اور جنسِ مخالف سے دوستی کی کوئی حدود ہوتی ہیں، میں جس ماحول میں تھا وہاں سے میں نے یہی سب کچھ سیکھا اور اپنایا۔''

''تو تم شراب بھی......'' اس سارے لیکچر میں مجھے اس کی یہی بات نئی لگی تھی، سگریٹ اور لڑکیوں سے دوستیاں تو میں جانتی تھی، ان کی حدود کیا تھیں......اس کا علم نہ تھا۔

''رہی بات شادی کی......تو وہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔'' اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''پھر کبھی سناؤں گا۔''

''ابھی سناؤ زین......اس وقت اتنا کچھ سن رہی ہوں تو وہ بھی سنا دو۔''

''اس شادی میں میری مرضی شامل نہیں تھی، جہاں میں شادی کرنا چاہتا تھا وہاں پاپا کو منظور نہ تھا۔ ان کی ضد تھی کہ خاندان کی کوئی لڑکی ان کی بڑی بہو بنے گی، انہوں نے مجھے عباس چاچا کی بیٹیوں، تینوں پھپھو کی بیٹیوں اور تم دونوں بہنوں میں سے کسی کا انتخاب کرنے کا ''حق'' دے دیا تھا۔'' وہ رکا۔ ''یہ بھی ان کا بڑا احسان تھا۔''

''تو ان سب میں سے تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟'' میں نے بہ مشکل سوال کیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے بیچ مجبوری کا رشتہ قائم ہوا، میں سمجھی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی تھی۔''

''تمنا کو میثاق، تحریم کو اس کا ایک کلاس فیلو، فاطمہ کو کبیر بھائی اور تمہیں......'' وہ رکا، میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا، میری نظروں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ''حرا کی شادی ہوگئی، طوبیٰ بہت چھوٹی ہے، عباس چاچا کی دو بیٹیاں منگنی شدہ ہیں باقی دو مجھے پسند نہیں تھیں۔''

''تم میرے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔'' میں نے جی کڑا کے کہا۔

''سرمد بھائی کی خواہش تھیں تم!'' اس کے کہنے پر میرے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ''جانتا ہوں یار کہ ان کی خواہش یک طرفہ تھی، تم سے پوچھا گیا تھا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ تمہارا دل ان چھوا تھا، اسی لیے تمہارا آپشن مجھے بہتر لگا......''

''بس؟'' دل میں شکر ادا کیا کہ اسے کامل کے بارے میں علم نہ تھا......ان چھوا دل! میں نے اس کی طرف چور نظروں سے دیکھا، دل میں خیال آیا کہ میری اس سے شادی ہوئی جب کہ وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا، میں بھی ماضی میں ایک ایسے ہی خواب کو آنکھوں میں سجا چکی تھی۔ اس نے مجھ سے پورا سچ کہہ دیا تھا، مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ایسا کرتی کیونکہ ہمارے ہاں عورت کا ماضی بے داغ ہونا اہم ہے، مرد کے ماضی پر حال کی گرد پڑ جاتی ہے۔

''تم مجھے اچھی بھی لگیں ان سب میں، خوب صورت، سادہ، بے نیاز سی اور ذہین بھی!'' اس نے مجھے پسندیدگی کی سند دی۔ ''سوچا تھا کہ ساتھ رہیں گے تو کچھ لگاؤ بھی ہو جائے گا اور یوں بھی اس کی اتنی ضرورت تو نہ تھی، وہ تو مما کا اصرار تھا کہ پاپا کو ناراض نہ کروں کیونکہ وہ بیمار اور دل کے مریض ہیں اور یہ کہ وہ مجھے عاق بھی کر سکتے تھے اور اس صورت میں، میں سڑک پر آ جاتا۔''

''تو صرف اپنے بچاؤ اور ذاتی مفادات کے لیے تم نے مجھ سے شادی کر لی؟''

''کچھ اس سے بھی اہم ہے۔''

''وہ بھی بتا دو زین!'' میں نے کمالِ ضبط سے لب بھینچے۔

''مما نے کہا تھا کہ تمہاری ماں کے اندر ایثار کا مادہ ہے، انہوں نے مشکل حالات اور ضرورت کے تحت، اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی۔ اس لیے جب کچھ وقت گزرے گا، پاپا کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور

میں دوسری شادی کرنا چاہوں گا تو تم بھی مجھے اجازت دے دوگی......'' وہ رکا۔ ''اسی لیے یہ بچہ میری زندگی کے اس حصے کے پلان میں نہیں تھا۔''

''کیا......؟'' میں چیخی۔ ''تم دوسری شادی کروگے؟'' میں ہیجانی کیفیت میں آ گئی۔ ''چھوڑ دوگے تم مجھے؟''

''مجبوری ہے، پاپا مان جاتے تو میں تم سے پہلی شادی ہی نہ کرتا، اسی سے کرتا۔'' وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے ٹائی تبدیل کرنے کی بات کر رہا ہو۔ ''اب حالات ایسے ہیں کہ اس سے شادی دوسری شادی ہوگی، کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اسے اپنے خون سے لکھ کر عہد دیا تھا۔'' اس کی مجبوریوں کی داستان میں ماؤف ہوتے ہوئے ذہن سے سن رہی تھی۔ ''جس دن مما نے تمہیں میرے کسی دوست کے ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا، میں اسی کے ساتھ تھا، اس نے میرے دو دن فون نہ کرنے پر غصے میں آ کر اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی۔'' میں پھٹی آنکھوں سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی، میرے وجود میں زلزلے آ رہے تھے، میرے منہ سے یہ سوال بھی نہ نکلا کہ وہ کس سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

''امرت......تم سے ایک اہم بات کرنا تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''وقت ہے تمہارے پاس، تنہا ہو تو بات ہو سکتی ہے؟'' فون پر سارہ تھی۔

''ہوں!'' میں نے کسمسا کر کہا، آنکھیں ابھی تک بند تھیں، جسم تھکان سے چور تھا۔

''سو رہی ہو اب تک؟''

''ہاں......'' میں نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر وقت دیکھا، ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ''اوہو، اتنی دیر ہو گئی ہے؟''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے پیاری؟''

''ہاں وہ رات دیر تک جاگتے رہے تو......'' میں نے بات کہنے کے بعد احساس ہوا کہ کچھ غلط کہہ دیا تھا میں نے کیونکہ وہ فوراً کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ''چاچو اور ماما گاؤں گئے ہیں تو!''

''کوئی بات نہیں یار...... تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ رات دیر تک جاگنے سے کون منع کر رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم کہو، کچھ خاص بات کرنا تھی تمہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں وہ......'' وہ کچھ کہتے، کہتے جھجک گئی۔

''کیا بات ہے سارہ؟'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا، جانتی تھی کہ وہ کسی مسئلے سے دوچار ہے۔

''ہم مل سکتے ہیں کیا؟ مجھے لگتا ہے کہ فون پر میں بات نہ کر سکوں گی۔''

''ہوں......'' میں سوچ میں پڑ گئی۔ رات کافی ٹینشن اور سوچوں میں سوتے، جاگتے گزری تھی، دل میں انجانے وسوسے تھے۔

''چلو اگر تم مصروف ہو یا......''

''ارے نہیں پیاری!'' میں نے فوراً کہا۔ ''سوچ رہی تھی کہ میں کتنی دیر میں شاور لے کر تیار ہو سکوں گی۔''

''ساڑھے دس بجے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بجے قریبی مال میں ملیں؟ اڑھائی گھنٹے کافی ہیں تیار ہونے کے لیے؟''

''کافی ہیں باس!'' میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کی، بستر چھوڑا تا کہ کاہلی ختم ہو۔ دروازے پر دستک

ہوئی، ساجدہ تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں ناں بالکل باجی؟'' اس نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے جمائی لے کر کہا۔

''جب سے آپ کی شادی ہوئی ہے آج پہلی بار آپ فجر کی نماز کے وقت نہیں جاگیں۔'' اس نے کہا تو میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے؟''

''آپ کے باتھ روم کی کھڑکی کی طرف میرا کوارٹر ہے، جب آپ ہر روز سویرے بتی جلاتی ہیں تو اس کی روشنی ہمارے کوارٹر کی کھڑکی پر پڑتی ہے اور میں بھی جاگ جاتی ہوں...... آج میری نماز بھی قضا ہوگئی کیونکہ آپ نے نماز مس کردی۔'' اپنی نماز کے چھوٹ جانے کا دکھ تو ہوا ہی مگر یہ جان کر اور بھی دکھ سوا ہوگیا کہ میری وجہ سے کسی اور کی نماز بھی قضا ہوگئی۔

''مجھے ایک کپ دودھ لادو ساجدہ...... میں تیار ہوتی ہوں، مجھے کسی دوست سے ملنے جانا ہے۔''

''آپ باتھ روم جائیں میں بستر تہ کر کے جا کر لے آتی ہوں۔'' وہ بستر کی شکنیں دور کررہی تھی۔

''ٹھیک ہے......'' میں اسے کمرے میں چھوڑ کر غسل خانے چلی گئی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ زندگی نے میرے ساتھ کس طرح کا مذاق کیا تھا، کس طرح کی لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی شدہ مردوں کو پھانس لیتی ہیں۔ مگر وہ تو پہلے سے ہی اس کے ساتھ پھنسا ہوا تھا...... میں کہیں سے بیچ میں حائل ہوگئی ہوں۔ چلو جو بھی کچھ شادی سے پہلے تھا وہ اپنی جگہ، دوستی، بے تکلفی، محبت یا الفت...... جو بھی تھا وہ ہماری شادی کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کس طرح کی مائیں ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کو یوں بے جا آزادی سے لڑکوں اور مردوں سے ملنے اور دوستیاں رکھنے دیتی ہیں۔ اگر معاملہ بھی خراب ہوا یا زین نے واقعی اس لڑکی سے شادی کا مصمم ارادہ کرلیا تو میں ایک بار اس لڑکی اور اس کی ماں سے ضرور ملوں گی، ان سے پوچھوں گی کہ ایک بٹے ہوئے مرد کے ساتھ وہ کیوں خود کو ملوث کیے ہوئے ہے۔

''باجی...... دودھ لے آئی ہوں۔'' ساجدہ نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا تھا۔ میں نے اسے چلے جانے کا کہا۔ تیار ہوکر بال سمیٹ کر باہر نکلی تو ٹرے میں دودھ کے گلاس کے ساتھ، ایک پلیٹ میں بریڈ کے سلائس پر مکھن لگا کر، اس میں آملیٹ اور چیز کا ایک سلائس رکھ کر ساجدہ نے نفاست سے سینڈوچ بنا کر رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ نہار منہ خالی چائے نہیں پینی چاہیے، بالخصوص اس حالت میں۔ میں نے مسکرا کر ناشتا کیا، ساتھ ساتھ فون پر اپنے پیغامات چیک کرنے لگی۔

فون کی گھنٹی بجی...... ڈاکٹر یاسمین کا فون تھا۔ ''کتنی جلدی میرے پاس آسکتی ہو تم؟'' انہوں نے میرے فون اٹھاتے ہی پوچھا۔

''ابھی کے ابھی!'' میں نے ان کی آواز سے اندازہ کیا کہ ان کی کال کسی اہم وجہ سے ہے۔

''اوکے، ریلیکس رہو...... اور اکیلی نہ آنا!'' انہوں نے فون بند کردیا۔ میں ہولے، ہولے کانپنے لگی۔ اس وقت کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟ دل چاہا کہ امو جان کو کال کروں مگر انہیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔ چاچو اور مما شام کو ویسے ہی لوٹ کر آنے والے تھے۔ زین دفتر جا چکا تھا...... اور کون!

''سارہ!'' میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔ ''تم گھر پر ہو یا روانہ ہوچکی ہو؟''

''بس نکلنے ہی والی تھی......'' اس نے کہا۔ ''خیریت تو ہے، تم کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو؟''

''ہاں، ہاں...... خیریت ہی ہے، تم گھر پر رکو، میں تمہیں گھر سے لے لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... یہ اچھا ہے، میں تو یوں بھی ٹیکسی منگوانے والی تھی۔'' میں نے فون بند کیا، اپنے بیگ میں ڈاکٹر کی فائل رکھی اور ساجدہ سے کہا کہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہے۔ سارہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو وہ باہر ہی کھڑی ملی۔

''یہ تم نے اچھا کیا۔'' میں نے اس کے یوں انتظار میں باہر کھڑے ہونے پر اسے داد دی۔

''یہ ہم مال کی طرف تو نہیں جا رہے؟'' اس نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... ہم کہیں اور جا رہے ہیں، میں چھوٹا سا کام کر لوں، اس کے بعد ہم وہیں کہیں قریب بیٹھ جائیں گے اور تم بات کر لینا۔''

''مجھے تم سے بہت ہی اہم، بہت خاص بات کرنا تھی امرت!'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''مجھے ڈاکٹر نے کسی اہم کام کے لیے بلایا ہے صرف چند منٹ لگیں گے۔'' اس نے منہ بسورا۔

''سوری!'' میں نے کہا تو وہ جیسے زبردستی مسکرائی۔ ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر چاچا نے گاڑی لگائی۔

''تم جا کر مل آؤ ڈاکٹر سے، میں یہیں گاڑی میں انتظار کرتی ہوں!''

''نہیں بھئی، تمہیں کسی وجہ سے ساتھ لائی ہوں، تمہارا ساتھ جانا ضروری ہے۔'' میں نے اسے ہاتھ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اندر پہنچنے تک تیزی سے چلنے کی کوشش میں میں ہانپ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر میں نے اپنی فائل وہاں بیٹھی لڑکی کو دی۔

''آپ بیٹھیں، اس مریضہ کے نکلنے کے بعد آپ کو بھجواتی ہوں، ڈاکٹر صاحبہ نے ہدایت دی تھی کہ جونہی آپ پہنچیں میں آپ کو اندر بھجوا دوں مگر معذرت خواہ ہوں کہ ابھی اندر ایک مریضہ کا ایمرجنسی میں معائنہ ہو رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... میں انتظار کر لیتی ہوں۔'' میں اور سارہ انتظار گاہ میں بیٹھ گئیں۔

''آپ جائیں اندر......'' اسی لڑکی نے پاس آ کر مجھ سے کہا تو میں اور سارہ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ اندر سے باہر آنے والی کے چہرے پر چھائیوں کے داغ تھے، وہ شکل سے ہی بہت کمزور لگ رہی تھی، جس بچے کا بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھی وہ اس کی سکت سے باہر لگ رہا تھا، وہ مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ اسے چند لمحوں میں، میں نے غور سے دیکھا۔ اس کے عقب میں ڈاکٹر کے کمرے سے نکلنے والے مرد کو دیکھ کر سارہ سکتے میں آ گئی تھی، میں نے اس کے چہرے پر نقش ہونے والے تاثرات کو دیکھا۔ اس مرد نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

''سارہ......'' میں نے اسے پکارا تو وہ چونک گئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

''ہوں...... ہاں!'' اس نے خیالوں میں گم جواب دیا۔

''تم جانتی ہو اسے؟'' میں نے اس سے سیدھا سوال کیا۔

''ہاں......'' اس نے گہری سانس لی۔ ''کبھی وہ میرا سب کچھ تھا، اب وہ میرا کچھ بھی نہیں۔'' وہ یقیناً اس کا سابقہ شوہر تھا۔

''اندر چلیں؟'' دروازے میں ایستادہ اس کا بت متحرک ہوا۔

''آؤ، آؤ......'' ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔ ''بیٹھو تم!''

''شکریہ!'' کہہ کر ہم دونوں نے نشستیں سنبھالیں۔

''میں سمجھی کہ تمہاری ساس تمہارے ساتھ آئیں گی۔''

''وہ گاؤں گئی ہوئی ہیں جی!''

''یہ کون ہیں؟'' ڈاکٹر نے سارہ کے بارے میں پوچھا۔ ''تمہاری بہن؟''

''بہن ہی سمجھیں...... بہت اچھی دوست ہے میری!''

''سارہ نام ہے میرا!'' سارہ نے مسکرا کر اپنا تعارف کروایا۔

''آپ کا چہرہ بھی دیکھا ہوا لگ رہا ہے۔'' ڈاکٹر یاسمین نے مسکرا کر کہا۔

''ہم دونوں ساتھ ہی جاب کرتی تھیں!'' میں نے بتایا۔

''اوہ اچھا...... اسی لیے!''

''یہ جو ابھی باہر گئے ہیں......'' سارہ نے اچانک کہا ''مجھے ان کا چہرہ کچھ دیکھا سا لگا۔''

''یہ...... ہاں، ممکن ہے! یہ ان صاحب کی دوسری بیگم ہیں، اس کے ہاں اس سے پہلے دو مردہ بچے پیدا ہو چکے ہیں، اب یہ تیسرا ہے، تینوں بیٹے!''

''تو کیا یہ والا؟'' سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... یہ بھی مر چکا ہے، میں نے اس کے لیے ڈلیوری کی تاریخ دینا تھی۔'' ڈاکٹر یاسمین نے وضاحت کی۔ سن کر دکھ ہوا مگر میں نے کسی طرح کی بات نہ کی۔

''ان کی پہلی بیوی......؟'' سارہ نے جانے کیوں سوال کیا تھا۔

''وہ چند سال پہلے مر گئی تو انہوں نے اس خاتون سے شادی کر لی تھی ابھی تک اس سے ان کی کوئی اولاد زندہ نہیں بچی، پہلی بیوی سے جو بچے تھے وہ ننھیال والوں کے پاس ہیں۔'' سارہ کا رنگ فق ہوا۔

''اوہو......'' میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے دبا کر اسے دلاسہ دیا۔

''ارے ہاں، میں نے تمہیں کال کر کے کیوں بلایا تھا، تم نے پوچھا ہی نہیں؟''

''جی وہ اصل میں اور بات شروع ہو گئی تھی ناں!''

''تم کیسا محسوس کر رہی ہو......'' انہوں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اب سیڑھیاں نہ چڑھنے کی وجہ سے تمہیں درد میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے؟''

''نہیں...... اب تو بلکہ درد ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔''

''ہوں......'' ڈاکٹر یاسمین نے سانس خارج کی۔ ''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔''

''ایسا کیوں ہے ڈاکٹر یاسمین؟'' میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

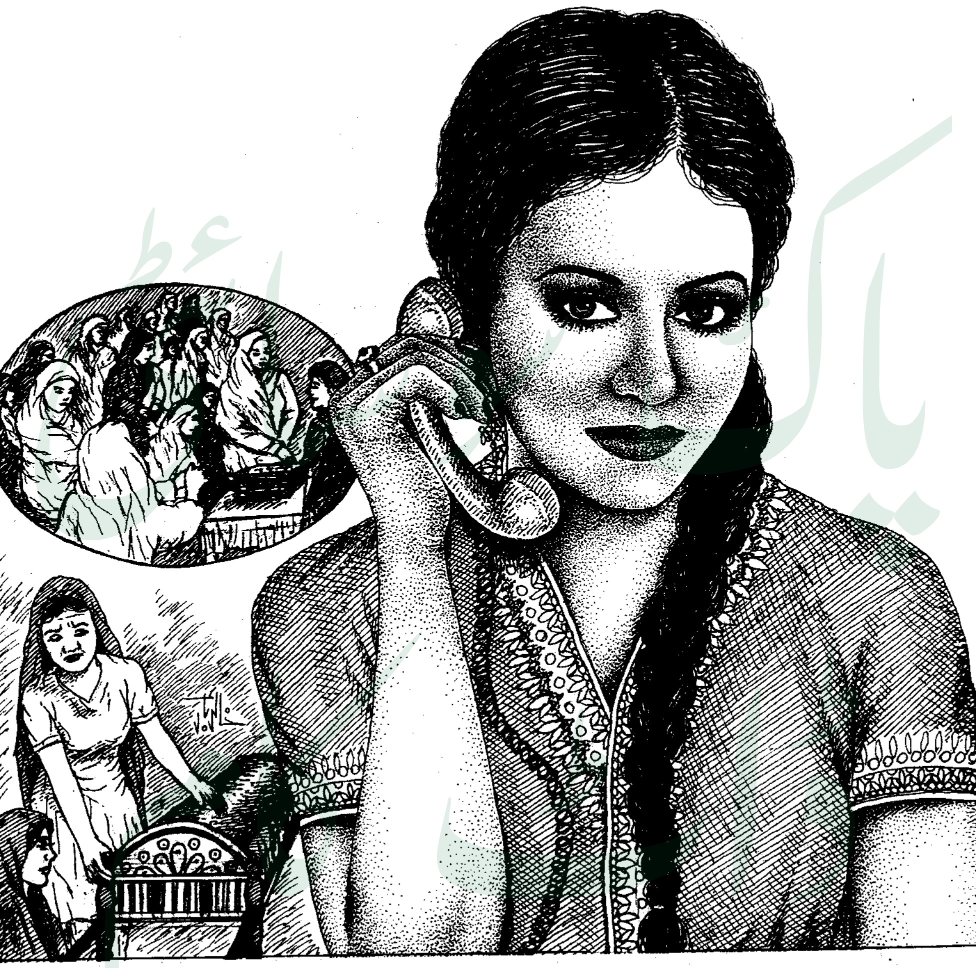
''میں جو کچھ تمہیں بتانے جا رہی ہوں اسے حوصلے سے سننا امرت!'' ڈاکٹر یاسمین کے الفاظ نے میرا جسم سن کر دیا۔ ''تمہارے ٹسٹ کی رپورٹ آ گئی ہے میرے پاس، میرا اندیشہ بالکل ٹھیک نکلا ہے۔'' پگھلا ہوا لاوا تھا جو میرے اوپر انڈیلا جا رہا تھا، میرے پیروں پر بھی کوئی گرم سیال بہہ رہا تھا۔ ''ہمیں سب سے پہلے چیک کرنا ہے کہ اس موذی مرض نے کہاں تک اپنی جڑیں پھیلا رکھی ہیں۔''

دھک دھک...... بھک بھک...... ٹھک ٹھک...... چھک چھک! آوازیں شور میں تبدیل ہو گئیں...... پھر مجھے آوازیں آنا بند ہو گئیں، صرف ڈاکٹر یاسمین کا منہ کھل اور بند ہو رہا تھا۔ ''لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے...... مجھے تمہیں بتانے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں! تم سمجھ رہی ہو ناں؟ سارہ آپ اپنی دوست کو سنبھالیں، اس طرح تو اس کے بچے کی جان کو......'' وہ کیا کہہ رہی تھی، مجھے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ ''دھڑام'' کی آواز آئی تھی، چھت گری تھی یا آسمان!

(جاری ہے)

محبت زادِ راہ

حیا بخاری



ائرپورٹ ویسے ہی لوگوں سے بھرا ہوا تھا جیسے اُس دن تھا جب وہ اسے وداع کرنے یہاں آئی تھی۔ اُس دن بھی وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی اور آج بھی نہ جانے کیوں آنکھیں بھیگنے پر مصر تھیں۔ آج جبکہ وہ واپس آ رہا تھا، ہمیشہ کے لیے...... کبھی دوبارہ اس مٹی کو چھوڑ کر نہ جانے کے لیے پھر بھی نہ جانے کیوں دل پھٹنے کو ہو رہا تھا۔

سب کچھ ویسا تھا...... حالانکہ ان دس سالوں

میں کیا کچھ نہیں بدلا تھا...... پھر بھی اسے سب کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا گویا کل کی ہی بات تھی۔ سامنے بھاگتے ہر منظر کی طرح گزرے لمحوں کی یادیں بھی تو بہت واضح تھیں...... پھر کیسے کچھ بدل سکتا تھا۔ اور پھر سامنے لگے برقی بورڈ نے جہاز کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا وہ آرہا تھا۔

اسے وہ منظر یاد آگیا تھا جب وہ جا رہا تھا...... مسکراتا، آنکھیں صاف کرتا، مڑ، مڑ کر نگاہوں کی زبانی بہت کچھ کہتا...... لیکن اب واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا۔

☆☆☆

وندر (پلاسٹک کی ہلکی سخت رسی) سے بُنی چارپائی پر بیٹھے، بیٹھے اس کے نرم جسم پر نشان پڑنے لگے تھے۔

''ہائے، فریدہ، کڑی تو بڑی پیاری ڈھونڈ کے لائی ہے تو اپنے پتر کے لیے۔'' سانولی سی رنگت والی اس عورت نے اسے دیکھتے ہی تعریف کی تو سرخ ہوتے رخسار انگاروں کی سی لو دینے لگے۔

''ماشاء اللہ کہہ۔'' فریدہ مسکرائی۔ ''میرا ایک ہی پتر ہے۔ شہزادی نہ لاتی بھلا۔''

''ماشاء اللہ تو تب کروں ناں جب دل کی بھی پیاری نکلے...... سات بہنوں کے اکلوتے بھائی کی بیوی بن کر آئی ہے۔ دیکھ کب تک گزارہ کرتی ہے اور گزارہ کرتی بھی ہے کہ نہیں۔'' معصومہ کو پہلی بار اس عورت کی شکل بے انتہا بری لگی۔ جو آتے ہی اس کے پیاروں کے دل میں اس کے لیے میل ڈالنے لگی تھی۔

''خیر بول رشیدہ...... ایسی باتیں نہ کر۔'' اماں فریدہ بھی برا مان گئیں۔

''جیسی اوپر سے دکھتی ہے دل کی بھی اتنی ہی روشن ہوگی میری چندا...... تو فکر نہ کر۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک انداز میں منع کیا۔

''لے...... میں نے تو بس ایک بات کہی تھی۔ تم تو برا ہی مان گئیں۔'' وہ منہ بنانے لگی۔

''اچھا ہٹ...... تھک گئی ہوگی میری شہزادی، میں اسے کمرے میں لے جاؤں۔'' انہوں نے اسے اشارہ کر کے معصومہ کو سہارا دے کر چارپائی سے اتارا۔

''نسیم، بھابی کے لیے کچھ لے کر آ...... نہ جانے کچھ کھایا بھی ہے صبح سے یا نہیں۔'' انہوں نے فکرمندی سے بیٹی کو آواز دی تھی۔

☆☆☆

اور اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ صرف روپ کی ہی نہیں، دل کی بھی شہزادی ہے۔ ساتوں نندیں، ساس اور شوہر سب اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ اتنی اچھی سسرال ملنے پر وہ بھی خدا کا شکر کرتی رہتی سب کچھ ٹھیک تھا لیکن پھر اس نے اماں کو پریشان رہتے دیکھا۔

''اماں، کیوں پریشان ہے؟'' رات کو اس کی ٹانگیں دباتے اس نے پوچھا تو فریدہ حیران رہ گئیں۔ جو اُن کی اولاد نہ جان سکی، وہ ان کی بہو نے ان کے چہرے سے پڑھ لیا، دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔

''بڑی دو کے لیے خالہ زبیدہ نے بڑے اچھے رشتے بتائے ہیں۔ کھاتے پیتے خاندانی لوگ ہیں لیکن ایک سال کے اندر ہی شادی چاہ رہے ہیں۔ اب تو بتا معصومہ، پریشان نہ ہوں تو کیا کروں......'' اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''سات بیٹیوں کا بوجھ، کمانے والا ایک اور پھر اتنے چنگے رشتے کہاں ملتے ہیں بار، بار۔'' معصومہ سر ہلا گئی۔

''پر کوئی تو حل ہوگا ناں اماں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔

''آج اسلم بھرا آیا تھا کہہ رہا تھا کہ نعیم کو اس کے ساتھ دبئی بھیج دوں...... اتنا کما لے گا کہ سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔ دس بارہ سال کام کر لے پھر بے شک یہاں اپنا کاروبار جما لے۔'' اماں بتانے لگیں۔

''دبئی اماں......'' وہ بجھ سی گئی۔

''ہاں پتر...... پر تو فکر نہ کر، تیرا خیال ہے مجھے۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''اپنی اولاد کے سکھ کے لیے میں تجھے، اپنی دھی کو دکھی کر سکتی ہوں بھلا۔'' اماں مسکرائیں۔

''اماں......'' معصومہ ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے بھی اسے خود میں سمولیا۔

☆☆☆

اور پھر سوچتے سمجھتے نہ جانے کب وہ خوابوں جیسی لڑکی حقیقت کا آئینہ بن گئی۔

''تو دبئی چلا جا نعیم۔'' اور وہ حیران رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

''تیرے جانے سے گھر کا خرچہ آسان ہو جائے گا ناں...... باجیوں کی شادی ہو جائے گی، اماں کی دوائی بھی وقت پر آئے گی...... ہے ناں......!'' وہ سوچوں میں گم بولی۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

''تو پھر تو چلا جا۔'' اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

''سچ کہہ رہی ہے؟'' وہ تشکر آمیز لہجے میں پوچھنے لگا۔ وہ سر ہلا گئی۔

''میرے بغیر رہ لے گی؟'' اس نے معصومہ کے نرم، نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔

''یہاں تو اماں ہے، باجیاں ہیں، میرا دل تو پھر بھی بہلا رہے گا لیکن......'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو میرے بغیر رہ لے گا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''تیری محبت ہے ناں میرے پاس......'' اس کی آنکھوں میں صرف محبت تھی۔

''میری ہم سفر، میری زادِ راہ...... تیرے بغیر رہ ہی لوں گا۔'' وہ مسکرایا۔ معصومہ نے نم آنکھیں بند کر کے سر اس کے چوڑے سینے میں چھپالیا، نعیم نے اس کے گرد پناہیں گھیر لیں۔

☆☆☆

اور پھر اس کے جانے کا دن آ گیا...... وہ امید سے تھی۔ ان سب کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ اسے ائرپورٹ چھوڑنے ساتھ گئی تھی۔

دونوں مسکرا رہے تھے۔ خاموشی کی زبان سن اور بول

غزل

یہ جو عشقِ دل کی نماز ہے
یہی سوز ہے یہی ساز ہے
تو بلند اور میں ہوں پست تر
یہ عجیب رسمِ نیاز ہے
مجھے خواہشوں پہ گرفت ہے
مرے واسطے یہ اعزاز ہے
کبھی کھل گیا، کبھی نہ کھلا
یہاں آدمی کوئی راز ہے
تو نے مارنے میں کمی نہ کی
یہ تو میری عمر دراز ہے
میں تو خانم اپنے خدا کی ہوں
مجھے اس کی ذات پہ ناز ہے

کلام: فریدہ خانم، لاہور

رہے تھے اور دونوں کی آنکھیں نم بھی تھیں اور پھر وہ چلا گیا۔

وقت کے بھی عجیب ڈھنگ ہیں...... نہ گزرنے پر آئے تو لمحے بھی ٹھہر جاتے ہیں اور جو پر کھول لے تو لمحوں میں صدیاں مٹھی میں بھر کر اڑان بھر لیتا ہے۔

اللہ نے اسے بیٹا دیا تھا، سلیم نے اس کی تنہائی بانٹ لی تھی۔ نعیم صرف ایک بار آیا تھا تین سالوں میں، جب سلیم دو سال کا ہوا تھا۔ پھر تین سال بعد جب دو اور بہنوں کی شادی ہوئی تھی۔ اماں کی صحت اچھی ہونے لگی تھی۔ سلیم اسکول جانے لگا تھا، پرائیویٹ اسکول، اس کے کپڑے، اس کا سامان دیکھ کر بچے رشک کرتے، معصومہ کے روپ میں سادگی سی اتر آئی۔

بوجھ ایک، ایک کر کے اترنے لگے لیکن اس کی شخصیت میں نہ جانے کیوں اداسیاں اور سنجیدگیاں اترنے لگی۔

ان آٹھ دس سالوں میں وہ عمر سے بڑی دکھنے لگی تھی۔

آخری دو بہنوں کی شادی بھی اچھی جگہ ہوئی تھی...... نعیم اس بار نہ آسکا تھا۔ اس نے معصومہ کو بتایا تھا۔

''بس اس بار پکا ہی آؤں گا۔ کبھی نہ جانے کے لیے۔'' اور اس کا دل جھوم، جھوم اٹھا۔

''سب فرض اتر گئے۔ اب مجھے تیرے فرض چکانے ہیں بس...... ایک سال اور بس...... اتنا کمالوں کہ تو سلیم اور میں ایک اچھی زندگی بسر کر سکیں۔ پھر دیکھنا...... ہمیشہ تیرے ساتھ ہی رہوں گا۔'' وہ وعدے کرنے لگا۔

''تو آجا...... میرے لیے تیرا ساتھ ہی اچھی زندگی ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے التجا کی۔

''اوہ پگلی...... اوروں کے لیے اتنا صبر کرلیا، کچھ صبر سلیم کے لیے کرلے، تجھے، مجھے نہ سہی، سلیم کو تو ضرورت ہے ناں اچھی زندگی کی۔'' معصومہ نے سوتے سلیم کو ایک نظر دیکھا۔

''چل ٹھیک پر پکا وعدہ کر کہ اگلے سال آئے گا۔'' وہ اداس ہوئی۔

''تیری قسم......'' اور اس رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

وقت صدیاں نہیں دیکھتا، ایک سال کیا تھا...... لیکن نہ جانے کیوں یہی سال بھاری لگنے لگا تھا۔ لمحے تھم سے گئے تھے وقت تھا کہ کٹنے کا نام نہیں لیتا۔

وہ روز رات کو فون کرنے لگا تھا۔ بینک میں بھیجی جانے والی رقم بھی تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔

''تیری ترقی ہوگئی ہے کیا؟ جو اتنے پیسے بھیجنے لگا ہے؟'' وہ پوچھتی۔

''نہیں، اوور ٹائم لگانے لگا ہوں، دن رات کام کرتا ہوں تاکہ جلدی سے تیرے پاس آجاؤں۔'' اس کے لہجے میں اس کی بے تابیاں کرلاتیں۔ وہ شرما سی جاتی۔ پھر فکرمند بھی۔

''ایسے تو تم بیمار پڑ سکتے ہو، میں نے کہا ناں جو ہے کافی ہے۔''

''تو فکر نہ کر...... اب تو بہت کم دن رہ گئے ہیں، بس ائرپورٹ مجھے لینے آنا نہ بھولیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''لو بھلا...... یہ بھلا میں بھول سکتی ہوں؟'' وہ بھی مسکرادی تھی۔

☆☆☆

اور آج وہ آرہا تھا۔ اس نے کافی محنت کی تھی۔ ماں، بہنیں، بیٹا، سب کا حق ادا کردیا تھا۔ بس خود کو اور معصومہ کو تھوڑا خوار کیا تھا۔ مگر کیا تھا...... اب تو وہ ہمیشہ کے لیے مل رہے تھے ناں...... آج سب ساتھ تھے۔

پھر بھی نہ جانے کیوں سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کی سات سہاگن بہنوں کی آنکھیں...... بیوہ بوڑھی ماں کی منتظر آنکھیں...... اور باوقار...... ہر طرح کے بوجھ سے آزاد معصومہ کی آنکھیں بھی......

وہ رفتہ، رفتہ ان کے قریب آرہا تھا۔ مگر وہاں سے نہیں جہاں سے تمام مسافر آرہے تھے۔ اور پھر وہ اپنا ان اپنوں کے سامنے تھا خاموش سا...... ایمبولینس میں رکھے تابوت میں لیٹا، وہ ایسے تو نہیں گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکان تھی اور اس کی دائیں آنکھ کھلی تھی۔ شاید معصومہ کو دیکھنے کے لیے۔

اماں، بہنیں سب اس کے تابوت سے لپٹ، لپٹ کر رو رہی تھیں۔ اور وہ سلیم کا ہاتھ تھامے بس خاموشی سے اس کا چہرہ تکے جارہی تھی۔

''میرے بغیر رہ لے گی؟'' شریر سی سرگوشی اس کے کانوں میں گنگنائی تھی...... اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

سلیم کے ہاتھ پر گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

''تیرے بغیر سہی...... تیری محبت تو ساتھ ہے ناں میرے۔'' وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

''ارے میرے مسافر پیا، محبت زادِ راہ ہے۔ زندگی کٹ ہی جائے گی۔'' وہ چپکے، چپکے رو رہی تھی...... محبت نے عشق کی صورت پالی تھی...... وجود اور مورت کی چاہ بے روح کی تعلق کو جاودانی ملی تھی۔ محبت زادِ راہ تھی...... راستہ آسان تھا...... مگر...... کیسے......؟ یہ حقیقت تو وہ ہی جان سکتی تھی۔

خوابِ گزیدہ

دردانہ نوشین



”رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے اماں......“ ادھیڑ عمر غلام احمد نے کلچا توڑ کر کشمیری گلابی چائے میں ڈبویا اور ضعیف اماں کے منہ کے پاس لایا۔ اماں اونچا سنتی تھی مگر اس نے سن لیا تھا وہ بیٹے کو دیکھتی اور نوالے چباتی رہی۔ اماں کو کھانا صبر و تحمل سے کھلانا پڑتا تھا وہ ایک، ایک نوالے کو وقت لگاتی پر چند لقمے ہی کھاتی تھی۔

غلام احمد چائے میں چمچ ہلاتے کھڑکی کے پار

سبزے سے ڈھکے میدانوں پر بے دھیان نظر جمائے خواب کے ٹکڑے جوڑ رہا تھا۔

''میں نے سنا ہے پنجاب کا ایک شہر ملتان ہے، اس کے پاس چھوٹا سا قصبہ مظفر آباد ہے۔''

بوڑھی ماں نے کھڑکی کے پار سدھاں گلی روڈ پر نظریں ٹکائیں۔

''یہ والا نہیں اماں...... پاکستان میں ہے۔''

خالی پیالہ رکھ کر غلام احمد نے سفیلچی میں اماں کے ہاتھ دھلائے۔ اماں نے تکیے ہٹانے کا اشارہ کیا، وہ اب لیٹنا چاہتی تھی۔ آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں وہ نسل در نسل رہتے چلے آرہے تھے، غلام احمد ابھی بات جاری رکھنے کے موڈ میں تھا۔

''بھمبر سے آیا ہوا بابا وُنگا جو ماتھے پر گارا لیپ کر لکیریں پڑھتا تھا۔''

''تو مسلم ہو کے...... ہندو وِڈیا دی گل مندا ہے...... مدتیں ہو گئیں صبورا چل بسی...... ترے نہ ہوئی اولاد...... نہ تھی مقدر میں۔'' اماں نے گویا بات ختم کر کے کروٹ بدل لی۔

غلام احمد نے برتن سمیٹ کر لکڑی کی چھوٹی سی ٹرے میں رکھے اور باورچی خانے میں لے گیا۔ کام کاج اسے خود کرنا ہوتا تھا۔ برتن، دھوئے، سنک اور کھڑکی صاف کی ساتھ کے ساتھ خود کلامی جاری رکھی۔

''وہ بولا تھا...... بسنتی پھول، ہری نیناں...... گلام احمد...... پتری تری گل زعفران...... صبورا...... مظفر آباد...... جا، جا......'' اس کی ننگی پیٹھ پر سفید لکیریں کھنچی تھیں۔ وہ کوئی چیڑ کا درخت تھا جدھر بیٹھا رہتا ہندو مسلم سب اس کے پاس جاتے تھے۔ سب کہتے جو بتائے ہو کے رہتا ہے۔ پھر پتا نہیں کدھر کو چلا گیا...... ہماری شادی کے کوئی چھ سال بعد صبورا کو حمل ہوا۔ اس کے بطن میں ہی ہم نے اس کا نام گل زعفران رکھ دیا تھا۔ یہ کس سن کی بات تھی بھلا؟''

وہ صافی سے گیلے ہاتھ پونچھتا اماں سے یقین طلب کرنے آیا مگر اماں کو خراٹے لیتا دیکھ کے پلٹ گیا۔ ترکاری کی ٹوکری اتاری اور باہر چلا گیا۔ نرم بادلوں کے سائے میں سرد خنکی تھی۔ گلی کی ٹھنڈی اینٹوں کی گیلی چپل کے پار محسوس ہو رہی تھی، چپل بھی تو پھٹی ہوئی تھی۔ چپل موچی کو دے کے وہ اپنے دوست اسامہ راج کی دکان پر جا بیٹھا۔

''مظفر آباد کیسے جاؤں؟'' اس کا دماغ تو اسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا جبکہ اسامہ راج اسٹور کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔ ابھی ابھی تو دن چڑھا تھا۔ اِکا دُکا دکانیں کھل رہی تھیں۔ سلام کا تبادلہ ہوا۔ غلام احمد پھر سے سوچ میں کھو گیا...... ''کیا پتا صبورا نہ مری ہو...... مظفر آباد؟ نہیں۔''

''تم پنجاب گئے تھے ناں......؟''

''ہاں...... مدتوں پہلے گیا تھا۔''

''میں جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں......؟''

''ہے ایک مظفر آباد......''

''وہ تو یہ رہا......''

''اس کی بات نہیں کر رہا...... پنجاب میں بھی ہے۔''

''خیر تو ہے، کچھ فکر مند لگ رہے ہو۔'' اسامہ راج آب گرم کا گلاس لے کر کشن پر آ بیٹھا۔ ''بسم اللہ......'' اس کو پیشکش کی۔

''نہیں ابھی چائے پی کر آرہا ہوں۔'' غلام احمد نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اپنا اعتماد بحال کیا، بات کا سرا پکڑا۔

''میں جا سکتا ہوں ناں؟''

''پر بات کیا ہے؟''

''بات بتاتا ہوں...... مگر اماں کو کس طرح چھوڑوں......؟ کس کے پاس چھوڑوں......؟ اماں کی فکر ہے مجھے۔''

''اماں کی فکر نہ کر...... تھوڑے دن لگانے ہیں تو تری بھابی خیال خاطر کر لے گی۔ بلکہ اُدھر ہی رہ جائے گی...... اب بتا بات کیا ہے؟'' راج نے ڈھارس بندھائی۔

''تمہیں شاید یاد نہ ہو...... میں نے صبورا کے فوت ہونے کے بعد ایک خواب دیکھا تھا۔ تمہیں بتایا تھا...... وہی خواب کافی بار دیکھتا رہا۔ کبھی سال بعد...... کبھی مہینوں بعد...... کل پھر وہی خواب دیکھا۔''

''کیا...... تھا؟''

''میں بس میں بیٹھا ہوں...... کہیں جارہا ہوں...... سڑک کے کنارے مظفر آباد کا بورڈ دیکھتا ہوں تو شور مچا دیتا ہوں، مجھے اِدھر جانا ہے۔ میں اتر جاتا ہوں، اپنا گھر اپنی بیوی ڈھونڈ رہا ہوں...... راستے، گلیاں، مکان اجنبی انجانے ہیں...... پھر ایک مسجد کے سبز مینار نظر آتے ہیں...... اس کے ساتھ کوئی مکان ہے جس میں کھجور کا درخت باہر سے دکھتا ہے...... اس کی چھت کی چار دیواری میں نو سوراخوں والے نہیں بلکہ تین اور تین چھ...... اور نیچے تین اور تین چھ...... بارہ سوراخوں والے مربع نما بنے ہوئے ہیں۔ وہاں سے مجھے ''بابا...... بابا'' میری بچی بلاتی ہے...... میں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ پھر میں اس کا نام لیتا ہوں...... زعفران گل...... ''وہ اڑ کے آجاتی ہے۔ ایسی پیاری سی...... کومل...... ملوک زادی...... سبز آنکھوں والی...... وہ میری بیٹی ہے۔''

راج کے چہرے پر خوف اتر آیا۔

''غلام احمد...... تری گھر والی فوت ہوگئی تھی اور...... اس کی لاش بھی مل گئی تھی۔''

''ہاں...... پر......؟''

''بس کرلالہ...... چودہ سال گزر گئے تجھے چاہیے تھا تو شادی کرلیتا۔''

''اس بات کا اب کیا مطلب؟''

''دیکھ ناراض نہ ہوئیو...... مرد آپس میں بات کرلیتے ہیں تو کسی عورت کے پاس گیا ہوگا اور تجھے وہم......''

''نہیں، نہیں حرام کی راہ تلاش کرنے کی ضرورت کیا تھی، نکاح کرلیتا، مجھے کوئی روکتا تھا؟''

''تو پھر...... یہ بیٹی والا خواب...... چھوڑو یار...... وہم ہے تیرا......'' اسامہ راج اٹھ کر آنے والے گاہک کی طرف بڑھ گیا۔ غلام احمد مصافحہ کرکے نکل آیا۔

☆☆☆

''اماں...... سن رہی ہو؟'' لحاف کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے غلام احمد نے اپنا رخ اماں کی طرف موڑا۔

''ھووں۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے گل زعفران نے کسی دوسری صبورا کے بطن سے جنم لے لیا ہو؟''

''کھڑکی بند تو کردی ہے۔''

''ہاں اماں، سب کچھ بند کردیا ہے...... میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔'' کچھ ثانیے کمرے میں سرد خاموشی رہی...... اماں کھانسی پھر ہولے، ہولے بولنے لگی۔

''میرے پتر غلام احمد...... تجھے اولاد کی چاہ تھی۔ ہر کسی کو ہوتی ہے۔ پانچ سال سے دعائیں مانگ رہے تھے...... ہم تینوں جنے...... اللہ سوہنے نے خوشی دی...... صبورا بہت خوش رہتی...... کھلی کھلی رہتی تھی مگر اصل مالک تو اللہ ہے...... مالک کی مرضی تھی...... ہم راضی اس کی رضا پر......''

''وڈیا جوتش نے میرے سامنے بیٹھ کے...... صبورا کا ناں (نام) میرا ناں...... گل زعفران کا ناں بولا تھا...... تو وہ میری بیٹی پیدا ہوئی تھی ناں...... وہ پیدا ہوئی ہے۔ مجھ سے دور ہے...... اپنے باوا کو ڈھونڈتی ہے۔''

''تو تو پاگل ہوگیا ہے، سٹھیا گیا ہے...... کلمہ پڑھ کے سوجا...... جھوٹے سچے خواب، وہم...... وڈیا پہ یقین...... توبہ، توبہ کر...... اللہ سے معافی مانگ...... جھلا نہ ہو تو......'' غصہ نکالتے، نکالتے اماں کو پھر کھانسی آنے لگی۔

غلام احمد نے چپ اوڑھ لی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار، بار خواب کا منظر سوچتا...... اس کے معنی نکالتا، کروٹیں بدلتا...... دبے قدموں اٹھا...... ٹین کا بکسا دھیرے سے کھولا۔ بائیں طرف رکھی پونجی کی تھیلی

ٹٹول، ٹٹول کر رقم کا اندازہ کیا، تھیلی رکھ کر بکسا بند کیا اور سفر کا ارادہ بناتے، بناتے آنکھ لگ گئی۔

دھوپ کی ہلکی حرارت پہ اماں کھٹولے پر تکیہ کے سہارے بیٹھی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ بیرونی دروازے سے اسامہ راج کی گھر والی، رفعت آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی غلام احمد پچھے کے پیچھے والے کمرے سے اپنا بیگ لینے چلا گیا۔ رفعت تپاک سے اماں کو ملی اور پائنتی بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگی۔

غلام احمد آکر رکا...... اماں کی قدم بوسی کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''اماں پیاری...... آج جمعہ ہے نماز پڑھ کر نکلوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگلا جمعہ لوٹ آؤں گا زیادہ دیر لگی تو دوسرے جمعہ ہر حال میں تیرے قدموں میں حاضر ہوں گا، اگر زندہ رہا...... رفعت بھابی کو سارا کام سمجھا دیا ہے۔ تری دوائیں، کھانے پینے کا سامان، ایندھن میں نے مہیا کر رکھا ہے...... فکر نہ کرنا اماں ...... مجھے خوشی سے اجازت دے دو......'' اس کا سر اماں کے پیروں پر جھک گیا۔

''جس کی نیت ہو گئی...... اس کو کیا روکنا...... اللہ تمہارا سفر آسان کرے پتر...... خیر سے لوٹو...... اپنا وعدہ یاد رکھنا، جمعے کا سنیچر ہوا تو بڈھی ماں مرجائے گی۔''

''اللہ نہ کرے اماں جی۔'' رفعت بھابی نے روکا۔ ''خیر کی دعائیں دیں...... اسے بھی خود کو بھی...... آپ میری خالہ ہیں، بوا ہیں، ماں ہیں...... میں آپ کا غلام احمد بھائی سے زیادہ خیال رکھوں گی...... جا ویر جا...... فکر نہ کرنا۔''

اور......

ایک مجنون اپنے خواب کو پکڑنے نکل گیا۔

باغ سے مظفر آباد، وہاں سے ایبٹ آباد، اسلام آباد، ملتان اور پھر...... وہی خواب والی پرانی بڑی بس اور قصبہ مظفر آباد کی کم چوڑی سڑک...... جاگتی آنکھوں وہ اپنے خواب میں داخل ہو چکا تھا۔ سوچ کے تانے بانے الجھاوے نے اونگھ طاری کر دی۔ ساتھ والے نے بس کی چھت پر ہاتھ مار کر زور سے کہا۔

''مظفر آباد روکنا۔''

غلام احمد کی عازم خواب روح چھلانگ مار کر حواس میں کودی اور وہ ہڑ بڑا کر جاگا...... بیگ سنبھالتا اتر گیا...... اترتے، اترتے کنڈیکٹر سے تصدیق مانگی۔

''بھرا...... یہ مظفر آباد ہے ناں ملتان والا؟''

کنڈیکٹر نے گیٹ میں پاؤں پھنسایا اور بس کو چلنے کا اشارہ دے دیا۔

غلام احمد ہونق بنا بس کو جاتا دیکھتا رہا...... اس کے ساتھ اترنے والے نے کہا۔

''ہاں بابا...... مظفر آباد ہے۔ کدھر جانا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟''

''میں بہت دور سے...... مظفر آباد سے۔''

''او کوئی نشہ وشہ تو نہیں کر رکھا...... یہی تو مظفر آباد ہے۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔ غلام احمد یوں اس کے پیچھے لپکا جیسے وہ کھو گیا تو مظفر آباد کھو جائے گا۔

''رکو بھائی...... میں آزاد کشمیر سے آیا ہوں...... یہاں کوئی...... غلام احمد ہے جس کا گھر مسجد کے ساتھ ہے۔ مسجد جس کے گھر کے ساتھ ہے۔''

وہ شخص رک کر اسے غور سے دیکھنے کے بعد بولا۔

''کیا کرتا ہے غلام احمد؟''

''یہ...... تو پتا نہیں۔''

آس پاس کچھ اور فارغ البال بھی اکٹھے ہو گئے...... غلام احمد عام سا نام تھا، مظفر آباد کوئی پچاس مکانوں کی بستی تو نہیں تھی۔ لوگوں کے طرح، طرح کے سوالات تھے اور وہ کسی کا جواب نہ جانتا تھا۔ لوگ کھسر پھسر کرنے لگے اسے مشکوک یا کم عقل سمجھنے لگے۔

اچانک اس کو ایک راہ سجھائی دی، وہ تیزی سے ایک رکشے کی طرف بڑھ گیا۔

''اس شہر میں جتنی بھی مسجدیں ہیں...... مجھے باری، باری وہاں لے چلو...... تمہارے جتنے پیسے بنیں گے دوں گا۔''

رکشے والے نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا، داڑھی کھجائی۔

''چلو گے؟'' دوبارہ پوچھا۔

''آؤ بیٹھو...... اللہ بیلی......!'' غلام احمد نے بیٹھنے میں دیر نہ لگائی۔

پہلی مسجد نہر کے کنارے تھی اس کا گرد و نواح یکسر مختلف تھا۔ دوسری مسجد چھوٹی اور زیر تعمیر تھی۔ اس کے گنبد یا مینار ہی نہ تھے...... تیسری مسجد کا تیز گلابی روغن دور سے چمکتا تھا۔ اور غلام احمد کے ذہن میں جے عکس سے قطعاً مختلف تھا۔ وہاں اتر کر اس نے پانی پیا اور دل ہی دل میں اللہ کے حضور گڑگڑاتا رہا چوتھی مسجد ایک عام مسجد تھی۔ مینار گنبد ''یا اللہ...... یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......'' کا محراب پر لکھا ہونا...... مگر اس کے ساتھ کوئی ایسا مکان نہ تھا جس کے اندر سے اونچی کھجور جھانکتی ہو، جس کی چھت کی چار دیواری ہو...... وہ غور سے دیکھتا اور پریشانی بڑھتی۔ ڈرائیور سے نماز پڑھنے کی مہلت مانگی مگر ڈرائیور نے بھی اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ایک مسجد اور قریب ہی ہے اسے بھی دیکھ لیں وہیں نماز پڑھ لینا......

وہ پوچھتا تھا رشتے داروں کا کوئی فون نمبر نہیں ہے۔ غلام احمد کے پاس کوئی بھی تاویل نہ تھی بس دعا کا دامن تھاما ہوا تھا۔ وہ دونوں پھر رکشا میں آبیٹھے...... کچھ گلیاں مڑی تھیں کہ ایک مسجد کے مینار دکھائی دینے لگے۔ غلام احمد کا دل زور سے دھڑکا۔

''مینار تو...... ویسے ہی ہیں......'' وہ بڑبڑایا۔ مسجد کے دروازے پر رکشا رکا، غلام احمد لپک کر باہر نکلا...... مسجد کے گرد چکر لگاتے اسے ایک مکان سے کھجور کا درخت دکھائی دے گیا، وہ مکان کی طرف بڑھا چھت کی طرف دیکھا۔

ہاں، چار دیواری تھی...... ہاں، ہاں چار دیواری میں چھ، چھ سوراخوں والے چوکور بنے ہوئے تھے۔

''بس مل گیا۔ یہی ہے۔'' اس نے جلدی سے رکشے والے کو نوٹ پکڑائے۔ بیگ اٹھایا اور دو قدم چلا تھا کہ رکشے والے کو رک کر دیکھا پا کر جانے کا اشارہ کیا...... وہ چاہتا تھا کہ اس کا تماش بین کوئی نہ ہو...... وہ کبھی اوپر دیکھتا...... کبھی ادھ کھلے دروازے کو دیکھتا...... اندر سے جھاڑو لگانے کی آواز آرہی تھی۔ غلام احمد نے سوچتے، جھجکتے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' ڈیوڑھی کے ولنگ سے کوئی عورت جھانکی۔ ملگجے کپڑے دوپٹے سے ناک لپیٹ کر ڈھانپ رکھا تھا غالباً جھاڑو وہی دے رہی تھی۔

''غلام...... غلام احمد......''

''ابا کو ملنا ہے؟ وہ دکان پر ہیں......'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

غلام احمد کے دل میں خوشی کا نعرہ گونجا۔ ''تو اس کے ابا کا نام غلام احمد ہے کہیں یہ ہی تو گل زعفران نہیں؟''

''پتری...... میں بہت دور سے آیا ہوں، دکان کا مجھے پتا نہیں ہے۔'' پیچھے سے اس کی غالباً ماں کی آواز آئی۔

''ظفراں کون ہے؟''

''زعفران......؟'' غلام احمد پورے وجود سے ہل گیا اسے اتنے زور کا چکر آیا کہ وہ دروازہ پکڑتا دہلیز پر بیٹھ رہا۔ وہ اس کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کتنی بدنصیبی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ لڑکی چلی گئی۔

وہ سر نیہوڑائے سراپا غم بیٹھا تھا۔ اندر سے ایک بچہ آیا۔ یہی کوئی آٹھ نو سال کا ہوگا۔ نکر شرٹ میں تھا اور کافی تیز تھا...... اعتماد سے بولا۔

''چاچا...... وہ سامنے جہاں یہ گلی ختم ہوتی ہے وہاں دودھ، دہی کی دکان ہے، وہ ہماری ہے ابا وہیں ہوں گے۔''

غلام احمد خود کو سنبھال کر اٹھا، کاندھے پر بیگ درست کیا اور مرے، مرے قدموں سے چلنے لگا۔ وہ کس کٹھن راہ پر چل پڑا۔ کیسے کسی کو سمجھائے گا؟ کون اس پر یقین کرے گا؟

دکان کی سائڈ پر ایک بورڈ رکھا ہوا تھا۔

''گاموں دہی لسی والا۔'' وہ ایک صحت مند سانولا شخص تھا جس نے بنیان اور شلوار پہن رکھی تھی۔ جسے گاموں

بلایا جاتا تھا۔ بہر حال وہ خوش اخلاق بندہ تھا۔ غلام احمد کو تپاک سے ملا۔ لسی کا بڑا ٹھنڈا گلاس پیش کیا۔

”بے فکر بیٹھو بھرا (بھائی) آرام کرو۔“ وہ دور سے آنے کا سن کر خاص توقیر کرنے لگا۔ غلام احمد چاہتا تھا کہ اسے دعوت دے کر گھر لے جائے تاکہ فراغت سے بات ہو۔ بالآخر وہ لب کشا ہوا۔

”گاموں صاحب...... میں یہاں کسی کو نہیں جانتا...... آپ مسجد میں میرا قیام کروادیں البتہ...... میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں بلکہ...... اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔“

”خیر ہے بھائی، خیر ہے...... آرام سے بیٹھو دال روٹی حاضر ہے...... ویسے مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”کوئی شک دل میں نہ لانا گاموں بھائی، میں سب کچھ بتادوں گا...... یہ میرا شناختی کارڈ ہے۔ رکھ لیں جب تک میں یہاں ہوں...... رکھ لو۔“

گاموں نے کارڈ لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر غلام احمد کو دیکھا پھر لوٹانے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہٹا لیا۔

”چلو میں یہ رکھ لیتا ہوں...... زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔ ناراض نہ ہونا۔ کاکا آتا ہے اسے دکان پر بٹھا کے گھر چلتے ہیں۔“

کاکا آگیا جو ملازم اور رشتے دار کا مرکب لگتا تھا۔ اس کے آتے ہی گاموں نے ”کشمیر سے آنے والے اجنبی مہمان“ کی خبر سب سے پہلے سنائی...... کاکا بار، بار غلام احمد کو تاڑتا، بہر حال گاموں اسے دکان پر بٹھا کر نو وارد کو گھر لے آیا۔

بیٹھک کھول کر اسے بٹھایا اور خود اندر کھانے کا کہنے چلا گیا۔ بیٹھک کی اشیا متوسط سے کمتر درجے کے معیارِ زندگی کی نشاندہی کررہی تھیں۔ تین کرسیاں ایک میز اور ایک پلنگ رکھا تھا۔ غلام احمد الجھی ہوئی کہانی کی گرہیں کھولتا رہا...... چائے بسکٹ اور رسمی گفتگو کے بعد گویا ہوا۔

”آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں میری کچھ کاشت کاری اور فروٹ فارم ہے، پھلوں کے کاروبار میں حصہ ہے۔ اللہ کے کرم سے اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔ گھر میں ہم دو ہی تو جی ہیں۔ بوڑھی والدہ اور میں...... میری بیوی صبورا بہت خوب صورت تھی۔ اس کے بھورے بال، سبز آنکھیں اور سنہری رنگت تھی۔ سنہری رنگت کمیاب ہوتی ہے۔ شادی کے پانچ سال تک ہم اولاد کی خوشخبری کو ترستے رہے۔ دعا، دارو، دم، تعویذ اپنی سی کر کے دیکھ لی۔“ اس نے بولتے ہوئے ہلکی سی کھنکھار سے گلا صاف کیا۔

”اُدھر ہمارے پہاڑی درختوں کا ایک جنگل ہے۔ کبھی یاروں دوستوں کے ساتھ سیر کو چلا جاتا...... ایک دفعہ کیا دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے لوگوں کا ہجوم لگا ہے، معلوم ہوا ہندو وڈیا جانے کب سے آکر بیٹھنے لگا ہے۔ قسمت کا حال بتاتا ہے۔ وہ بولتا غیر واضح تھا۔ فقرے ٹوٹے ہوئے ہوتے۔ سوالوں کا الگ الگ جواب نہیں دیتا تھا۔ تشریح وضاحت نہیں کرتا تھا، جو کہہ دیا وہ سن لو اور سمجھ لو بلکہ گرہ سے باندھ لو کیونکہ وہ ہو کر رہے گا...... میں دیر تک اس کا عمل دیکھتا رہا...... جو کوئی جاتا وہ بائیں طرف پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھ رہتا بلکہ چپ سادھ کے بیٹھ جاتا...... جاپ کرتے، کرتے وہ دائیں ہاتھ سے مٹی کا کوزہ اٹھا کے پہلے سے پڑی گیلی مٹی کو چھینٹا دیتا، سر کے اشارے سے پوچھتا ”بول“ بائیں طرف بیٹھا ہوا بندہ اپنا سوال منمناتا وہ جاپ کرتے، کرتے چار انگلیوں میں گارا لے کے سوال کرنے والے کے ماتھے پر لیپ دیتا، مٹی جب سوکھتی ایک پرانا سا گول عدسہ اس کے ماتھے کے آگے پھراتا اور جو بتانا ہوتا بتادیتا...... میں بھی قطار میں لگ گیا۔ میرے دل میں ایک ہی سوال تھا میری اولاد ہوگی؟ میری باری آئی یہ سب عمل ہوا جو لفظ اس نے کہے مجھے حرف بہ حرف آج تک یاد ہیں۔

”پُتری بِلّی، ہری اکھاں...گل زعفراں...... غلام احمد...... صبورا مظفر آباد...... جا......“ جا کا اشارہ پا کر میں اٹھ گیا۔ میں خوش تھا مجھے...... سبز آنکھوں اور سنہری رنگت والی پتری کی نوید ملی تھی۔ جس کا باپ میں غلام احمد اور ماں صبورا تھی۔ جس کا نام گل زعفران ہوگا۔

مجھے امید ہوگئی کہ اب جلد خوشخبری ملے گی۔ اللہ کی کرنی ہوئی تین ماہ اور پانچ سال کا سکوت ٹوٹا...... میری بیوی نے اماں کو خوشخبری سنائی' اماں اس کا بہت خیال رکھنے لگی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ پیٹ میں ہی بچے کا نام گل زعفران رکھ دیا تھا...... چوتھا مہینہ لگا تھا صبورا کی ماں ملنے آئی، کچھ دن کے واسطے بیٹی کو ساتھ لے گئی...... ہمیں کیا خبر تھی کہ اس کا میکے جانا نہیں ہمیشہ کا وچھوڑا ہے...... بس جی نہ پوچھو...... ایک قیامت گزر گئی۔ جب یہ خبر ملی کہ صبورا دریائے نیلم میں جا گری۔ ساری عمروں کی رتی گلی جھیل کی رہنے والی ان پتھروں' رستوں پر چلنے والی...... کیسے گری، کیا ہوا، رب کی رب جانے ہماری تو دنیا اندھیر ہوگئی...... صبورا مر گئی...... گل زعفران مرگئی۔''

وہ سر جھکا کر رو رہا تھا' ایک ادھیڑ عمر باریش مرد ہو کر ہچکیاں لے۔ لے کر رو رہا تھا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ بیٹھک میں اندھیرا تھا۔ کھلی کھڑکی سے ہلکی، ہلکی روشنی اور ہوا آ رہی تھی۔ فضا بہت بوجھل تھی...... گاموں بھی چپ تھا۔

غلام احمد نے صافہ اتار کر آنکھیں صاف کیں اور اپنا آپ سنبھال کر بولا۔

''اس کے بعد پانچویں رات میں نے خواب دیکھا۔ ایک مکان ہے جو مسجد کے ساتھ ہے' مسجد کے سبز مینار دکھتے ہیں...... اس مکان میں کھجور کا درخت ہے۔ اس کی چھت کے چار طرف دیوار ہے جس میں چھ، چھ سوراخوں والے خانے ہیں، ونگا بابا کی... بڑبڑاہٹ ہے خواب میں وہی کے وہی لفظ جو اس نے بولے تھے۔ اس مکان میں سنہری رنگت اور سبز آنکھوں والی میری پتری گل زعفران مجھے بابا، بابا بلاتی ہے...... پہلی بار خواب سے آنکھ کھلی تو...... میں نیم پاگل ہو کے رات کو باہر نکل گیا۔

''دوسری، تیسری بار یہ خواب دیکھا...... تو غور کیا کہ بابا ونگا مظفر آباد کیوں کہتا ہے؟ میں تو باغ میں رہتا ہوں۔ میں مظفر آباد نکل گیا۔ وہاں ایک، ایک مسجد دیکھی...... مظفر آباد تو ویسے بھی میرا دیکھا بھالا تھا...... کوئی پانچ سال پہلے وہاں کچھ لوگ سیر کے لیے آئے ہوئے تھے...... ان سے پتا چلا پنجاب میں بھی کوئی مظفر آباد ہے وہاں سے آئے ہیں...... میں ان سے کیا پوچھتا؟ مسجد؟ مکان؟ بچی؟ کوئی کیا بتلائے؟ خود میری ماں مجھے پاگل گردانتی تھی، اب بھی کہتی ہے تو جھلا ہے، پگلا ہے...... آپ ہی بتاؤ گاموں صاحب، کوئی خواب بے مقصد اتنی بار کیوں دکھتا ہے؟''

گاموں کا حال اپنی جگہ عجیب تھا۔ اسے یکسر جھٹلانے کی طاقت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ پاگل لگتا تھا نہ جھوٹا...... وہ کرتا بھی تو کیا کرتا...... تسلی کے لیے کوئی لفظ نہیں تھے۔ سچ یہی لگا کہ خوب صورت بیوی اور عرصہ بعد ہونے والی اولاد کی اچانک موت نے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ گاموں کے چہرے پر حیرت اور ترس ٹھہرا ہوا تھا۔ غلام احمد کی آنکھوں میں یقین کی بھیک تھی۔

گاموں نے رکی ہوئی سانس چھوڑی اور کہا۔

''اچھا بھائی کشمیر والے...... اللہ تم پر رحم کرے...... اب آرام کرو...... ریسٹ کرو، عشا کی اذان ہونے والی ہے۔ نماز کے بعد کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کے سو جاؤ۔'' پھر رک کر مزید کہا۔ ''میں اپنی ماسی جی کو فون کر کے بلواتا ہوں۔ وہ قریب ہی شیر شاہ میں رہتی ہے...... صبح پہنچ جائے گی...... جو کچھ ہمارے پاس سچائی ہے...... وہ آ کر بتائے گی...... بس اب آرام کرو......''

گاموں اندر چلا گیا۔

غلام احمد کا ذہن اور بھی الجھ گیا۔ وہ رات بھر جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ فجر کی اذان سنتے ہی مسجد میں چلا گیا۔ نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہا۔ گاموں کا بیٹا آٹھ بجے ناشتا دے گیا...... ناشتے کے برتن واپس لینے آیا تو ابا کا بلاوا دے گیا۔

بیٹھک میں گاموں کے ساتھ سفید چادر والی ایک سن رسیدہ عورت بیٹھی تھی جو یقیناً اس کی ماسی جی تھی۔ غلام احمد نے ادب سے سلام کیا اور بیٹھ رہا۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی۔ گاموں کا بیٹا بھی پُرشوق

بچوں تمھیں حج مبارک ہو .... ثریا فرخ

میرے بیٹا، بہو طلحہ اور حسنہ اس دن گھر آئے تو کہنے لگے...... امی ہم اس سال حج پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ابو آپ بھی ارادہ کر لیں...... ''اللہ تمہارے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔'' میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

پچھلے سال رمضان میں طلحہ نے اپنے نانا سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ ''بیٹا تم ارادہ کر لو...... اللہ تعالیٰ خود بلا لے گا انشاء اللہ اور پھر اللہ نے یوں کرم کیا کہ راستے بنتے چلے گئے اور سارے انتظامات اللہ کے فضل و کرم سے ہوتے چلے گئے۔

دونوں بچوں کا جذبۂ ایمانی...... ہر اس جذبے پر غالب آ گیا جو دنیاوی محبت کا ہے...... بچوں کی فکر کہ ان کے دو چھوٹے، چھوٹے بچے ہیں، بیٹا طلال ماشاء اللہ آٹھ برس کا ہے۔ اور بیٹی مریم ماشاء اللہ چھ برس کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی کو بلانا ہوتا ہے تو وہ ایسے بلا لیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بے شک اس کے یہاں اخلاص اور جذبۂ ایمانی کی قدر ہے...... اور وہ بڑا قدر دان ہے۔

بچوں کے سارے انتظامات ہو گئے۔ vaccination ہو گئی۔ حاجی کیمپ میں تربیت بھی ہو گئی...... تو خوش خبری ملی کہ انشاء اللہ 14 اگست کو ان کی روانگی ہے۔ دوپہر کو ڈھائی بجے تک ائرپورٹ پہنچنا ہے۔

جوانی میں کی گئی عبادت کا اپنا الگ مقام ہے۔ یہ عمر ہر قسم کی دلچسپیوں کی ہے۔ دنیاوی رنگینیاں اپنی طرف بلاتی ہیں۔ کبھی کسی کام کی طرف بندہ سوچتا ہے یہ کر لیں تو حج پر جائیں...... وہ کر لیں تو حج پر جائیں...... مگر وقت گزرتا جاتا ہے اور یوں عمر کی نقدی ختم ہونے کو آ جاتی ہے۔ پھر صرف یہ دن رہ جاتا ہے کہ کاش اس بات اور اس کام کی فکر نہ کی ہوتی اور جوانی میں ہی حج کر لیتے۔

نظروں سے کسی متوقع خطرے کے انتظار میں سب کو دیکھ رہا تھا۔ گاموں کی اس پر نگاہ پڑی تو ڈپٹ دیا۔

''اوئے تو جا...... دکان پر جا...... کاکا اکیلا ہوگا...... رش کا ٹیم ہے۔'' وہ بادلِ ناخواستہ چلا گیا...... غلام احمد کو محسوس ہونے لگا کہ اب جلد ہی اسے باعزت رخصت کر دیا جائے گا آغازِ گفتگو کی خاطر کھنکھارا۔

''ماسی جی...... میں آزاد کشمیر سے آیا ہوں۔''

''وہ سب کچھ مجھے گاموں پتر نے بتا دیا ہے...... فجر ویلے کی آئی بیٹھی ہوں، گاموں کی خالہ ہی نہیں ماں بھی ہوں...... اس کی شادی میرے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی ماں، جو میری بڑی بہن تھی اتنا سا چھوڑ گئی تھی۔'' وہ ہاتھ سے قد بتا کر چپ ہو رہی...... پھر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹھک کا ماحول بہت بھاری اور گھٹن زدہ تھا۔ غلام احمد نے سوچا جو ہونا ہے ہو جائے اور وہ کم از کم تازہ ہوا میں جا کر سانس لے۔

''کشمیر والے پتر......'' شکر ہے بوڑھی خاتون نے خاموشی کی برف توڑی۔

''تری طرف کی کہانی تو سیدھی سی ہے...... حادثے سانحے ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی کرنی ہے جوان مر جاتے ہیں۔''

غلام احمد کی سوالیہ نظریں بات کے مکمل ہونے کی راہ تک رہی تھیں۔

''مگر...... ترا یہ خواب...... عجیب ہے...... تم کہتے ہو کہ بار، بار دیکھا...... گاموں پتر...... میں حیران ہوں اس نے خواب کے سہارے رستہ ڈھونڈا...... پر کس کا رستہ......؟ یہاں تو نہ تری بیوی نہ بچی...... ہمارا کیا لینا دینا بنتا ہے۔'' غلام احمد کا دل بجھ گیا۔ ''ظفراں میری پوتی ہے...... اس کی عمر...... پورے حساب سے تیرہ سیال آٹھ ماں بنتی ہے، میں جوانی میں دایہ کا کام کرتی تھی۔ جسے مڈ وائف کہتے ہیں۔ ظفراں کی ماں صفورا......''

''صبورا......'' غلام احمد کے منہ سے ایک دم نکلا۔

گاموں نے سخت نگاہ سے گھورا...... ماسی جی

میں ان کے ابو دونوں بچے اور حسنہ (بہو) کے ابو اور بھائی ائرپورٹ ان کو چھوڑنے گئے۔ ماشاءاللہ چھوٹے بچوں نے بہت خوشی، خوشی ماں، باپ کو رخصت کیا۔ بس جب حسنہ اندر جانے لگی تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ جس پر اس نے جلد ہی قابو پالیا۔ یہ دیکھ کر طلال میاں بھی منہ پھیر کر رونے لگے۔ دعاؤں کے سائے میں ہم ان کو رخصت کر کے واپس ہوئے۔

آج وہ خوش نصیب دن ہے۔ جب میرے بچے حج کی سعادت حاصل کر چکے...... آج وہ دونوں ایسے ہوگئے جسے ان کی ماؤں نے انہیں آج ہی جنم دیا ہے۔ آج اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کا میل کچیل دور کر دیا...... آج وہ ان مقدس مقامات پر اپنے رب سے قریب ہوگئے۔ جہاں جانے کی ہر مسلمان کو تمنا ہوتی ہے۔ میرا دل ان کے دلوں کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ میری دعائیں ان کی دعاؤں کے ساتھ مل رہی ہیں، میرے بچوں کو اللہ تعالیٰ نے وہ نور عطا کر دیا کہ اس کا جتنا شکر کروں وہ کم ہے۔ اے میرے معبود حقیقی! میرے بچوں کو ہمیشہ ایمان پر رکھنا اور ایمان پر اٹھانا...... اور میرے معبود مجھے بھی موت ایمان کی حالت میں دینا۔ (الٰہی آمین)

اپنے تمام متعلقین سے حج کی مبارک باد وصول کرتے ہوئے میرا دل فخر و خوشی سے لبریز ہے۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے نیک تمنائیں ہیں۔

آخر میں اگر اپنے پوتی پوتا اور ان کے نانا، نانی کی تعریف نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ ماشاءاللہ بچوں نے بہت اچھی طرح وقت گزارہ اور ماشاءاللہ بچوں کے ننھیال والوں نے بھی ان کو بہت اچھی طرح سے رکھا اور اتنا مصروف رکھا کہ انہیں ماں، باپ کی دوری زیادہ محسوس نہ ہوئی۔

اللہ ہم سب کو بھی یہ سعادت نصیب کرے، آمین۔

تنبیہی نظروں سے دیکھنے لگی وہ ہکلا کے رہ گیا۔

”یہ 2004ء کی بات ہے...... اب مجھے سن یاد آیا ہے...... صفورا کو حمل ٹھہرا...... پہلے تین ماہ وہ کپڑے دھوتی رہی...... چوتھے ماہ سے آثار ہوئے۔ میں نے خیال کیا کہ دن چڑھے ہیں۔ مگر ڈاکٹرنی کے پاس لے گئے تو ڈاکٹرنی بولی اسے چار ماہ کا پیٹ ہے...... میں تو ہنس پڑی، کہا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ حساب پھر کرو، آپ کو غلطی ہو رہی ہے۔ اسے پچھلے مہینے تو......“ ڈاکٹرنی نے سمجھایا کہ پریشان نہ ہوں ایسا ہو جاتا ہے...... وہ کیا کہتے ہیں...... کیا ہوتا ہے۔“ ماسی جی ماتھا ٹھونک ٹھونک کر سوچتی رہی پھر یاد کر کے کہا۔ ”ریئر (rare) کیس...... وہ تھا...... خیر سے احتیاط کی تلقین کی اپنے ٹیم (ٹائم) پہ بچی پیدا ہوگئی...... دو جھی بات...... صفورا ایک دن اوپر چھت پر سردی کی دھوپ میں بیٹھی تھی۔ نیچے آئی تو ہاتھ میں رسالہ تھا خوشی سے بتانے لگی۔ ”ماسی جی میں نے اپنی دھی کا نام ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ دیکھو، یہ لکھا ہے زعفران گل......“ ہمیں ڈاکٹرنی نے شیشہ لگا کے دیکھ کے بتا دیا تھا کہ بیٹی ہے...... تو لڑکیوں والے نام سوچتی رہتی تھی اس کی ماں...... اتنا مشکل ناں میرے منہ نہ چڑھتا تھا۔

”میں نے صفورا سے کہا کوئی چھوٹا سا اسلامی نام سوچ لے...... میڈی سوہنی شہزادی صفورا ناراض ہوگئی۔ مجھ سے لاڈ کرتی تھی...... میں نے کہا اچھا چل تو راضی رہ...... یہی ناں (نام) رکھ دیں گے۔ اسکول کے رجسٹر میں یہی نام ہے...... پر ہمارے منہ نہ چڑھا...... میں ملواتی ہوں ابھی ظفراں سے کشمیر والے پتر...... ظفراں کی ماں کو بھی اپنی بچی پالنا، سنبھالنا نصیب نہ ہوا...... تین ماہ بعد ہماری کرماں والی چل بسی...... ظفراں کو میں نے پالا...... گاموں کا دوجھا نکاح کیا...... اس کو اللہ نے دو بیٹے دیے پر میری ظفراں تو سرسوں کا پھول ہے...... وہ نہیں ملتی بھائیوں سے...... گاموں پتر...... بلوا دے بیٹی کو۔“

گاموں کا انداز غیر واضح تھا۔

غلام احمد کی آواز اور الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ دامنِ دعا تنگ پڑ گیا تھا۔ وہ کبھی ماسی اور کبھی گاموں کو صرف ظاہری آنکھ سے دیکھتا نظر آرہا تھا اس کا وجود، قلب و روح کہیں معلق تھے۔ صفورا، صبورا...... زعفران...... ظفراں سرسوں کا پھول...... وہ میرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں۔

ماسی جی نے گاموں کو کوئی اشارہ کیا۔ گاموں نے سرائیکی کا سہارا لیا مبادا غلام احمد سمجھ جائے۔

''اساں کیوں دھی نوں ملاوّں۔'' (ہم کیوں بیٹی کو ملائیں) ماسی جی بضد رہی، دو تین بار آواز دی تو سرائیکی میں جواب آیا۔

''آیندی پئی آں ماسی جی۔''

ایک خواب زدہ بوڑھا باپ، بیٹی کے قدموں کی چاپ پر آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا۔ بیٹھک کا گھر کی طرف کھلنے والا دروازہ الہام کی تفسیر سے چمک اٹھا۔ ایک معصوم صورت جس کی ہری آنکھیں، موتیا رنگت، گلاب کی پنکھڑیوں سے لب تھے۔ جس نے دو چوٹیاں کس رکھی تھیں اور بڑے، بڑے پرنٹ کا لمبا فراک جو شلوار کے پائنچوں سے کچھ اوپر تک تھا۔ جلدی میں لیا گیا کالا دوپٹا فرش پر لٹک رہا تھا۔

سفید داڑھی والا غلام احمد اضطراب سے یوں اٹھا کہ کاندھے سے صافہ نیچے جا گرا۔ بے ساختہ دونوں باہیں پھیلیں۔ ''آ میری گل زعفراں......'' دوسرے ہی پل دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ جسم زلزلے کی زد میں تھا...... بے عنوان، بے درد لمحہ ایسا تھا کہ ماسی جی آنکھیں پونچھ رہی تھی تو گاموں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ظفراں، ماسی جی کے پہلو میں دبکی آنکھوں میں حیرت بھرے تک رہی تھی۔ ماسی جی نے اس کے کان میں کچھ... سرگوشی کی...... وہ معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔

''کشمیر والے بابا جی...... آپ کی بیٹی کا نام بھی زعفران گل تھا۔ آپ کی بیٹی زعفران گل مرگئی؟''

''اللہ نہ کرے پتری......'' غلام احمد زور، زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، ادھر اُدھر ہاتھ مار کر یونہی چند چیزیں اکٹھی کرنے لگا...... گرا ہوا صافہ اٹھایا...... چپل ڈھونڈی۔

''صبورا کی مٹی کو بتاؤں گا...... جھلی نہ ہو تو تری پتری زندہ ہے۔ آکے دیکھ اماں...... مجھے کہتی تھی پگلا نہ ہو تو جھلا نہ ہو تو...... یہ ہے میرا خواب...... یہ بیٹھی ہے...... گل زعفران......'' اس نے ان کی طرف سے پشت کیے، کیے سامنے کی طرف منہ موڑا تو داڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔

''ماسی جی...... میں جارہا ہوں...... جیسے تم نے آج تک پالی پوسی...... ویسے ترے حوالے۔'' گاموں نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر دیا، وہ کارڈ لے کر اپنی جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے کارڈ کی فوٹو کاپی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔

''جب میں مٹی ہو جاؤں...... میری مال ملکیت میری گل زعفران کا ہے...... لے جانا۔'' کالا سفری بیگ، کندھے پر لٹکایا، قمیص کی آستین سے چہرہ رگڑا...... دروازے کی طرف بڑھا ذرا سی پشت موڑے دایاں ہاتھ اٹھا کر زیرِ لب رب را کھا کہا۔ پتھر کے بتوں میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

اس کا ایک قدم باہر اور دوسرا اٹھا ہی تھا کہ ظفراں نے ماسی جی سے ہاتھ چھڑایا وہ لپکی ہی تھی کہ اسی تیزی سے گاموں نے پکڑ کر کھینچ لیا۔

''جھلا بندہ ہے جانے دے۔''

''کشمیر والے......'' وہ پکاری مگر پکار ادھوری تھی۔ غلام احمد کے قدم تھمے...... جسم سراپا کان ہو گیا۔

''بابا......'' وہ زور سے چلائی...... ''رونا نئیں بابا......'' غلام احمد نے پلٹ کر دیکھا۔ جھرنے کی طرح بہتی آنکھیں...... مگر ہونٹ ہنستے تھے...... انگشتِ شہادت اوپر اٹھائے...... زور، زور سے ہنستا اور اتنے ہی زور سے روتا وہ پاگل نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

پگلا جھلا خواب زدہ باپ چلا گیا تھا۔



سرِ دیوار لکھتا ہوں پسِ دیوار سنتا ہوں

نصرت یوسف

تیز، تیز قدم اٹھاتے، ہاتھ میں کی گئی شاپنگ کے تھیلے اٹھائے وہ سروس روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خلافِ توقع زیادہ وقت خریداری میں لگ گیا تھا اور آگے کے تمام کاموں پر جس کا لازمی اثر پڑنا تھا۔ از سرِ نو ذہن میں بقیہ مصروفیت کو ترتیب دیتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے جیسے تھما سا دیا تھا۔

ڈھلتی شام کی دھیمی، دھیمی روشنی ان خود رو پھولوں اور پودوں پر سنہری افشاں کی طرح چمک رہی تھی جو اس پوری سڑک کی لمبائی میں سانس لے رہے تھے۔ ان کے قریب بلکہ جڑوں میں پیوستہ کوڑا کرکٹ انسانوں پر خبث اور خباثت کے جراثیم اسپرے کر رہے تھے۔ سامنے کا منظر تو کوئی مبہوت کرنے والا نہیں تھا پھر کیوں شاہنواز تھم سا گیا تھا۔ اسے بھی دیکھے جانے کا احساس ہو چکا تھا۔ جبھی اس سرو قد لڑکی نے اپنے عبایہ کا نقاب خواہ مخواہ صحیح کیا اور سڑک کی دوسری جانب ہوگئی۔ ہاتھوں میں کالے دستانے اور کالے ہی بند جوتے اوپر سے نیچے تک کالے سیاہ رنگ میں بس آنکھوں کے گرد سنہری کھال کا چمکتا رنگ ہی نمایاں تھا۔

شاہنواز نے لڑکی کو راستہ تبدیل کرتے دیکھا تو

مکدر سا ہوگیا۔ اس کے سیاہ عبایا... پر چمکدار نگوں سے بنے سوالیہ نشان ہی دراصل وہ نقطہ تھا جس نے شاہنواز کو ٹھٹکا دیا تھا۔لڑکی کے قد کی مناسبت سے اس کے عبایا... کے دونوں اطراف میں بنے فیروزی اور سفید رنگ کے امتزاج کے ساتھ وہ نشانات چمک رہے تھے۔

''بوجھو تو جانیں۔'' شاہنواز کو لگا جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔ایک بار پھر اس کا سراپا جانچا جو اب قدرے دور جا چکا تھا۔ وہ عجب سی سنسنی محسوس کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی پھر سامنے نظر آتے بل بورڈ پر نگاہ ڈالی جہاں لکھا تھا

" insomnia is in trend alow"

(بے خوابی موجودہ دور کا فیشن ہے) انٹرنیٹ کنکشن مہیا کرنے والی کمپنی کی طرف سے تازہ، تازہ پینٹ کیا گیا بورڈ آتے جاتے لوگوں کو شاید ''تعلیمِ بالغاں'' دینے کے لیے لگایا گیا تھا۔

☆☆☆

''ہائے جگر کہاں تھے تم؟ پچھلے تین دن سے غائب ہی ہو... کہاں پائے جاتے ہو آج کل؟ کہیں ملک سے زندہ بھاگنے کی تیاری میں مصروف تو نہیں؟'' ان چاروں نے شاہنواز کو دیکھ کر پوچھنا شروع کردیا۔

''تین دن؟ ابھی کل تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔'' شاہنواز نے حیرت سے کہا۔

''پان کے کھوکھے پر شکل دیکھی تھی بس تمہاری۔'' یاور نے تیکھے لہجے میں کہا تو شاہنواز ہنس پڑا۔

''ویسے پان کی عادت کم کردو تو تمہارے ڈینٹسٹ کا بل بھی کم ہوجائے۔'' شاہنواز نے یاور کو مشورہ دیا تو وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

''بس اس کی طرح سگریٹ، پان استعمال کیا کر، انجانے میں، بیگانے کی طرح......'' صفدر نے دوستانہ سا طنز کرتے ہوئے شاہنواز کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بنا جواب دیے اس کے ہاتھ سے جلتی سگریٹ لے کر ایک گہرا کش لگایا۔ اور بغور ان خالی

کین کو دیکھنے لگا جو اُن چاروں کے قریب خالی لڑھک رہے تھے۔ بوٹ بیسن کے علاقے میں نم اندھیری جگہ پر بیٹھے وہ یقیناً مراقبے میں مصروف نہ تھے۔ خوشحال طبقے سے تعلق کے باعث ان کی زندگی کے مسائل وہ نہ تھے جو اسّی فیصد عوام کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے تھے۔ ان کے مسائل زندگی میں طاقت اور اختیار حاصل کرلینے کے گرد گھومتے تھے۔ جائداد کی خرید و فروخت، چین، ملائشیا سے امپورٹ کردہ آئٹم اور ان کی کھپت پر گفتگو ہوتی تھی۔ چھبیس، ستائیس برس کے یہ تمام جوان زندگی کے تلخ ذائقوں سے ناآشنا تھے، انہوں نے آنکھ کھولتے ہی سہولتیں اپنے اردگرد پائی تھیں اور وہ انہی کے عادی تھے سوائے شاہنواز کے جس نے سہولتیں ہونے کے باوجود اپنے باپ عارف مجتبیٰ کی شیر کی نگاہ بھی دیکھی تھی۔ جب تک بچوں پر ان کا کنٹرول رہا وہ خاصی حد تک اردگرد پھیلے بگاڑ سے بچے رہے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے اپنے، اپنے پر پھیلا کر پرواز شروع کی تو وہ اثرات نمایاں ہونے لگے جو اردگرد موجود تھے۔ عارف مجتبیٰ کی شیرانہ نگاہ کے اثرات مدھم سے پڑنے لگے تھے۔ اکلوتی بیٹی رشنا کو انہوں نے مخلوط نظامِ تعلیم پر مبنی اداروں میں پڑھانا پسند نہ کیا مگر اولیولز کے بعد اس نے جس آرٹ کالج میں داخلہ لیا وہیں کے ٹیچر کے ساتھ اس کی پسندیدگی اتنی بڑھی کہ باپ نے کسی غیر مناسب وقت کو دیکھنے سے پہلے ہی اس ٹیچر سے رشنا کی خواہش کے مطابق رشتہ کردیا۔ اس نوجوان ٹیچر میں بظاہر کوئی خامی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ جس پُرتعیش زندگی کی رشنا عادی تھی، وہ فی الوقت اس کا متحمل نہیں تھا۔ باپ کو بیٹی کی اس بغاوت کا خاصا غم تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ بہت جلد ان دونوں کے درمیان گرم جوش تعلقات کا جھاگ بیٹھ جائے گا۔ وسائل کی قلت رشنا کو بے چین کردے گی لہٰذا انہوں نے ذاتی کوششوں سے بیٹی داماد کو لندن سیٹل کرادیا۔ دونوں میاں بیوی وہاں جاب کرکے کماتے کھاتے تھے۔ دیارِ غیر تک بھجوانے

میں باپ نے کردار ادا کیا اس کے بعد کی تمام ترقی ان دونوں نے اپنے بل بوتے پر کی۔ آج کل عارف مجتبیٰ اور ان کی بیوی اپنے دونوں بیٹوں شاہنواز اور شاہ زیب کو چھوڑ کر اپنی بیٹی، داماد کے پاس لندن گئے ہوئے تھے۔

بیٹی، داماد کی محبت سے زیادہ ان دونواسوں کی چاہت انہیں گاہے بہ گاہے کھینچ لاتی تھی جو نانا، نانی کی آمد پر بے حد خوش ہوتی تھیں۔ کمانے میں بے حد مصروف والدین کی عدم موجودگی میں لاڈ اٹھانے والے نانا، نانی کی آمد انہیں بے حد پسند تھی۔ باپ کے پیچھے شاہنواز ان کی ٹریولنگ ایجنسی کامیابی سے سنبھالے ہوئے تھا...... جبکہ چھوٹا شاہ زیب A.C.C.A کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ کھانے، پینے، سونے اور گھر لوٹنے کے اوقات ممی، ڈیڈی کی غیر موجودگی میں خاصے ابتر تھے۔ جسے شاہنواز نے اڑان کا نام دیا تھا۔ ایجنسی کے تمام معاملات بظاہر ٹھیک ٹھاک ہی رواں تھے مگر آج کل خلافِ توقع کسی پرانی کلائنٹ فرم سے تعلقات کشیدہ ہو چلے تھے۔ تقریباً پچیس لاکھ کی رقم اس فرم پر واجب الادا تھی مگر ادائیگی میں مستقل ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا تھا۔ فریق اتنا طاقتور تھا کہ اس پر دباؤ ڈالنا کوئی آسان نہیں تھا۔ قوی اندیشہ تھا کہ یہ رقم ڈوب جائے گی۔ شاہنواز پچھلے کئی دنوں سے اس معاملے کے حل کی تگ و دو میں تھا مگر کامیابی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دو دن پہلے ڈیڈی کے پاکستان واپسی کے فون نے اسے متفکر سا کر دیا تھا۔

”ٹائیگر کچھ پریشان دکھتا ہے۔“ علی حیات نے شاہنواز کے تاثرات جانچتے ہوئے کہا تو سب نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کے چہرے پر سب کچھ درج ہو۔

”نہیں بھئی...... کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“ شاہنواز ہاتھ اٹھا کر شگفتگی سے بولا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو غیر متعلقہ اشخاص سے اپنی پریشانیاں بیان نہیں کرتے۔

”اصل میں مجھے symbolic language (علامتی زبان) میں ایک پیغام ملا تھا۔ میں اس کو ڈی کوڈ نہ کر سکا اور وہ ضائع ہو گیا۔“

”کیوں، تمہیں کوئی جاسوسی ناول کا کردار مل گیا تھا؟“ صفدر نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک ناول کا حوالہ دیا جو شاہنواز اور اس کے پسندیدہ مصنف کا متنازعہ ناول تھا۔ امریکا میں اس ناول پر خاص لے دے اسے خاصا مشہور کر چکی تھی۔

”ناول میں مصنف اگر مقدس ہستیوں پر عام انسانوں کی طرح بحث نہ کرتا تو یہ ناول میں دوسروں کو ضرور پڑھاتا۔ لیکن اب یہ شیئر نہیں کیا جا سکتا۔“ شاہنواز نے صفدر کو اس کا ناول واپس کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔ اب صفدر نے اسی ناول کا حوالہ دیا جس میں ”Holy grail“ ایک ایسا راز تھا جو ایک اجنبی زبان میں تحریر تھا۔

”نہ، نہ ٹائیگر کو خلائی مخلوق سے رابطے کا سفیر بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ایسی باتیں کر رہا ہے۔“ یاور نے اپنی انگلی سے اس کے سر کو تھپتھپایا تو سب نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔

”اور اندازے لگاؤ، تم بھی بولو، تم بھی کچھ کہو۔“ شاہنواز نے دونوں بازو باندھتے ہوئے مزے لے کر بقیہ دونوں دوستوں کو بھی ابھارا۔

”چل یار کسوٹی نہ کھیل!“ علی نے چیونگم کا پیکٹ اس کے آگے کیا۔

”کوڈز ایک برقع پر لکھے تھے بلکہ بنے تھے۔“ شاہنواز نے ریپر پھاڑ کر چیونگم منہ میں رکھی اور نہایت ڈرامائی انداز میں بولا۔

”برقع پر......؟“ صفدر نے حیرت سے دُہرایا۔

”تمہارا مطلب ہے وہ کالے گاؤن جو بیچاری عورتیں پہنتی ہیں۔“ یاور نے عورتوں پر افسوس کیا۔

”کیا مذاق ہے، صحیح سے بتاؤ۔“ علی نے کندھے پر زور کا ہاتھ مارا۔

”اب میں بتاتا ہوں لکھا تھا۔“ خاور جو مستقل خاموش تھا پُریقین لہجے میں بولا تو سب کی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ ”برقع پر لکھا تھا۔ touch me not بس اتنی سی بات ہے جسے بتانے میں اس نے اتنے گھنٹے لگا دیے ہیں۔“ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے سر نفی

میں ہلایا اور پھر وہ واقعہ سنانا شروع کیا جب عبایا پر بنے سوالیہ نشانات سے ابھرتی سرگوشیاں اسے سنائی دیں اور تلاطم خیز خیالات دائرے بنانے لگے۔

''دل تو چاہ رہا تھا کہ میں اس حسینہ سے جا کر کہوں اگر تم سوال ہو تو میں جواب ہوں، تم معما ہو میں حل ہوں، تم الجھن ہو تو میں سلجھن ہوں۔''

''اور تم حسینہ ہو تو میں پسینہ ہوں۔'' یاور نے طنزیہ انداز میں اس کی بات کاٹی اور چیونگم سائڈ میں تھوک دی۔

''یہ انٹلیکچوئل کب سے پسند آنے لگی تمہیں؟'' گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

''کہاں چلے؟'' اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے شاہنواز بولا۔

''کھلی جگہ ہی میں بیٹھنا ہے تو اسنوکر کلب کے لان میں بیٹھ جایا کرو...... یہاں اب بہت بُو آتی ہے۔ کوڑا ابھی خاصا ہو گیا ہے......'' وہ بدستور کھڑا رہا۔

''بات پسند کی نہیں مسٹری کی ہے۔ وہ کوئی مسٹری کوئی راز لگ رہی تھی۔'' شاہنواز نے سر ہلایا اور اپنی بات شروع کر دی۔ کسی مووی کا وہ کردار جو آخر تک نہیں حل ہوتا اور آپ چاہتے ہیں کہ اس کو واضح کر دیں کسی ایک سمت لے جا کر غیر یقینی صورتِ حال سے نکل آئیں۔''

''نو مور فلسفہ پلیز...... سیدھی بات یہ ہے کہ کھلی ڈلی دوستوں سے تم بور ہو چکے ہو، کچھ نیا چاہتے ہو جس کی شروعات اس انٹلیکچوئل سے ہو چکی ہے۔ چلو اٹھو کچھ شغل میلا کرتے ہیں۔'' خاور نے کہا تو شاہنواز نے سر ہلایا۔

''سوری، آج میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا...... ہاں کل سنڈے ہے۔ کل کلب میں ملاقات ہو گی۔ بہت دن ہو گئے ہیں جانا نہیں ہوا۔'' شاہنواز نے ان سے معذرت کرتے ہوئے اگلے دن کا پروگرام بنایا تو سب تیار ہو گئے۔

''ماہا کو بھی بتا دو کہ وہ اور اس کی فرینڈز ہمیں جوائن کرنا چاہیں تو کل آ جائیں۔'' یاور نے شاہنواز سے کہا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''ماہا سے بہتر ہے ابیکا گروپ کو لے لو۔ ماہا اپر کلاس میں سیٹ ہونے کی کوشش تو کرتی ہے لیکن بیچاری مس فٹ رہتی ہے پچھلی بار سلیولیس ڈریس میں آئی تھی اور یہ عقل نہیں تھی کہ ایسے آؤٹ فٹس کے لیے کچھ اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے۔'' شاہنواز نے ایسے برے تاثرات سے کہا کہ سب گلا پھاڑ کر ہنس پڑے۔ فضا میں ان کے قہقہے حدود و قیود سے باہر نکلی عورت کو ارزاں اور بے قیمت کر رہے تھے۔ سطحی لطف و مزے کے لیے بے حجاب عورت ہو یا حجاب کرنے کے لیے نامناسب انداز اختیار کرنے والی عورت...... دونوں ہی صنفِ مخالف کے جذبات میں احترام کے بجائے ہیجان برپا کر دیتی ہیں۔ ماہا کو بے مول کیا جا رہا تھا تو عبایا پر بنے سوالیہ نشانات نے بھی شاہنواز کو متوجہ کر دیا تھا۔ اس میں ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ وہ بھی موضوعِ گفتگو بن گئی تھی۔

''تمہارے ساتھ کچھ مسئلہ ہے شاہ، کل تک ماہا کے ساتھ تم انجوائے کرتے تھے، آج تمہیں کو سچین مارکس والی سیاہ چمگادڑ اپیل کرنے لگی۔'' علی کو ماہا پر تبصرے سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاہنواز کی باتوں پر کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی کا رخ گھر کی جانب تھا۔ راستے میں آنے والے ایک سپر اسٹور کو دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی۔ سی ڈی سیکشن میں مختلف سی ڈیز دیکھتے ہوئے وہ اپنی مطلوبہ سی ڈی کی تلاش میں تھا۔ سی ڈیز کا کوئی خاص انتخاب یہاں پر موجود نہیں تھا۔ ناکامی پر اس نے اسٹور سے باہر جانے کے لیے زینے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ سی ڈی سیکشن دوسری منزل پر واقع تھا۔ کسٹمرز کے لیے لفٹ کی سہولت بھی مہیا تھا لیکن جتنی دیر وہ لفٹ کے اوپر آنے کا انتظار کرتا اتنی دیر میں ایک منزل نیچے خود اتر سکتا تھا۔ ابھی شاہنواز نے چند ہی سیڑھیاں اتری تھیں کہ اچانک اسے دھکا لگا اور وہ بہ مشکل اپنا توازن گرل پر ہاتھ جما کر برقرار رکھ پایا۔ چار ساڑھے چار سال کے لگ بھگ عمر کا ایک بچہ اس

سے ٹکرا کر اوپر بھاگ چکا تھا۔ شاہنواز نے مڑ کر دیکھا تو وہ animated movies کے شیلف کے آگے کھڑا اچک اچک کر سی ڈیز دیکھ رہا تھا۔ بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اس نے بچے کے والی وارثوں کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو سامنے لفٹ کے دروازے سے باہر آتی لڑکی پر اس کی نگاہ ٹک گئی۔

''سنی، سوئٹ ہارٹ ویٹ! ویٹ۔'' بیٹے کو پکارتی ہوئی وہ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالے تیزی سے آرہی تھی۔ اخروٹی رنگ کے بالوں کے ساتھ اس کی دراز گردن میں عجیب شان تھی۔

''سوئٹ ہارٹ تم خود ہو، یہ شیطان بچہ نہیں۔'' شاہنواز نے دل میں تبصرہ کیا اور مسکراتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

☆☆☆

موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی کا دورانیہ گھٹ رہا تھا۔ شاہنواز رات کتنی ہی دیر تک جاگے لیکن صبح کے نو بجے وہ باقاعدگی سے ایجنسی پہنچ جایا کرتا تھا۔ ایجنسی کے تمام امور کی نگرانی اس نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ''باپ کی پوری، بیٹے کی آدھی اور نوکری بلا سے۔'' کاروبار پر توجہ کے درجے ڈیڈی اکثر دہرایا کرتے تھے۔ شاہنواز آدھی کے بجائے پوری توجہ اور فکر کرتا تھا۔ ذرا فرصت ہوئی تو اس نے اپنے آفس کی کھڑکی کے بلائنڈز کھول دیے۔ کھڑکی داخلی راستے کی سیدھ میں تھی۔ جہاں سے سڑک اور لوگوں کی آر جار نظر آجاتی تھی۔ ٹریفک رواں، دواں تھا۔ چھوٹی، بڑی سواریاں چھوٹے، بڑے لوگ، اونچے، نیچے قد، رنگ برنگے انسان، سڑک سے اڑتی دھول کہ سرکار نے سڑک بنانے کا احسان کرنے کے بعد استرکاری بھی نہیں کی تھی۔ قدیم درختوں کی داڑھیاں جو باریش بزرگ کے مانند درخت کو جہاندیدہ، تجربہ کار ظاہر کرتی تھیں اس سڑک پر نمایاں تھے۔

یہ درخت کیا، کیا نہ جانتے ہوں گے۔ شاہنواز کے دل میں عجیب سا خیال ابھرا۔ ''انہوں نے دادا جان کو بھی دیکھا ہوگا۔ ڈیڈی کو بھی جانتے ہیں اور مجھ سے بھی واقف ہیں۔'' ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ سے پتے ملنے لگے تو اسے لگا جیسے اس کے خیالات پر درخت نے ردعمل دیا ہو، اچانک کوئی کوا پر سمیٹتے ہوئے ایک اونچی شاخ پر آکر ٹک گیا۔

''کالی چمگادڑ!'' زیر لب اس نے کہا اور دھیمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ وہ پلٹ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا تو میز پر رکھے سیل فون سے ابھرنے والی مترنم ٹون سے چونک گیا۔ فون کی اسکرین پر alarming message تھا۔

''اوہ آج اسپینشا کا برتھ ڈے ہے۔'' اسپینشا ایک پارسی لڑکی تھی، بے حد شوخ اور چنچل۔ بی اے کے پورے چار سال اس کی سنگت کے شاہنواز کی خوشنما یادوں میں سے تھے۔ صفدر اور خاور بھی جب ہی شاہنواز کے ساتھی بنے تھے۔ اسپینشا سے تینوں ہی کی دوستی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ایک اکیلی پارسی لڑکی بلا جھجک اسلام پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی تھی مگر کسی کی پیشانی پر طیش بھری شکنیں نہ ابھرتی تھیں۔ اس کے تبصرے بالعموم کچھ اس طرح کے ہوتے تھے۔

''مذہب کے نام پر تمہارے ہاں عورتوں کو آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ آخر تم لوگ عورتوں کے خلاف ناانصافی پر آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ تم لوگوں کے لیے عورتوں کی explanation میں کوئی مثبت رخ ہی نہیں۔'' ناک سکوڑتے ہوئے وہ یہ سب کہتی تو ایک آواز نہ ہوتی جو اسے روک دیتی۔

''واقعی ہمارے ہاں explanation تو بہت ہے لیکن حق بھی تو دیا ہے رائے کا، مرضی کا اب اگر عورت اسٹینڈ نہیں لیتی تو اس کی مرضی......'' خاور اس کے تمام الزامات گویا قبول کرتے ہوئے اس کی بات ہی اونچی کر دیتا۔

''مرضی! کیسی مرضی؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولتی۔ ''کیا تم اپنے گھر کی کسی لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے مطابق پارسی خاندان میں کر سکتے ہو؟'' اس پر خاور چپ رہ گیا تھا اور اسپینشا ہنس کر کھڑی ہو گئی تھی۔

افسوس تو اس بات پر تھا کہ کسی کو بھی یہ نہیں پتا تھا کہ عورتوں کی عزت، حرمت اور قدر و قیمت کا اعلیٰ ترین چارٹر قرآن پاک کے سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے ثبت کردیا ہے۔ دنیا کا کوئی اصول، کوئی قانون ایک باعصمت عورت پر بدکرداری کے الزام کو اتنی سنجیدگی سے نہیں ڈیل کرتا جتنا اللہ تعالیٰ کا قانون...... ایسے جھوٹے الزام ہی پر مجرم کے لیے اِسّی کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ایسی کوئی نظیر دنیا کے کسی مذہب و قانون میں نہیں۔ دین کے ایسے حقیقی اور پائدار اصولوں سے لاعلمی کے باعث ہی غیر مسلم گروہ کے الزامات پر عام مسلمان مدافعت بھی نہیں کر پاتے۔

بحیثیت پیدائشی مسلمان شاہنواز کو یہ باتیں چبھ ضرور جاتی تھیں لیکن اسے بھی یہ اپنے ہی مذہب کی کمزوری لگتی تھی۔

بی بی اے ختم کر کے شاہنواز نے ایم بی اے کرنے کے بجائے اپنے والد کے ساتھ ٹریولنگ ایجنسی میں اپنا بھرپور وقت اور صلاحیت لگادی۔ اسپینشا مزید اسٹڈیز کے لیے سنگا پور چلی گئی۔ صفدر اور خاور کے ساتھ گاہے بہ گاہے ملاقات رہتی تھی۔ ہاں وہ ہمیشہ کی طرح اسپینشا کو اس کی سالگرہ پروش کرنا نہیں بھولتا تھا۔ چاہے وہ ای میل ہوتی، کال ہوتی یا مختصر سا ٹیکسٹ میسج۔ شروع، شروع میں جب وہ اسپینشا سے علیحدہ ہوا تھا تو سنگا پور تک کال کرلیتا تھا، وقت کے ساتھ، ساتھ نقوش مدھم ہونے لگے۔ ایک اسپینشا چھوڑ گئی اور خوش ادا اور نگاہ خیرہ پیکر زندگی میں آتے گئے۔ بس اب سالگرہ کی حد تک کا تعلق ہی رہ گیا تھا۔ لمحوں میں رنگین سا ایم ایم ایس کر کے اس نے اسپینشا کا نمبر کلک کیا اور ماضی کو چھوڑ کر حال میں واپس لوٹ آیا۔ آج یہ اس کے ایجنسی سے اٹھنے کا وقت تھا۔ سو گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے اس نے باہر کا رخ کیا۔

صفدر کو اس کے اسٹوڈیو سے پک کرتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ شاپنگ ایریا کی جانب کیا تو وہ چونک گیا۔

''یہ کیا! تم مجھے کہاں لے جانے کے لیے آئے تھے؟''

''وہیں لے جارہا ہوں جہاں کا کہا تھا۔'' شاہنواز نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ صفدر کا تجسس پوری طرح ابھار چکا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ exciting scene ہے۔'' وہ گاڑی شاپنگ مال کی طرف مڑتے دیکھ کر جھنجلایا۔

''exciting ہی ہے۔ صبر ذرا، میں بھی گھنٹا بھر پہلے ایسے ہی نہیں ایجنسی سے اٹھ آیا۔'' صفدر کو جواب دیتے ہوئے اس نے گاڑی سروس روڈ پر لے جاتے ہوئے دھیمی کردی تھی۔

''اوہ تو تم اس لیے یہاں آئے تھے بوائے۔'' صفدر نے بے اختیار سامنے سے آتی ایک دراز قامت عبایا میں ملبوس لڑکی کو دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں گول ہو کر سکڑ چکے تھے۔ عبایا پر بنے چمکتے دمکتے سوالیہ نشان اور شاہنواز کی توجہ سے وہ فوراً ہی یہاں آنے کا مقصد جان چکا تھا۔ شاہنواز نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کالی تتلی، بنا کسی رنگ کے۔'' صفدر نے حیرت سے کہا۔ ''ہاں یہ اس کے جسم پر بنے مارکس واقعی exciting ہیں۔'' صفدر نے شاہنواز کے انہماک کو دیکھتے ہوئے ایک اور تبصرہ کیا تو اس نے گردن موڑ کر صفدر کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''میں نہ کہتا تھا کہ exciting ہے۔'' لڑکی کی چال میں قدرتی لچک تھی۔ ایسے میں قد کی لمبائی کے ساتھ اس کا متوجہ کرتا ہوا عبایا شاہنواز کی جذباتی کیمسٹری میں ابال پیدا کررہا تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر باہر کھڑے ہوچکے تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے کو محسوس کرتے ہی لڑکی کی چال میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی تھی۔ کندھے پر بڑا سا شولڈر بیگ خوامخواہ درست کرتی وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی گئی۔

''لگتا ہے یہ سامنے والے انسٹیٹیوٹ سے آئی ہے۔'' صفدر نے اس کے ہاتھ میں پکڑی کمپیوٹر لینگویج کی کتاب دیکھ کر کہا۔

''ہاں پہلی مرتبہ جب میں نے دیکھا تھا تو PHP (کمپیوٹر لینگویج) کی کتاب تھی۔''

''گڈ چمگادڑ دماغ بھی رکھتی ہے۔'' صفدر نے قہقہہ لگایا اردگرد موجود ایک آدھ لوگوں نے ان دونوں کی نگاہوں کا مرکز بھانپ لیا تھا اور ایسے مسکرا رہے تھے جیسے کسی اسکرین پر چلتی مووی کے دلچسپ سے سین سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

''پیچھا کریں کہاں جاتی ہے؟'' صفدر کے سوال پر شاہنواز نے نفی میں سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لڑکی دور جا چکی تھی۔ صفدر نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا کہ کچھ ہی فاصلے پر موجود رہائشی علاقے کی طرف اس کا رخ ہو چکا تھا۔

''مڈل کلاس کی تتلی... کیا خیال ہے اٹھوالیں اسے۔'' صفدر نے مزہ لیتے ہوئے کہا تو شاہنواز ہنس پڑا۔

''صفدر حیات کم از کم میرے جیسے اٹھوالیے جاتے ہیں مگر اٹھانے کے ذرائع نہیں رکھتے۔''

''تم تو یونہی بیکار آدمی...... تم سے کون کہہ رہا ہے کہ اٹھاؤ یہ کام تمہارے یار تمہارے لیے کر سکتے ہیں اگر تم چاہو تو۔'' صفدر نے اگر پر زور دیتے ہوئے سامنے بل بورڈ پر بنی حسینہ کو دیکھا جس کے بھرے، بھرے ہونٹوں میں دبی اسٹرا اور عریاں بازو نمایاں کرتے ہوئے جوس کی مارکیٹنگ کی جا رہی تھی۔

''غضب کی عورت ہے یہ، چالیس کے قریب پہنچنے والی ہوگی لیکن......'' اس کے بعد صفدر نے حدود قیود سے آزاد تبصرے جو شروع کیے تو شاہنواز بھی تازہ ترین دیکھی گئی مووی کی ہیروئن پر رائے دینے لگا۔

صفدر کے ساتھ اسنوکر کلب میں کچھ وقت گزارنے کے بعد جب اس کو اسٹوڈیو میں اتارا تو ایک بار پھر اس نے اپنی آفر دہرائی۔

''اگر تم چاہو تو تتلی تمہاری مٹھی میں آسکتی ہے شیزی...... یہاں بڑے اور برے آدمی کے لیے سب ممکن ہے۔'' شاہنواز نے صفدر کی بات پر قہقہہ لگایا۔

''تو تم بڑے ہو یا برے؟''

''دونوں......'' صفدر نے فوراً جواب دیا اور شاہنواز نے مسکراتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھر

ذرا سا عمل دیرپا راحت

☆ جہاں معاف کرنے سے خوشگواریت اور اچھائی کا امکان ہو وہاں بدلہ لینا ظلم ہے۔

☆ اپنے دل کو ہرے بھرے درختوں کے مانند بنا کر رکھو، سکون امن اور پیار کے پرندے خود ہی اس پر آ بیٹھیں گے۔

☆ آپ کا بہت بڑا سرمایہ وہ لوگ ہیں جو آپ کی غیر موجودگی میں اپنے رب سے دعاؤں میں آپ کے لیے خیر و بخشش مانگتے ہیں۔

☆ اچھی سوچ اور نیت والوں کو سکون ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ ان کے دل ہمیشہ کسی نکھری ہوئی صبح کی طرح اجلے اور پُرسکون رہتے ہیں۔

از: رابعہ، جھنگ

پہنچتے، پہنچتے شاہنواز نے صفدر کی آفر سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''قفل لگے بند دروازے پر کسی روز ہتھوڑا مارنا ہی پڑے گا ورنہ میں اسی طرح غبی بنا رہوں گا۔'' وہ اندرونی آوازوں کو دبانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

''قصور سارا اس لڑکی کا ہے کیوں ایسی ڈیزائنگ کی کہ مجھے متوجہ کر دیا۔ اب تم سوال ہو جانم تو میں جواب ہوں۔'' وہ خیالوں میں مخاطب ہوا۔ بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹتے ہوئے اس نے اپنے اندر سنسنی سی پھیلتی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا سیل فون اٹھا کر صفدر سے بات کرنا چاہی۔ صفدر کا نام اسکرین پر چمک کر ڈائلنگ شروع ہو گئی تھی کہ اچانک اس نے سرخ بٹن دبا دیا۔ ہمیشہ کی طرح پھر ایک لہر سی اٹھی اور اس کا سارا جوش ایسے بہہ گیا جیسے پانی سے بھرے ٹینک میں لگا stopper ایک جھٹکے سے نکال دیا جائے تو لمحوں میں بھرا ہوا ٹینک خالی ہو کر سوکھا سا لگنے لگے۔ شاہنواز نے جھنجلاہٹ کے عالم میں سیل فون اچھال دیا۔ ہزاروں کا خریدا گیا سیٹ فضا میں اچھل کر کہاں غائب ہوا اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ بس اسے اپنی کم ہمتی کا شدید ترین قلق تھا۔

صبح دروازے پر تیز دستک سے اس کی آنکھ کھلی تو

وہ بدستور جوتوں سمیت بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا تھا۔ونڈو اے سی کی کولنگ سے کمرا ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔اس موسم میں اے سی محض دو تین گھنٹے چلا کر وہ بند کر دیا کرتا تھا لیکن گزشتہ رات اپنے اوپر غصے نے اسے ٹھنڈک محسوس ہی نہیں ہونے دی۔سامنے لگے وال کلاک سے اندازہ ہوا کہ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔دروازے پر زور کی دستک سے وہ کچھ گھبرا کر کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا۔سامنے چھوٹا بھائی شاہ زیب تھا۔بھائی کو فارمل کپڑوں اور جوتوں سمیت نیند بھری آنکھوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اسے کچھ اچنبھا ہوا۔

”کیا رات آپ گھر نہیں آئے تھے شیزی؟“ اس کے لہجے میں کھوج تھی جسے محسوس کر کے شاہنواز الرٹ ہو گیا۔

”تم یہ بتاؤ اتنی صبح تم کیوں اتنے تیار ہو؟“ شاہ زیب کو فریش حلیے میں دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

”شیزی ممی، ڈیڈی کی فلائٹ ہے آدھے گھنٹے بعد کی۔کیا آپ بھول گئے ہیں کہ جودی اور سارہ بھی ساتھ آ رہی ہیں اور انہیں ریسیور کرنے ہم جاتے ہیں ضرور۔“ شاہ زیب نے بھائی کی بھول پر سخت تعجب کرتے ہوئے اپنی بھانجیوں کی آمد بھی یاد دلائی تو شاہنواز کے ذہن سے دھند جیسے چھٹنے لگی۔سولہ سالہ بھانجی جودی سے اسے بہت محبت تھی۔دونوں کا بلڈ o+ve تھا۔جبکہ باقی سب B+ve یا B-ve کے تھے۔ممی، ڈیڈی، رشنا، اس کا شوہر اور شاہ زیب۔

”اوہ، واقعی یار میں بالکل ہی بھول گیا۔بس ابھی آتا ہوں۔دس منٹ میں، تم گاڑی نکلواؤ۔دوسری میں خود ڈرائیور کرلوں گا۔“ شاہ زیب نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر کا رخ کیا۔

واقعی ٹھیک گیارھویں منٹ شاہنواز گرے ٹی شرٹ اور بلو جینز کے ساتھ دھیمی خوشبو میں لپٹا grey Hummer کی سیٹ پر آ چکا تھا۔۔۔شاہ زیب نے اپنے اسمارٹ بھائی کو رشک سے دیکھا جو زندگی کو انجوائے کرنا جانتا تھا۔

صبح کا دھیما، دھیما سا اجالا پھیل رہا تھا۔فضا میں تازگی بھی تھی اور نمی بھی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے نومولود صبح کا نرم ملائم سا احساس تمام جاگنے والوں کے ساتھ لپٹ رہا ہو۔محبت میں گندھا، نرمی سے بھرا۔بس فطرت کی اس بے بہا عنایات کو دونوں نے کچھ منٹ ہی محسوس کیا اور پھر گاڑی کے شیشے بند ہو گئے اور اس کے ساتھ لطیف اور تازگی بھری صبح کا تاثر بھی۔شاہ زیب نے بٹن دبا کر میوزک آن کر دیا۔انسانی روح فطرت سے اور دور ہوتی گئی۔

جودی سے ملتے وقت شاہنواز کو وہ کچھ گم صم سی لگی۔نہ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ شاہنواز کو وہ نہایت ڈسٹرب سی لگی، ممی ڈیڈی بھی گاہے بہ گاہے جودی پر فکرمندی کی نگاہ ڈال رہے تھے۔شاہ زیب اور سارہ سب سے بے نیاز اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

”زیب ماما یہ سسٹر جودی اتنی سلی ہے کہ اس کا ایک ایر رنگ واش روم میں ڈرین ہو گیا تو اتنا روئی، اتنا روئی کہ بس۔“ شاہنواز نے پٹر، پٹر باتیں کرتی نٹ کھٹ سی سارہ کو دیکھا اور بیک ویو مرر سے بغور نگاہ جودی پر ڈالی۔اسے سارہ کی بتائی وجہ پر یقین نہیں آیا۔ایک لمبے فضائی سفر کے بعد گھر پہنچ کر سامان کی سیٹنگ اور تھکان اتارنا ممی، ڈیڈی کی ہمیشہ سے ترجیح تھی۔مختصر سی ملاقات کے بعد وہ فریش ہو کر آپس میں تفصیل سے گفتگو کرتے تھے۔ممی کی ہدایات کے مطابق شاہ زیب ایک دن قبل ہی جودی اور سارہ کے لیے مخصوص کمرے کی سیٹنگ کرا چکا تھا۔

”شاہ زیب آپ کو میری انٹریر ڈیزائننگ فرم میں آج سے اپائنٹ کرلیا گیا۔“ سارہ نے ڈرامائی آواز میں کہا تو کمرے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی جودی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ زیب نے یہ سب کرایا ہے۔“ شاہنواز تعجب سے بولا۔

وہ ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے

رک گیا تھا۔ جہاں دونوں بھانجیوں کو شاہ زیب کمرے کی نئی ترتیب دکھا کر رائے جاننا چاہ رہا تھا۔ سارہ نے کیا جواب دیا اس نے نہیں سنا کیونکہ ملازم نے آ کر اطلاع دی تھی کہ بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔

''حیرت ہے ممی ابھی کیوں بلا رہی ہیں؟''

شاہنواز اُن کی عادت سے واقفیت کے باعث حیران تھا، کھلے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے...

بے اختیار نگاہ جودی پر ڈالی جو اسے بدستور اپ سیٹ ہی لگی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنی۔ شاہ زیب تیز، تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

''شیزی آپ کے دوست صفدر کا فون تھا مگر میرے ریسیو کرنے سے پہلے ہی کٹ گیا۔ میرے فون پر کیوں کال آئی تھی۔ آپ کا فون کہاں ہے؟'' وہ اپنا سیل فون ہاتھ میں لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

''صفدر کا فون؟ اس وقت!'' شیزی نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی جہاں ساڑھے سات بج رہے تھے۔

''لیکن اس نے میرے نمبر پر کیوں ٹرائی کیا۔'' شاہ زیب کو الجھن سی تھی۔

''کیونکہ میرے فون سے اسے رسپانس نہیں مل رہا ہوگا۔'' بے اختیار اس کے ذہن میں رات کے تمام مناظر اپنے تمام تر محسوسات کے ساتھ زندہ ہونے لگے۔

''پتا نہیں کتنے ٹکڑوں میں ہو چکا ہوگا میرا E62'' شاہنواز نے ممی، ڈیڈی کے بیڈ روم پر ناک کرتے ہوئے آخری بات سوچی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔

دونوں کمرے کی دیوار سے جڑے تھری سیٹر پر بیٹھے تھے۔ شاہنواز کو کمرے کے ماحول میں بے آرامی کا سا احساس ہوا۔ ڈیڈی نے اسے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آج بھی ڈیڈی کے سامنے خود بہ خود مؤدب سا ہو جاتا تھا۔ باوجود اتنی خود مختاری اور آزادی کے۔

ڈیڈی نے گفتگو کی ابتدا کاروباری مشکلات پر ہلکے پھلکے سوال جواب سے کی، شاہنواز کو سب عجیب ہی لگ رہا تھا۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے بیڈ روم میں اسے کاروباری معاملات پر رائے دی ہو یا مانگی ہو...... دوسرا یہ کہ ممی ایک دو مرتبہ پہلو بدل چکی تھیں جیسے انہیں اس تمام قصے سے کوئی دلچسپی نہیں ہو اور وہ کچھ اور شروع کرنا چاہ رہی ہوں۔

''کوئی ایسی بات جو تمہارے لیے...... "pain in neck" بنی لیکن تم مجھ سے شیئر نہیں کر رہے؟'' ڈیڈی نے اچانک سوال کیا تو شاہنواز نے ایک گہری سانس لے کر پچیس لاکھ کی اس ڈوبتی رقم کو سوچا اور تفصیل بتانے لگا۔ ممی اب بیزار سی نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن تحمل سے بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔ ساری تفصیل سننے کے بعد ڈیڈی سوچ میں ڈوب سے گئے۔

''شیزی تم کہتے ہو کہ میرے پیچھے ایسا کچھ نہیں ہوا جو ہمیں غاصب بناتا ہو، الٹا ہمارے ساتھ ہی بے انصافی ہو رہی ہے۔'' ڈیڈی نہ جانے کیا کھوجنا چاہ رہے تھے۔

''پھر گیارہ گھنٹے قبل کیوں ایسا ہوا؟'' وہ پیشانی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائے تو ممی کے چہرے پر سایہ سا آ گیا۔ انہوں نے میاں کے کندھے کو ہلکا سا تھپتھپایا تو وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ کمرے میں بوجھل پن پھیلتا جا رہا تھا۔

''کچھ گڑبڑ ہے ممی، سب کچھ نارمل نہیں ہے، آپ، نہ ڈیڈی اور نہ جودی۔'' شیزی ماں، باپ کے تاثرات کو جانچتے ہوئے بولا تو ممی کے چہرے نے ایک بار پھر رنگ بدلا۔

''ہاں شیزی.. بہت کچھ غلط ہوا ہے ہمارے ساتھ، ہماری جودی کے ساتھ۔'' ممی تھکی تھکی آواز میں بولیں۔ جودی کا نام سنتے ہی شیزی کی حسیات الرٹ ہو گئیں۔

''کیا ہوا جودی کے ساتھ؟ خیر تو ہے ممی۔'' شیزی کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگے تھے۔

''ائیرپورٹ روانگی سے قبل اس نے ہمیں بتایا تھا

کہ اس کی فرینڈ کا برتھ ڈے ہے جس کا گفٹ وہ راستے سے گزرتے ہوئے دینا چاہ رہی ہے۔ کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس ہم نے ائرپورٹ کے لیے مقررہ وقت سے گھنٹا بھر قبل نکلنے کا ارادہ کرلیا۔'' ممی بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھیں۔ ''جودی گلابی رنگ کے چمکدار کاغذ میں لپٹا ڈبا لے کر گاڑی میں بیٹھی تھی جس کے اوپر بڑا سا ربن کا بو بندھا ہوا تھا۔'' شیزی کو یہ سب تفصیلات جز بز کرنے لگیں۔ وہ کہنا چاہ رہا تھا۔ ''اصل بات پر آئیں ممی......'' اور شاید ممی کو اصل بات پر آنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔

''گاڑی کچھ سفر کے بعد ایک اونچی عمارت کے قریب رک گئی۔ جودی یہ کہہ کر تیزی سے نیچے اتری کہ میں بس ابھی آئی۔ پورے پانچ منٹ میں۔'' وہ ایک گیارہ منزلہ عمارت تھی اور جودی کی دوست چھٹی منزل پر تھی۔

''دس منٹ سے کم میں یہ نیچے نہیں آئے گی تحفہ دے کر'' میں نے اسے بھاگتے ہوئے عمارت میں جاتا دیکھ کر سوچا تھا۔ چھٹی منزل تک جانا اور واپس آنا، چاہے لفٹ سے بھی جودی کرے دس منٹ سے قبل واپسی نہیں ہوگی۔ میرا اندازہ دس منٹ کا تھا جب پندرہ منٹ گزر گئے تو رشنا فکرمند ہوئی باہر نکلی تا کہ گراؤنڈ فلور پر لگے انٹرکام سے اس کی فرینڈ کے گھر رابطہ کیا جائے۔ حیرت تھی جودی اپنا سیل بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ رشنا ابھی عمارت میں داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک آدمی اس سے ٹکراتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا اور سامنے لفٹ کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے جودی کھڑی تھی۔ خوفزدہ اور کپکپاتی ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ریسپشن ڈیسک خالی تھا۔ دن کے اس حصے میں لوگوں کی آمدورفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔'' ممی نے پھر خواہ مخواہ کی تفصیل بتائی۔ شیزی کا دل جیسے آنے والے لفظوں کا اندازہ کرنے کی کوشش میں تیز، تیز دھڑکنے لگا۔

''ممی وہ آدمی؟ ممی وہ آدمی؟'' بس وہ یہ کہتی روتی جا رہی تھی۔ رشنا اسے وہیں سنبھالنا چاہ رہی تھی۔ گاڑی میں لانے کا مطلب تھا کہ سب ہی شاک میں آجائیں۔ وہ سب کچھ جو اس خبیث آدمی نے میری بچی کے ساتھ دوسری منزل سے لفٹ میں سوار ہونے سے لے کر گراؤنڈ فلور تک کرنا چاہ وہ......''

''اسٹاپ ممی، آگے نہیں سنائیں۔'' شاہنواز سن ہوتے پیروں سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ڈیڈی نے کرسی کی پشت سے ٹکائے سر کو سیدھا کیا۔ ان کے ماتھے کی ایک رگ خاصی ابھری ہوئی لگ رہی تھی۔

''بس ایک جواب مجھے اس سوال کا دے دیجیے جو میں اپنے منہ سے پوچھنا نہیں چاہتا۔'' شاہنواز نے اب کہ رخ بھی پھیر لیا تھا۔ کمرے میں لگی اس پینٹنگ کی طرف نظریں جمائے تھا جس میں جلتے الاؤ کے درمیان گل و گلزار پینٹ کیا گیا تھا۔ نہ الاؤ واضح تھا اور نہ غنچہ، تجریدی آرٹ کے اس نمونے میں یہ خاصیت تھی کہ کوئی آنکھ صرف تپش کا نظارہ کرتی تو دوسری نظر پھولوں کا مشاہدہ۔ بندے کی جیسی فکر ویسے ہی اس کے محسوسات ......اس وقت شاہنواز کو پوری تصویر میں آگ کے لپکتے شعلے ہی نظر آ رہے تھے۔ بے اختیار وہ ممی کی طرف مڑ گیا جب انہوں نے یہ کہا۔

''اللہ نے خیر کرلی۔ رشنا جس وقت اندر داخل ہوئی تھی اسی وقت لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تھی۔ خودکار دروازہ کھلا تو رشنا کی ہیل کی آواز سے وہ چوکنا ہو کر جودی کو چھوڑ کر فوراً باہر بھاگ گیا۔ ورنہ اس نے بارھویں منزل چھت کا بٹن دبا ہی دیا تھا۔ خوش قسمتی تھی کہ وہ جانتا نہیں تھا کہ نمبر بے شک بارہ تک ہیں لیکن لفٹ گیارہ سے اوپر نہیں جاتی۔ اس لیے وہ حرکت میں نہ آئی اور اللہ نے جودی کو بچا لیا۔ شکر ہے وہ کامیاب نہ ہوسکا مگر اس کی مذموم ارادوں کی طرف پیش قدمی۔۔ جودی کو ہلا چکی ہے۔'' ممی کی آواز دکھ سے بوجھل تھی اور شاہنواز گم صم......

''آج ہی کسی سائیکاٹرسٹ سے اپائنٹمنٹ لو۔ میں پہلی فرصت میں اسے دکھانا چاہتی ہوں تا کہ اس کے اثرات ختم کیے جاسکیں۔'' ممی کی بات پر شاہنواز

نے گردن ہلادی۔ الفاظ تو سارے جیسے اس کے پاس سے کہیں گم ہوگئے تھے۔

''اس آدمی سے بچنے کی کوشش میں اس کا ایک ایر رنگ بھی کہیں گر گیا تھا۔ رشنا نے گاڑی میں آکر سب کو یہ ہی بتایا کہ جودی اپنا ایر رنگ تلاش کر رہی تھی اور اس کے کھونے پر وہ بہت افسردہ ہے چونکہ جودی اپنی پسندیدہ چیزوں کے لیے بہت حساس ہے سو سارہ تو مطمئن ہوگئی۔ وہ جودی کے برخلاف کسی بھی چیز کے لیے کڑھنے والی نہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے رشنا کی بات سن کر فوراً ہی مجھے دیکھا تھا۔ ان کو اس بات پر بالکل بھی یقین نہیں آیا تھا جس کا اظہار ان کی نگاہوں سے ظاہر تھا۔ پھر رشنا کا بار، بار جودی کو فکرمندی سے دیکھنا مجھے بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ ''جودی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' میں سارے راستے خدشات ہی میں تھی۔ ''شکر ہے کمال (داماد) ساتھ نہیں تھا۔'' میں نے نہ جانے کس سوچ کے تحت کمال کے نہ ہونے پر شکر کیا تھا۔'' رشنا نے ائرپورٹ پہنچ کر ڈیڈی اور سارہ کو سامان میں لگا کر موقع ملتے ہی مجھے مختصراً یہ بات بتائی۔ میرے برے اندازوں کی درستگی کے وہ لمحات بہت سخت تھے۔ رشنا اس بات کے حق میں تھی کہ جودی کو میرے ساتھ ہی پاکستان جانا چاہیے۔ کیونکہ نوکری کی بنا پر وہ اس کے جذباتی دھچکے کو ختم نہیں کر سکے گی۔ اور پھر جودی بھی میرے ساتھ ہی آنے پر راضی تھی۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو بھی جہاز میں بتایا تھا۔''

''ہم سارہ کو زندگی کی اس تلخ حقیقت سے فی الحال لاعلم رکھنا چاہتے ہیں۔'' ڈیڈی نے طویل خاموشی کے بعد کہا تو دونوں نے او کے کہنے پر اکتفا کیا اور وہ بوجھل قدموں سے باہر آگیا۔

''اب سے دس گھنٹے قبل جس وقت جودی وہ سب کچھ فیس کر رہی تھی تو میں صفدر کو فون کر رہا تھا۔'' شاہنواز نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر خیالات کے بہاؤ میں سیل کے ٹکڑوں کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی بھی حصہ کہیں پڑا نظر نہیں آیا۔ اس نے حیران نظروں سے اِدھر اُدھر کھوجا کہ آخر سیل گیا کہاں؟ فرش پر رکھے فلور کشنز کو پیر سے، ہلاتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ٹھک کی آواز سے اس نے آواز کے رخ پر دیکھا تو فلور کشنز کے درمیان موجود سیل فرش پر آگیا۔ حیران کُن طور پر وہ دو کشنز کے درمیان اٹک گیا تھا۔ بالکل صحیح و سالم اور ڈبے میں رکھی پیکنگ کی طرح فکس شاہنواز نے غیر یقینی نظروں سے اسے آگے پیچھے سے چیک کرتے ہوئے دیکھا۔ صفدر کی کتنی ہی مسڈ کالز نظر آرہی تھیں۔ اس نے بددلی سے صفدر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو بوائے کدھر ہو۔'' فوراً ہی صفدر کی ہشاش بشاش آواز ابھری۔ ''میرے آدمی کل رات کسی کام سے میرے پاس آئے تو... میں نے سوچا تمہارے کام کی بات بھی کرلی جائے۔ صبح ان کے جانے سے پہلے آخری ٹرائی کے طور پر تمہارے بھائی کے نمبر پر بھی کال کی مگر کچھ نہیں بنا۔'' صفدر کی بات وہ بہ خوبی سمجھ رہا تھا مگر وہ جس ذہنی الجھن میں تھا اس میں صفدر کی بات قطعاً متوجہ کُن نہیں تھی۔ صفدر نے بھی اس کی بے توجہی نوٹ کرلی تھی اور جلد ہی مزید بات کیے، رسمی سے فقرے ادا کر کے فون کال منقطع کردی۔ فون سے فارغ ہو کر اس نے اپنی سائڈ ٹیبل کی دراز کو کھنگالنا شروع کیا۔ کسی چیز کی تلاش میں وہ فائل میں لگے کاغذات کو تیزی سے دیکھ رہا تھا۔

ایک پیپر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے کلپ دبا کر مطلوبہ کاغذ احتیاط سے کاغذات کے درمیان سے نکالا اور فائل واپس رکھ دی، یہ پچھلے سال کی جودی ہی کی بھیجی ہوئی ای میل کا پرنٹ تھا۔ ای میل میں جگہ، جگہ خوب صورت رنگ برنگی تتلیاں نمایاں تھیں۔ شاہنواز کے ہونٹوں کو مدھم سی مسکراہٹ نے چھوا اور وہ خط کا متن پڑھنے لگا۔

''ڈیئر شیزی آج بہت عرصے بعد سارہ اور میں نے ممی، ڈیڈی کے ساتھ بھرپور وقت گزارہ...... میں نے آن لائن آپ کا انتظار بھی کیا تاکہ آپ سے ان خوشگوار لمحوں کی باتیں شیئر کرسکوں مگر لگتا ہے آپ

کہیں اور مصروف تھے۔ خیر دریا کنارے ہماری پکنک اتنی خوب صورت تھی کہ بس..... ممی نے آج بلوسنائز کا وہی نیکلس پہنا تھا جو آپ نے پچھلی بار نانو سے ان کے لیے بھجوایا تھا۔ ڈیڈی کی آنکھیں آج ہنستی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ورنہ عموماً وہ بہت تھکے ہوئے لگتے ہیں۔ سارہ چیچر باکس نے بہت ہی مزے کا ایپل پائے بنایا تھا جو اس نے اپنی فرینڈ کی ممی سے سیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی بیکر بنے گی مجھے یقین ہے..... پتا نہیں سورج واقعی زیادہ چمک اٹھا تھا یا مجھے لگ رہا تھا۔ ہر لمحہ کوزی، کوزی فیل ہو رہا تھا۔'' شاہنواز نے جب پہلی بار یہ میل پڑھی تھی تو وہ بھرپور مسکرایا تھا۔

''وسلی جودی!'' دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے آگے پڑھا تھا۔

''میرا خیال ہے شیزی آپ نے کچھ وقت نانا، ڈیڈی اور نانو ممی کے ساتھ بڑا کوالٹی والا گزارہ ہے۔ تب ہی اس کے اثرات ہم دونوں بہنوں کے پاس آئے ہیں۔'' اس کے بعد جودی نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بنایا تھا۔ ''یہ میں نے اس لیے کہا کہ کل ہی میں نے butterfly effect کو خاصی تفصیل سے پڑھا تھا جسے ''chaos theory'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے آج کی پکنک کے بعد مجھے یہ ہی لگا جیسے جو آپ نے کیا ہو اس کے اثرات مجھ تک آ گئے۔'' ایک اور مسکراتا چہرہ جودی نے بنایا تھا۔ شاہنواز اس کی یہ منطق پڑھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ تین چار دن قبل ہی اس نے دوستوں کے ساتھ بنا بنایا پروگرام چھوڑ کر ممی کے کہنے پر سنڈے ان کے ساتھ گزارہ تھا۔

میل پڑھ کر شاہنواز نے میل کے آخر میں دیا ہائپر لنک کلک کر دیا تھا۔ ایک نیا ویب پیج کھل چکا تھا۔

"butterfly effect or chaos theory"

بڑے، بڑے حروف میں لکھا تھا۔ شاہنواز نے میڈیا پلیئر سے ابھرنے والی دھیمی موسیقی کو pause کا بٹن دبا کر خاموش کر دیا تھا۔ وہ بغور یہ سطریں پڑھ رہا تھا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ.....

''ایک چھوٹا اور غیر ضروری عمل وجہ بن سکتا ہے بڑی تباہی کا یا پھر کسی بڑی تباہی سے بچاؤ کا......''

آگے کچھ اور پڑھنے کے بعد وہ اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''آپ زندگی میں صرف اپنے ہی انجام کیے گئے اعمال کے نتائج کے ذمے دار نہیں بلکہ اس کے اثرات اچھے یا برے (آپ سے متعلقہ کسی بھی دوسرے شخص پر پڑ سکتے ہیں۔) دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پودا دادا لگاتا ہے اور پھل پوتا کھاتا ہے یا برا دادا کرتا ہے اور بھگتنا اس کی نسلوں کو پڑ جاتا ہے۔

''لو جی ہر چیز کے ہم ہی قصور وار......!'' اس نے جودی کو رپلائی میں بس یہ ایک جملہ لکھ کر ڈھیر سارے مسکراتے چہرے بنا کر سینڈ کا بٹن دبا دیا تھا۔ جیسے ہی میل روانہ ہوئی اچانک کسی خیال کے تحت اس نے جودی کی سیل کے ساتھ تھیوری کی وہ سطریں جنہیں اس نے بھرپور توجہ سے پڑھا تھا paste کر کے پرنٹ کے آپشن پر کلک کر دیا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو اس وقت شیزی کے ہاتھ میں تھا۔ اندر کہیں لاشعور میں جودی کی میل کا وہ جملہ جس میں اس نے شیزی اور اپنی ملنے والی خوشیوں کو مربوط کیا تھا۔ پوری طرح زندہ تھا اور اب جودی کے ساتھ بیتے حادثے سے وہ یک دم ابھر گیا تھا۔ پورے کے پورے سال بھر بعد۔

''تو کیا میری جنبش کا اثر میری بھانجی پر پڑا۔'' یہ خیال خاصی چبھن لیے تھے اس لیے ہی وہ اس پر یقین بھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے، لاکھوں میل دور جودی اور میرے صفدر کو فون کرنے میں کوئی تعلق ہو؟'' اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔

''جو بھی ہے ہوا یہ ہی ہے کہ جب میں صفدر کو فون کر رہا تھا تو تقریباً اسی وقت جودی نے یہ سب فیس کیا ہے۔'' وقت کی یکسانیت اسے ششدر بھی کر رہی تھی۔

''تھیوری تو بس تھیوری ہوتی ہے۔'' سوچوں میں گم شاہنواز نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو رول کر کے دوسرے ہاتھ پر ہولے، ہولے مارنا شروع کر دیا۔

ایجنسی میں پہنچنے کا وقت بھی گزر چکا تھا مگر وہ خیالات کے تانے بانے ہی بنتا رہا۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ شاہنواز نے کام کے وقت کسلمندی محسوس کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو سارے خیالات، فلسفہ، افکار صرف اس وقت تک بلند اور فکر انگیز لگتے ہیں جب تک وہ اپنے آپ کو ان کے درمیان کستا ہوا محسوس نہیں کرتا، جہاں اسے اپنا آپ پھنستا ہوا محسوس ہوتا ہے، وہ انہیں محض ایک خیال، ایک وبال قرار دے کر نکلنا چاہتا ہے۔ شاہنواز کی بھی کچھ یہ ہی کیفیت تھی۔ وہ اپنا دفاع کر رہا تھا۔

''تھیوری کے لحاظ سے تو وہ وجود قصور وار ہے جس نے یہ ساری سنسنی خیزی پھیلائی۔'' ذہن کے پردے پر عبایا پر بنے سوالیہ نشان لہرانے لگے۔ وہ دل و دماغ کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔

''میں نے اس سے پہلے کب اس انتہا تک سوچا تھا'' اس نے اپنا سر بیڈ کے کراؤن سے ٹکا دیا۔ جودی کے واقعے نے اسے بے حد اپ سیٹ کر دیا تھا۔ شاید جودی سے بھی زیادہ کیونکہ وہ بالواسطہ اپنے آپ کو اس میں جڑا محسوس کر رہا تھا۔

''تمہاری ناکامی نے ہی جودی کو کسی المیے سے محفوظ رکھا۔'' اندر سے ایک سرگوشی ابھری تو شاہنواز نے بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے برسوں سے جمع شدہ اپنے آپ سے شکوہ چھٹتا محسوس کیا۔ ایسے جیسے بند کمرے میں تازہ ہوا کا روزن نمودار ہو جائے۔

''شکر ہے جودی محفوظ رہی۔'' بے آواز شکر کرتے ہوئے اس نے اپنے ... آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ موبائل میں لگا الارم گنگنا رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ آج سوہا کے ساتھ لنچ طے تھا جبکہ وہ ابھی ایجنسی بھی نہیں پہنچا تھا۔ الارم دو بجے کے لنچ کے لیے الرٹ کرنے کے لیے تھا۔ سوہا کے ساتھ کا سوچتے ہی شاہنواز کو یاد آیا کہ سوہا کی ممی شہر کی مانی ہوئی سائیکاٹرسٹ ہیں۔ ''چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔'' اپنا آپ آزاد محسوس ہوتے ہی اسے دوسرے ضروری کاموں کا دھیان آنا شروع ہوا۔

''جودی کے لیے اس سے بہتر آپشن کیا ہوگا۔'' وہ مطمئن ہو گیا۔ لنچ کے اہتمام میں ڈریسنگ کرتے ہوئے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر کسی نغمے کے بول مچل اٹھے۔

every thing is gonna se alright

جب تک تو ہے میرے ساتھ

its gonna be alright

اردو انگریزی کے اس ملغوبے سے کمرے میں نادیدہ دائرے بن رہے تھے جو تیرتے ہوئے باہر لان میں پھولوں کی لچکتی ڈال پر پہنچے تو نازک سی تتلی نے ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا، پھولوں کا رس چوسنا چھوڑ چھاڑ وہ پر ہلاتی دور افق میں گم ہو گئی۔

کچھ ہی دیر میں شاہنواز بھی تیز، تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار پورچ تک آچکا تھا۔ گیٹ سے گاڑی نکالتے ہی اس نے میوزک آن کر دیا۔ ایک بار پھر وہی بول ابھر آئے۔ ''جب تک تو ہے میرے ساتھ its gonna be alright'' نہ جانے وہ یہ کیوں نظر انداز کر چکا تھا کہ ایک عمل کے... ردِعمل سے آزاد ہونے نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا تو آنے والی ہر جنبش نے اگر اسے قید کرنا شروع کر دیا تو وہ کیا کرے گا۔ کون سا راستہ ہر پہلو سے آل رائٹ ہے۔

شاہنواز یہ جانتا تھا کہ دور ماضی میں اس کے پردادا کے دعاؤں کے لیے اٹھے دو بوڑھے ہاتھوں میں آنسو روز گرتے، دل سے نکلنے والی دعائیں ہاتھ کی لکیروں پر پھیلتی چلی جاتیں۔ اپنی اور تا قیامت آنے والی نسلوں کے لیے عافیت کی دعائیں، شر سے محفوظ رہنے کی التجا' دائمی خسارہ نہ ملنے کی طلب سجدے میں رب سے قریب کرتیں تو اثرات وقت کی گردش کے باوجود رواں دواں رہے۔ وہ تمنائیں جو شاہنواز نے کبھی کی بھی نہ ہوں، ان کے فیض سے بھی وہ محروم نہ رہا کیونکہ دعائیں اس کے ساتھ متحرک تھیں۔ butterfly effect یہاں بھی کام کر رہا تھا چاہے کسی کے علم میں ہو یا نہیں۔



عورت کتھا

شگفتہ شاہ

جیسے ہی ایک ٹیچر نے اسٹاف روم میں آکر یہ اعلان کیا کہ ہماری ہیڈ مسٹریس کا تبادلہ ہوگیا ہے اور ان کی جگہ آپا خیر النسا ہیڈ مسٹریس بن کر ہمارے اسکول آرہی ہیں تو سب کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور اسٹاف روم میں جیسے ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ میں اس وقت سرکاری نوکری میں بالکل نئی بھرتی ہوئی تھی اس لیے نہ تو اسکولوں کی ہیڈز اور نہ ہی اس سرکاری اسکول کی ٹیچرز کے بارے میں پتا تھا، اس لیے ایک سینئر ٹیچر سے ان تمام استانیوں کی پریشانی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"دراصل آپا خیر النسا اس شہر کی ایک سینئر ہیڈ ہیں، وہ بہت سارے اسکولوں کو بہت کامیابی سے چلا چکی ہیں۔ وہ انتظامی لحاظ سے تو بہت کامیاب خاتون ہیں مگر مزاجاً اور ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہیں، نہ خود کبھی دیر سے آتی ہیں، نہ ہی دوسروں کو دیر سے آنے دیتی ہیں، پڑھائی کے معاملے میں بھی کڑی نگرانی کرتی ہیں، شارٹ لیو اور چھٹی دینے کے معاملے میں بھی بہت

بااصول ہیں اس لیے یہاں پر پہلے سے چلنے والے آرام دہ... اورسست ماحول کا کیا ہوگا؟''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری کہ میں تو ایک اعلیٰ اسٹینڈرڈ کے پرائیویٹ اسکول سے آئی تھی جہاں ڈسپلن کی پابندی تھی مگر یہاں تو سرکاری اسکول کی استانیوں کے ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ کوئی صبح آدھا گھنٹا لیٹ آرہی ہے تو کوئی گھنٹا لیٹ آرہی ہے۔ پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں...... اسٹاف روم میں کھانا پینا، نٹنگ کرنا اور کڑھائی وغیرہ کرنا عام بات تھی اور پھر کئی اور بے اصولیاں...... اگر کوئی آکر ماحول کو درست کردے تو یہ تو اچھی بات ہوگی مگر اصل مسئلہ تو بیویوں اور ماؤں کا تھا جن کے ساتھ گھر کے مسائل تھے۔ صبح وہ شوہر اور بچوں کے لیے ناشتا تیار کریں۔ پھر اگر بچوں کو اسکول تک چھوڑنے کے لیے کوئی گھر میں نہ ہو(یا ذمہ ہی نہ لے) تو وہ خود جاکر ان کو اسکول پہنچاتیں یا پھر دوپہر کے لیے پہلے سے سبزی وغیرہ...... کاٹ کر رکھتیں اور آٹا بھی گوندھ کر ریفریجریٹر میں رکھتیں...... تو پھر لیٹ تو ہوجانا ہی تھا سو اب اگر سخت مزاج اور اصولوں کی پابند... ہیڈ مسٹریس آئیں گی تو یہ سب تو نہیں چلے گا جو کئی سالوں سے ان کا معمول تھا۔

خیر...... نئی ہیڈ مسٹریس تو آکر رہیں...... کچھ دن تو خیر سے گزر گئے مگر پھر وہی ہوا...... جس بات کا خدشہ تھا۔ انہوں نے اسٹاف میں ایک میٹنگ کی جس میں ڈسپلن اور وقت کی پابندی کو لازمی بتایا اور صبح دیر سے آنے، چھٹی سے پہلے گھر جانے، چھٹی کرنے، شارٹ لیو لینے وغیرہ کے اصول بتائے اور سب کو ان کی پابندی کا آرڈر دیا۔

خیر...... جناب...... ہماری تو خیر تھی کہ ہم تو ویسے ہی ان تمام اصولوں کے پہلے ہی پابند تھے مگر مسئلہ کچھ استانیوں کا تو تھا...... ہم جیسی غیر شادی شدہ لڑکیوں کا نہیں...... پھر آخر ایک دن ایک ٹیچر صبح اسٹاف روم میں آتے ہی چیختے ہوئے کہنے لگی۔

''آپا خود تو بیوہ ہیں اور کوئی اولاد بھی نہیں...... گھر میں بھی اکیلی رہتی ہیں اور سسرال وغیرہ کی کوئی ذمے داری بھی نہیں ہے ان پر اسی لیے تو ان کو ہمارے مسائل کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم کس طرح سے ان کو فیس کرتی ہیں۔ شوہر صاحب کو تیار کرکے آفس بھیجیں اور بچوں کو اسکول...... تو ان کاموں میں آنے میں لیٹ تو ہو ہی جاتے ہیں...... پھر آپا کی روز کی چخ، چخ سنیں۔ ارے ہم بھی مجبوری میں جاب کرتی ہیں کہ خرچہ پورا نہیں ہوتا گھر کا ورنہ ہم بھی آرام سے گھر میں نہ بیٹھ جائیں۔''

اب ایسے ڈائیلاگ روز کا معمول بنتے گئے۔ بیویوں اور ماؤں کے یہ ہی بڑے مسائل تھے۔ سو کچھ ماہ تو یوں ہی بیت گئے۔ شکایتیں بھی ہوتی رہیں اور ڈانٹ بھی پڑتی رہی۔ ایک مرتبہ تو میری بھی شامت آہی گئی۔ اسمبلی ختم ہوتے ہی میں اسکول پہنچی تھی مگر آپا کا حکم تھا کہ اسمبلی سے پہلے پہنچا جائے۔ روز تو ٹائم پر ہی آتی تھی آج ہی اتنی سی دیر ہوئی تھی سو ڈرتے، ڈرتے آفس کے اندر گئی اور جھٹ سے سلام جھاڑا ہی تھا کہ وہ بول اٹھیں۔

''کم از کم آپ جیسی ٹیچرز کو تو دیر سے نہیں آنا چاہیے کہ آپ لوگوں کے پاس شوہر اور بچوں کی ذمے داری کا بہانا بھی نہیں ہے۔''

''آپا، گھر میں ایک ہی گاڑی ہے، ڈرائیور پہلے بھتیجوں کو اسکول چھوڑ کر آتا ہے پھر مجھے، آج اشفاق سے تھوڑی دیر ہوگئی ورنہ روز تو میں ٹائم پر آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں سائن کرکے آفس سے نکل آئی مگر مجھے دکھ ہوا کہ ہم جیسی ذمے دار اور محنتی ٹیچر کو اگر کوئی اعزاز نہیں دیا جاتا تو نہ سہی مگر ایسی کبھی کبھار کی کوتاہیوں کو تو نظر انداز کردینا چاہیے۔

پندرہ بیس دن کے بعد پھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ گاڑی ٹریفک جام میں پھنس گئی اور اسکول تھوڑا لیٹ پہنچی ...... تو پھر یہی سننا پڑا۔

''آخر آپ کے کیا مسائل ہوسکتے ہیں، آپ تو شادی شدہ بھی نہیں ہیں، آپ کیوں لیٹ ہوجاتی ہیں؟''

ابھی میں جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ ایک اور شامت کی ماری غیر شادی شدہ ٹیچر بھی پہنچ گئی پھر تو دونوں کو وہ لیکچر ملا جو سن کر ہم خاموشی سے گردن جھکا کر آفس سے باہر نکل آئیں۔

''یہ غیر شادی شدہ ہونا بھی عجیب مصیبت ہے، اسکول کی ہر اہم ذمے داری ہمیں ہی ملتی ہے کہ نوجوان اور غیر شادی شدہ ہیں اس لیے ہم پر گھر کی ذمے داریاں نہیں ہیں حالانکہ ہم بھی گھر جا کر گھر کا کام بھی کرتی ہیں۔ ہمارے اوپر بھی گھر کی ذمے داریاں ہیں۔'' میں نے آفس سے نکلتے نکلتے اپنی ساتھی ٹیچر سے کہا۔

''اور کیا...... ہم بھی تو جوائنٹ فیملی میں رہتی ہیں۔ کبھی گاڑی کسی اور کے استعمال میں تو کبھی رکشا ملنے میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے ناں......'' وہ بھی دل کے پھپولے پھوڑنے لگی۔

خیر جناب...... ہمارے چھوٹے موٹے مسائل تو تھے ہی مگر شادی شدہ اوں کی حالت دیکھ کر تو اکثر بہت رحم آتا تھا۔ چھوٹے، چھوٹے بچوں کے ساتھ رت جگا کرتیں، صبح اسکول جانے والے بچوں کو اٹھاتیں، ان کو ناشتا دے کر اسکول روانہ کرتیں...... کبھی بیمار بچے کو پیچھے چھوڑ آتیں تو ڈیوٹی پر بھی دھیان وہیں لگا رہتا...... پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی امتحانوں کے دنوں میں جلد چھٹی ہو جاتی تو باوا تو بے فکر رہتے مگر وہ خود جاتیں اور انہیں لے کر اسکول ہی آ جاتیں اور ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے تک ان کو مختلف طریقوں سے بہلاتیں۔ گھر پر خود ان کو امتحان کی تیاری کراتیں...... گھر واپس جا کر لنچ کی تیاری کرتیں...... پھر کسی کے ساتھ جھگڑالو شکی مزاج شوہر کا مسئلہ تو کسی کے ساتھ ساس، نندوں کا جھگڑا کبھی، کبھی تو صبح کے کاموں میں انہیں کنگھی کرنے اور لپ اسٹک لگانے کا بھی ٹائم نہیں ملتا تھا تو یہ کام بھی اسکول پہنچ کر کیا جاتا...... ورکنگ وومین کا یہ حشر دیکھ کر رحم آتا مگر یہ بھی اسی کا کارنامہ ہے کہ ہزار پریشانیوں کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو ٹپ ٹاپ رکھتی ہے، کپڑوں اور میک اپ کی میچنگ سے خود کو اپ ٹو ڈیٹ رکھتی ہے، فیشن کے مطابق اکثر ٹیچریں اسٹاف روم میں ایک دوسرے سے اپنے دکھ درد شیئر کرتیں تو کچھ گھر کے مسائل گھر پر چھوڑ کر وہاں گپیں لگاتیں، قہقہے لگاتیں اور یوں تھوڑی دیر کے لیے سب بھول بھال کر اچھا وقت گزارتیں۔

پھر...... ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی...... وہ آپا... خیر النسا جو اپنی ساری سروس میں شاذونادر ہی ڈیوٹی پر دیر سے پہنچی ہوں گی اور اب تو وہ ریٹائرمنٹ کے بھی قریب تھیں کہ وہ اب اچانک سے ہر روز لیٹ اسکول آنے لگی تھیں۔ جس کا سبب بھی پتا چل گیا کہ انہوں نے اپنی بھتیجی کی نومولود بچی کو ایڈاپٹ کیا تھا (گود لیا تھا) تب اس بچی کی ذمے داری لینے کے بعد انہیں ان مجبوریوں کا احساس ہو گیا تھا جو مائیں اتنی دفعہ بتا کر بھی انہیں قائل نہیں کر سکی تھیں۔

ہاں اب جب وہ مائیں دیر سے آتیں تو وہ انہیں کچھ نہیں کہتیں اور اب تو انہیں بھی پہلے کی طرح شارٹ لیو ملنے لگی اور دوسری رعایتیں بھی اس لیے اب ان کو بھی آپا خیر النسا سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی کیونکہ ماں بننے کے بعد آپا یکسر بدل کر رہ گئی تھیں گو کہ انہوں نے خود تو اس بچی کو جنم نہیں دیا تھا ان کے لہجے کی کڑواہٹ بھی غائب ہو گئی تھی اور وہ بے حد شفیق اور مہربان ہوتی جا رہی تھیں۔ اب وہ فون پر آیا کو بچی کے لیے ہدایت دیتی نظر آتیں اور اکثر وہ ڈیوٹی کے دوران گھر کا چکر بھی لگا کر آ جاتیں۔ بچی اگر بیمار ہوتی تو آپا کا سکھ چین چھن جاتا تھا۔ مطلب کہ اب ان کو ایسی ماؤں کے مسائل سمجھ میں آ گئے تھے جو ورکنگ وومین بھی ہوتی ہیں۔ وہ خاتون جو اپنے سخت اصولوں اور ڈسپلن کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی ایک ننھی سی بچی نے اس ڈسپلن کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ماں تا عورت کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

اب ساری ٹیچرز ان سے بہت خوش تھیں کہ ان کا رویہ اب سب کے لیے شفقت بھرا اور برابری والا تھا۔

اچانک ایک خبر پھر کسی دھماکے کی طرح اسٹاف روم میں پہنچی تھی کہ ان کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ وہ چلی گئیں...... ان کی شفقت اور مہربانی والا رویہ بھی چلا گیا۔

نئی ہیڈ مسٹریس آ گئی۔ اب نئے جھگڑے اور مسائل شروع ہو گئے۔ ''ماؤں'' نے پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا کیونکہ نئی ہیڈ مسٹریس بھی بے اولاد تھی۔

ہم کو عبث بدنام کیا

سیما رضا ردا

آخری حصہ

یہ شبنمی لہجہ ہے آہستہ غزل پڑھنا
تتلی کی کہانی ہے پھولوں کی زبانی ہے

صبح کا پُرکیف منظر اس کے سامنے تھا......
اس کا مخصوص کمرا...... کمرے سے باہر خوشنما پودے، بادل کے ساتھ جھومتی ہوا...... دھواں، دھواں سا موسم صبح نے اس سے مکالمہ کرتے ہوئے کہا......

”اُٹھو...... دیکھو
باہر کیا خوب صورت نظارہ ہے۔“

اس کے شنگرفی لبوں پہ مسکراہٹ ابھری۔

”ٹھہرو...... پہلے اپنے رب کا شکرادا کرنے دو...... مجھے ایک اور نئی زندگی عطا کرنے پر......“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی۔

وضو کے پانی سے خود کو اللہ کے حضور عاجز ہوتے دیکھا...... اور نماز میں سپردگی کے احساس نے اسے سکون عطا کیا...... سلام پھیر کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اس کی نظر ساتھ رکھے ایک شاپر پر پڑی اور کچھ دن پہلے کا منظر اس کے سامنے آگیا۔

ڈاکٹر راحیل کے روم میں وہ تایا جی کے ساتھ بیٹھی تھی...... ڈاکٹر راحیل بتا رہے تھے۔

”آپ کو بہت مبارک ہو مس تشمیرہ...... آپ کو ایک نئی زندگی ملی ہے اور یہ بڑی خوب صورت زندگی ہے...... اب آپ کو بس آگے دیکھنا ہے پیچھے مڑ کر ہرگز نہیں دیکھنا۔ ہماری محنت ان سی ڈیز میں ہے...... جس میں پل پل آپ کو لاشعور سے شعور میں ڈھالا ہے......

آپ کو ایک نئی زندگی ملی ہے تشمیرہ! زندگی ہے تو اللہ تعالیٰ کی امانت...... مگر جس نے آپ کو بچانے کے لیے اپنا وقت، نیند، سکون، خوشی آپ کے لیے وقف کر دیا ہو...... تو اس ناخدا کی بھی قدر کرنی چاہیے...... شاید میرے اس قدر کہنے سے بھی آپ کو اندازہ نہ ہو مگر یہ سی ڈیز آپ کو حیران کر دیں گی......“ وہ اپنی چمکیلی آنکھیں حیرت کے ساتھ جھپکاتی ہوئی ان سی ڈیز کو دیکھنے لگی۔ اب ڈاکٹر راحیل نے تایا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اعزاز کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اس کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ اگر یہاں ہوتا تو تشمیرہ بی بی کو ہر بات کا پہلو سمجھ میں آجاتا......“

”ڈاکٹر اعزاز......؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”اوہ...... نو......!“ وہ مسکرا دیے۔ ”وہ ڈاکٹر نہیں ہیں، تمہارے مسیحا ہیں...... وہ بہت جلد تم سے ملیں گے۔“ ڈاکٹر راحیل بولے۔

”ارے بیٹا...... وہ بہت پیارا آدمی ہے۔ اس نے

تمہارے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ تم اس سے ملو گی تو جان جاؤ گی کہ وہ کتنا ہیرا شخص ہے...... با ادب...... با نصیب بچہ ہے......"

"اور مس تشمیرہ، اعزاز جاتے ہوئے یہ "بکے" آپ کے لیے دے گئے تھے۔"

اس نے گلاب کے پھولوں کا اتنا فریش بکے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حیرت سے فوراً تھام لیا۔

"بے فکر رہیے۔ یہ کبھی نہیں مرجھائیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے...... "یہی ان پھولوں کا حسن ہے۔ اور اب آپ بالکل پیچھے مڑ کر نہ دیکھیے گا۔ میں بھی کہہ رہا ہوں...... اور اعزاز نے بھی کہا ہے کہ تشمیرہ سے کہنا ہماری محنت پہ پانی نہ پھیرے...... اوکے...... گڈ لک...... اللہ حافظ!"

اب بیڈ کی سائیڈ دراز کے اوپر سبز ڈائری اور تازہ گلاب رکھے ہوئے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر شوق و تجسس تھا کہ وہ سی ڈیز کو دیکھے...... ان میں ہے کیا آخر۔

یکم مئی ...... پہلی سی ڈی اس نے اٹھائی...... کور سے نکالی، تاریخ دیکھی اور سی ڈی پلیئر میں ڈال دی۔ سامنے اندھیری اسکرین پر روشنی ابھر آئی اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک منظر سامنے تھا۔

......☆......☆......☆......

ہر نیا دن...... نیا سورج ایک نئی داستان کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، اعزاز شاہ، تشمیرہ کو ایک نئی زندگی دینے پر بہت خوش تھے۔ اس سے روبرو ملنا چاہتے تھے مگر انہیں کیا خبر تھی کہ وہ کس صورت حال میں پھنس جائیں گے۔

اعزاز شاہ حیران، پریشان سے فیضان کے بیڈ کے قریب کھڑے اس کی کیفیت نوٹ کر رہے تھے...... جو روزی، روزی کی تکرار کر رہا تھا...... روزی اس کی زندگی میں کب آ گئی......؟

"فیضان...... فیضان کیا ہوا......؟" اعزاز نے اسے زور سے پکارا...... ان کے بار بار کہنے پر فیضان نے بہ مشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی...... پھر غنودگی میں چلا گیا۔



"معاملہ کچھ سنگین ہے.....'' وہ حقیقتاً پریشان ہو گئے۔
اس کے خون کے ٹیسٹ کے مطابق اس کے جسم میں ڈرگز کے آثار ملے تھے.....اور یقیناً اسی کیفیت میں اس نے ڈرائیونگ بھی کی۔ ایک پولیس آفیسر اس کے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔
"سر.....!'' اس نے اپنی کیپ اتارتے ہوئے اعزاز کو مخاطب کیا۔
"جی!''
"آپ کو رپورٹ دے رہا ہوں .....گاڑی درخت سے ٹکرا گئی تھی.....ڈرائیونگ سیٹ کا ڈور بھی صحیح سے لاک نہ تھا..... ان کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ دروازے پہ زور پڑا تو یہ سیٹ سے گر کر لڑھکتے ہوئے آگے جا کر بے سدھ پڑ گئے.....جگہ پتھریلی ہونے کی وجہ سے جسم کے مختلف حصوں میں چوٹیں تھیں.....سر کا پچھلا حصہ زخمی تھا.....خون بہت زیادہ بہہ گیا، اس لیے انہیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا.....''
"ان کے ٹریٹمنٹ میں کسی بھی قسم کی کمی نہیں آنی چاہیے.....'' زوار شاہ، ڈاکٹر سے کہہ رہے تھے۔ وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے.....وہ بابا کو لے کر راہداری میں چلے گئے۔
"میں نے تمہیں کہا تھا.....اسے روزی سے دور رکھو۔ وہ کسی اور مقصد کے لیے اس سے دوستی کر رہی ہے۔ مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو گئی تھی.....'' وہ بہت غصے سے کہہ رہے تھے۔
"اس پر نظر رکھو..... ایف آئی اے میں دو اس کا نام..... اس کا چاندنی سے تعلق ضرور ہے..... اٹھارہ سال پہلے کا قرض چکانے آئی ہے یہ.....'' محب اللہ کے الفاظ خنجر کی نوک کی طرح چبھ رہے تھے۔
"مگر افسوس تم نے میری ایک بات نہ مانی.....'' وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے..... اعزاز شاہ نے زوار شاہ کو دیکھا جو شکست خوردگی سے محب اللہ کی بات پر سر ہلانے لگے۔
"تم نے اپنی ذاتی زندگی میں بھی روزی کو شامل کر لیا تھا..... وانیہ کے معاملے میں بھی تم نے روزی کو راز دار بنا لیا اور پھر جو ہوا سب نے دیکھا.....''
"میں اتنا بے خبر تھا گھر کے ماحول سے .....؟''
اعزاز نے سوچا۔ تب ہی تیز، تیز قدموں سے اس کے آفس کا رائیڈر بوائے ہاتھ میں موبائل کا پیکٹ تھامے قریب آ گیا۔ اعزاز نے فیضان کا موبائل ریپیرنگ کے لیے دیا تھا..... جو ایکسیڈنٹ کے وقت اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا تھا۔ اسکرین پہ بے تحاشا لکیریں تھیں۔ ریپیرنگ شاپ والا وہی موبائل لے کر یہیں آ گیا تھا۔
"جناب میں نے موبائل کی ریپیرنگ کرا دی ہے۔ موبائل کے ٹکڑے جوڑ دیے ہیں..... مگر ایک عجیب بات ہے.....''
"کیا.....؟''
"جب میں نے کیسنگ اتار کر موبائل کی بیٹری نکالی تو حیران رہ گیا.....''
"کیا مطلب.....؟'' اعزاز نے الجھن سے اسے دیکھا۔
"کیا ہوا اب.....؟'' محب اللہ نے پوچھا۔
"اس فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ آپ کہیں تو لگا رہنے دوں.....''
"ٹریسر..... فیضان کے فون میں.....؟'' اعزاز کی سانس رکنے لگی۔
زوار شاہ جیسے سکتے میں آ گئے۔
"اوہ مائی گاڈ! جس نے بھی یہ ٹریسر ڈالا ہے وہ ہمہ وقت لوکیشن ٹریس کر سکتا ہے۔''
"اور ٹریس کرتا رہا ہے.....'' محب اللہ نے کہا۔
اعزاز بنا پلک جھپکے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر ٹریسر کو دیکھے گئے۔
"جناب یہ بہت ایڈوانسڈ ہے..... کوئی بھی جب چاہے اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی سن سکتا ہے۔'' وہ لڑکا ٹریسر کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔
"اوکے..... یہ ٹریسر مجھے دے دو، بہت شکریہ.....'' اعزاز نے ہاتھ بڑھا کر ٹریسر اور موبائل لے لیا۔ لڑکا راہداری سے چلا گیا تھا۔ ایک لمحے کو سناٹا

چھا گیا۔

”سنو زوار، حالات ہمارے موافق نہیں ہیں۔“

محب اللہ نے کہا۔”فیضان کے ذریعے ساری معلومات، سارا احوال، ہمارے ڈاکومنٹس، فائلیں سارے راز جانے کہاں تک پہنچ گئے ہوں گے.....اور مجھے پکا یقین ہے کہ روزی ان سارے حالات کی ذمّے دار ہے..... اسے فوراً ٹریس کرو، کہیں وہ فرار نہ ہوجائے..... جانے نہ پائے.....“ انہوں نے بہت تیزی سے موبائل سے پولیس کے ہائی آفیشلز سے رابطہ کیا..... صورتِ حال بتائی اور پھر زوار سے کہنے لگے۔

”جس اسپتال میں یہ لوگ (فیضان کی طرف اشارہ کرکے) گئے تھے..... وہاں کسی خاتون کو ایڈمٹ کروایا تھا۔ ہمیں وہاں جانا پڑے گا..... روزی وہیں ہوگی.....“

”ردا کو فون کردو کہ وہ فیضان کے پاس ٹھہرے.....اعزاز تم یہاں رکو گے یا چل رہے ہو؟“ زوار شاہ نے اعزاز سے پوچھا۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آئیں آپ لوگ...... وہ کچھ بھی کرسکتی ہے، کسی کو بھی نقصان پہنچاسکتی ہے۔ اب خطرات بڑھ گئے ہیں...... بابا وہ اسپتال...... یہاں سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پہ ہے......“ اعزاز نے اسپتال کی لوکیشن چیک کرکے navigation آن کردی۔

وہ تینوں اسپتال کی پارکنگ سے گاڑی میں آبیٹھے۔

ڈرائیونگ سیٹ اعزاز نے سنبھال لی...... تینوں کے درمیان خاموشی تھی۔ خاموشی کے بیچ اس سفر میں محب اللہ کبھی اعزاز کی طرف اور کبھی کن انکھیوں سے زوار کی طرف دیکھتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہے تھے...... انہیں یہ ضرور احساس تھا کہ ماضی پلٹ کر واپس آتا ہے اور حساب کے گوشوارے بھی چکانے پڑتے ہیں۔ ان کی نظروں میں چاندنی کا چہرہ آگیا۔

......☆......☆......☆......

”کیا اس کے ساتھ انہوں نے ناانصافی کی تھی؟“

وہ مارکیٹنگ کنسلٹنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ آفس

کے ہر فرد کے ساتھ اچھی بننے کی کوشش کرتی تھی۔ اور جب محبت اللہ نے اسے سمجھایا کہ اپنی حد میں رہو تو وہ آہستہ آہستہ محبت اللہ میں دلچسپی لینے لگی۔ ان کے دفتر میں گھنٹوں بیٹھ کر محبت اللہ کے لیکچر سنتی۔ اور ان کی اس نشست میں زوار شاہ بھی آ گئے۔

ان دنوں زوار شاہ بہت الجھے، الجھے رہتے تھے...... مہرو کے ساتھ ان کی رفاقت ختم ہونے جا رہی تھی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر چاندنی اور محبت اللہ کے ساتھ باتوں میں وقت گزار لیتے تھے۔

محبت اللہ کے دل میں چاندنی کے لیے نرم گوشہ ابھر رہا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس لڑکی کے لیے بہت کچھ سوچتے کہ ایف آئی اے کے مختلف چھاپوں نے ان کے ادارے کو ہلا کر رکھ دیا تھا...... بہت ساری فون کالز کا ریکارڈ ایف آئی اے کے پاس تھا...... بہت سی سیاسی شخصیات اور بااثر لوگوں کو دھمکیاں دی گئی تھیں...... زوار کے ادارے کی ساکھ خطرے میں آ گئی تھی۔ یہاں سے کال ریکارڈنگ کا ثبوت ایف آئی اے برانچ میں تھا۔

چاندنی وہ نہیں تھی جو نظر آتی تھی۔ مجرم کہیں نہ کہیں اپنے ہی دام میں پھنس جاتا ہے۔ کئی بار کرائم برانچ نے ان کے دفتر کے چکر بھی لگائے اور پھر چاندنی کے آنے جانے کے اوقات...... اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی......

''سر میں کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر جانا چاہتی ہوں...... میری بہن کا ایڈمشن بہت ضروری ہے...... میں واحد کفیل ہوں...... اس لیے مجھے جانا ہوگا......''

زوار نے اس کی چھٹی کی گرانٹ منظور کر لی تھی مگر دو گھنٹے بعد ہی ایف آئی اے کے بندے سادہ لباس میں آ دھمکے اور زوار کے آفس میں انہوں نے چاندنی کو بلا کر پوچھ تاچھ شروع کر دی تھی۔

''تم مان لو بی بی......'' آفیسر نے کہا...... ''اور خود بتا دو...... ورنہ بہت برا حشر ہوگا تمہارا، تم کس مقصد کے لیے یہاں ہو اور کس مافیا نیٹ ورک کے لیے کام کر رہی ہو۔ تمہاری بچت ہو سکتی ہے...... ورنہ تم گئیں کام سے...... تم یہاں سے بچ نہیں سکتیں اور اگر بچ بھی گئیں تو بھی تمہارے لوگ تمہیں مار دیں گے......'' چاندنی نے خود کو مافیا گروپ سے لاتعلق ظاہر کیا۔ وہ رو رہی تھی...... وضاحتیں کر رہی تھی مگر سب بیکار تھا۔

''تم نے جتنی فون کالز یہاں سے کیں...... ڈرگز سپلائی کرنے کا اڈا اس جگہ کو بنایا...... سب ثبوت ہیں ہمارے پاس...... اب کچھ نہیں ہو سکتا اور تمہارا اصل نام چندا ہے...... تمہاری ایک بہن اور ماں بھی اس میں شامل ہیں۔ تم کال گرل، برانڈ ایمبیسڈر بن کر بہت کچھ سپلائی کرتی ہو اور کچھ بتاؤں......؟ لہٰذا اب پورے گروپ کا نام بتا دو؟'' آفیسر کی آواز پتھر بن کر اس کے سر پہ پڑ رہی تھی...... محبت اللہ، زوار شاہ دونوں دم بخود تھے۔

محبت، عزت سب داؤ پہ لگ گیا تھا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ ہوا کا جھونکا کھڑکی سے اندر آیا تو جیسے اسے نجات کا راستہ ملا۔ اس نے ایک نظر محبت اللہ کو دیکھا اور برق رفتاری سے کھڑکی سے کود گئی۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ کوئی کچھ نہ کر سکا۔ کوئی اسے روک نہ سکا...... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے ہارٹ اٹیک بھی ہوا تھا۔

اس کی موت معما بن گئی تھی۔ خودکشی کا یہ عمل اس کے خلاف بہت سارے ثبوت کھول گیا تھا۔ زوار کے ادارے کی ساکھ خطرے میں پڑ گئی تھی۔

اخبارات نے اس اسکینڈل کو بہت اچھالا۔ بالآخر وقت کے ساتھ ساتھ باتیں دب گئی تھیں، سرگوشیوں میں کمی آ گئی اور اخبارات بھی خاموش ہو گئے...... زوار شاہ نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ وہ مہرو کی بے وفائی سے بہت دلبرداشتہ ہو کر کچھ عرصے کے لیے گاؤں آ گئے۔ جہاں ان کی شادی زبردستی ردا بیگم سے کروا دی گئی...... جو اُن کی کزن تھی۔ یہ سمجھوتے کی شادی تھی، اُدھر محبت اللہ نے بھی خود کو جرمنی میں سیٹل کر لیا...... اور ہیمبرگ آ گئے...... ان کے بہت سے مشترکہ بزنس تھے۔ چاندنی کی یادوں کو بھلانے کا واحد ذریعہ یہی تھا۔

اور اب اٹھارہ سال بعد واپسی ہوئی تو پھر وہی در کھل گیا۔ اب بارش کے قطرہ کی ماہیت مختلف تھی......

سانپ نے بارش کے قطرہ کو زہر بنا لیا تھا......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



روزی کے ذہن میں جو کچھ تھا اس کی سوچ اور عمل سے بہت شدید نقصان ہوسکتا تھا۔ فیضان کا شکار وہ کرچکی تھی......آگے کیا ہوگا......؟

پولیس اور ایف آئی اے پھر حرکت میں آچکی تھی۔

گاڑی اسپتال کے دروازے پہ رک چکی تھی......

......☆......☆......☆......

''مجھے صرف سچ سننا ہے......تم کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتیں......''

خالہ زینب کے پرائیویٹ روم میں روزی تن کر کھڑی تھی......کمرا اندر سے مقفل تھا۔

''دیکھو مجھے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے......زندگی مجھے کتنی مہلت دیتی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اس ایکسیڈنٹ سے میرا کندھا اور گھٹنا بالکل فریز ہوچکا ہے۔ میں اب اور کتنا بھاگوں اور کس کے لیے بھاگوں......؟'' وہ زینب سے مخاطب ہوکر بولی۔

''میرے پاس مزید وقت نہیں ہے......'' اس نے اپنے موبائل کی اسکرین ایک لمحے کو دیکھی......کسی شناسا نمبر سے کال آرہی تھی۔

''ہاں خان......بولو......سارے کام ہوگئے؟''

''میڈم اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے......''

''اس کا موبائل؟''

''ہاں مجھے پتا ہے......آگے بتاؤ......'' وہ خشک لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

دوسری جانب سے جواب سن کر وہ چونک گئی۔

پھر خالہ زینب نے اسے سرد لہجے میں کہتے سنا......

''اگر موقع ملے تو اسے کسی نہ کسی طرح مار دینا اور موبائل کو سرچ کرو کہاں ہے......پل، پل کی خبر چاہیے تھے، بالکل کوتاہی نہیں ہونی چاہیے......اوکے!'' لہجہ سرد تھا اور پھر اس نے کال منقطع کردی اور سامنے چلتے ہوئے گھوم گئی۔

''یہ اپنی بہن چاندنی سے کتنی مختلف ہے......وہ ہمدرد تھی......خود غرض نہیں تھی......اور یہ تو کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہیں آپ میرے بارے میں......؟'' روزی شاطرانہ انداز میں مسکرائی......''میں کچھ بھی کرسکتی ہوں......مجھے اپنی بہن کے قاتلوں کو پکڑنا ہے......صرف سچ بتاؤ سچ......وہ تم تک کیسے پہنچی اور ان دونوں میں سے قاتل کون ہے؟'' دو تصویریں Zoom کرکے ان کے سامنے آگئیں......زوار شاہ کے ساتھ مسکراتے ہوئے گلے میں ہاتھ ڈالے محب اللہ تھے۔

''قاتل......؟ نہیں یہ لوگ قاتل نہیں ہوسکتے۔''

وہ الجھن کا شکار تھیں۔

''مجھے نہیں پتا......لیکن وہ اسے کیوں مارتے؟ محب اللہ تو اسے پسند کرتا تھا......'' زیب النسا کے لہجے میں کمزوری اور کپکپاہٹ تھی۔

''اور زوار شاہ......؟'' وہ غرائی۔

''نہیں......وہ بھی ایسا نہیں کرسکتا......''

''کیوں نہیں کرسکتا؟'' روزی غرا کر بولی۔

''جب وہ وانیہ شاہ کے لیے قتل کا حکم نامہ دے سکتا ہے تو وہ میری بہن کو بھی مرواسکتا ہے......''

''اس نے خودکشی کی تھی......''

''یہی راز سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کرے گی وہ ایسا؟ وہ نہیں کرسکتی ایسا ہاں کبھی نہیں۔'' روزی سختی سے بولی۔

جان لیوا دکھ انسان کو بے حس کردیتے ہیں۔ وہ اپنی بہن کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔

''تم......وہاں سے بتاؤ پوری بات جب تمہاری چاندنی سے دوستی تھی اور میری بہن کا ان لوگوں سے کس حد تک رابطہ تھا۔ میں اپنی بہن کے قاتلوں کے ہر راز سے واقف ہونا چاہتی ہوں۔ اپنی یادوں کو آواز دو......میرے پاس وقت نہیں ہے......'' وہ ان کے قریب آکر بولی۔

''وقت تو میرے پاس بھی نہیں ہے......'' زیب النسا نے دھیرے سے کہا اور پرانے زخموں کو آواز دینے لگیں۔

اور کہانی کرداروں کی صورت......ان کے سامنے آگئی اور وہ ایک، ایک یاد دہراتی چلی گئیں......اور روزی ایک، ایک لفظ پہ غور کررہی تھی۔

اور کہیں دور نیلی روشنی کی جلتی بجھتی پولیس کی ہارن

بجاتی گاڑیاں زوار ہاؤس کی طرف رواں تھیں۔

......☆......☆......☆......

رات بھر سینے میں اک بے نام سی الجھن رہی
رات بھر کرتی رہیں آنکھیں ستاروں کو شمار

۳۰/اکتوبر......

جب کچھ غیر معمولی ہونا ہوتا ہے تو اس کی اطلاع انسانوں سے پہلے پرندوں، جانوروں، درختوں اور ہواؤں کو ہو جاتی ہے...... بارش کے احساس کے ساتھ مور ناچنے لگتا ہے...... گھر میں کسی خوشی کی آمد ہوتی ہے تو منڈیر پر کوے کائیں، کائیں کرنے لگتے ہیں...... مگر وہ ایک بجھا ہوا سا دن تھا...... راستوں میں نہ پہلے جیسی آہٹیں تھیں...... نہ چہروں پہ صبح کی جگمگاہٹیں تھیں...... ہوائیں درختوں میں دبکی ہوئی تھیں......

آسمان دور، دور تک پرندوں کی اڑان سے خالی تھا...... ہر گھر کی کھڑکی سے سناٹے جھانک رہے تھے...... عموماً صبح پانچ بجے تک لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں......

فیضان کی وجہ سے رات ویسے ہی بے قرار گزری تھی۔ موبائل کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ زوار شاہ کا نام اسکرین پر چمک رہا تھا...... کانوں سے لگاتے ہی اور ان کے 'ہیلو' کہنے پر وہ انہیں اسپتال آنے کا کہہ رہے تھے۔

''میں نے ڈرائیور کو بھی بتا دیا ہے۔''

''جی اچھا۔'' کہہ کر انہوں نے لان کی طرف دیکھا...... ڈھلتی ہوئی سیاہی مائل رات کا رنگ کم ہو گیا تھا مگر سیاہی مائل رات کا فسوں ہر طرف تھا......

اس دن گلیوں میں موت چھپی تھی اور نشانے پہ زوار ہاؤس تھا۔

ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی...... اور چوکیدار مین گیٹ بند کر رہا تھا...... گلی اچانک دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔

......☆......☆......☆......

اپنے حصے کی چال تم چل بیٹھے
ہمارے منتظر رہنا کہانی ختم کرنی ہے

زندگی آسان نہیں ہوتی اور زندگی آسان ہے بھی نہیں...... جب اس نے آنکھ کھولی تو دنیا اپنی بہن کی نظروں سے دیکھی جو چندا سے چاندنی بن گئی تھی۔

اس کی ماں اس خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو اُن چھ کروڑ لوگوں میں سے تھے جو دوسری جنگِ عظیم کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے...... وہ وہاں سے کسی طرح سنگاپور پہنچی...... یہ کہانی ادھوری سی ہے...... وہ، اس کی ماں اور بڑی بہن جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی، انہیں پیسے کی تنگی تھی۔ ماں کی بیماری کے بعد زندگی بسر کرنے اور خاندان کی کفالت کے لیے وہ دو تین جگہ کام کرتی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ سنگاپور کے ایک چھوٹے سے بازار میں پرفیوم بیچا کرتی تھی...... وہیں اس کا ٹکراؤ سیٹھ داؤد سے ہوا...... بہت بڑے مافیا گینگ کا ایجنٹ تھا۔

زندگی میں کامیابی کا جو طریقۂ کار کچھ لوگ اپناتے ہیں وہی فارمولا ان جیسے بعض اور لوگ بھی اپناتے ہیں جو یا تو کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں مگر راہ گیروں کی ٹھوکروں سے ہی صحیح راستہ مل جاتا ہے۔

غربت میں حسن کی قیمت کے دام منہ مانگے مل جاتے ہیں اور چندا کو جو راہ ملی اسے اس نے بخوشی قبول کیا...... معمولی تعلیم جو نہ ہونے کے برابر تھی مگر وہ حسن کے زیور سے مالا مال تھی...... بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن روزینہ کے لیے اس نے اپنی خوب صورتی کے دام لگا دیے...... جائز اور ناجائز کا فرق مٹ گیا...... ماں نے مرنے سے پانچ سال پہلے تک قیمتی دواؤں کے سہارے ایک آئیڈیل زندگی بسر کی۔

وہ ناسٹلجیا کے مرض میں مبتلا ہو کر بیٹیوں کی ذمے داریوں سے آزاد تھی مگر چندا نے اپنی ماں اور بہن کے لیے خود کو رہن رکھ دیا تھا۔

''جانی تم کیا کام کرتی ہو......؟'' جب وہ پندرہ دن کے بعد گھر آتی تو وہ اپنی بہن کے معصوم سوالوں سے خوفزدہ اور پریشان ہونے لگتی۔

''میں برانڈ ایمبیسڈر ہوں......''

''یہ کیا ہوتی ہے؟'' روزینہ سوال پہ سوال کرتی۔

''دیکھ جہاں میں کام کرتی ہوں اس کمپنی کی پراڈکٹ یا برانڈ کو متعارف کرواتی ہوں...... یہ دیکھو۔''

اس نے اپنی ایک تصویر دکھائی جس میں وہ کسی پرفیوم کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے بہت دلکش نظر آرہی تھی۔

''تم کتنی پیاری لگ رہی ہو چانی......'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی...... ''میں بھی تمہارے جیسی ہی بنوں گی...... ہیں ناں......!''

''اللہ نہ کرے......'' چندا نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''کیوں......؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو......؟''

نو سالہ روزینہ نے اس سے لپٹ کر کیا۔

''میں چاہتی ہو...... میری گڑیا بہت پڑھے...... میرے خوابوں کو پورا کرے...... اور...... اور...... بہت آگے جائے......'' چندا نے اسے پیار کرتے ہوئے اس کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں تمہاری طرح ہی بنوں گی......'' وہ ضد کرنے لگی تو چندا نے اسے بے بسی سے دیکھا جو آنکھوں میں آنسو بھر، بھر کر اسے منا رہی تھی۔

''ارے بیٹا...... مان جا اس کی بات...... بچی ہے ہاں کر دے ابھی اس کا دل رکھ لے، کہہ کر ابھی جان چھڑا......'' ماں نے روزینہ کی ضدی طبیعت سے زچ ہو کر کہا۔

وہ کیسے بتاتی کہ یہ دل اور دلدل کا سفر ہے...... وہ نیم رضامندی سے گردن ہلا کر رہ گئی...... تو چانی، چانی کہہ کر وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے پیار کرنے لگی۔

کانٹوں کی جس دلدل میں وہ تھی۔ اس سے وہ اپنی بہن کو بچانا چاہتی تھی۔ ماں کو اس نے دکھی نظروں سے دیکھا جو اپنی وہیل چیئر کو خود ہی چلاتی دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔

''مگر تم میری ایک بات یاد رکھو...... اگر تم اپنی چانی سے پیار کرتی ہو تو بہت محنت سے پڑھو گی اور مجھے کبھی مایوس نہیں کرو گی......''

''ٹھیک......'' اس نے خوش ہو کر کہا اور اپنے کھلونے جمع کر کے ایک طرف رکھنے لگی۔

وہ اپنی فیملی کو اس آگ سے دور رکھنا چاہتی تھی...... جس میں وہ جل رہی تھی...... داؤد مافیا نے اس کی grooming (تربیت) پہ بے حد پیسہ خرچ کیا تھا...... وہ بیک وقت کئی کام سرانجام دے سکتی تھی۔

ریڈی ٹو ویئر ملبوسات کی نمائش میں حصہ لینے کا بنیادی مقصد ملائیشیا کی طرف سے نمائندگی تھی...... آج کل وہ پاکستان میں تھی...... وہ تمام کام اس کے سپرد تھے جو ایک خوب صورت عورت بہ آسانی انجام دے سکتی تھی۔

وہ ذہین تھی، ہوشیار تھی اور بلا کی پُرکشش اور جاذب نظر تھی...... اس کے ایک اشارے پہ تمام فائلیں تہہ خانوں سے نکل کر اس کی دسترس میں آجاتیں......

وہ ایک عام سا دن تھا...... جب وہ شام کے وقت گروپ آفیسر کے ساتھ دامن کوہ آگئی...... دامنِ کوہ میں اس کی ملاقات ایک لڑتے جھگڑتے جوڑے سے ہوئی۔

وہ دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی...... جو بار، بار کہہ رہی تھی...... ''میں نہیں چھوڑوں گی اسے...... وہ مجھ سے کیسے آگے جا سکتی ہے...... اس کو اتنا امیر آدمی کیسے مل گیا...... اور مجھے پتا بھی نہیں چلا......''

وہ غصے میں انٹ شنٹ بول رہی تھی اور آس پاس سے بالکل بے نیاز تھی...... اسے نہ اپنی عزت کی پروا تھی نہ اس آدمی کی......

''دیکھو...... اب تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں...... اس کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ ایک بااثر آدمی کی بیوی ہے۔''

''نہیں...... میں اس کی شادی ختم کروا دوں گی...... وہ خوش کیسے رہ سکتی ہے...... میں اسے...... میں اسے...... میں اسے......'' شدتِ جذبات سے اس کے منہ سے الفاظ صحیح ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم......؟'' اس آدمی نے کہا۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے، مجھے ابھی سمجھ میں نہیں آرہا...... مگر طفیل تم میرا ساتھ دو گے ناں......؟''

''ہاں بابا...... زندگی بھر ساتھ دوں گا......!'' وہ اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہہ رہا تھا...... وہ لمبی،

لمبی سانسیں لے رہی تھی۔۔۔۔۔اور آنکھوں میں بے حد غصہ تھا۔۔۔۔۔وہ اسے یقین دلا رہا تھا کہ میری وفائیں تمہارے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔

"یقیناً اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔۔۔۔۔" چاندنی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جاگ گیا۔۔۔۔۔ وہ اس کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگی۔

"میں اسے اعتماد میں لے کر اس سے دوستی کروں گی۔" اسے کافی عرصہ پاکستان میں رہنا تھا۔۔۔۔۔ کچھ دنوں یہ شغل ہی سہی۔۔۔۔۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہونے لگے تو لوگوں کا جم غفیر چھٹنے لگا۔۔۔۔۔ واپسی کے راستوں پہ ان کے قدم بھی ہم سفر ہو گئے تھے۔۔۔۔۔چاندنی کی نظروں کے حصار میں وہ جوڑا تھا جو آہستہ آہستہ پکی بنی ہوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔۔۔۔۔گاڑی کی پارکنگ کافی دور تھی۔

"سنو میں کچھ دیر اکیلے گھومنا چاہتی ہوں، میرا مطلب ہے کہ مجھے واک کرنا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں پارکنگ ایریا میں ملوں گی۔۔۔۔۔" اس نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے آفیسر سے کہا۔۔۔۔۔

وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔۔۔۔۔ چاندنی نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آگے چلتے ہوئے دو سایوں کے درمیان آ گئی۔۔۔۔۔

"ہیلو۔۔۔۔۔ میں چاندنی ہوں۔۔۔۔۔ آج کل آپ کے شہر میں ہوں۔۔۔۔۔" اس نے خوش دلی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"مگر میں تمہیں نہیں جانتی۔۔۔۔۔" زینب نے اس کا سراپا بغور دیکھا اور روکھے لہجے میں کہا۔

"جان جاؤ گی۔۔۔۔۔ اگر دوستی کرو گی۔۔۔۔۔ مجھے تم اچھی لگی ہو۔۔۔۔۔" چاندنی نے کہا۔

"اچھا۔۔۔۔۔" زینب نے مسکراتے ہوئے پیشانی کے بل درست کیے اور اس کا بڑھا ہوا خوب صورت ہاتھ تھام لیا۔

"یہ تمہارا۔۔۔۔۔؟" چاندنی نے اس کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھا جو بظاہر لاتعلق سا نظر آ رہا تھا مگر دھیان ان کی گفتگو کی طرف ہی تھا۔۔۔۔۔

"یہ میرے شوہر ہیں طفیل۔۔۔۔۔"

"ہیلو۔۔۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ جھجک گیا۔

"کیوں۔۔۔۔۔" زینب نے اسے ٹھوکا دیا تو اس کے گھورنے پر اس نے چاندنی سے ہاتھ ملا لیا۔۔۔۔۔ اس ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے شوہر پہ حاوی ہے۔۔۔۔۔آئس کریم بار کے قریب آ کر چاندنی نے فوراً آرڈر کر دیا۔۔۔۔۔سنگ مرمر کی بنی بینچ، درمیان میں رکھی خوب صورت ٹیبل بھی سنگ مرمر کا شاہکار تھی۔۔۔۔۔آرڈر بہت جلدی سرو کیا گیا۔۔۔۔۔تین مختلف فلیور کے آئس کریم کپ کھاتے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے چاندنی کو احساس ہوا کہ زینب احساس برتری اور احساسِ کمتری کا مکسچر ہے۔۔۔۔۔اس کا شوہر آئس کریم خاموشی سے کھاتا رہا اور اس کے حکم کا منتظر رہا کہ کب وہ چلنے کا کہتی ہے۔

یہ ان دونوں کی آخری ملاقات نہیں تھی، ملاقات دوستی میں بدلتی گئی۔ چاندنی نے اپنی حیثیت یہاں مارکیٹنگ منیجر کے طور پر بنالی تھی۔ اسے یہاں بارہ مہینے ہر صورت میں گزارنے تھے۔۔۔۔۔ کچھ انفارمیشن، سپلائی باکس کے کارٹن، سی ڈیز کو شاپ کرنا۔۔۔۔۔ یہ وہ اہم کام تھے جس کے لیے یہاں اسے نوکری کرنا تھی۔۔۔۔۔اور ہر فرد کے ساتھ مراسم رکھنا اس کے لیے حکم تھا۔۔۔۔۔اس حکم میں کبھی، کبھی شناخت بھی چھپادی جاتی۔۔۔۔۔

زوار کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔۔۔۔۔محب اللہ اسد نے پہلے ہی انٹرویو میں اسے سلیکٹ کر لیا تھا۔۔۔۔۔وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ بلا کی اسمارٹ تھی۔۔۔۔۔اس کے لیے بزنس لانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس پیشے میں اس نے ہر ایک سے دوستی کر لی تھی۔۔۔۔۔محب اللہ نے اس کی خوب صورتی اور اخلاق کو الگ زاویے سے دیکھا۔۔۔۔۔ خوب صورتی کا فائدہ ضرور اٹھایا۔۔۔۔۔مگر اخلاق کے راستے میں ہر ایک نہیں۔۔۔۔۔اور چاندنی نے اس کے سمجھانے پر اپنی ساری توجہ اس کی جانب مبذول کر لی۔۔۔۔۔اس کی اپنائیت، نرم لہجہ یہ سب اس کے لیے بے حد اچھا تھا۔ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا مگر وہ

چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی...... اس کی زندگی میں ویرانے تھے......اب صرف ماں اور بہن کے لیے اسے جینا تھا۔ وہ اپنی اور محبت کی دوستی کو دراز کرتی چلی گئی...... زوار بھی اس دوستی کا حصہ بنا مگر وہ زیب النسا سے بھی ملتی رہی...... اس کے بہت سے مسائل اس نے حل کیے...... کئی جگہ زیب النسا کو ماڈلنگ کے لیے راستہ دکھایا اور اس نے بھی جم کر اپنی خوب صورتی کو کیش کروایا...... اس کا شوہر طفیل بھی مطمئن ہو کر دبئی چلا گیا......اور وہ خطرناک کام بھی زیب النسا نے چاندنی کے ذریعے کیا......جس نے اس کی بہن کی زندگی تباہ کر دی اور یوں مہرو کے ساتھ اس نے بہت برا کیا...... اس کی ہنستی بستی زندگی اجاڑ دی......اس کے کردار کو اس کے شوہر کی نظروں میں داغ دار کر دیا کہ وہ اس کی شکل دیکھنے تک کا روادار نہ رہا۔

''میں دوستی نبھانے میں ماہر ہوں......تمہارا کام ہو جائے گا......مگر ایک بار سوچ لو......'' چاندنی نے اس سے کہا۔

''میں صرف یہ سوچتی ہوں جو کچھ اسے ملا ہے...... اسے نہیں ملنا چاہیے...... اسے ہر چیز مل جاتی ہے...... مجھے کیوں نہیں ملتی...... یہ اس کا حق نہیں ہے...... میں اسے تباہ کرنا چاہتی ہوں......'' اس نے سفاکی سے کہا۔

''ایک میری گڑیا ہے روزی جس کے منہ سے نکلنے والی ہر خواہش کا احترام میں کرتی ہوں......وہ میری محبت ہے......اور محبت مہربان ہوتی ہے......حسد نہیں کرتی۔''

مگر زیب النسا کی دوستی کے لیے وہ سب چاندنی نے کیا جو اس نے چاہا...... کسی نہ کسی مقام پر تو آدمی گرتا ہے......اور میں نے بھی انسانیت کی سطح سے گر کر اس کی مدد کی۔

کسی کی تصویر کو کسی کے ساتھ جوڑنا، آواز کا جادوئی کمال، فائلنگ میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال......یہ سب اس کی تربیت کا حصہ تھا۔

مافیا گینگ کے سہارے Spy اور نمائندے اس میں ماہر تھے......

ایک بار اس نے زیب النسا اور مہرو کی گفتگو سنی تھی......اس طرح اسے مہرو کی آواز کا کلیو (Clue) مل گیا تھا......سو چاندنی نے کئی جعلی تصاویر اور فون کالنگ کی رپورٹ تیار کر کے جب زیب النسا کو دکھائی تو اس کی زبان گنگ ہوگئی۔

''یہ......یہ تم نے کیا ہے......؟'' زیب النسا کو یقین نہیں آرہا تھا۔

مہر النسا کے ساتھ جس آدمی کی تصویر تھی......وہ بہت ہینڈسم تھا......چاندنی نے بڑی ٹیکنیک سے اس میں مختلف locations یہ کام کر کے دونوں کی مختلف زاویوں سے ہنستی، مسکراتی تصاویر، پارک، ہوٹلز اور ریسٹورنٹ کے مقامات پر سیٹ کی تھیں۔

''یہ آدمی کون ہے......؟'' زیب النسا نے تجسس سے کہا۔

''یہ......یہ......اب سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی، دل تھام کے سنو......یہ مارا جاچکا ہے......نبیل نام تھا...... بے قصور تھا بیچارہ......اس کی تصویریں تھیں میرے پاس اور اس کی آواز بھی محفوظ ہے میرے پاس......اپنی منگیتر سے بہت لمبی، لمبی رومینٹک باتیں کرتا تھا......بس تمہاری بہن کی آواز کا انداز ٹھہراؤ میں ذرا دقت پیش آئی...مگر سب ہوگیا۔ یہ سنو......'' اس نے کیسٹ پلیئر میں پلے کا بٹن دبایا۔

مردکی آواز ابھری......خوب صورت گمبھیر لہجہ تھا۔

''ہیلو......میں نبیل بات کر رہا ہوں......''

''ہیلو......ہاں......جی......وہ ابھی اماں سو رہی ہیں......'' مہرو کی آواز ابھری۔

''یہ تو مہرو ہے......'' وہ چلائی۔

''سنو تو......'' چاندنی نے کہا۔

''جی......'' مہرو کی آواز۔

''میری دلربا......میں تمہارا دلبر بن کر ساری زندگی تمہارا ساتھ نبھاؤں گا......تم ہاں کہہ دو......میں فون رکھ دوں گا......تم ہاں کہہ دو......'' گمبھیر لہجے میں التجا تھی۔

''اچھا بابا......'ہاں'......میں رکھتی ہوں فون......

زینب آرہی ہے......'' بالکل مہرو کی آواز لگ رہی تھی۔

کیسٹ پلیئر کا بٹن اسٹاپ کر کے چاندنی نے داد طلب نظروں سے زیب النساء کو دیکھا جس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

''کیسے، یہ سب کیسے کیا تم نے......'' اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا......

''بس تمہاری دوستی کی لاج رکھی ہے......تمہیں اپنی بہن سے سب کچھ چھین کر سکون مل جائے گا......''

اس نے اس کے الفاظ واپس کیے تو زیب النسا فتح مندی سے مسکرا دی......

''اور مجھے اپنی بہن کو سب کچھ دے کر سکون ملے گا......'' چاندنی نے دل میں کہا......''مجھ میں اور اس میں کتنا فرق ہے......''

اور پھر وہی ہوا جس کے لیے زینب نے منصوبہ بندی کی تھی......حالانکہ چاندنی، زیب النسا کے حوالے سے زوار کے آفس میں کام کر رہی تھی مگر اپنا اور زیب النسا کا تعلق ظاہر نہیں کیا تھا......

زیب النسا نے ظلم کی حد کردی، مظلوم بہن کو بالآخر اس جگہ پہنچا دیا......جس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''بیچاری مہر النسا......ہونہہ......بہت عیش کرنے چلی تھی۔'' وہ دل ہی دل میں اپنی فتح مندی پر خوش ہوئی۔

پھر ایک روز اسے وہ خبر مل ہی گئی جسے سننے کے لیے اس کی سماعتیں بے چین و بے قرار تھیں......اماں کی حالت بگڑ گئی تھی......اور مہرو بے حد گم صم سی ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے مہرو کی طرف دیکھا جو بالکل چپ سکتے کی کیفیت میں تھی۔

''یہ تو ہونا تھا اماں......تم مہرو کو سمجھاؤ......اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ رشتہ کرے گی تو دھوکا تو کھائے گی ناں......دفع کرو آگے کی سوچو......'' اس نے بظاہر ہمدردی اور بے رخی سے کہا۔

''دھوکا تو اس نے کھایا ہے......میری بیٹی فرشتوں کی

طرح معصوم ہے...... میں نے اسے پیدا کیا ہے...... جس نے بھی میری بیٹی کے ساتھ ایسا کیا ہے...... اللہ اسے معاف نہ کرے گا...... اسے دنیا میں دکھائے گا...... میری بیٹی کے صبر کا حساب دینا پڑے گا اسے...... میری بچی معمولی نہیں ہے...... کردار کی پختہ ہے......'' اماں یک دم شیرنی کی طرح گرجیں...... پھر ہچکیوں سے رونے لگیں۔

''اگر تیرے بارے میں کوئی اس طرح کہتا زیب النسا تو میں شاید اعتبار کر لیتی مگر مہرو کے لیے نہیں۔ اس کے ساتھ جس نے کیا ہے وہ قرار کو ترسے گا...... بہت جلد اس کے آگے آئے گا...... میری بچی پریشان نہ ہو...... وہ تجھے نہیں چھوڑے گا تو اسے فون پر خوشخبری سنا کہ اللہ نے تجھے امید سے نوازا ہے...... ہمت کر بیٹی...... ہمت کر......'' اماں مہرو کو دلاسا دیتی رہیں۔

مہرو خاموشی کی تصویر بنی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی...... شاید وقت بھی ظالم تھا...... اور لوگ بھی ظالم تھے...... اس کے کانوں میں سیسہ پگھلائے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔

اس نے زوار شاہ کو خوشخبری سنانے کے لیے فون کیا تو زوار شاہ نے کہا۔

''خوشخبری تمہیں میری طرف سے ملے گی...... اسے تم زندگی بھر یاد رکھنا۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں...... میں ایسی گری ہوئی عورت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جس کا کردار مشکوک ہو...... میں تم جیسی چالاک عورت کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا...... میری غیرت کا مذاق اڑانے والی تم وہ گھٹیا عورت ہو...۔ اگر میرے سامنے آئیں تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا...... سمجھیں......'' اور فون پٹخ دیا گیا تھا۔

زینب کو ساری باتیں معلوم ہو گئی تھیں...... وہ بہت خوش تھی...... اس نے مہرو کے پر کاٹ دیے تھے...... زوار نے زینب کو ایک روز فون کر کے آفس بلایا تھا...... وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

شاندار پُرشکوہ عمارت میں ہر چیز چمکتی ہوئی نظر آئی...... اس کا احساسِ کمتری پھر جاگ اٹھا...... ایک امید نظر آئی مگر بے سود......

دوسرے فلور پہ زوار شاہ کے نام کی تختی سنہرے حروف میں لگی تھی...... وہ ہلکی سی دستک کے ساتھ اندر آ گئی...... زوار شاہ کا یہ انداز اس کے لیے بالکل نیا تھا...... مہرو کے رشتے کے حوالے سے وہ بہت عزت دیتا تھا...... آج اس کا چہرہ مکمل اجنبی تھا۔

چاندنی بھی اسی فلور پہ تھی...... زوار شاہ کے ساتھ محب اللہ اسد بھی تھے...... جو اُن کے پارٹنر تھے...... یہ سب اسے چاندنی بتا چکی تھی۔

''آپ سے مجھے بہت ضروری کام تھا...... اس لیے آپ کو یہاں زحمت دی ہے...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا......'' زوار شاہ کی سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی...... ''یہ ایک لفافہ ہے......'' وہ خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے......'' اس میں آپ کی بہن کے کاغذات ہیں اور ایک عدد چیک...... یہ آپ ان کے حوالے کر دیجیے گا......'' اس نے وہ خاکی لفافہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آپ چاہیں تو یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتی ہیں...... کافی یا ٹھنڈا پی کر جایئے گا...... مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے......'' وہ تیزی سے اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے...... زینب ہکا بکا سی انہیں دیکھتی رہی۔ اس ساری صورتِ حال میں وہ اس اجنبی کو دیکھنے لگی جو اس منظرنامے سے ناخوش دکھائی دے رہا تھا...... اسی لمحے چاندنی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظریں زیب النسا سے ٹکرائیں...... جو جانے کی منتظر تھی۔

''آپ......؟'' وہ اجنبی بن کر اس سے مخاطب ہوئی۔

''یہ زوار کی مہمان ہیں......'' محب اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''اوہ...... کم آن آپ کہاں جا رہے ہیں...... کچھ دیر تو بیٹھیں...... زیب النسا کے پاس......'' چاندنی نے کہا۔

''میں ضرور بیٹھتا......'' پھر وہ چونک کر کہنے لگے...... ''تم انہیں جانتی ہو...... تمہیں ان کا نام کیسے پتا......؟ محب اللہ نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ حقیقتاً گھبرا گئی تھی...... ''ریسپشن پروزیٹرز میں ان کا نام لکھا تھا......آپ کی کھوجی طبیعت تو مجھے مروا دے گی......'' وہ ہنستے ہوئے بولی تو محب اللہ نے اسے بغور دیکھا اور نارمل ہو کر کہنے لگے۔

''نہیں مجھے بھی کام ہے...... اوکے میں چلتا ہوں......'' وہ چلے گئے تو چاندنی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر وہ خاکی لفافہ اس کے ہاتھ میں دیکھ کر چاندنی نے مجھے اسے وکٹری کا نشان دکھایا۔

''میرا کوئی پراجیکٹ آج تک ناکام نہیں ہوا...... میں ہمیشہ کامیاب رہی ہوں......'' چاندنی نے زعم سے کہا۔

''اور دیکھو زوار شاہ کو یقین آ گیا کہ سب کچھ اصلی ہے......؟''

''وہ بھی ایک ہی بار میں......'' زیب النساء نے بھی اس کا ساتھ دیا تو دونوں ہنسنے لگیں...... اچانک دروازہ کھلا...... محب اللہ اندر داخل ہوئے۔

''سوری میں مخل ہوا......میری گاڑی کی چابی یہیں رہ گئی تھی......'' انہوں نے یک دم چابی اٹھائی اور نکلنے لگے۔

دونوں لمحہ بھر کو خاموش ہوئیں تو محب اللہ ایک لمحے کو رکے، دونوں کو دیکھا پھر نکل گئے۔

''اوہ گاڈ......'' وہ تھوڑا محتاط ہو گئی۔

''یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے......اس خوشی کو بعد میں سیلی بریٹ کرتے ہیں......''

''تم یہاں کیا کرتی ہو......؟''

''میں مارکیٹنگ منیجر ہوں...... بہت لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں...... پھر آرام سے بات کریں گے چلو تم جاؤ......'' چاندنی نے کہا۔

اور پھر وہ کاغذات اور چیک لے کر آ گئی......

چیک اوپن اور ایک بڑی رقم کا تھا...... وہ کاغذات اس نے کھول کر نہیں دیکھے...... اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے خیال میں طلاق نامہ ہی ہو گا......اس نے اس ملاقات کا ذکر اماں اور مہرو سے بھی نہیں کیا۔ زینب نے اس چیک کو کیش کروایا اور زندگی کے مزے لوٹنے لگی...... خاکی لفافہ الماری کی نچلی دراز میں محفوظ رہا۔

کچھ دنوں بعد چاندنی سے ملاقات ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی تھی...... پوچھنے پر بتایا کہ کچھ لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں......اس نے زینب کو بھی ملنے سے منع کر دیا تھا۔ فون پر رابطہ تھا...... نہ اس سے ملاقات ہو رہی تھی...... ماڈلنگ کا دھندا بھی ماند پڑ گیا تھا......

ایک روز ہمت کر کے وہ زوار شاہ کے آفس گئی تو وہ بھیانک خبر سنی کہ چاندنی نے کھڑکی سے کود کر دوسری منزل سے خودکشی کر لی......اور اس کی موت چند لمحوں میں ہو گئی تھی...... وہ دہل کر رہ گئی تھی...... کئی سوالات اس کے اندر تھے مگر جواب نہیں مل رہے تھے اور آج تک نہیں ملے......؟ کیوں کیا اس نے ایسا......؟ وہ تو اپنی بہن روزینہ کو بہت آگے دیکھنا چاہتی تھی...... اور پھر وہ دلبرداشتہ ہو کر اپنے دونوں بچوں کو لے کر پنڈی کے ایک چھوٹے سے علاقے میں آ گئی...... یہاں زندگی اس کے لیے آسان نہیں بلکہ دشوار ترین تھی۔ حسد کی آگ نے اسے جلا ڈالا تھا۔ بچے ساتھ چھوڑ گئے...... گھر نہیں رہا...... اور شوہر پتا نہیں کہاں تھا......؟ حقدار کا مال کھانے والے غاصبوں کا انجام تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ خالہ زینب نے روزی کو شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا تھا۔

''پھر چاندنی کو کس نے قتل کیا ہے......؟'' روزی نے اپنے انتقام کی آگ میں سوچا...... ان کے قصے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی شک یا شبہ زوار یا محب اللہ پر جاتے...... ''پھر قاتل کون ہے......؟'' روزی کے دماغ کی الجھن سلجھ نہ پا رہی تھی۔

موبائل فون پہ اسی وقت مختلف سی ٹون بجی......

''سر......!'' وہ الرٹ ہو گئی...... چارمنٹ صرف خاموشی سے وہ کان لگائے حکم سنتی رہی اور پھر اوکے کہہ کر فون رکھ دیا۔

اسے فوراً اس شہر سے کوچ کرنے کا حکم مل گیا تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ اسپتال سے باہر تھی۔ اس کا سامان اسے راستے میں مل گیا تھا اور اب وہ ائرپورٹ پر تھی...... اپنی فلائٹ کی منتظر...... فلائٹ شیڈول

بورڈ پر اس کی نگاہ پڑی تو ایک اور منظر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

......☆......☆......☆......

روزی کے جانے کے بعد بھی اسپتال کے اس کمرے کا منظر کچھ زیادہ تبدیل نہ ہوا تھا......سوائے اس کے کہ ان کی سانسیں رک، رک کر چل رہی تھیں......

''یا اللہ میں تیرے پاس کس منہ سے آؤں گی۔ میں تو بہت کم ظرف ہوں۔ میں نے تو کبھی برداشت نہیں کیا کہ لوگ تو خوش رہیں اور میں غمزدہ رہوں......میری خوشی تو دوسروں کو برباد کرنے میں تھی......خود کو آباد کرنے میں سبھی کچھ برباد ہو گیا......کس کے صبر سے کتنا کھیلا میں نے......اور کیا صلہ ملا کہ آج کوئی میرے پاس نہیں۔

کاش ایک بار مہر النسا مجھے مل جائے...... میرے سامنے آ جائے۔ میں اس کے قدموں میں خاک ہو جاؤں گی......معافی مانگ لوں گی......وہ معاف کر دے گی اس کا دل بہت کشادہ ہے...... وہ کر دے گی مجھ گنہگار کو معاف......'' وہ بے آواز روتی رہیں، تڑپتی رہیں، سلگتی رہیں پھر منظر بدل گیا...... خاموش کمرے میں اچانک جوتوں کی آواز ابھری......باہر کا شور کمرے میں آنے لگا۔ انہوں نے اپنے سامنے کھڑے افراد کو دیکھا۔

بجھی، بجھی آنکھوں میں آشنائی کے رنگ گہرے ہونے لگے...... اعزاز اور محب اللہ ان کے بیڈ کے نزدیک کھڑے تھے......زوار شاہ باہر بینچ پر بیٹھے تھے۔

''آپ کو زخمی حالت میں جس لڑکی نے یہاں ایڈمٹ کیا تھا......کیا ان کے بارے میں آپ کچھ بتا سکتی ہیں......؟'' اعزاز نے ان کے قریب آتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا۔

''وہ ابھی پندرہ منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہے۔''

''ابھی......''

''راستے میں تو نہیں ملی......'' محب اللہ نے کہا۔

''کوئی فون آیا تھا......میں نے یہ سنا تھا کہ انہیں یہاں سے فوراً جانا ہے......کہاں گئی ہیں یہ مجھے نہیں پتا......آپ ان کے کون ہیں......'' زینب النسا نے کہا۔

''میں زوار شاہ کا دوست ہوں اور اس نے ان کے بیٹے کو مروانے کی کوشش کی ہے......''

''زوار شاہ......وہ کہاں ہیں......؟'' بیتابی سے یہ سن کر زینب النسا کا وجود جیسے تروتازہ ہو گیا......''وہ کہاں ہیں؟ خدا کے لیے آپ ان سے میری ملاقات کروا دیں...... میں ان کی سابقہ بیوی مہر النسا کی بڑی بہن زیب النسا ہوں......''

''کیا......؟'' اعزاز کو ان کی دماغی حالت پہ شک ہوا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں......؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں......زوار کو بلاؤ......'' محب اللہ نے کہا......وہ زیب النسا کو پہچان گئے تھے......''اور فوراً بلاؤ...... ہمارے پاس وقت نہیں ہے......'' اعزاز کمرے سے نکل کر تیز قدموں سے زوار کی طرف بڑھے جو سنگی بینچ پر براجمان تھے۔

''بابا......'' اعزاز نے آواز دی تو زوار شاہ نے ان کی طرف فوراً مڑ کر دیکھا...... اعزاز کی حالت عجیب دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی آنکھیں حیران، چہرہ پریشان اور ماتھا سلوٹوں سے آباد ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اعزاز نے کچھ کہے بنا کمرے کی طرف اشارہ کیا......زوار نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ اور جلدی سے اندر آ گئے اور سوالیہ نظروں سے محب اللہ کو دیکھا۔

''یہ خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں......'' محب اللہ نے انہیں آگے آنے کا اشارہ دیا......

''مجھ سے......'' وہ حیرت سے بڑبڑائے اور ان کے قریب چلے گئے۔

اعزاز خاموش کھڑے ایک نئے دھماکے کے منتظر تھے......ان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ اس ماحول کی یکسانیت سے بچ کر کچھ دنوں کے لیے خوب صورت زندگی کی طرف چلے گئے تھے۔ شمیرہ کو ایک نئی دنیا سے متعارف کروانا کیسا خوب صورت عمل تھا۔ اور جب وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گئی اور زندگی اسے مل گئی تو میرے ساتھ کیا ہوا......؟ اس پر ڈپریشن پھر حملہ آور ہونے

لگی۔ میرے دل نے پہلی بار مجھے احساس دلایا..... محبت کیا ہوتی ہے.....؟ کیسے ہوتی ہے.....؟''

میں کس بازار میں جاؤں محبت ڈھونڈ کر لاؤں؟

وہ محبت کی ادھوری نظم کو خلاؤں میں گھورتے ہوئے مکمل کر رہے تھے۔ کہ زوار شاہ کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی..... وہ جیسے چونک کر حال میں واپس آئے... وہی کمرا تھا مگر منظر بدلا ہوا تھا..... وہ مریض خاتون رو، رو کر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دیں..... میں نے آپ کا گھر تباہ کیا ہے..... آپ کی بیوی فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ اس کے کردار کو داغدار بنانے میں صرف میرا ہاتھ ہے..... میں نے اسے آپ کی نظروں سے گرایا تھا...... وہ تصویریں، آواز کی ریکارڈنگ سب جھوٹی تھیں، سب جھوٹی تھیں.....'' وہ بلک، بلک کر رو رہی تھیں۔

تڑاخ..... ایک دھچکا لگا..... بہت دور تک کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی..... گرد و پیش کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں..... وقت تھم گیا..... سناٹا چھا گیا تھا..... کیا کہہ رہی تھی یہ۔

"I don't believe that"...... اعزاز نے محب اللہ کے منہ سے یہ جملے سنے...... ''مگر کیسے یہ سب؟'' زوار شاہ سن کھڑے تھے۔

''چاندنی ان تمام کاموں میں طاق تھی..... اس نے میری مدد کی تو کام آسان ہو گیا..... سب کچھ ٹھیک تھا..... آپ نے بھی یقین کر لیا..... آپ کا اعتبار مہرو پر سے اٹھ گیا..... مجھے اور کیا چاہیے تھا مگر بالآخر مجھے اس کا صبر کھا گیا..... مہرو مہر و وفا کا پیکر تھی..... سب کچھ سہہ گئی..... تمام تکالیف کا ہنس کر مقابلہ کیا..... میں نے اس کے کردار کو داغدار کیا مگر وہ آج بھی باکردار ہے۔ اس کا کردار اس کا بیٹا ریبال ہے اور میں نے سب کچھ گنوا دیا..... چاندنی کے سہارے کامیابی حاصل کرنا چاہتی تھی..... وہ سہارا بھی سب سے پہلے چھن گیا..... اولاد آوارہ اور نکمی نکلی..... بیٹا جیل میں ہے..... بیٹی اپنی مرضی سے چلی گئی..... شوہر کا پتا نہیں..... معاشی حالات خراب ہو گئے۔ سب ختم ہو گیا اور اب بیماری نے میرا کام تمام کر دیا ہے..... میں نے وہ لفافہ اسے آج تک نہیں دیا..... مگر اس نے کبھی دوسری شادی کا نہ سوچا..... وہ آج بھی آپ کے نام پر بیٹھی ہے..... آپ اسے منا لیجیے..... وہ وفا کا پیکر ہے..... ورنہ میرا خدا مجھے معاف نہیں کرے گا..... مگر آپ ضرور معاف کر دیں..... مہرو سے بھی کہیے گا مجھے معاف کر دے..... مجھے بہت سزا مل چکی ہے..... میں نے اسے بہت تکلیف دی ہے..... بہت تکلیف دی ہے.....'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے بلکتی ہوئی معافی مانگتی ہوئی جیسے بے ہوش ہو گئی تھیں.....

''اُف میرے اللہ..... خون کا رشتہ اور اتنا ظلم..... سنگین ظلم.....'' محب اللہ کا وجود ہل رہا تھا..... ''مہرو بھابی تو ویسے بھی مظلوم ہی تھی..... یہ سب سن کر تو ان کی عزت توقیر اور بڑھ گئی۔''

زوار کے قدم بھاری ہو گئے تھے..... وہ اپنے وجود کو سنبھالے ایک نظر بے ہوش پڑی زینب النسا کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے..... دل کو کسی پل قرار نہ تھا..... اس انکشاف نے ان کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی.....

''وہ میرا دل و نظر تھی..... کیسے دل سے نکل گئی..... اور میری نظر سے گر گئی، میں نے ایک پل کو بھی نہیں سوچا کہ وہ ایسی کیسے ہو سکتی ہے؟'' پچھتاووں کے سمندر میں وہ ڈوب ابھر رہے تھے۔

''کیا تم نے واقعی مہرو کو طلاق دے دی تھی.....؟'' محب اللہ نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....'' وہ سپاٹ لہجے میں بولے..... انہیں اپنی آواز دور سے آتی سنائی دی.....

''تاعمر شکل نہ دیکھنے کی سزا دی تھی۔''

''اور وہ مہر کا چیک بھی تو تھا.....''

''وہ زندگی گزارنے کے لیے دیا تھا.....'' زوار شاہ نے دور کہیں سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معاہدہ کیا تھا اس کے ساتھ میں نے ان کاغذات کے ذریعے..... اور اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی.....

''تم نے میرا نام کہیں اور کسی کے سامنے لیا تو میں

تمہارا بہت برا حشر کروں گا..... تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی.....'' انہیں اپنے الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی.....لہجہ سخت اور سرد تھا۔

اس کی سسکیاں ان کے کانوں میں آج بھی گونجتی تھیں.....کئی باران کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے آنسو اپنی ہتھیلی میں جذب کر لیں.....مگر انہوں نے اپنے اس جذبے کو دبا کر..... بے حس بن کر ردا بیگم کو اپنا لیا.....وہ سوچ میں گم آگے بڑھ رہے تھے..... اعزاز سے بھی بے نیاز کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

تب ہی ان کے پیچھے سے دوڑتے قدموں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ''ایکسکیوزمی.....وہ.....وہ..... خاتون..وہ خاتون مرگئی ہیں..... کیا آپ ان کے کسی وارث کو جانتے ہیں.....ہم ڈیڈ باڈی ایسے ہی کسی کے حوالے نہیں کر سکتے.....''

وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے چلی گئی.....دکھ میں سب گرفتار ہو گئے۔

''اوکے، یہ ذمے داری میں لیتا ہوں، آپ چلیں.....'' زوار اس کے ساتھ استقبالیہ کی جانب بڑھ گئے تھے.....زیب النسا کے سفر کا آخری مرحلہ تھا.....جو ان کے حصے میں آیا۔

'' یہ ہے انسان.....اپنے مفاد کی خاطر دوسرے کو تباہ کر دیا..... کیا ملا.....؟ آج مٹی کے اوپر اور کل مٹی کے نیچے.....''

''اور میں ہار گیا مہرو..... جدائی کے طویل راستے اور محبت کی شدت.....کیا میں ان زیادتیوں کی تلافی کبھی کر سکوں گا.....جو میں نے اپنے اور تمہارے درمیان روا رکھی.....'' سوچوں ہی سوچوں میں مہر النسا سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے زیب النسا کے سارے واجبات ادا کر دیے۔

روزی کی تلاش میں زیب النسا کی موت آڑے آ گئی..... اور تلاش لا حاصل رہی..... پولیس اور ایف آئی اے کے اہلکار الرٹ تھے..... مگر وہ کہاں تھی..... زمین کھا گئی یا آسمان.....؟ سارے راستے اس نے اپنے حق میں بند کر دیے تھے.....

.....☆.....☆.....☆.....

جگنو بھونرے کھلتی بگیا سب میں اس کے روپ
اس کی برکھا اس کی چھاؤں اس کی ہر جا دھوپ
پوجا اس کی جانیو جس کو انسانوں سے پیار
ورنہ ہو تو لاکھ برس کی پوجا ہے بیکار
سادھو بھائی اس دنیا میں سب سے ملتے جا
جانے کون سے بھیس ماں بگلے تاں کو ملے خدا

زیب النسا مٹی کا رزق بن چکی تھی.....مہر النسا کو اطلاع دینا بے سود تھا.....وہ سمندر پار تھی۔ اپنے بیٹے کی کامیابی کے جشن میں مگن.....اس کا ہونا ربیال کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا.....صرف بیس دنوں کے لیے مہر النسا کو اجازت ملی تھی اور یہ بیس دن ربیال کی زندگی کے کامیاب، اہم ترین دن تھے.....

اس کی خوشی کا ہر لمحہ جاگتے گزر رہا تھا..... ماں بھی کتنی بڑی، حسین اور انمول نعمت ہے.....وہ اس تصور سے ہی خود کو بہلا رہا تھا کہ جب کانووکیشن میں اپنی ماں کے سامنے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے گا تو ماں کو کتنا فخر ہوگا..... اس پر وہ اکثر بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگتا۔

اور جہاں نور اس کی ایک، ایک حرکت کو نوٹ کرتی.....اور چھیڑتے ہوئے کہتی۔

''میرا خیال ہے امی تمہارے منہ میں نوالہ ڈال رہی ہیں..... اس لیے تم مسکرا رہے ہو، ہے ناں ربیال.....؟'' اور وہ جھینپ جاتا..... یوں ہی انتظار کی کیفیت سے گزرتے ہوئے وہ دن آپہنچا..... جب وہ ہیمبرگ کے Helmut Schnidt Flughafer ائرپورٹ پہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ان کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا..... جہاں نور کافی شاپ سے کافی لینے چلی گئی تھی۔

جرمن قوم بھی اپنی ثقافت اور تہذیب کی عکاس ہوتی ہے..... ائرپورٹ کی پینجر لابی بھی ائرپورٹ کی طرح چمکتی ہوئی تھی..... چھوٹے، چھوٹے کیبن، کافی شاپ، ریسٹورنٹ، بک شاپ سب ہی کچھ سلیقے سے

آراستہ تھا...... جرمن محنتی ہونے کے ساتھ، ساتھ بہت بااخلاق بھی ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں ریبال نے محسوس کیا تھا کہ ان کا مطالعے کا رجحان بہت وسیع ہوتا ہے..... دنیا بھر کی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ اور تحقیقی مقالات بھی شائع ہوتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی نمائش یہاں جرمنی میں ہوتی ہے۔ جب ہی تو ہائیڈل برگ سٹی میں ایک گلی علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے۔

میں امی کو ہائیڈل برگ ضرور لے کر جاؤں گا جو Hilly area ہے۔ امی بہت خوش ہوں گی وہاں جا کر انہیں علامہ اقبال سے ویسے بھی بہت عقیدت ہے۔ کتنے اشعار تو ان کو زبانی یاد تھے۔ وہ سوچوں میں گم اپنی والدہ کے لیے جانے کون کون سے پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جہاں نور اس سے تین فٹ کے فاصلے پر کافی شاپ سے کافی لینے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے پلٹ کر یونہی ریبال کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں گم دکھائی دیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرادی۔ ''ماں کا انتظار ہے۔'' اور پھر اس کی طرف بڑھ گئی کافی کے مگ کے لیے۔

بھاپ اڑاتی Choco Coffee کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ اپنے خیالات کی دنیا سے واپس آ گیا۔ ریشمی عبایا پہنے وہ ہاتھوں میں کافی کے مگ لیے کھڑی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ.....'' وہ کافی کا لطف لینے لگا۔

جہاں نور نے اس کی طرف دیکھا، وہ بہت خوش اور آسودہ دکھائی دے رہا تھا۔

''بہت خوش ہو..... ہے ناں......!''

''ہاں.....بہت.....'' وہ بہت جوش وخروش سے بولا۔

''مجھے پتا ہے، تم اپنی امی کے لیے پلاننگ کر رہے تھے کہ میں انہیں یہاں لے کر جاؤں گا وہاں گھماؤں گا، ہے ناں؟''

''رئیلی مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟'' وہ حیرت میں پڑ گیا۔

''یہ راز کی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ویسے آنٹی کے لیے میں نے بھی بہت کچھ سوچا ہے۔''

''کیا.....؟''

''میں انہیں یہاں کے sea points دکھاؤں گی۔ جو تم نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

''یہاں سمندر ہے.....؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''تم تو اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو کر دیا میں نے تمہیں پانی، پانی یا تمہاری میموری کہیں چلی گئی ہے خیر جانے دو۔'' وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔ ''میں انہیں ریسٹورنٹ لے کر جاؤں گی اور مزے کے کھانے کھلاؤں گی۔''

''معاف کردو.....'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''حلال ریسٹورنٹ تلاش کرنا پڑے گا۔''

''مجھ سے زیادہ جانتے ہو اس جگہ کے بارے میں۔'' وہ اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے بولی۔ ''میں یہاں رہتی ہوں یا تم.....'' وہ چڑ کر بولی، لہجے میں خفگی تھی۔

''سوری میڈم۔'' وہ معصومیت سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

جہاں نور کی ساری خفگی ختم ہوگئی، وہ ایسا پہلے کب تھا یہ انداز، یہ شوخی اس کے لیے بالکل جدا تھی..... وہ اس کی طرف بے ارادہ دیکھے گئی۔

''ہیلو.....کیا ہوا.....؟'' اس نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر بولی۔

''امی کو..... میرا مطلب ہے آنٹی کو یہاں حلال ترکش ریسٹورنٹ لے جائیں گے اور پاکستانی ریسٹورنٹ Baloch اور Balochistan کی بھی دو برانچز ہیں وہاں ہر کھانا کھلایا جاسکتا ہے۔''

''اوکے..... اوکے۔'' ریبال نے اس کو روکا اور اسکرین کی طرف دیکھا۔ جہاز لینڈ ہو رہا تھا، ان کے باہر نکلنے میں کم از کم آدھ پون گھنٹا ضرور تھا۔

''میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔'' وہ اچھی خاصی اردو بولنے لگی تھی۔ ریبال نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''ہاں پلیز.....!''

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی حلال ریسٹورنٹ کے علاوہ ہم انہیں Internationally Famous ایک ہوٹل ہے، اٹلانٹک وہاں بھی لے جاسکتے ہیں اور Alster بھی جائیں گے جو پانی پر بنا ہوا ہے۔ کچھ یاد آیا تمہیں؟'' جہاں نور نے اسے یاد دلایا جب وہ جینی تھی۔ ریبال کی آنکھوں میں وہ یاد لہرائی۔ ''اس کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں، پاکستان میں جس طرح مہنگی فوڈ اسٹریٹس ہیں۔ یہاں بھی ہیں اسی علاقے میں جہاں تم رہتے ہو۔ یہاں پر بھی بہت اچھی فوڈ اسٹریٹ موجود ہے۔''

''اُف، تم کتنا بولتی ہو۔ میری امی اتنا کچھ نہیں کھا سکتیں۔ وہ بہت سادہ مزاج ہیں۔ سادہ کھانا کھاتی ہیں۔ سمجھیں جہاں نور بیگم اور پلیز مجھ میں ہمت نہیں ہے اتنے ریسٹورنٹس کے بارے میں سننے کی، ہم بہت فقیر لوگ ہیں جہاں نور بیگم ہمیں اپنی چادر میں رہنے دو۔'' وہ بے رخی سے بولا۔

''ہیں......'' وہ ہکا بکا ہوگئی۔ ''کیا مطلب......؟''

''اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلانا میری امی کو وہ پسند آئے گا! او کے۔''

''او کے۔'' وہ خوشی اور ناسمجھی میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

''چلو اس طرف چلتے ہیں۔ فلائٹ آگئی ہے، مسافر آرہے ہیں۔'' وہ تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ وہ بھی ریبال کے ساتھ ہر خاتون میں ریبال کی امی کو ڈھونڈتی رہی۔

''امی، امی، وہ رہیں امی......'' وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے تعاقب میں جہاں نور نے اس سمت کو دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں ملبوس سر پہ اسی رنگ کا جارجٹ کا دوپٹا لیے اور کاندھوں پر میرون اور آف وہائٹ کمبی نیشن کی شال لیے، وہ مہرالنسا بیگم تھیں۔ ریبال کی والدہ، باوقار اور سادہ خاتون۔ وہ ریبال کو دیکھ کر آگے بڑھیں اور اس کے گلے لگ گئیں۔ ایئرپورٹ پہ یوں تو ملنے والے تڑپ کر ہی ملتے ہیں اور اشکبار آنکھوں سے استقبال بھی کرتے ہیں اور خدا حافظ بھی کہتے ہیں مگر ریبال کے لیے دنیا میں صرف ایک ہی ہستی ایسی تھی اور وہ تھی اس کی ماں......اس کی کل کائنات۔ وہ دیوانوں کی طرح انہیں دیکھے جارہا تھا جیسے یقین نہ آرہا ہو۔ انہوں نے ریبال کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور آنکھوں سے آنسو گرتے رہے پھر مسکراتے ہوئے اسے اطراف کے ماحول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے لے آئیں۔

اتنا جینئس مین مگر ماں کے آگے ایک معصوم بچہ لگ رہا تھا۔ جیسے میلے میں ان سے کھو گیا تھا اور اب ان کا ہاتھ پکڑے انہیں کندھے سے لگائے وہ لوگوں کے ہجوم سے ذرا آگے آگیا۔ وہ اپنی دُھن میں ماں سے باتیں کرتا ایک لمحے کو رکا، مڑا اور پھر کہا۔

''اوہ امی، ٹھہریں۔'' جہاں نور کو تلاشنے لگا۔

''یہیں تو تھی، کہاں ہے؟''

وہ اس کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا...... امی بھی اس کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''کون بیٹا، کس کو دیکھ رہے ہو؟''

''السلام علیکم......! میں یہاں ہوں۔'' وہ مہرالنسا بیگم کے سامنے آتی ہوئی بولی تو مہرالنسا نے دراز قد، ریشمی عبایا میں ملبوس خوب صورت دوشیزہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے آپ کے بیٹے کے کردار کو دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے۔ اور میرا نام جہاں نور ہے۔'' وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی تو مہرالنسا بیگم نے اسے گلے لگالیا۔ انہیں جہاں نور بہت اچھی لگی تھی۔

''اور آپ میرے ساتھ رہیں گی۔'' وہ بہت مان سے بولی اور ان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگی، مکمل استحقاق کے ساتھ۔

......☆......☆......☆......

"when you focus on problems
you will have more problems
but
when you focus on possibilities
you will have more"

وہ اس مقولے پر پورا اتر رہی تھی۔

آج اس کا شہر میں آخری دن تھا...... جہاز پرواز کے لیے تیار تھا......اس کا کام ہو چکا تھا...... ہر جگہ پر اس نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے...... وہ چاندنی نہیں تھی جو دل کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر چلتی......

اس نے ہمیشہ مسائل اور مشکلات کو نفرت سے دیکھا......اور اپنے پُراعتماد انداز کے ساتھ ہر جگہ اپنی

پہچان بنائی منفی انداز کے باوجود "be positive" بن کر کامیابی حاصل کی......

لوگوں کی نفسیات سے کھیلنا، مہرہ بنا کر بساط پلٹ دینا اس کے لیے بالکل مشکل نہ تھا......

ان احکامات پہ کام کیا جہاں کامیابی اس کے قدم چومتی مگر افسوس کا لمحہ پیدا ہو ہی جاتا ہے...... چاندنی کے قاتلوں کا پتا چل ہی نہ سکا...... یہ پہلی شکست اسے کھائے جا رہی تھی......اس کی جان سے عزیز بہن آج زندہ ہوتی تو حالات ہی کچھ اور ہوتے...... جب اسے چاندنی کی موت کی خبر دی گئی تو وہ سکتے میں آ گئی تھی...... وہ کیسے زندگی کی طرف واپس آئی اسے کچھ احساس نہ تھا......اس وقت وہ سولہ سال کی ہو چکی تھی...... جب اس نے اے لیول کرلیا تھا اور چاندنی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مزید تعلیم کے لیے اسے بیرون ملک بھیجے گی...... مگر سارے خواب بکھر گئے تھے......اس کی موت نے مفلسی کی چادر دراز کر دی تھی...... تب ایک دن چاندنی کے باس آئے اور اسے پُرکشش معاوضے کی پیشکش کی اور یہ بھی کہا کہ اگر چاندنی کی موت کا انتقام لینا ہے تو ہمارے گروپ کا حصہ بننا ہوگا اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر انہیں جوائن کرلیا......غلط کام، غلط لوگ......اس نے کچھ نہیں دیکھا......اپنی بہن کی موت کے غم میں وہ انتقام کی آگ میں جھلستی رہی......اور وقت نے اسے روزینہ سے روزی بنا دیا۔

پاکستان آنے کے بعد حالات کچھ موافق ہوئے اور اس نے زوار گروپ کو جوائن کیا......منشیات کی سپلائی یونیورسٹی اور کالجز میں بہت منظم طریقے سے اس کے زیرِ نگرانی ہوتی رہی...... بگ باس نے جو تصویریں اسے میل کی تھیں۔ وہ زوار شاہ اور محب اللہ کی تھیں......اصل قاتل کون ہے یہ پتا لگانا مشکل نہ تھا...... فیضان شاہ کو ٹریپ کرنا۔ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا...... جی پی ایس ٹریسر کے ذریعے لمحہ، لمحہ کی خبر ملتی رہی......''زوار کی بیوی کو مروا دیا، فیضان کو نشے کا عادی بنا دیا۔'' تمام داؤ پیچ آزما کے راز کھلنے والا تھا کہ واپسی کا حکم نامہ مل گیا......اور وہ واپس سنگاپور آ گئی تھی......تب ایک روز بم کی طرح چاندنی کی موت کا راز کھل گیا...... بگ باس نے سرد مہری سے کہا۔ ''نو پرابلم روزی...... تم اس لیے کامیاب ہو کہ تم دل کی جگہ دماغ رکھتی ہو......اور تمہاری بہن دل کے چکر میں آ کر کمزور پڑ گئی تھی...... اگر وہ خودکشی نہ کرتی تو اوپر والے مار دیتے......وہ بیوقوف تھی۔''

''چاندنی نے خودکشی کی تھی......؟'' حیرتوں کے جھٹکے اس کے وجود کو ہلا گئے...... مگر یہ سب کچھ ہی دیر کے لیے تھا......اس نے خود کو نارمل کیا......اسے سارا گیم سمجھ آ گیا تھا...... وہ ایک سفر کے لیے جپسی بن کر روانہ ہوگئی......سزا اور جیل اس کے لیے نہ تھے......اور قصاص کے معنوں سے وہ کوسوں دور تھی......

......☆......☆......☆......

بدلتے موسم کی رُت ہے
میدانوں میں اندھیرا ہے
وہ سامنے اونچی کرسی کے مکانوں کی نیم روشنی میں
دروازوں کے باہر کھڑے
لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں
گزرے ہوئے دنوں کی
آنے والے ماہ و سال کی
کچھ پتا نہیں چلتا
بس دور سے ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے ہیں
دور دیس سے منظر بدل جاتا ہے

''فیضان شاہ ہنوز اسی صورت میں ہے......'' زوار شاہ، محب اللہ اور اعزاز شاہ اسپتال کی لابی میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔

سب کے ذہنوں میں الگ، الگ کہانیاں گردش کر رہی تھیں۔

محب اللہ، روزی کے چھلاوا ہونے سے بے حد پریشان تھے...... مسلسل آٹھ گھنٹے کی پولیس کی بھرپور کوششوں کے باوجود وہ کہیں سے دستیاب نہ ہوئی...... البتہ اس کے خلاف بہت سے ثبوت سامنے آگئے تھے...... وہ منشیات فروخت کرنے والے بڑے گینگ سے وابستہ تھی۔

تمام تعلیمی اداروں میں یہ سپلائی بہ آسانی ہو رہی تھی...... اور برانڈ ایمبیسڈر کا ٹیگ لگا کر مختلف ممالک میں کیش رقم بہت سلیقے سے سپلائی ہو رہی تھی۔ ایجنسیاں جیسے بے بس تھیں...... اعزاز شاہ نے روزی کے فوٹو گراف اور تفصیلات ایجنسیوں کو میل کر دیے تھے۔

اس افراتفری میں ابھی تک ردا بیگم کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا...... پے در پے انکشافات اور صدموں نے سب کے ذہن ماؤف کر دیے تھے...... کوئی کسی سے نظریں ملا کر بات نہیں کر رہا تھا سب گم تھے یا کسی خبر کے منتظر تھے۔

محب اللہ نے چاندنی کو چاہا تھا...... اسے پانے کے لیے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی تھی...... وہ دل سے گھر بسانا چاہتی تھی مگر جن راہوں پر وہ تھی...... وہ کانٹے اسے کبھی خود سے جدا نہ کرتے...... محب اللہ دل شکستہ ہو کر یہاں سے چلے گئے تھے باہر اور زندگی بھر شادی نہیں کی۔ زوار کے کاروبار کو سنبھالتے رہے اور اب ایک عرصے بعد واپسی ہوئی تو لگا کہ وقت پر لگا کر پیچھے کی طرف چلا گیا ہے...... سب بے سود ہوا۔

روزی نے ان کا بہت نقصان کیا تھا...... کاروبار، مراسم اور اولاد سب کو اپنے حساب سے چلا رہی تھی...... اعزاز پہ ہاتھ شاید اس لیے نہیں ڈال سکی کہ اس کی ماں کی ماں کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں...... مگر وانیہ کو اس نے بری طرح ٹریپ کر کے بالآخر علیحدہ کر دیا تھا...... گھر تڑوانے میں تو کامیاب ہو گئی تھی۔

''اُف......'' زوار شاہ نے کراہ کر سوچا۔

سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے کہ اپنے، اپنے غم کو پھر سے اپنے اندر سمیٹ لیں۔

''میں نے ان کے اندر ممتا دیکھی تھی...... میرا دل چاہتا تھا مہرالنسا آنٹی میری ماں ہوتیں تو میں کتنا خوش نصیب ہوتا۔'' اعزاز شاہ، مہرالنسا بیگم کے بارے میں سوچنے لگے۔ ''مجھے ریبال پہ کتنا رشک آتا تھا...... ایک ایسی محبت اور پیار مجھے ان سے ملا جو میری سمجھ سے باہر تھا...... بابا نے اتنی نیک خاتون کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟...... مجھ میں اور بابا میں یہی تو فرق ہے کہ میں وانیہ جیسی عورت کو برداشت کر گیا...... اور بابا کمزور لمحوں کا شکار ہو گئے، کاش یہ افراتفری جلدی ختم ہو جائے سارے حالات جلد سے جلد بہتر ہو جائیں......'' اعزاز نے شدت سے دعا کی۔

''فیضان صحت یاب ہو جائے...... تو پھر میں خود مہرالنسا امی کو مناؤں گا...... وہ بابا کو معاف کر دیں گی......'' پھر اس کا ذہن تشمیرہ کی طرف چلا گیا۔

''نہ جانے تشمیرہ کیسی ہے......؟ وہ مجھے بھول گئی تو نہیں......'' ان کے اندر وہم نے سر اٹھایا۔

''نہیں......'' ایک صدا نے احساس دلایا۔

''ریبال میرا بھائی ہے......؟'' وہ مان سے سوچ گئے...... ایک سرخوشی کا احساس سر اٹھانے لگا...... ''انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس کچہری کے چکر بھی ختم ہو جائیں گے۔'' اور اسی لمحے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی...... تینوں اپنی سوچوں سے باہر نکلے...... سامنے دو پولیس آفیسرز کھڑے تھے۔

''جی آفیسر...... روزی کی کوئی خبر ملی......؟'' زوار شاہ نے پوچھا۔

''زوار صاحب...... روزی کی تلاش جاری ہے مگر آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔''

''کیا......؟ سب کچھ تو داؤ پہ لگ گیا اب اس سے بری خبر کیا ہو سکتی ہے......؟'' محب اللہ نے سوچا۔

''مجھے افسوس ہے سر...... آپ کی مرسڈیز گھر

سے جب نکلی جس میں آپ کی بیگم بیٹھی تھیں...... حملہ آوروں نے انہیں آپ کی گلی ہی میں شدید فائرنگ کر کے ماردیا ہے...... آپ کا چوکیدار آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا تھا...... اسے بھی گولیاں لگی ہیں وہ شدید زخمی ہے......اس کے بیان پر ہی آپ کو اطلاع دی ہے...... میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں سر...... ان حملہ آوروں کی تلاش جاری ہے۔"

وہ سر جھکا کر سب بتا رہا تھا...... اور خاموشی کے کتنے لمحے گزر گئے......

"یا خدا......! ہم پر رحم کر۔"

زوار شاہ کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں...... آگ لگا دیں ہر طرف...... اعزاز تیزی سے لابی سے نکل کر بھاگے...... محب اللہ نے انہیں جلدی سے پکڑ کر قابو کیا۔

"ہوش میں آؤ اعزاز...... صبر کرو میرے بچے...... یہ خون اتنا ارزاں نہیں ہے...... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے...... بہت جلد حساب ہوگا......" وہ کسی نہ کسی طرح اعزاز کو روکنے میں کامیاب ہو گئے...... ورنہ وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔

وہ اعزاز کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہوئے...... اعزاز شاہ کی آنکھوں میں وحشت اتری ہوئی تھی...... وہ حال سے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ "یا اللہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے...... رحم فرما...... رحم......!" وہ گڑگڑا کر اللہ کے حضور دعا کر رہے تھے۔

"میرے مالک کس گناہ کی سزا ہے...... میں زندہ ہوں...... اور میرے پیارے یہ سب بھگت رہے ہیں......" زوار شاہ جیسا مضبوط آدمی حالات کے اس رخ پر بکھر اجا رہا تھا...... کیا یہ سب سہنا مقدر تھا......؟

......☆......☆......☆......

ایک صورت دل میں سمائی ہے
ایک شکل ہمیں پھر بھائی ہے
ہم آج بہت سرشار سہی
پر اگلا موڑ جدائی ہے

اسکرین پر ایک پُرکشش شخصیت کا چہرہ نمایاں تھا...... گھنی مونچھیں، مسکراتے لب، ذہین اور چمکدار آنکھیں لیے تشمیرہ سے ہم کلام تھا۔

وہ پیار اور محبت سے اس کو منا رہا تھا...... اس کی وہ ساری باتیں اسے یاد دلا رہا تھا...... جو اس کی ڈائری میں قید تھیں۔

"اسے میری ڈائری کی باتیں کیسے معلوم......؟ یہ اتنا مجھے کیسے جانتا ہے......؟"

وہ حیرتوں کے سمندر میں غرق ہوتی تو کم نہ تھا...... اس نے جلدی سے ایک اور سی ڈی لگائی۔

"اُف اعزاز شاہ کیا کمال کا جادوگر ہے...... اس کے سامنے تو پتھر بھی بول پڑے کتنی خوب صورت باتیں کرتا ہے......" وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے اسے دیکھتی رہی......

"میرے لیے اس کے لہجے میں اتنا پیار کیوں ہے؟ اور یہ اکیلا مجھ سے بات کر رہا ہے......" وہ اعزاز شاہ کی ایک، ایک حرکت کو دیکھ رہی تھی...... ایک، ایک لفظ سن رہی تھی۔

اور اس وقت اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں...... جب اعزاز شاہ نے اس کے ہاتھوں کی vibratin کو محسوس کیا تو اس کے چہرے پہ خوشی کے آثار نمایاں تھے...... جیسے کسی جیت کا احساس ہو...... کیمرا اعزاز شاہ کے فیس ایکسپریشن دکھا رہا تھا...... جو اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا...... تشمیرہ نے لاشعوری طور پر سہی...... ایک اجنبی مرد کے لمس کو محسوس کیا اور یہ اس کی قوتِ مدافعت اور اعزاز شاہ کی پہلی کامیابی تھی...... اس نے مڑ کر کسی کو دیکھا تھا...... شاید یہ ڈاکٹر راحیل ہوں...... پھر کیمرا بیڈ پر لیٹی ہوئی تشمیرہ کو دکھانے لگا...... جو بالکل بے سدھ لیٹی تھی...... بے حس و بے حرکت۔

"میں ایسی ہو گئی تھی...... کیوں......؟" اسے بہت عجیب لگا۔

"نو...... ان باتوں کو نہیں سوچنا ہے...... بس آگے دیکھنا ہے۔"

''او کے......!'' وہ مسکرائی......اور اسی پل......
''تشمیرہ باجی اکیلے، اکیلے یوں کیوں آپ ہنس رہی ہو...... مجھ کو بھی شامل کرلو......'' مینا...... دھپ، دھپ کرتی چال کے ساتھ اندر آگئی......اور تشمیرہ کے ساتھ اسکرین کو دیکھ کے خود بھی ہنسنے لگی۔
''باجی آپ تو بالکل مست ہوگئی ہیں...... دیکھیں...... وہ جو صاحب ہیں ناں...... جن کا نام بڑا معزز سا ہے......'' وہ اٹک کر بولی...... ''یعنی اعزاز......''
وہ نام کو کھینچ کر بولی......انہوں نے جی......'' وہ ہاتھ کے اشارے سے وہ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
''بہت پیارے صاحب ہیں یہ...... انہوں نے ڈاکٹروں سے بڑھ کر آپ کی خدمت کی ہے...... آپ کے بارے میں مجھ سے ایک، ایک بات پوچھ رہے تھے...... آپ کو کیا پسند ہے کیا، نہیں...... پھول، پودے آپ کے سارے گملے، ان کے نام، آپ کی کتابیں...... اور جی باجی جی...... آپ کی یہ ڈائری بھی میں نے دی تھی...... دیکھیں جی آج آپ ہمارے پاس ہیں......'' وہ خوش ہوکر تشمیرہ کے ہاتھوں کو چھونے لگی...... اس کی محبت بھری باتوں پہ تشمیرہ کا دل خوش ہونے لگا۔
''تم خود بہت اچھی ہو مینا...... اسی لیے میں تمہیں اچھی لگتی ہوں......''
''تشمیرہ باجی جی...... آپ کے تایا کی تو یہ اتنی عزت کرتے ہیں جیسے ان ہی کے بیٹے ہوں...... فرشتہ ہیں جی فرشتہ اعزاز صاحب...... تایا جی کے مددگار تھے یہ......'' پھر افسردہ لہجے میں بولی...... ''بیچارے کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں...... ان کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے ناں......! ورنہ تو وہ آپ کے ساتھ ہر پل تھے...... تایا جی کہتے ہیں...... وہ اپنے دفتر بھی نہیں جاتے تھے...... آپ کی فائل پر کام کررہے تھے......'' مینا ڈاکٹر کی رپورٹ کے متعلق بات کررہی تھی...... اب اس کا رکنا بہت مشکل تھا...... وہ بے اختیار ہنس دی۔
''اچھا بابا...... اعزاز نامہ بند کرو اور میرے لیے اچھی سی چائے بنالاؤ...... چینی کم ڈالنا......''
''اچھا جی۔'' اور چینی کے ذکر پر وہ ہنس دی۔
''مینا...... تم بھی ناں...... اب کیا ہوا......؟''
''کچھ نہیں جی......'' وہ تائی کا نام لینا نہیں چاہتی تھی......اس لیے ہنستے ہوئے چلی گئی۔
''بی بی کو ایسی باتیں یاد مت دلانا......'' ڈاکٹر راحیل کی ہدایات یاد آئیں۔
''اس کو کیا ہوا......؟'' وہ حیرت سے بڑبڑائی...... پھر سر جھٹک کر آخری سی ڈی کو لگانے لگی......'' تو اعزاز صاحب نے خاصا ہوم ورک کیا ہے میرے اوپر...... اتنا ریسرچ ورک تو میں نے اپنے ماسٹرز کے پراجیکٹ پہ نہیں کیا...... میری سبز رنگ کی ڈائری بھی استعمال ہوئی ہے......'' یہ آخری سی ڈی تھی......علاج کا آخری ہتھیار۔
سائیکو اینالسٹ کا کامیاب وار اس نے کیا تھا......
تمام محرومیاں سامنے لاکر اسے ایک اور زندگی کا انعام پھر دیا گیا تھا...... ریال کا نام بھی اعزاز شاہ نے لیا تھا...... اور وہ جو کمزور سے اعصاب کی مالک تھی...... اس وقت خاصی مضبوط اعصاب کی مالک دکھائی دے رہی تھی۔
اس کے بچپن کی محرومیوں کی داستان اور پھر تشمیرہ کو اس کا احساس دلا کر شعور میں لانا...... فاطر کی موت کے صدمے سے زندگی کی طرف بڑھانا......اور پھر اس کا چیخ مار کر...... احتجاج کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنا کہ وہ ایسی نہیں ہے...... وہ بے قصور ہے...... نہیں ہے وہ ایسی......اور بالآخر علاج کارگر ثابت ہوگیا۔
اس نے ریموٹ سے اسٹاپ کا بٹن دبانے کے بجائے...... اعزاز کی ویڈیو ایک لمحہ کو Still کردی......
اس نے اعزاز شاہ کو احسان مندی کے احساس سے دیکھا۔
''کیا اس شخص کا احسان میں ساری زندگی اتار پاؤں گی......؟ کاش میں اس کے کسی کام آسکوں......؟''
وہ گھٹنوں میں سر جھکا کے سوچنے لگی...... ''انسان اللہ کی کن، کن نعمتوں کی شکر گزاری کرے...... ہر انسان فاطر نہیں ہوتا...... اللہ تعالیٰ امتحان سے گزارتے ہیں...... میں تو ایک طویل مسافت طے کرکے آئی...... یا اللہ تیرا

شکر ہے...... ''کاش میں اس کے کچھ کام آسکوں۔
وہ احساسِ تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر نہ جانے کتنی دیر اسی عالم میں رہی...... اسکرین پہ اعزاز شاہ کی تصویر ہینگ ہو گئی تھی...... مینا نے اس کو یوں گم صم بیٹھے دیکھا تو گھبرا کر تایا جی کو بلا لائی...... وہ گھبرائے ہوئے دوڑے چلے آئے...... ان کی سانس پھولنے لگی تھی......
''تشمیرہ بیٹی کیا ہوا......؟ اس طرح کیوں بیٹھی ہو......؟'' وہ واقعی پریشان ہونے لگے تھے...... تایا جی کی آواز سن کر تشمیرہ نے سر اٹھایا تو ان کی جان میں جان آئی...... وہ سمجھ گئی مینا کی حرکت ہے یہ......
''میں بالکل ٹھیک ہوں تایا جی......'' وہ اشکبار آنکھوں سے تایا جی کے شانے سے لگتے ہوئے کہنے لگی۔
''میں آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں تایا جی......''
پھر وہ اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی......
''کیسے اترے گا یہ احسان...... کیا کروں میں......؟''
''ارے میری بیٹی...... یہ سب محبتوں کے گلاب ہیں...... اور اعزاز بڑا پیارا بچہ ہے...... اسے اللہ نے ہماری مدد کے لیے ہی بھیجا تھا خیر اگر میں اس کی تعریف کرنے لگ گیا تو ڈائری کی ضرورت پڑے گی...... بس اب تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو...... تا کہ اس منصوبے پہ کام کیا جائے......''
''میں بتاؤں جی......'' مینا نے اتنا ہاتھ اٹھایا۔
''تمہیں...... کیسے پتا کہ تمہاری تشمیرہ بی بی کیا کرنا چاہتی ہیں......'' وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر شفقت سے پوچھ رہے تھے...... مینا کی گول، گول آنکھیں چمکنے لگیں۔
''تشمیرہ باجی کو تو پڑھنے کا بہت شوق ہے جی...... اور نوکری کرنے کا بھی بہت شوق ہے...... آپ ان کو اجازت دے دیں جی......'' وہ اپنی دانست میں بہت ہوشیاری کی بات کر گئی۔
''واہ بھئی...... مینا کو تو سب پتا ہے......'' پھر وہ تشمیرہ کی طرف مڑے...... ''اپنا ادھورا ماسٹرز مکمل کرو...... اور پھر جو چاہے کرو...... کوئی رکاوٹ نہیں...... میں اپنی بیٹی کو بس خوش دیکھنا چاہتا ہوں......'' وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
''میں بھی آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں تایا جی...... مجھے معلوم ہے آپ تائی جی کا ذکر میرے سامنے نہیں کرتے مگر میں ایک روز ان کو واپس اس گھر میں ضرور لاؤں گی......'' فیصلہ کُن لہجے میں سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔
تایا جی جا چکے تھے...... مینا اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرا صاف کرنے لگی اور اس کی نگاہ اعزاز کے دیے ہوئے گلدستے پر ٹھہر گئی اور وہ گل دستے میں جیسے قید ہو گئی تھی۔

......☆......☆......☆......

محبت دل کی مٹی میں اگا سرسبز برگد ہے
محبت اسمِ اعظم ہے محبت ظرفِ انسانی
محبت لہجہ ربی، محبت عہدِ آسمانی
محبت لفظ ''کُن'' کا کارنامہ ہے

اوائل نومبر کا دودھیا پن ہیمبرگ میں چھایا ہوا تھا...... گزشتہ رات ہونے والی بارش سے سڑکیں مزید نکھر گئی تھیں...... ہیمبرگ میں درختوں کے درمیان گھیرے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے علاقے میں یہ سات منزلہ عمارت تھی...... کیب پارکنگ ایریا میں رکی تو جہاں نور نے کار کا دروازہ کھول کر مہرالنسا کو احترام سے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے ساتھ ہی سہارا دیا......
فرسٹ فلور پہ جہاں نور کا اپارٹمنٹ تھا...... ریبال سوٹ کیس تھامے پیچھے آرہا تھا۔
اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا تو بائیں جانب ہی چھت پہ نصب ایک ہک سے لٹکا ہوا بہت دیدہ زیب صورت ساؤنڈ ٹائم کا استقبالیہ منظر اچھا لگا...... جو پانچ فٹ سے زیادہ لمبا تھا...... گولڈن گرے پلیٹ تھی...... اور لڑیاں لٹک رہی تھیں...... یوں محسوس ہوا تھا...... جیسے کوئی جادوئی کھلونا لٹکا ہو۔
جہاں نور نے ہولے سے لڑی کو چھوا تو لڑیوں کے بیچ اسٹک سے ٹکرائی اور ایک مسحور سی دُھن بج اٹھی۔
خوب صورت الفاظ گولڈن پلیٹ پہ انگریزی میں کندا تھے...... (جس کا اردو ترجمہ یہ ہے)

انسان جب اچھا سوچتا ہے تو اللہ خود
ہی راستے بنا دیتا ہے اور
مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں......

انہوں نے مسکراتے ہوئے موٗمی چہرے والی لڑکی کی طرف دیکھا...... جس کے مسکراتے چہرے پر نور کا ہالہ تھا...... وہ قدم قدم رکھتی...... اس کے ہمراہ اندر چلی آئیں...... ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں اس نے انہیں ایک سنگل بیڈ پہ بٹھا دیا...... صاف ستھری خوب صورت چادر اس پہ بچھی تھی...... سامنے دیوار کے ساتھ لگی کارنر ٹیبل سے پہلے ایک چھوٹا سا بک شیلف تھا...... جس پر مختلف کتابوں کی جلدیں رکھی تھیں...... قرآن پاک کے ساتھ ساتھ انجیل، توریت کے صحیفے بھی تھے...... کارنر ٹیبل پہ ایک فریم میں سورۂ اخلاص کے عربی الفاظ جگمگا رہے تھے...... انہوں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں نور کی سادگی اور سلیقے کو سراہا...... ''والدین کے بغیر یہ کیسے رہتی ہوگی......'' تب ہی تازہ انار کے مشروب کے دو گلاس وہ لے آئی۔

''بہت باہمت ہو تم بیٹی......''

''جی......'' اس نے کہا۔

''زندگی اگرچہ مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو تو کوئی مشکل نہیں رہتی۔'' اس کی بات پر وہ مسکرائیں۔

''میں نے جینے کا سراغ پا لیا ہے آنٹی...... اس لیے کوئی خوف نہیں ہے بس آپ یہ جوس پئیں...... پھر میں آپ کے لیے پلاؤ بناتی ہوں...... شامی کباب کے ساتھ کھیر بھی ہے...... آپ کو پسند آئے گی......'' وہ بہت پیار سے کہہ رہی تھی۔

مہر النسا کو وہ بہت اچھی لگی......

''ریبال کہاں ہے......؟ وہ اندر نہیں آیا......''

''وہ باہر ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں...... وہ اندر نہیں آتے...... آپ کی وجہ سے آج یہاں تک آ گئے......'' وہ سادگی سے کہہ رہی تھی...... انہیں اپنے بیٹے کے کردار پر یقین تھا...... اور آج ایک غیر لڑکی کے منہ سے سن کر اچھا لگا...... انار کا شربت بہت عمدہ تھا...... روح سیراب ہو گئی...... دستر خوان پہ پلاؤ، شامی کباب کے ساتھ دہی کا رائتہ بھی تھا...... اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا...... انہوں نے تعریف کی تو اس نے بے اختیار کہا۔

''یہ ریبال نے سکھایا ہے مجھے آپ بھی تو اس طرح بناتی ہیں ناں...... آپ کی ریسیپی ہے پوری......'' جہاں نور کے اعتراف پہ انہوں نے کھیر کھاتے ریبال کو دیکھا...... اس نے بھی نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا...... مہر النسا بیگم مسکرا دیں......

جہاں نور نے برتن سمیٹے اور کمرے سے چلی گئی۔

''امی میں کل صبح چھ بجے آپ کو لینے آؤں گا...... صبح نو بجے تقریب ہے...... میں اب چلتا ہوں آپ آرام کریں......'' وہ ان کی پیشانی پہ پیار کرتا ہوا باہر نکل گیا...... اور جب جہاں نور قہوہ لے کر آئی تو اسے گئے دس منٹ ہو چکے تھے...... امی کو قہوہ دینے کے بعد اس نے ریبال کو ڈھونڈا۔

''ریبال......؟''

''وہ چلا گیا ہے صبح آئے گا......؟ تم پی لو قہوہ......''

مہر النسا کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزر گیا......

انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا...... ریبال کے جانے کا ملال اس کے چہرے پہ رقم تھا۔

''وہ صبح جلدی آئے گا...... ہم ساتھ چلیں گے......'' یہ لڑکی موج نسیم کی طرح ہے...... اس کا دل بہت حساس ہے...... کسی ان دیکھے جذبے کی دمک انہیں دکھائی دے رہی تھی...... اس نے بے دلی سے قہوے کی تیسری پیالی اٹھائی تھی۔

اور جہاں نور کی میزبانی میں پہلا دن بہت اچھا گزر گیا تھا...... ہیمبرگ کا سورج اگلے دن بہت جلدی روشن ہو گیا تھا...... ایسا انہیں محسوس ہوا۔

یہ کامیابیاں، یہ عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے
تمہارے دم سے ہیں میرے لہو میں کھلتے گلاب
میرے وجود کا سارا نظام تم سے ہے

کہاں بساطِ جہاں اور میں کمسن و ناداں
یہ میری جیت کا سب اہتمام تم سے ہے

صبح ہونے کا دل میں یقین رکھتے ہوئے فجر کی اذان کی آواز کانوں میں ضرور سنائی دی...... جہاں نور کے موبائل کے ذریعے انہوں نے time set کر کے الارم لگا دیا تھا...... ایک خوب صورت اور پُرنور صبح کا آغاز تھا...... جہاں نور نے نماز کا اہتمام کیا اور مہر النسا کے ساتھ مل کر نماز پڑھی...... ان کے کپڑے پریس کر کے فوراً دیے...... ہلکے پھلکے ناشتے میں صرف ٹوسٹ اور چائے شامل تھی۔

انگوری رنگ کے سادہ سے شلوار سوٹ میں اور بڑی چادر سر پہ لیے وہ بہت باوقار لگ رہی تھیں...... جہاں نور ریشمی عبایا میں ملبوس تھی...... اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور چمک رہا تھا...... ریبال مقررہ وقت پہ آ گیا تھا...... آف وائٹ ڈریس پینٹ کے ساتھ چاکلیٹی رنگ کالر شرٹ میں وہ بے حد اسمارٹ لگ رہا تھا...... آج کا دن اس کے لیے بہت خاص دن تھا...... بہت بڑی کامیابی اس کی منتظر تھی۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی ایک دوسری شاخ جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں اسلامک اسکولز کے تحت عمل میں آئی تھی...... ریبال نے PHD اسکالر شپ کے ذریعے اس موقع کو avail کیا...... یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں 400 سے زیادہ افراد کی گنجائش تھی...... ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا...... خوب صورت، محنتی چہرے، ذہانت کی چمک لیے ہوتے افراد...... وہ اپنی ماں کے ساتھ آگے کی مخصوص نشستوں پہ براجمان تھا...... جہاں نور، مہر النسا کے ساتھ بیٹھی تھی۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والے دو اور طالب علم تھے۔

چیف منسٹر ہیمبرگ مہمانِ خصوصی تھے اور پھر وہ لمحہ قریب آ گیا جس کے لیے ایک ماں نے بیٹے کی شخصیت و کردار سازی کی تھی۔

اپنے اوپر لگے الزام کو غلط ثابت کرنے کی کئی صورتیں ہوتی ہے...... مظلوم شخص ظالم ہوتا ہے...... جو گھٹ گھٹ کر مر جاتا ہے۔

صبر کے گھونٹ پی کر اللہ پہ بھروسا کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ وقت سب سے بڑا منصف ہے...... اور اسی منصف نے آج فیصلہ سنا دیا تھا......

سامنے ایک بڑی سی اسکرین تھی...... ریبال احمد کا نام چمک رہا تھا اور پھر وہی نام ڈاکٹر ریبال احمد کے ساتھ سے جگمگا اٹھا...... ساتھ ہی اس کا سبجیکٹ

"Comparative Studies of Communication media in networking"

بے تحاشا تالیوں کی گونج میں ریبال اپنی ماں کے ساتھ اسٹیج پہ چڑھ رہا تھا۔

مہر النسا کی آنکھوں سے شکرانے کے آنسو رواں تھے...... زوار شاہ آج ہر ہر قدم پہ انہیں یاد آ رہے تھے۔

''کاش تم دیکھ سکو کہ ریبال آج عظمت کی کس سیڑھی پہ ہے...... میرے اللہ نے مجھے سرخرو کر دیا اور... آج میں اپنے بیٹے کو ضرور بتاؤں گی کہ اس کے باپ کا نام کیا ہے......''

وہ اسٹیج پر ریبال کے ساتھ فخر سے کھڑی تھیں......

چیف منسٹر ریبال سے ہاتھ ملا کر اسے ڈاکٹریٹ کی سند دے رہے تھے...... اعزازی طور پر اسے کیش ایوارڈ، شیلڈ دی جا رہی تھیں...... بین الاقوامی میڈیا چینلز ایسے موقعوں پر کوریج کے لیے موجود ہوتے ہیں...... تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جو ملکی ترقی کی راہ کو ہموار کرتا ہے اور اس ملک کے تعلیمی پس منظر کو بھی واضح کرتا ہے۔

''ڈاکٹر ریبال احمد فرام پاکستان......''

بار بار اناؤنس ہو رہا تھا...... اور ریبال کے وجود میں وطن کی محبت کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ مہر النسا کو سب مبارک باد دے رہے تھے۔

ریبال کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو اس نے صرف دو جملے کہے۔

''میری کامیابی صرف میری ماں کے دم سے ہے...... اگر اللہ میری زندگی میں ماں جیسی نعمت نہ دیتا تو میں آج یہاں نہ ہوتا......''

تالیوں کی گونج میں وہ مبارک باد وصول کرتا نیچے اتر

آیا...... جہاں نور بہت خوشی سے آگے بڑھی مبارک باد دی اور سرخ اور سفید گلابوں کا تحفہ آگے بڑھا دیا۔

''بہت شکریہ جہاں نور......!'' اس نے پھول تھام لیے۔

''بس شکریہ......'' اس نے چھیڑا...... ''آپ کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہے ڈاکٹر ریبال احمد۔ آج ہمیں آپ پورا ہیمبرگ گھمائیں...... آپ کے پاس کیش رقم بھی خاصی ہے......''

''بالکل ٹھیک ہے بیٹا...... آج جو جہاں نور کہے گی...... وہ ہی ہوگا۔'' مہرالنسا نے اس کی خوشی کا ساتھ دیا...... تو ریبال نے خندہ پیشانی سے سر جھکا لیا۔

''او کے...... چلیے......''

وہ بڑا یادگار دن تھا...... وہ ساری جگہیں اور مقامات جو انہوں نے سوچ رکھی تھیں...... چھ گھنٹے میں اچھا خاصا گھوم لیے تھے۔ وہ رات انہوں نے زوار سے شکوہ کرتے ہوئے گزاری۔

''محبت اللہ کو تو معلوم تھا کہ میں نے کس طرح ریبال کی پرورش کی...... مگر اے میرے اللہ تو اب بھی زوار شاہ کے دل میں رحم ڈال دے...... میرے لیے گنجائش پیدا کر دے...... میں ان تمام لوگوں کو معاف کرتی ہوں جو میری تکلیف کا سبب بنے...... میں اپنی بہن کو بھی معاف کرتی ہوں۔ اس کے مزاج میں سدا خود غرضی تھی۔ میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں۔ میرے مالک تو نے مجھے سرخرو کیا۔ یا اللہ تیری رحمتوں کے صدقے اسی وسیلے سے زوار کو نرم دلی عطا فرما دے...... تا کہ میرے بیٹے کی یہ محرومی بھی دور ہو جائے......'' وہ روتے، روتے سو گئی تھیں...... اور اطمینان کی ایک لہر نے ان کو اندر سے سرشار کر دیا تھا۔

''جب تم پاکستان آؤ گے تو تمہیں تمہارے والد سے ضرور ملواؤں گی...... یہ میرا وعدہ ہے......''

''مجھے جہاں نور بہت اچھی لگی ہے......'' پانی پہ بنے اس حلال فوڈ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے ریبال سے کہا...... انہوں نے عقب میں دیکھا، جہاں نور سلاد کے باؤل میں سلاد کا انتخاب کر رہی تھی۔

''ہاں اچھی ہے......'' ریبال نے سادہ لہجے میں کہا۔

''بہت اچھی ہے......'' انہوں نے زور دے کر کہا۔

''جی......!'' ریبال نے سعادت مندی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اور پھر دن اتنی تیزی سے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا...... ایک روز وہ مہرالنسا کو لے کر اپنے اسکول بھی گئی جہاں وہ بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتی تھی...... انہوں نے اس کا ہر روپ دیکھا...... اسلام لانے سے پہلے وہ کیا تھی انہیں اس سے مطلب نہیں تھا لیکن اب وہ کیا ہے......؟ یہ ان کے لیے اہم تھا...... اس کی آنکھوں میں حیا تھی...... اور یہ حیا بہت کم لڑکیوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔

انہوں نے ریبال کی کلاس فیلو تشمیرہ میں بھی مشرقیت کے بہت رنگ دیکھے تھے۔ ریبال کے دل میں تشمیرہ کے لیے نرم گوشہ تھا...... وہ اس سے بھی واقف تھیں...... انہیں وہ اچھی بھی لگی تھی...... مگر وہ کہاں تھی......؟ کچھ اتا پتا نہ تھا...... اعزاز سے ریبال نے کہا تھا مگر پھر اعزاز سے ان کی بات نہ ہو سکی...... وہ ان کا ٹکٹ کروا کر یقیناً مصروف ہو گیا ہوگا...... ورنہ وہ ضرور فون کرتا۔

''مجھے پاکستان دیکھنے کا شوق ہے......''

جہاں نور نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا...... وہ دونوں واک کرتی ہوئی اسکول سے واپس گھر آ رہی تھیں...... ''میں نے ریبال سے بھی کہا تھا...... کیا میں جا سکتی ہوں وہاں......؟'' وہ مہرالنسا سے کہہ رہی تھی۔

''دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے......'' مہرالنسا نے کہا...... ''اگر نیت اچھی ہو تو اللہ ضرور راستے ہموار کرتا ہے...... تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' ان کی بات پر وہ خوش ہو گئی تھی۔

''انشاء اللہ......! آپ کو پتا ہے ریبال سے ملنے کے بعد میری زندگی بالکل بدل گئی ہے......''

''اور ریبال کے جانے کے بعد......؟'' مہرالنسا کے کہنے پر وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔

''میرا دل بند ہو جائے گا...... شاید میں اس کے بنا نہیں رہ سکتی......'' وہ بہت سادگی سے اپنی محبت کا اظہار کر گئی۔

''تمہیں پتا ہے وہ......'' مہرالنسا نے کچھ کہا ہی تھا کہ وہ بول اٹھی...... ''جی وہ اپنی دوست تشمیرہ کو پسند کرتا ہے......''

''کیسے......؟'' انہیں حیرت ہوئی۔

''میں نے اس کی پریشانی دیکھی تھی...... جب وہ اپنے دوست اعزاز شاہ کو اس کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں بھی آپ...... کو ایک بات بتاؤں......'' وہ مہرالنسا سے بولی...... ''میں نے ایک بات ریبال سے چھپائی تھی...... اعزاز کا فون میں نے ریسیو کیا تھا...... وہ ریبال کو تشمیرہ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا کہ اس کا پتا چل گیا ہے...... وہ کومے میں ہے...... عین شادی کے دن اس کے شوہر کا مرڈر ہو گیا تھا......''

''تمہیں پتا تھی یہ بات......'' انہیں حیرت کا جھٹکا لگا...... ''اتنی بڑی بات ریبال کو معلوم ہونی چاہیے تھی۔''

''ہاں...... مگر میں نے ریبال کو نہیں بتایا...... وہ ڈسٹرب ہو جاتا کیونکہ اس کو یہاں سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا...... میں اس کو اس ذہنی پریشانی سے اکیلی کیسے بچا سکتی تھی...... میں نے بس اتنا کہا کہ اعزاز شاہ نے تشمیرہ کے کیس کو سنبھال لیا ہے......''

''اعزاز میں یہ خصوصیت تو بہت زیادہ ہے...... وہ انسان دوست اور ہمدرد بچہ ہے......'' انہیں اعزاز کی یاد آنے لگی۔

''کیا ہوا ہے تشمیرہ کے ساتھ......؟'' یہ آواز ریبال کی تھی جو جہاں نور اور ماں کی گفتگو کا آخری حصہ سن چکا تھا...... اس کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی۔

جہاں نور کو ڈر لگا...... اولین دنوں کا سا لہجہ جب وہ جرمنی آیا تھا......

''تم نے کیوں چھپائی یہ بات......؟'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

''میں اس کے لیے پریشان تھا اور یہ بات تم جانتی تھیں......'' وہ بے حد غصے میں تھا...... ''تم اعزاز سے کانٹیکٹ میں رہیں، کیوں؟ کس حیثیت سے؟ میں سب سمجھتا ہوں تم یہ ہتھکنڈے میرے اوپر نہ آزماؤ...... یہ مجھ پہ نہیں چلیں گے......''

''ریبال زبان سنبھال کر بات کرو...... کس لہجے میں تم بات کر رہے ہو...... ہوش میں تو ہو تم...... تم نے صرف آخری بات سن کر فیصلہ کر لیا...... یہ تربیت ہے میری......؟ معافی مانگو اس سے......'' انہیں سخت برا لگا تھا۔

''امی پلیز......!''

''مجھے کچھ نہیں سننا...... میرا بیٹا ایسا کیسے ہو سکتا ہے......؟ سوری کہو جہاں نور سے......'' ریبال نے سر جھکا لیا۔

''جہاں نور......'' مہرالنسا نے پکارا...... اس کی خاموشی کو محسوس کر کے انہوں نے اس کی طرف دیکھا...... وہ زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔

''جہاں نور......'' ریبال نے پکارا...... مسلسل خاموشی......

اس نے فوراً ایمبولینس کال کی...... سائرن بجاتی ایمبولینس جلد آ گئی...... پندرہ منٹ میں وہ مقامی اسپتال میں تھے...... ایمرجنسی میں اس کو رکھا گیا تھا...... ریبال...... بے حد پریشانی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا...... مہرالنسا الگ فکرمند تھیں...... آدھے پون گھنٹے بعد ڈاکٹر ایمرجنسی وارڈ سے باہر آ گئے تو ریبال کو بلایا...... مہرالنسا بھی ساتھ تھیں۔

''بلڈ پریشر خطرناک حد تک لو تھا...... نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھیں...... بچت ہو گئی ہے...... خوش رکھیں انہیں...... ابھی بہت young ہیں وہ...... ڈونٹ وری انہیں ریلیکس کرنے کے لیے انجیکشن دے دیا ہے...... ایک گھنٹا انہیں آرام کرنے دیں...... او کے!''

اور جب وہ ریبال اور مہرالنسا کے سہارے گھر واپس آئی تو بہت خاموش تھی...... ریبال بہت شرمندہ تھا۔

''سوری مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا...... تمہیں تکلیف پہنچی...... تمہارا دل دکھایا...... معاف کر دو پلیز......''

''میں نے معاف کیا......'' جہاں نور نے کہا۔

''دیکھیں ریبال...... جب میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی ہوں تو ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں جو میرے کردار کو چوٹ پہنچائے۔ مجھے اللہ پہ یقین ہے کہ جو چیز مجھ تک پہنچنی ہو گی وہ خود پہنچ جائے گی...... اسے چھیننے سے کیا حاصل......'' ریبال اس کی بات پر اسے گہری نظر

سے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں نے اعزاز سے کہا تھا جب حالات بہتر ہوجائیں تو آپ ریبال سے بات کرلیں...... کیونکہ تشمیرہ کی سائیکوتھراپی میں اعزاز کو باقاعدہ ہائر کیا گیا تھا۔ان دنوں آپ ذہنی دباؤ کا شکار تھے...... امی کے آنے کا مسئلہ اور دیگر مسئلوں کی وجہ سے میں نے چھپایا...... ورنہ آج امی ہمارے درمیان نہ ہوتیں......" اس نے مہر النسا کی طرف دیکھا...... انہوں نے پیار سے دونوں کی طرف دیکھا۔

"بیٹا پرسوں مجھے چلے جانا ہے...... لہٰذا تم دونوں دوستی کرلو...... ان بیس دنوں میں ایک لڑائی نہیں دیکھی تھی سو وہ بھی دیکھ لی...... شکریہ آپ دونوں کا......" ان کی بات پر وہ دونوں دل کھول کر ہنس دیے...... جس رات مہر النسا کی فلائٹ تھی...... اس روز سہ پہر میں پیکنگ کرتے ہوئے ریبال اور جہاں نور ان کا ساتھ دے رہے تھے...... جبھی ایک سفید لفافہ انہوں نے ریبال کو دیا۔

"میرے جانے کے بعد کھولنا......"

انہوں نے بہت پیار سے جہاں نور کو اپنے پاس بلایا...... اور کہا۔ "بیٹی تمہاری خدمتوں کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں...... مگر ایک چیز ہے میرے پاس تمہارے لیے...... انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی سے ایک سونے کا چھلا اتارا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پہنادیا۔

"اب تم تنہا نہیں ہو......" اور جہاں نور گنگ سی سونے کے چھلے کو دیکھے جارہی تھی...... معتبر ہونے کا احساس اسے سرشار کر گیا اور پھر جدائی کا لمحہ آن پہنچا...... ائرپورٹ پر بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تو جہاں نور کو لگا آج وہ تنہا ہوگئی ہے...... وہ اپنی رو میں چلتی آگے بڑھنے لگی تو ریبال نے اسے روک لیا۔

"ٹھہرو تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں......"

"نہیں، میں چلی جاؤں گی......" جہاں نور آگے چلتی رہی۔

"اوکے...... امی کو پھر خود جواب دینا......" اس نے پیچھے سے کہا......

"وہ تو چلی گئیں......" وہ پیچھے مڑ کر بولی۔

"حکم دے کر گئی ہیں کہ گھر چھوڑ کر آنا...... سمجھیں...... چلو اب......"

اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی...... چند دنوں بعد ریبال کی بھی واپسی تھی مگر تیسری انگلی میں پہنی مہر النسا کی نشانی ایک عہد نامہ تھا...... جو اس کو سرور دیتا تھا۔

......☆......☆......☆......

کوئی خاموش زخم لگتی ہے
زندگی ایک نظم لگتی ہے
بزمِ یاراں میں رہتا ہوں تنہا
اور تنہائی بزم لگتی ہے
اپنے سائے پہ پاؤں رکھتا ہوں
چھاؤں چھالوں کو نرم لگتی ہے
چاند کی نبض دیکھنا اٹھ کر
رات کی سانس گرم لگتی ہے

زندگی کے بہت سے قیمتی لمحے سرک گئے تھے اور کچھ قیمتی لمحے باقی تھے۔ ان ہی یادوں میں ایک قیمتی یاد مہرو تھی......

آج وہ اس کے دروازے پہ چلے آئے تھے......

ردا بیگم کی موت، فیضان کا ایکسیڈنٹ، کاروباری ساکھ ایک بار پھر داؤ پر لگ گئی تھی......سب کچھ گنوانے کے بعد اعزاز شاہ اور محبّ اللہ نے طے کیا تھا کہ جیسے ہی مہرالنسا جرمنی سے واپس آئیں گی......وہ ان کو لے آئیں گے۔ فیضان اب بہتر تھا اور روزی کے ٹرانس سے باہر آ گیا تھا۔ اس کی بینائی بھی واپس آ گئی۔

دروازہ ہلکی سی دستک پہ فوراً کھل گیا......مہرالنسا بیگم آسمانی رنگ کے جارجٹ کے دوپٹے کو سر پہ سنبھالتی ہوئی سامنے آئیں۔

''اعزاز بیٹا تم......؟ کہاں تھے تم......کتنا یاد کر رہی تھی میں تمہیں......اور اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو تم کیا ہوا ہے......؟'' اور اعزاز ان کو دیکھ کو پھوٹ پھوٹ کر رو دیے...کئی دنوں کا دل کا غبار ان کے سامنے اشکوں کے ساتھ بہہ گیا......

''کیا ہوا تمہیں......؟'' وہ روتے ہوئے اعزاز کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں اور خود بھی ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اشکوں کی باڑ سے انہوں نے دیکھا...... زوار شاہ یک دم سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے......دکھ کی چادر بنا یہ شخص ان کا اپنا تھا......

محبت ہجر کا سونا
محبت وصل کی چاندی
اور محبت کھا ہی جاتی ہے

مہرالنسا کا دل زوار شاہ کے لیے آج بھی دھڑکتا تھا...... اور اب اس کے بعد کوئی پڑاؤ نہیں تھا......سب اثاثے تقسیم ہو گئے۔ سب گلے شکوے بنا کچھ کہے ہی ڈھل گئے تھے۔ مہرالنسا کا تو دل صاف ہی تھا، زوار شاہ کی آنکھوں سے بھی غلط فہمیوں کی دھند چھٹ چکی تھی۔

☆......☆......☆......

ہمیشہ کے لیے چہرے نقابوں میں نہیں رہتے
سبھی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

وہ email چیک کرنے بیٹھا تھا۔

''تم آ جاؤ تمہارے لیے سرپرائز ہے......'' اعزاز کی ای میل آئی تھی۔

دوسری میل تشمیرہ کی تھی......

"Congratulations! Dr. Reebal Ahmed, You have Completed your thesis.success fully"

امی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی......

''بیٹا تم نے جو سانچا تیار کیا ہے......اس کا تمہیں ادراک ہونا چاہیے......اگر وہ ٹوٹ گیا تو تم ٹوٹ جاؤ گے......بیٹا......محبت پر انسان کا اختیار نہیں......کہیں بے بسی ہے اور کہیں اختیار......تو تمہارے پاس جو قوت ہے اس کا استعمال کرو اللہ کے لیے......'' وہ جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

15 نومبر کو اس کی واپسی تھی......انٹرنیشنل یونیورسٹی آف ایڈنبرا سے اسے پڑھانے کی آفر تھی......فی الوقت وہ اپنے وطن کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا......جہاں اس کے لیے بہت ساری خوشیاں منتظر تھیں۔

☆......☆......☆......

وہ اعزاز شاہ کے آفس میں بیٹھی اس سے اپنا تعارف کروا رہی تھی اور اس کے مقابل بیٹھا اعزاز گھنی مونچھوں تلے مسکرایا تھا......''میں تشمیرہ احسن ہوں...... محسن صاحب سے آپ مل چکے ہیں......جو میرے تایا جی ہیں......آپ مجھے پہچان گئے ناں آپ نے ہی میرا علاج کیا تھا اور میں ابلاغ عامہ میں ماسٹرز ہوں......'' وہ

مسلسل ایک گھنٹے سے وضاحت کررہی تھی......
''الیکٹرانک میڈیا میں میرا ایم فل مکمل ہو چکا ہے...... مجھے آپ کا تعاون درکار ہے......''
''پھر......؟''
''پھر یہ کہ مجھے آپ سے کام ہے......''
''کیا کام......؟''
''مجھ سے دوستی کریں گی......؟'' انہوں نے پلٹ کر سوال کر ڈالا۔
''آپ میری بات سن ہی نہیں رہے ہیں......'' وہ زچ ہو گئی۔
''آپ ہی کو تو سن رہا ہوں......'' وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولے۔
''بھاڑ میں جائے شوق...... خواہ مخواہ تایا جی کے کہنے پر آ کر آپ کے پاس آ گئی......'' اس نے جھٹکے سے کرسی ہٹائی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ جو اتنی دیر سے اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے...... گھبرا کے اسے روکنے لگے اور اسی وقت تایا جی کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر فکرمند ہو گئے۔
''کیا ہوا بیٹا......؟ سب ٹھیک ہے ناں......؟''
''کچھ ٹھیک نہیں ہے آپ چلیں یہاں سے......'' وہ برا مناتے ہوئے ان کا بازو پکڑنے لگی۔
''تایا جی...... میرا مطلب ہے انکل میں ذرا ان کو چیک کر رہا تھا کہ سب ٹھیک ہے ناں...... بس یہ غصے میں آ گئیں......'' اعزاز شاہ نے تایا جی کو اشارہ کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں......
''تو سب ٹھیک ہے ناں......!'' تایا جی نے بھی اس کی تائید کی......
''انکل یہ وہ تشمیرہ ہی نہیں ہے جو ڈری سہمی رہتی تھی...... یہ تو شیرنی بن گئی ہے مقابل کے دانت توڑ سکتی ہے......''
''مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے...... میری بیٹی ایک پبلشنگ ادارے کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے اور تمہیں اس کا ساتھ دینا ہوگا......''
''جی بالکل انکل! میری خدمات حاضر ہیں......''
وہ شرافت کا نمونہ بنا ہوا تھا وہ ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھنے لگی......
''سوری......'' وہ اس کے سامنے آ گئے۔ ''کیا ایک مسیحا کا اتنا بھی حق نہیں......'' وہ انہیں گھورنے لگی۔
''دیکھو اپنی بڑی، بڑی آنکھوں سے ناحق نہ گھورو......''
''جائیں معاف کیا......'' اور اس کی ریشمی زلفیں لہرا گئیں اور وہ چلی گئی، خوشبو کا احساس دلا کر......

بہت دنوں کے بعد محبت بارش اور محسور کن جلترنگ جیسے جذبوں کو اس نے محسوس کیا تھا اور اپنی خوشی کا اظہار اس نے مہرالنسا بیگم سے کر دیا۔ وہ فیضان کے پاس بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھیں۔ اس کی بات سن کر مسکرانے لگیں۔
''مجھے معلوم تھا...... مسیحائی کام ضرور دکھائے گی۔ تم نے بھی جو سانچا تراشا ہے۔ اس کی قدر تم سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا......''
''میری پیاری امی......!'' کہہ کر وہ ان کے گلے لگ گیا...... فیضان بھی مسکرا دیا۔

......☆......☆......☆......

گھڑی کی سوئیاں تب 9 بج کر 05 منٹ کا اعلان کر رہی تھیں...... جرمنی سے آنے والی فلائٹ صرف 10 منٹ کی دوری پر تھی۔
اسلام آباد ائرپورٹ پر جہاز نے جیسے ہی زمین کی سطح کو چھوا...... مہربان سایہ دار بادل نے بارش کی بوندوں کو برسانا شروع کر دیا۔
ڈاکٹر ریبال احمد، فخر پاکستان اپنے تھیسس پہ کامیابی کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آ چکے تھے...... اس شعبہ میں یہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا گیا تھا۔
زوار شاہ، مہرالنسا، اعزاز شاہ اور فیضان شاہ سب اس کے منتظر تھے...... جیسے ہی وہ باہر آیا...... کیمرے حرکت میں آ گئے...... وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بے قرار و بے چین تھا...... پھولوں کے ہار اس کو ڈالے گئے...... پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں...... بڑی مشکل سے اسے راستہ ملا۔ وہ اپنی ماں مہرالنسا کے گلے لگ

گیا......زوار شاہ اپنے خوب صورت قد آور بیٹے کو دیکھ رہے تھے جو اُن جیسا قد و قامت رکھتا تھا......مگر مزاج میں ماں کا عکس تھا۔

مہر النسا کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں......زوار شاہ نے آگے بڑھ کر ریال کو گلے سے لگایا اور وہ آبدیدہ ہو گئے تھے۔ سب ہی اس محبت پر اشکبار تھے۔ موبائل کیمرے کی آنکھ نے یہ لمحے محفوظ کر لیے تھے۔

آج کل نجی چینلز سب سے پہلے نمبر پر آنے کے لیے ایسی منفرد خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگلے ہی دنوں میں ریال مختلف ٹی وی چینلز پر نیوز شو میں آرہا تھا کہ جس میں اس کی تعلیم اور اسلام سے وابستگی کی بنا پر جرمنی میں قیام اور ایک غیر مسلم لڑکی جینی کا قبولِ اسلام جیسے واقعات کے متعلق انٹرویوز ہو رہے تھے۔ جرمنی کے اخبارات نے بھی اس کے انٹرویوز شائع کیے تھے اور اب یہاں پاکستان کی یوتھ کے لیے اس کی جدوجہد کی مثالیں دُہرائی جا رہی تھیں۔ ایک چینل والوں نے تو گھر آکر اس کا فیملی انٹرویو کیا تھا۔ اینکر نے ناظرین کو ریال کا مکمل تعارف اور اس کی کامیابیوں کی تفصیل بتانے کے بعد تھا اس سے کچھ یوں سوال کیا۔

”ڈاکٹر ریال احمد آپ اپنی کامیابی کا کریڈٹ کس کو دیتے ہیں......؟“

”میری ماں مہر النسا نے بے تحاشا محنت، صبر و حسن اخلاق سے میری پرورش کی مگر انہوں نے ایک بات ہمیشہ مجھ سے چھپائی اور کہا جب تم بہت اعلیٰ مقام پہ پہنچو گے اس وقت تمہاری اس بات کا جواب دوں گی......ابھی کچھ دنوں پہلے جرمنی سے واپسی پر میری امی ایک لفافہ میرے لیے چھوڑ گئی تھیں جس میں وہ نام تحریر تھا......جس کو جاننے کے لیے اور خود کو پانے کے لیے میں نے یہ لمبا سفر کامیابی سے طے کیا......

” بلاشبہ یہ کریڈٹ میری ماں مہر النسا کو جاتا ہے۔ میرے خوابوں کو پورا کرنے میں جو راستہ مجھے ملا وہ میرے والدِ محترم زوار شاہ کا ہے......میرے والدین میرے لیے اثاثہ ہیں......

I Love my family and I also love my country and very proud to be a Pakistani“

......☆......☆......☆......

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

زوار ہاؤس میں خوشیوں کی رونق تھی اور خاندان کی مرکزی حیثیت زوار شاہ اور مہر النسا کو حاصل تھی......

مہر النسا نے بچوں کو سمیٹ لیا تھا......محبتیں گھر میں لوٹ آئی تھیں......

دل کے ویرانے میں بہار آگئی تھی...... فیضان صحت یابی کی طرف مائل تھا......

کھانے کی میز پر مہر النسا نے ایک قول سنا کر بچوں سے ایک فیصلہ مانگ لیا کہ

” کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پر بھی ہو اگر ایسا ہے۔ تو پھر وفاداری اور قدر دانی کا کیا......“

اور ان کی سمجھداری سے اعزاز اور تشمیرہ زندگی کے خوب صورت بندھن میں بندھ گئے......ریال نے بھی ماں کی خوشی کا احترام کیا اور جہاں نور کو اپنا لیا۔

☆☆☆

مقامی ہوٹل میں تشمیرہ اعزاز کے پبلشنگ ادارے کے اجرا کی تقریب ہوئی۔

تشمیرہ کا ناول ”ہم کو عبث بدنام کیا“ اس کے پبلشنگ ادارے کی پہلی کاوش تھا۔

محبتوں کے اس سفر میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور پھول بھی جو کانٹوں سے دامن بچا لیتا ہے پھول اس کی جھولی میں آجاتے ہیں۔

ہم کو عبث بدنام کیا کی تشمیرہ دکھ کی چادر اوڑھنے کے باوجود آج کامیاب ہے......محبت، انتظار اور صبر کے جذبات سے گندھی عورت تہمت اور بدنامی کے وار سہہ کر بھی ثابت قدم رہتی ہے اور بالآخر اس کا اپنا کردار اس کی پاکیزگی کی گواہی دے دیتا ہے۔

جس محبت کے سانچے میں اس کا وجود ڈھلا ہے وہ ہی محبت کے امر ہونے کا اولین نسخہ ہے۔

(ختم شد)



سقوطِ انا

سارہ احمد

نکاح نے حلال کیا تھا، کمال نہیں کہ ایک بستر پر سونے سے وہ ہم مزاج بھی ہو جاتے۔ انہیں تو مزاج آشنا ہونا تھا۔ اور یہ ایک رات نہیں ایک سال نہیں اور شاید یہ ایک زندگی بھی نہ بنا پاتی اگر ضد ایک دوسرے پر حکومت کرنے کی ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آئے اور پھر ہمیشہ ساتھ رہنے کی تمنا کر بیٹھے۔ محبتوں کی اولین داستان ایک نئی دنیا کے در وا کرتی چلی گئی۔ مان کی گھڑی جب ان چھوئے جذبوں کو گدگدا

کر لمحوں سے نکلی تو ان پر زندگی عیاں ہونے لگی۔ کاشف نے اپنا گھر اور دل دونوں تسمیہ کے اختیار میں دے دیے۔

''ہمیں سنوارو یا بگاڑو۔'' کاشف نے تسمیہ کی پیاری سی ناک چھو کر کہا۔

''ہمیں لکھو اور ہر بار مٹا دو۔'' تسمیہ نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے سارے بال خراب کر دیے اور اِک ادا سے کہتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگ گئی۔ کاشف اس سے پہلے دروازے پر پہنچ کر اپنی بانہیں پھیلائے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔'' تسمیہ اس کے وجود میں قید ہو گئی اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

رات کے کھانے کے بعد کاشف کا معمول تھا کہ کچھ دیر باہر اپنے دوستوں میں وقت گزارتا تھا۔ شروع میں تسمیہ کو تنہا یہ شام سے رات کا وقت گزارنا بہت صبر آزما لگا لیکن اس ایک بات کے علاوہ کاشف میں ایسی کوئی دوسری عادت نہیں تھی جو اسے پریشان کرتی۔ اس کے آنے تک وہ کسی نہ کسی طرح وقت کو گھسیٹ کر خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی...... اکیلی کبھی ڈر بھی جاتی اور وہم ہوتا کہ شاید کوئی گھر کے اندر دیوار پھاند کر آ گیا ہے۔ ہوا سے پردہ ہلتا تو چونک جاتی کہ ابھی اس پردے کے نیچے سے کسی کے جوتے نظر آئیں گے اور اکثر اسے محسوس ہوتا کہ کوئی سایہ ہے جو اس کے ساتھ، ساتھ چلتا ہے۔ کاشف کے آنے پر وہ یہ سب اس سے کہنا چاہتی لیکن اس کی محبت کے والہانہ انداز اسے شکوہ کرنے سے روک دیتے۔

محبت کی مٹی سے جو کونپلیں پھوٹتی ہیں وہ رشتوں کی بیلوں کو مزید پروان چڑھا دیتی ہیں۔ جب سے وہ ایک نئے رشتے کے احساس سے سرشار ہوئی تھی، اس کا دل اور بھی گداز ہو گیا تھا اور کاشف کا روز، روز دیر تک رات گئے غیر حاضر رہنا اس کے دل کو مسلنے لگا۔ سکوتِ شب سہج، سہج کر قطرہ، قطرہ پلکوں کو شبنمی کر رہی تھی۔ وہ سونا چاہ رہی تھی لیکن کاشف کے بغیر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل چاہا اسے فون کرے مگر ارادے ٹوٹ، ٹوٹ کر اس کے تکیے پر بکھرتے رہے۔ آنکھیں بند ہوئیں تو لمحہ بھر کو وہ ماحول سے غافل ہو کر نیند سے مغلوب ہو گئی۔ ایک ریشمی سی حرارت اس کی سانسوں سے ٹکرائی تو چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کاشف کی محبت بھری نگاہ اس کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''نئے مہمان نے تمہیں اور بھی حسین بنا دیا ہے۔'' کاشف نے اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیے۔ زمینِ دل پر بارش اتری تو تنہائی شکوہ کناں ہونے کو بے قرار ہوئی۔

''آپ جلدی گھر آ جایا کریں اب۔''

''شش......بس چپ سو جاؤ ابھی......کل ڈاکٹر کے پاس تمہیں چیک اپ کے لیے لے کر جانا ہے......میرے آنے تک تیار رہنا۔'' وہ ان سنی کر کے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

آنے والے دنوں نے تسمیہ کو خود سے بھی بیزار کر دیا، نہ ٹھیک سے کچھ کھایا پیا جاتا اور نہ گھر کے کسی کام میں دل لگتا، کاشف اگر کوئی بات کرتا تو بس ہوں، ہاں پر ہی اکتفا کرتی، اگر کہیں باہر لے جانے کا پروگرام بناتا تو وہ بھی رد کر دیتی۔

''ایسا کرو کچھ دن امی کے ہاں رہ آؤ۔'' کاشف نے اسے پیار سے کہا۔ مبادا کوئی الٹا مطلب ہی نکال لے اور وہی ہوا۔

''تا کہ آپ جو رات کو دیر سے آتے ہیں وہ بھی نہیں آئیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب صاف ہے جہاں دل لگتا ہے وہیں رہ جائیں اور کیا۔'' تسمیہ سے چپ نہیں رہا گیا۔

کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا اور آفس جانے کی تیاری کرتے ہوئے سوچتا رہا کہ تسمیہ کا ایسی حالت میں یہ ردِعمل فطری تھا۔ کچھ مہینوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

تسمیہ کے یوں بیزار رہنے پر اس کے اندر ایک بے چینی سی کنڈلی مار کے بیٹھ گئی اور اسے اماں کی یاد شدت سے ستانے لگی۔ ہفتے میں ایک دن ضرور وہ ان سے باتیں کرنے جاتا تھا اور اب نئی زندگی اسے راس آنے لگی تو انمول صورتیں اور قیمتی یادیں کیوں فراموش ہونے لگیں۔ قبرستان کی خاموشی میں اس کی پُرسوز تلاوت ایک احساسِ زیاں کو پکار کر ہر چیز کے فانی ہونے کا اقرار کر رہی تھی۔ سرخ گلابوں سے معطر اماں، ابا کی قبروں کی مٹی میں اس کے آنسو مل رہے تھے۔

''لڑکے نہیں روتے۔'' اماں نے اس کے گال صاف کر کے چومے۔

''مگر اماں جب تم روتی ہو تو ایک لڑکا نہیں بیٹا روتا ہے۔'' وہ لڑکا نہیں بیٹا ہونے پر فخر کرتا مگر اس کی الجھن نہ سلجھ سکی کبھی......

''اماں تمہیں کہیں چوٹ بھی نہیں لگتی اور تم پھر بھی روتی ہو۔'' اور اماں اسے اپنے سینے سے لگا لیتیں، مائیں اپنے بچوں سے کتنا کچھ چھپاتی ہیں، خاص کر اپنے دکھ اماں کے روپ میں اس نے عورت کی وہ معراج دیکھی تھی کہ دنیا کی ہر عورت اس کی نظر میں ہمیشہ قابلِ احترام ہی رہی۔ ابا کا رعب اور ڈر اس کے قد کے ساتھ اونچا ہوتا گیا، اسے ان دونوں کے رشتے کی سمجھ ان کے دنیا سے چلے جانے تک بھی نہیں آئی...... ان کے درمیان تعلق کی ٹھنڈک جب بڑھ کر جذبوں کو سرد کر دیتی تو دونوں دو مختلف دنیاؤں کے لوگ لگتے لیکن جدا بھی نہ ہوتے...... اسے ایک ایسا مرد نہیں بننا تھا جس کے ساتھ رہتے ہوئے عورت کو چوٹ تو نہیں آئے لیکن آنسوؤں کی تسبیح بطورِ گواہ اسے ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کر دے۔

تسمیہ کی نظروں کو تو وہ روز پڑھتا تھا اور نظر انداز کر دیتا تھا لیکن اب اس کی شکایت لفظوں میں اتر آئی تھی۔ تسمیہ کا شکوہ بجا سہی لیکن کیا شادی کے بعد اس کا اپنی ذات پر اختیار نہیں بچا تھا؟ کاشف پیار میں شناخت نہیں مدغم کرنا چاہتا تھا۔ دو وجود یک جان ہو کر

تمام پاکیزہ بیٹوں کے نام

نورِ نظر لکھوں یا کہ جانِ جگر لکھوں
حیران ہوں تجھے کیا میرے پسر لکھوں

تیرے ہی دم سے روشن میری صبحیں وشامیں
تجھ سے ہی سارے کام ہیں تجھے سر بسر لکھوں

جیتی ہوں تیری خاطر تجھ پر ہی جان دوں گی
تجھ کو میں کہکشاں کی اک راہ گزر لکھوں

تیرے لیے ہی کرتی ہوں ہر پل دعائے خیر
جانِ حیات تجھ کو فلاح کا اکبر لکھوں

میرے لعل تیری زندگی جنت نظیر ہو
ہو جائے زیست تیری مانند خضر لکھوں

رب کی رضا کا جام ملے یوں سرخرو تو ہو
آبِ کوثر کے لائق رشکِ قمر لکھوں

دعا گو: کوثر خالد، جڑانوالہ

معاشرے کے لیے فعال ثابت ہوں نہ کہ نفسیاتی اور جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر اپنی ہی نسل کو باغی کر دیں۔

وہ گھر آیا تو تسمیہ فون پر اپنی آپی سے بات کر رہی تھی، اس نے ہاتھ منہ دھو کر خود ہی کھانا نکال لیا، تسمیہ اٹھنے لگی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ تسمیہ کا موڈ بھی اچھا تھا حالانکہ صبح جس طرح اس نے ردِ عمل کیا تھا ایک بے نام سی اداسی سارا دن اس کے ساتھ رہی تھی۔

''یوں چپ سے کیوں لیٹ گئے؟'' تسمیہ پاس آ کر محبت سے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ ایک میٹھے سے سرور نے اس کے اعصاب کو سکون بخشا اور سارے بدن سے تھکاوٹ نکل گئی۔ وہ یونہی چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

''اچھا سوری...... کچھ بولیں بھی تو۔'' تسمیہ نے کاشف کے کان پکڑ کر سوری کہا تو وہ اس کی اس ادا پر

پل بھر میں نہال ہو گیا۔ قربتوں میں بس اتنا فاصلہ ہونا چاہیے کہ دونوں طرف سے ہونے والی پہل مسافت کو دراز نہ کردے۔ اسے اپنی سوچوں میں بھی کاشف پورے کا پورا چاہیے تھا۔

تسمیہ کے خوشگوار موڈ کے پیشِ نظر کاشف نے آج روز کی طرح باہر جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ موبائل پر ایک دو بار کال آئی مگر اس نے نظر انداز کردی اور موبائل وائبریشن پر لگا دیا۔

''آپ کے دوستوں کو آپ کی یاد ستا رہی ہے۔'' طنز نمایاں تھا۔

''ہم ابھی اگر اس بات کو نہ چھیڑیں تو مناسب رہے گا۔'' کاشف کی آواز دھیمی تھی۔

''خاموشی کا مطلب اپنے حق دوسروں کو سونپ دینا نہیں۔'' تسمیہ کے لہجے میں خفگی تھی اور وہ ماں بننے کے احساس کے ساتھ شاید اس پر غالب آنا چاہی تھی۔

''اچھا...... صرف ایک بات کو میرے تمام فرائض پر دھبا بنا کر لگا دیا...... بہت خوب بھئی۔''

''آپ کو کیا ایسی مجبوری ہے جو روز رات آپ باہر جائے بغیر رہ نہیں سکتے؟''

ازدواجی تعلق میں کبھی اعتماد بنا وضاحت کیے کیوں نہیں پنپ سکتا؟ کاشف خاموشی سے موبائل بند کر کے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ تسمیہ نے بھی تکیہ درمیان میں لگا کر بیڈ کا بٹوارہ کردیا۔ صبح کاشف نے خود ہی اپنا ناشتا تیار کیا اور اسے بے خبر سوتا دیکھ کر جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تکیہ درمیان میں اسی طرح پڑا تھا اور دونوں ہی رات بڑی احتیاط سے کروٹ بدلتے رہے کہ سقوطِ انا کا خطرہ تھا۔ تسمیہ سارا دن منتظر رہی کہ کاشف رابطہ کر کے اس کی طبیعت کا پوچھے گا اور اسے منالے گا مگر شام ڈھل گئی اور اسے ہی فون کرنا پڑا لیکن کاشف کا موبائل بند جا رہا تھا۔ اس کے کسی دوست کا نمبر بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ تسمیہ کی پریشانی بڑھ گئی۔

''بیٹا اس سے رابطے کا کوئی تو ذریعہ ہوگا۔'' تسمیہ کے والدین کافی دیر سے آئے ہوئے تھے۔

''کیا ضرورت تھی ایسے لڑکے سے شادی کرنے کی، جس کا کوئی آگے پیچھے ہی نہیں ہو۔'' تسمیہ کے ابو کو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''یہ ہمارے ساتھ چلے...... بعد میں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، چھوڑیں ساری باتیں۔'' تسمیہ کی امی کی تجویز اس کے ابو کو معقول لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے، نہ ہم رک سکتے ہیں نہ اسے یوں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔'' اپنے ابو کے غصے کے آگے وہ خاموش ہوگئی اور وسوسے اور واہمے اپنے دل میں لیے ان کے ساتھ چلی آئی۔

رات روشنیوں اور تتلیوں کے جہان کی طرف سمٹ رہی تھی...... رات جو مخلوق خدا کے آرام کرنے کا وقت...... رات جو کسی کے لیے سرور تو کسی کے لیے تکلیف.... پھیلتی جارہی تھی۔ وہ بار، بار کاشف کا نمبر ملا رہی تھی اور وہ اسی طرح بند جارہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ضبط ہار جاتا اسے کاشف کی کال آگئی اور اس نے نہیں اٹھائی صرف اس کا نمبر اسکرین پر دیکھتی رہی۔

پھر اس کا میسج آیا۔

''میں جانتا ہوں تم جاگ رہی ہو اور تمہیں میرے بغیر نیند نہیں آئے گی۔ میں جب عملی زندگی میں آیا تو میں نے عہد کیا کہ میں اپنی فیملی کے لیے تو ساری زندگی کام کرتا رہوں گا کیوں نہ اپنی ذات کے خلا کو بھی بھرنے کے لیے زندگی میں کچھ کروں...... میں نے ڈھابوں پر کام کرنے والے غریب الوطن لڑکوں کو پڑھانے کا ذمہ لیا۔ کیا تم چاہتی ہو میں ادھورا رہ جاؤں اور انا جیت جائے؟''

تسمیہ کو زندگی سمجھا رہی تھی کہ زہر کا ایک قطرہ فنا کرنے کے لیے کافی ہے لیکن امرت کے ہر گھونٹ کے ساتھ پیاس اور طلب بڑھتی جاتی ہے۔ اسے کاشف کو کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی وہ گھر کے باہر اس کا منتظر ہے اور اسے اگلا اقدام کیا کرنا ہے۔

اکو کی شادی

شمیم فضل خالق

جب سے میرا رشتہ شہزادی انجم سے طے پایا تھا گھر کے لوگ جیسے میرے دشمن بن گئے تھے۔ مجھ بیچارے اکلوتے فرزند سے وہ، وہ کام لیے جاتے کہ جسے سن کر پسینے آجائیں لیکن میں وہ سب کام کرنے پر مجبور ہوتا۔ اماں تو جب بھی بات کرتیں دانت کچکچا کر بات کرتیں، بڑی باجی تو اچھے بھلے نام اکبر کو بگاڑ کر اکو کہہ کر بلایا کرتیں۔ چھوٹی باجی اگرچہ میٹھے لہجے میں بات کرتیں لیکن ان کے بھی کچھ کم کام نہ ہوتے غرض میں



سب کے بیچ گھن چکر بنا چکراتا پھرتا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی گھر والوں نے بڑی بنائی ہوئی تھی۔ محلے میں ہمارا گھر دوسرے گھروں سے نسبتاً بڑا تھا...... ابا کے ریٹائر ہونے کے بعد میں ان کی جگہ پر بھرتی ہو گیا۔ چھوٹی سی سرکاری نوکری تھی، میں نالائق بھی بہت تھا مر مرا کر ایف اے کر لیا تھا بس قسمت اچھی تھی جو سرکاری نوکری مل گئی۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا سو لاڈلا بھی بہت تھا، نوکری نے جیسے میرے سر پر تاج رکھ دیا تھا۔ بڑے چاؤ چونچلے ہوتے کہ میں اکلوتا بیٹا تھا اور کماؤ بھی...... میں اکڑ کر بیٹھا رہتا اور سب کی محبتیں سمیٹتا...... لیکن اچانک ان محبتوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی وجہ تھی شہزادی انجم......

شہزادی انجم ہمارے محلے کے نکڑ پر رہتی تھی ان کا دو مرلے پر بنا چھوٹا مکان تھا۔ جس میں کوٹھڑی نما کمرے بنے تھے۔ ایک کمرے میں اس کا بھائی اور بھابی رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے درمیان کوئی شناسائی نہ تھی۔ اماں اور بہنیں تو ان دو، دو مرلوں میں رہنے والوں کے سخت خلاف تھیں۔ وہ تو قربانی کا گوشت تک ان کے گھر بھیجنے کی روادار نہیں تھیں، میں جب آفس کے لیے نکلتا تو شہزادی انجم بھی اس وقت اسکول جانے کے لیے نکلتی، وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں پندرہ سو یا دو ہزار مشاہرے پر پڑھاتی تھی...... ہم دونوں ایک راستے کے مسافر ضرور تھے لیکن ہمارے درمیان کوئی شناسائی نہیں تھی۔ چند ماہ ہی ہوئے جب میں اور وہ حسب معمول راستے میں اکٹھے ہوئے تو ایک ہلکی سی کمزور آواز میں کہا گیا۔

''سنیے......'' پہلے تو میں سمجھا کہ وہ کسی اور کو بلا رہی ہے لیکن اِدھر اُدھر دیکھا تو ہمارے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ میں سٹ پٹا کر پلٹا اور کہا۔

''جی فرمائیے۔''

''آپ...... آپ مجھے کچھ رقم ادھار دے دیں گے؟''

''جی......؟'' مجھے جھٹکا سا لگا یہ تو جان نہ پہچان...... میں تیرا مہمان والی بات ہو گئی...... دل ہی دل میں مجھے غصہ بھی آیا جانے یہ لڑکی کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے...... وہ شاید میرے اندر کی سوچ کو سمجھ گئی اس لیے جلدی سے بولی۔

''جی...... وہ...... میرا نام شہزادی انجم ہے۔ ہم وہ دو مرلوں والے تیسرے مکان میں رہتے ہیں...... آپ وہ نیلے مکان والوں کے بیٹے ہیں ناں......'' اس نے تصدیق چاہی تو میری گردن خود بخود اثبات میں ہل گئی۔

''دراصل مجھے اماں کی دوائی لینی ہے لیکن میرے پاس پیسے کم ہیں۔ ابھی تنخواہ میں چار دن رہتے ہیں...... جیسے ہی تنخواہ ملے گی میں آپ کی رقم واپس کر دوں گی۔''

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' میں کچھ دیر سوچ کر بولا۔

''بس پانچ سو تک سے کام چل جائے گا...... تین سو میرے پاس ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی تو میں نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ویسے تو اس کا قد و قامت اچھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بھینگا پن تھا۔

''خیر...... مجھے کیا؟'' میں نے سوچا اور پانچ سو کے نوٹ پر فاتحہ پڑھی اور تیز، تیز قدم اٹھا کر آفس کی سمت روانہ ہو گیا۔ میں فطرتاً ایک رحم دل بندہ تھا۔ جتنا میرا بس ہوتا میں دوسروں کی مدد ضرور کرتا تھا۔ اس لڑکی کی مدد اس لیے کی کہ وہ ضرورت مند تھی لیکن جب چار دن بعد اس نے پھر مجھے آواز دی اور شکریے کے ساتھ مجھے پانچ سو کا نوٹ دیا تو میں سچ مچ حیران رہ گیا...... کیونکہ مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ میرا پانچ سو کا نوٹ دوبارہ میری جیب میں آ جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی ماں کی بیماری وغیرہ سب ڈھکوسلا لگ رہی تھی لیکن اس وقت وہ متشکرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''آپ نے بر وقت میری مدد کی ورنہ جانے اماں کا بغیر دوائی کے کیا حال ہوتا......''

''رہنے دیں...... پھر بھی سہولت سے دے دیجیے گا۔'' میں نے اپنے پہلے والے خیالات پر شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں...... قرضہ مجھ پر ایک بھاری بوجھ کے مانند ہوتا ہے اور میں آسانی سے کسی سے کوئی قرضہ نہیں

لیتی...... جب تک انتہائی ضرورت نہ ہو۔'' میں نے متاثر ہوتے ہوئے اپنا نوٹ جیب میں ڈال لیا...... ہم ساتھ، ساتھ چلنے لگے میں نے بات برائے بات کرنے کو کہہ دیا۔

''آپ یہ ساتھ والے نیلے گیٹ والے اسکول میں پڑھاتی ہیں۔''

''جی......؟'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''یہ پرائیویٹ اسکول والے کام تو زیادہ لیتے ہیں لیکن سیلری بہت کم دیتے ہیں۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''جی...... پندرہ سو دے رہے ہیں۔'' میں سچ مچ حیران ہوا۔

''اتنے کم پیسوں میں تمہارا گزارہ کیسے ہو جاتا ہے۔''

''ہو جاتا ہے...... ایک میں اور میری اماں ہی تو ہیں۔'' وہ بولی۔

''لیکن...... مہنگائی کے اس دور میں دو بندوں کے لیے پندرہ سو روپے بہت کم ہیں۔''

''جی...... پر ہم بھائی کے ساتھ رہتے ہیں ناں...... گیس، بجلی وغیرہ کے بلز بھائی ہی پے کرتے ہیں...... میرے ذمے بس اپنا اور اماں کا کھانا، پینا اور اماں کی دوائیاں وغیرہ ہیں۔''

''لیکن دوائیاں بہت مہنگی ہیں...... پھر کچن کا خرچہ...... سب کیسے پورا ہوتا ہے۔'' مجھے سچ مچ فکر ہوئی۔

''ہو جاتا ہے...... ہم کفایت شعار لوگ ہیں...... پھر بھی دیکھ لیں۔ قرض کی نوبت آ ہی جاتی ہے۔'' اس نے جیسے آنسوؤں کا گولا حلق میں اتارا...... اسکول کا بورڈ سامنے نظر آ رہا تھا وہ خدا حافظ کہہ کر عجلت میں اسکول کے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ میں کچھ خالی ذہن کے ساتھ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا...... پھر اپنے راستے ہولیا۔

ہمارے بیچ جیسے شناسائی کا ایک در کھل گیا...... اب راہ چلتے ہماری بات چیت ہو جاتی...... بے تکلفی ہو گئی...... اب وہ مجھ سے اپنے گھریلو پرابلمز بھی شیئر کرنے لگی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کے بھائی اور بھابی ان ماں، بیٹی کا وجود اس گھر میں بہ مشکل گوارا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ماں، بہن کو دھکے دے کر تو گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ بھائی اس کا سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا اور اس کے تین بچے تھے اگرچہ شہزادی انجم، بھائی اور بھابی سے خوش نہیں تھی لیکن اسے اپنے بھائی سے ہمدردی ضرور تھی۔ وہ اس کا دفاع بھی کرتی تھی کہ ''بھائی بہت محنت کرتا ہے...... اس کا اپنا کنبہ بڑا ہے...... پانچ بندے ہیں، ان کا خود کا پورا نہیں پڑتا تو ہمیں کہاں سے کھلائیں۔'' میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھینگا پن تھا بس اس کے سوا اس میں کوئی خامی نہیں تھی...... وہ ایک صاف دل اور صاف گو لڑکی تھی...... ایک محنتی اور ایماندار لڑکی تھی...... اس کی سوچ بہت مثبت تھی۔ ان تمام ملاقاتوں کا نچوڑ یہ نکلا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی۔

پہلے تو میں خود کو یہ یقین دلاتا رہا کہ مجھے سچ مچ شہزادی انجم سے محبت ہو بھی گئی ہے یا صرف وقتی پسندیدگی ہے...... لیکن اس کا رزلٹ بہت جلد سامنے آ گیا...... اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اور وہ گھر تک محدود ہو گئی...... نہ پوچھیے کہ اس دوران میں نے اسے کتنا مس کیا...... میرا نہ گھر میں دل لگتا نہ آفس میں...... عجیب بے چینی تھی۔ رات ساری کروٹیں لے کر گزر جاتی، صبح آفس جاتا تو اس کے گھر کو نظروں کے حصار میں لیے رہتا کہ شاید اس دشمن جاں کا دیدار ہو جائے لیکن وہ نظر نہ آتی خیر...... اُن دنوں مجھے جس بات کی الجھن تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا، میں یقیناً شہزادی انجم کے عشق میں گوڈے، گوڈے دھنس گیا تھا اب بس اس کی رائے لینا تھی کہ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی...... میں دبلا پتلا اور قدرے چھوٹے قد کا مالک تھا، نقوش بھی عام سے تھے۔ رنگ سانولا تھا لیکن آپ اسے گہرا سانولا کہہ سکتے ہیں...... اگر میں گھر کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو یقیناً میری پرسنلٹی ایسی تھی کہ کوئی دوسری نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرتا...... لیکن جو اعتماد مجھے ملا تھا وہ اس لیے کہ گھر میں سب مجھے اہمیت دیتے تھے۔ میرے کھانے، ناشتے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا...... اور جب سے میں کمانے کے قابل ہو گیا تھا تو اس اہمیت

میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پہلا مرحلہ تو طے ہو گیا یعنی خود اپنی محبت کا مجھے یقین ہو گیا جو مجھے شہزادی انجم سے ہو گئی تھی اور میرے خیال میں یہ محبت اتنی شدید تھی کہ اب میں شہزادی انجم سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... دوسرا مرحلہ شہزادی انجم کو راضی کرانے کا تھا......اور یہ مرحلہ بھی خاصا مشکل تھا...... خیر ہمت کر کے میں نے اپنی محبت کا اظہار اس سے کر دیا......میری بات سن کر وہ گم صم ہو گئی۔ کافی دیر تو اس سے کچھ بولا نہ گیا...... میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے یا کسی اور طرف...... مجھے اس کے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا......آخر کار وہ بولی۔

''آپ کا بہت شکریہ اکبر کہ آپ نے مجھے اس عزت افزائی کے قابل سمجھا......لیکن اکبر صاحب......میری اور آپ کی کلاس میں بہت فرق ہے......میں چھوٹے طبقے کی عام سی، بدصورت سی لڑکی ہوں......آپ اکلوتے بیٹے ہیں اپنے گھر کے...اکلوتے بھائی ہیں اپنی بہنوں کے......آپ کے توسط سے انہوں نے بہت سے خواب بُنے ہوں گے۔ میں...... بھلا......'' اس کی آواز رندھ گئی......میرے دل میں جیسے ایک نوکیلا تیر پیوست ہو گیا۔کیا چیز ہے یہ محبت بھی......جس میں محبوب کی آنکھ میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں ہوتا۔

''دیکھو شہزادی......'' میں تڑپ کر بولا۔''منزل پانے کے لیے راستے کی کٹھنائیاں تو برداشت کرنی پڑتی ہیں......تم ہاں کر دو......باقی ساری مشکلات میرے لیے رہنے دو۔ہاں تم، ایک وعدہ کرو گی مجھ سے کہ مشکلات تو ضرور پیدا ہوں گی لیکن ہم دونوں اسے حوصلے اور صبر سے برداشت کریں گے اور ہمت نہیں ہاریں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی......'' وہ نظریں جھکا کر شرمیلے انداز میں بولی۔

''گویا......تمہیں میرا ساتھ منظور ہے......میری محبت منظور ہے؟'' میں مسرت سے بے قابو ہوتا ہوا لرزتی آواز میں بولا۔

''ہاں......کون بدبخت ہو گا جو گھر آئی خوشیوں کو لوٹا دے گا لیکن مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ اگر آپ کے گھر والے نہ مانے تو آپ ان کی بات مان لیں گے......مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر عقیدت سے اسے دیکھا وہ یقیناً ایک اچھی لڑکی تھی، کھری اور سچی......اور مجھے ایسی ہی شریکِ سفر کی تلاش تھی۔

دو مرحلے طے ہو گئے تھے اب آخری اور سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا...... میں روزانہ اماں، ابا سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کرتا لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ میں جانتا تھا اماں تو ان گھروں میں قربانی کا گوشت تک بھیجنے کی روادار نہیں تھیں تو ایسے گھر کی بہو کیسے لاتیں......لیکن بات تو کرنی تھی، بہادر تو بننا تھا۔

سو اس دن جب میں ابا کے ساتھ صحن میں چائے پی رہا تھا، اماں بھی ساتھ بیٹھی تھیں تو میں نے بات چھیڑی۔ میں جانتا تھا میری بات سب کے لیے کسی شاک سے کم نہیں ہو گی لیکن اس درجہ سب کو شاک لگے گا اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بات کر کے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے صحن میں کوئی طاقتور بم پھینک دیا ہو۔ابا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی اور اماں نے اتنی کربناک چیخ ماری کہ میرا دل دہل کر رہ گیا......کمرے سے بہنیں بھی اماں کی چیخ سن کر دوڑی، دوڑی آئیں......اور جب اماں نے سسکیوں اور ہچکیوں کے بیچ اٹک، اٹک کر ان کو ساری بات بتائی تو دونوں باجیوں کو جیسے سکتہ سا ہو گیا......وہ دونوں اپنی پوری آنکھیں کھولے، منہ پھاڑے میری طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے میں ان کا بھائی اکبر نہیں......نہ جانے کون ہوں۔ ابا تو ابھی تک ٹوٹی پیالی پر نظریں جمائے ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ ہمارا معصوم بھائی...... اتنا بے غیرت بھی ہو سکتا ہے......ہم نے اپنے اس

بھائی کے کتنے لاڈ اٹھائے ہیں۔'' آخر کار بڑی باجی رندھی آواز میں بولیں۔

''ارے...... میرے دل سے پوچھو...... میرے دل سے۔'' اماں سینے پر دوہتھڑ مار کر بولیں۔'' میرا دل جل کر کوئلہ ہو رہا ہے...... ارے کسی کا اکلوتا بیٹا ایسی نافرمانی دکھائے گا...... اور وہ ماں زندہ رہے گی؟ تف ہے مجھ پر اور میری زندگی پر......'' وہ بلند آواز سے رونے لگیں...... ابا کو فکر ہوئی کہ ساتھ والے گھروں کے لوگ پُرسا دینے نہ آجائیں کہ شاید میں مر گیا ہوں۔

''زیتون...... اس طرح رو، رو کر بدشگونی مت پھیلاؤ......'' اماں کو چپ کراتے ہوئے وہ بولے۔ ''محلے والے تو کسی ایسے واقعے کی بُو سونگھتے پھرتے ہیں بچے نے بات ہی تو کی ہے...... وہ سچ مچ اسے بیاہ کر تو نہیں لایا ناں! ہم اسے سمجھائیں گے تو یہ سمجھ جائے گا۔''

''جانتے ہو، وہ لڑکی بھینگی ہے۔'' اماں اور زیادہ شدت سے روتے ہوئے بولیں۔'' اس کم بخت کو کوئی اور اچھی لڑکی نہیں ملی تھی...... یہ ہی لڑکی ملی تھی۔'' اب وہ سسکیاں لے رہی تھیں۔

''میں نے کہا ناں، ہم اسے سمجھالیں گے...... یہ اس سے شادی کا خیال چھوڑ دے گا۔'' ابا دوبارہ اماں کو سمجھانے لگے۔

''ہم کیسے کسی کو اس لڑکی سے متعارف کرائیں گے...... اکو تو نے یہ بات کرتے ہوئے کچھ نہ سوچا۔'' چھوٹی باجی ناک سڑک کر کہنے لگیں۔

میں نے اس منظر نامے سے ہٹنے کو ہی نجات کا ذریعہ سمجھا اور سیدھا کمرے میں جا کر اپنی چارپائی پر پڑ گیا...... میں کسی رعشے کے مریض کی طرح تھر، تھر کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی میں نے ایسی جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے...... میرے ساتھ ایسا برتاؤ شروع ہو گیا تھا جیسے میں ایسا قیدی ہوں جس نے کوئی سخت جرم کیا ہو اور وہ کال کوٹھڑی میں بند ہو...... مجھے اکبر جان...... اکبر جانی کہنا تو بالکل موقوف ہو گیا تھا اب میرا پیارا والا نام ''اکو'' طنز والا نام بن گیا

تھا۔ ''ارے او اکو...... اے اکو سن۔ اوے اکو......'' کہہ کر پکارا جاتا...... گھر کے سارے گندے سندے کام مجھ سے کرائے جاتے۔ جیسے میں اس کا گھر کا اکلوتا بیٹا نہیں...... کام والا چھوکرا ہوں...... ابا سارا دن مجھے نصیحتیں کرتے رہتے' اماں اور باجیاں، شہزادی انجم کے گھر جا کر ایک بہت بڑے جھگڑے کے موڈ میں تھیں لیکن ابا نے انہیں قطعی منع کر دیا تھا۔

''کیوں محلے میں شور شرابا کر کے تماشا بنانا چاہتی ہو ابھی تو بات گھر میں ہے کل کلاں کو سارے محلے میں پھیل جائے گی۔ اکو ہماری بات مان جائے گا...... تم لوگ تھوڑا صبر تو کرو......'' ابا کے سمجھانے بجھانے سے بات اماں اور باجیوں کی سمجھ میں آگئی...... اس سلسلے میں شہزادی انجم کا کردار زبردست تھا، اس نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں نے گھر میں بات کی ہے کہ نہیں، ہم روز ملتے اور عام سی باتیں کرتے...... وہ اپنی ماں کی صحت کے بارے میں متردد تھی...... میں نے گھر میں کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا...... آفس میں ایک پلیٹ چھولے کھالیتا۔ چائے کی تین چار پیالیاں پی لیتا، شروع میں تو گھر میں کسی نے نوٹس نہیں لیا لیکن جب بغیر ناشتا کیے آفس جاتا اور دوپہر اور رات کا کھانا کھائے بغیر کام وام کرتا تو اماں اور باجیاں چونک اٹھیں...... اس صبح ابا ڈپٹ کر بولے۔

''اوئے اکو...... کیوں بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ چل آ...... ناشتا کر میرے ساتھ......''

''نہیں ابا......'' میں آواز کو پتلا اور کمزور کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ناشتا نہیں کرنا...... آفس کو دیر ہو رہی ہے۔''

''یہ بتا......'' اماں کولھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے دہاڑ کر بولیں۔

''سوگ منا رہا ہے اپنی اس شہزادی کا...... بول...... بتا ناں......'' میں خاموش رہا دراصل آج کل میں ایک چپ سو سکھ والے مقولے پر عمل درآمد کر رہا تھا سو ہر کسی کی اچھی بری بات پر چپ ہی رہتا اس وقت بھی میں خاموشی سے آفس چل دیا' ماں تو پھر ماں ہوتی ہے جب میری بھوک ہڑتال لمبی ہونے لگی اور میں کمزور اور نیم جاں نظر آنے لگا تو اماں کو سچ مچ فکر لاحق ہوئی وہ اتوار کا دن تھا...... اماں اور ابا صبح صبح ناشتا کر رہے تھے۔ پراٹھوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی اور میرا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ فوراً بستر سے نکلوں اور پراٹھوں پر ہلا بول دوں لیکن نہیں...... یہ میرے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ باہر سے اماں کی فکر مندسی آواز آرہی تھی۔

''اکبر بہت کمزور ہو گیا ہے...... سارا دن بھوکا رہتا ہے، اکبر کے ابا...... ایسا کب تک چلے گا۔''

پہلے ابا کے چائے پینے کی شڑپ، شڑپ کی آواز آئی پھر وہ بولے۔

''جب تک تم لوگ اس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی پر راضی نہیں ہوتے۔''

''کیا کہہ رہے ہو اکبر کے ابا......؟'' اماں کی حیران آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ایک ریڑھی چلانے والے کی بہن جو......'' ابھی اماں اس کے آنکھوں کے عیب کا کہنے ہی والی تھیں کہ ابا نے انہیں ٹوکا۔

''بس کرو...... یہ اللہ کے کام ہیں کسی کے جسمانی عیب کو اس کے لیے برائی مت بناؤ۔ شادی کرو یا نہ کرو کم از کم کسی لڑکی کے بارے میں ایسا تو مت کہو۔''

''تو کیا میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کرادوں اس سے؟''

''تو کیا ہوا؟'' ابا بولے...... ''بڑے، بڑے نوابوں، رئیسوں نے طوائفوں سے شادیاں رچا رکھی ہیں، غیر مذہب والیوں سے شادیاں رچا رکھی ہیں...... تیرا بیٹا ایک بھینگی آنکھوں والی غریب لڑکی سے شادی رچالے گا تو کون سی قیامت آجائے گی نیک بخت۔''

''لیکن...... ہمارے سب ارمان، ہماری خواہشات...... ان کا کیا ہوگا۔'' اماں رو کر بولیں۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' ابا رسان سے بولے۔ ''عشق کا یہ بخار جس تیزی سے چڑھا ہے اسی تیزی سے اتر بھی جائے گا...... تم دیکھ لینا۔ اکبر پھر اس لڑکی سے جان چھڑانے کا سوچے گا۔ بس...... تم اس کی دوسری شادی کرا لینا اپنی پسند سے، اپنی مرضی سے...... میری

بات گرہ سے باندھ لو زیتون...... شادی اور طلاق میں زیادہ وقت نہیں ہوگا۔"

"کیا...... سچ......؟" اماں کی آواز سنائی دی۔ "سچ کہہ رہے ہو۔"

"ہاں، تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ جلد ہی اکبر اپنے اس فیصلے پر پچھتائے گا اور......"

اس کے بعد حالات بہت بہتر ہوگئے، اماں اور بہنیں شہزادی انجم کے گھر میرا رشتہ مانگنے چلی گئیں...... ظاہر ہے وہاں سے انکار تو ہونا نہیں تھا...... لیکن جب اماں اور بہنیں شہزادی کے گھر سے واپس آئیں تو اس دن گھر میں ایک سوگ کا سا سماں تھا۔ صرف ایک میرا دل تھا جو خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا اور اس دن ابا سمیت گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا سوائے میرے...... میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا، وہ دن ہم دونوں کے لیے خوشیوں بھرا دن تھا...... میں نے اور شہزادی انجم نے پارک میں بیٹھ کر مستقبل کے خواب ایک دوسرے سے شیئر کیے پھر ریڑھی سے دہی بھلے اور بن کباب کھائے وہ دن یقیناً ہمارے لیے ایک خوب صورت دن تھا...... چند دن گزرے تو ابا نے شور مچا دیا کہ اکبر کا نکاح ہونا چاہیے۔

"کیسے ہوسکتا ہے اکبر کا نکاح......؟" اماں پریشانی سے بولیں۔

"کیوں...... کیوں نہیں ہوسکتا......؟" ابا بولے۔ "ہم نے کون سی کوئی شاندار شادی کرنی ہے...... بس چار بندوں کو لے جا کر نکاح پڑھوا لیں گے اور لڑکی کو گھر لے آئیں گے۔"

"مسئلہ تو یہی ہے کہ لڑکی کو بیاہ کر کہاں لے کر آئیں گے۔" اماں بولیں۔ "کمرا کہاں ہے؟ لڑکی کس کمرے میں دلہن بن کر آئے گی۔" اماں کی بات سن کر میں اور ابا دونوں سوچ میں پڑ گئے ہمارے گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک کمرے پر بڑی باجی قابض تھیں دوسرے نسبتاً چھوٹے کمرے میں چھوٹی باجی اور تیسرے کمرے میں اماں، ابا کے ساتھ ایک کونے میں میری چارپائی ہوتی تھی...... سردی کم ہونے لگتی تو میں کمروں کے آگے بنے برآمدے میں سویا کرتا...... صحن میں دو باتھ روم بنے تھے۔ کسی کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ نہیں تھے...... صحن میں ایک بے ڈھنگا سا کچن بھی تھا اور صحن میں کوئی کمرا وغیرہ بھی نہیں بنایا جا سکتا تھا...... اب تو سب سوچ میں پڑ گئے۔ دونوں باجیاں اپنے، اپنے کمروں کو کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ شادی کا مسئلہ وہیں دب گیا۔ چند دن بعد پھر ابا نے نکاح کا شور ڈالا لیکن بغیر کمرے کے کچھ نہیں ہوسکتا تھا...... بات ایک بار پھر ختم ہوگئی اب تو مجھے سخت تشویش لاحق ہوئی۔ ابھی تک میں نے یہ مسئلہ شہزادی انجم کے سامنے نہیں رکھا تھا اس دن جب ہم معمول کے مطابق راستے میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے تو وہ بولی۔

"اکبر...... ایک بات کہوں...... مانو گے؟"

"ہزار باتیں منوا لو...... جانِ من......" میں نثار ہونے والے لہجے میں بولا۔

"ہزار نہیں صرف ایک بات۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں...... ہاں کہو......"

"اکبر...... کیا ہم شادی کے بعد اماں کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

مجھے تو اس کی بات سن کر جیسے چکر سا آ گیا...... یہاں تو اپنے لیے جگہ نہیں تھی...... اور یہ خدا کی بندی اپنی ماں کو بیچ میں لے آئی میں اسے فوری جواب نہیں دے سکا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کیا ہوا اکبر......؟" وہ گھبرا کر بولی۔ "کیا تمہیں میری بات بری لگی ہے؟"

"نہیں تو...... لیکن اس پر بعد میں بات کریں گے۔" میں نے اس وقت تو اسے ٹال دیا لیکن بعد میں ساری صورتِ حال اس پر واضح کر دی۔ وہ گھبرا گئی۔ دہل کر بولی۔

"اب کیا ہوگا اکبر...... کیا ہماری شادی کھٹائی میں پڑ جائے گی؟"

"نہیں...... ایسا نہیں ہوگا......" میں نے اسے تو تسلی دی لیکن میرا دل جیسے پاتال میں ابھرا اور ڈوب رہا تھا۔

لاکھ سوچنے کے باوجود بھی اس مسئلے کا سلوشن سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا..... گھر کے سارے لوگ تو خاموشی سے بیٹھ گئے تھے کہ ان سب کے لیے تو یہ خوشی کا مقام تھا کہ ایک ناپسندیدہ شخصیت کے لیے ان کے گھر میں جگہ نہیں بن رہی تھی لیکن میرا دماغ تو مسلسل اسی ادھیڑ بن میں رہتا..... میں سوچ، سوچ کر پاگل ہونے لگا تھا اور جب میں مکمل طور پر مایوس ہونے لگا تو اچانک میرے ذہن میں ایک تجویز آ گئی..... میں جتنا، جتنا اس پر سوچتا گیا تو یہی تجویز مجھے گویا اپنے اس موجودہ مسئلے کا موزوں حل نظر آیا..... اس دن میں نے ناشتا کرتے ہوئے ابا سے کہا۔

''ابا..... کیا بڑی باجی اور چھوٹی باجی میرے ساتھ جگہ تبدیل نہیں کر سکتیں؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' ابا کے بجائے اماں نے جواب دیا۔

''مطلب یہ کہ وہ اپنا کمرا ہمیں دے دیں اور وہ میرے بیڈ پر آپ کے ساتھ سویا کریں۔''

''کک..... کیا..... کیا؟'' بڑی باجی اور چھوٹی باجی اتنے زور سے بیک وقت چلّائیں کہ میرے کان بج اٹھے۔ دونوں باجیاں خونخوار انداز میں میری طرف جھپٹیں۔

''تم ہماری مرضی کے خلاف ایک تو ہمارے سر پر اسے مسلط کر رہے ہو..... وہ تو چلو ہم نے سہہ لیا..... اب ہمارے کمرے بھی ہم سے چھین رہے ہو..... ہمیں سڑک پر کیوں نہیں دھکیل دیتے۔'' چھوٹی باجی روتے ہوئے بولیں، بڑی باجی، بھی اپنی ناک سڑک رہی تھیں..... اماں تو سینے پر دو، ہتھڑ مار کر بولیں۔

''ارے..... اگر تم دونوں کی قسمت اچھی ہوتیں تو کب کی تمہاری شادیاں ہو چکی ہوتیں..... لیکن... بدنصیبو..... اس لڑکی کی قسمت تم سے اچھی نکلی۔ اب بھائی کمرے لے رہا ہے..... ہماری موت کے بعد تو تم دونوں سچ مچ سڑک پر پھینک دے گا۔''

اب تو اماں اور باجیاں بلند آواز سے رونے لگیں۔

''چلو اکو..... معافی مانگ بہنوں سے۔'' ابا گھبرا کر بولے۔ ''جب تک ہم زندہ ہیں ان کے کمرے ان ہی کے رہیں گے..... اب تم اپنے لیے کیا سوچتے ہو..... کیا کرتے ہو..... تمہاری مرضی۔''

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بات ناممکنات سے ہے کہ باجیاں میرے لیے اپنے کمرے چھوڑ دیں..... لیکن یہ صرف میری تجویز کی تمہید تھی۔ سو میں نے فوراً دونوں باجیوں سے معافی مانگ لی اور بجھے دل سے کہنے لگا۔

''ابا..... پھر تو اس مسئلے کا ایک ہی حل رہ جاتا ہے۔''

''کیا.....؟'' سب میری طرف متوجہ ہو گئے..... اماں کی سسکیوں اور باجیوں کی ہچکیوں کو بھی بریک مل گیا۔

''وہ..... یہ کہ نکاح کے بعد میں شہزادی انجم کے گھر رہوں عارضی طور پر.....'' میں نے وہ دھماکا کر ہی دیا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔

''کک..... کیا..... تم اس کے گھر رہو گے؟'' اماں بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ باجیاں بھی منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تو پھر کیا کروں اماں.....'' میں بے بسی سے بولا۔ ''مجبوری ہے۔ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے اس مسئلے کا.....'' ابا جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے، بڑی دیر بعد سر اٹھا کر بولے۔

''میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں..... یہ ایک عارضی حل ہے..... ہو سکتا ہے آگے چل کر کوئی اچھا سا مستقل حل ڈھونڈ سکیں ہم۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔'' اماں بدک اٹھیں۔ ''اکو اکلوتا بیٹا ہے میرا..... کیسے اس کے ہاتھ سونپ دوں..... یہ نہیں ہو سکتا..... کبھی نہیں ہو سکتا۔'' وہ جیسے تڑپ اٹھیں۔

''ارے بیگم..... اکو کہیں بھی رہے، رہے گا تو ہمارا بیٹا ہی ناں..... اس کی تنخواہ ہماری ہو گی..... وہ دن بھر یہیں رہے گا..... رات کو وہاں جائے گا..... کیوں اکو.....!'' وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے تو میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میں نے سنا، ابا اماں سے کہہ رہے تھے۔

''دیکھو زیتون..... یہ تو بڑی اچھی بات ہو گی.....

تمہیں اور بچیوں کو اس لڑکی کو ہر وقت دیکھ کر ٹینشن نہیں ہوگی۔ وہ تم سب کی نظروں سے دور ہوگی...... اور تمہارا بیٹا تمہارا ہی رہے گا۔''

''لیکن اس مسئلے کا یہ تو کوئی حل نہیں ہے...... تو کیا وہ ساری عمر اسی کے گھر رہے گا۔'' اماں اداسی سے بولیں۔

''ارے نہیں...... حل تو ہے...... جلد ہی اکو کا دل اس سے بھر جائے گا...... لکھوا لو مجھ سے...... بس وہ اسے طلاق دے کر چھوڑ دے گا اور اپنے گھر آجائے گا تب تک شاید ایک بیٹی کا رشتہ طے پا جائے گا اور کمرا خالی ہو جائے گا۔ اکو کی نئی دلہن کے لیے۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' اماں کی آواز میں امید کے سائے لرز رہے تھے۔

''بالکل ہو سکتا ہے...... بس اب تم دل بڑا کر کے اکو کو اس کی سسرال رہنے کی اجازت دے دو۔''

گھر سے اجازت ملی تو اب ایک بڑا مرحلہ شہزادی انجم سے بات کرنے کا تھا...... اور جب ہمت کر کے میں نے بات کی تو شہزادی انجم حیران رہ گئی۔

''کک...... کیا...... کیا کہہ رہے ہیں آپ اکبر...... ہمارے گھر میں کوئی فالتو کمرا نہیں ہے۔ آپ کو پتا تو ہے۔''

''ہاں پتا ہے۔'' میں رسان سے کہنے لگا۔ لیکن ہم اسی کمرے میں رہ لیں گے جس میں تم اور اماں رہتی ہو۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی۔

''آپ سمجھ بھی رہے ہیں کہ آپ کیا، کہہ رہے ہیں۔''

''اماں بالکل معذور ہیں...... وہ نہ سن سکتی ہیں نہ دیکھ سکتی ہیں۔ ان کا بے ضرر وجود...... ہمیں کیا ڈسٹرب کرے گا۔''

''لیکن اکبر...... وہ جیتا جاگتا انسان تو نہیں ہے ناں......؟'' میری بات پر وہ آہستگی سے بولی۔

''ہاں تو کمرا تو خاصا کھلا ہے...... تم بیچ میں ایک پردہ لٹکا لینا۔'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''یہ ایک عارضی حل ہے شہزادی......'' میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ورنہ ہمارا نکاح کھٹائی میں پڑ جائے گا...... اور

کیا خبر کل کو میرے گھر والے اس رشتے سے ہی منکر ہو جائیں...... تم جانتی ہو کہ کن حالات میں ہمارا رشتہ طے ہوا ہے...... بس اب جلد سے جلد میں تم سے نکاح کر کے اس رشتے کو پکا کرنا چاہتا ہوں...... بعد میں ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں گے۔''

''لیکن اکبر...... اماں تو راضی ہو جائیں گی لیکن بھیا اور بھابی کیسے راضی ہوں گے؟ وہ تو خوش تھے کہ میرے ساتھ، ساتھ ان کو اماں کے وجود سے بھی چھٹکارا مل جائے گا...... لیکن اب۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔

''تم ان کو سمجھا لو کہ یہ سب عارضی ہے...... میں خود بھی یہاں رہنا پسند نہیں کروں گا...... اور ان سے یہ بھی کہہ دو کہ اماں بھی ہمارے ساتھ جائیں گی، جہاں ہم جائیں گے...... اور ان کو ساری سچویشن بھی سمجھا دو......'' میں اسے دھیمے لہجے میں ساری بات سمجھاتا رہا...... وہ غور سے سنتی رہی...... اور اگرچہ اس کے کہنے کے مطابق بھائی بھابی کا ماننا بہت مشکل تھا۔ لیکن اس نے سارے جتن کیے پھر بھی ان کی ایک نہ تھی جو کسی طرح ہاں میں نہیں بدل رہی تھی۔ آخر کار جب تھک ہار کر شہزادی انجم نے انہیں یہ لالچ دی کہ اکبر ہر ماہ اپنے یہاں رہنے کی فیس ادا کیا کرے گا تو وہ اس شرط پر راضی ہو گئے کہ یہ دورانیہ زیادہ لمبا نہ ہو...... خیر جو بھی ہوا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا...... اور تب چند لوگوں کی موجودگی میں بڑی سادگی سے ہمارا ہو گیا...... نکاح والے دن اماں اور بہنیں صبح سے رو رو کر پاگل ہو رہی تھیں گھر میں ایسی سوگواریت تھی جیسے ابھی، ابھی گھر سے کوئی میت نکلی ہو...... ابا ایک ٹوٹی چارپائی پر اٹوائی کھٹوائی لیے لیٹے تھے اور بار، بار ہائے اوئی کر رہے تھے...... ایسے جیسے ان کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہو...... میں... کن انکھیوں سے اپنے اس نئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا جو میں نے اپنے نکاح کے لیے دو تین ماہ پہلے بنایا تھا...... اسے استری کر تو رکھا تھا لیکن پہننے کی ہمت نہیں تھی۔ مقررہ وقت پر مارے خوف کے میں ان ہی ملگجے کپڑوں میں ابا کے ساتھ چل پڑا...... دو تین ابا کے قریبی دوست بھی تھے، کسی رشتے دار کو بلاوا دیا تھا نہ محلے والوں کو۔ شہزادی انجم نے اپنی تنخواہ سے چائے اور مٹھائی کا اہتمام کیا تھا...... میں نے شہزادی کو کچھ رقم دے دی تھی کہ وہ اس سے نکاح کا جوڑا سلوا لے...... اس کا بھائی قاضی کو لے کر آیا تھا۔ ہمارا نکاح پڑھا دیا گیا اور شاید دنیا میں ایسا نکاح کسی کا نہ ہوا ہوگا...... مبارک سلامت تک کسی نے نہیں کہا...... چائے اور مٹھائی کسی زہر کی طرح سب نے حلق سے اتاری اور چلتے بنے۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس شہزادی انجم کو اس کی بھابی اندر لے گئی اور میں ابا کے ساتھ گھر آ گیا۔ اماں اور باجیاں مجھے دیکھ کر چیخ، چیخ کر رونے لگیں...... مجھے بھی رونا آ گیا لیکن میرا رونا اس بات پر تھا کہ کسی کی شادی ایسی بھی ہوئی ہو گی جیسے میری ہوئی تھی۔ بہر حال رونا دھونا ختم ہوا...... میں ابا کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ رات کا کھانا بھی ابا کے ساتھ کھایا جب میں شہزادی انجم کے گھر جانے لگا تو اماں نے ایک دردناک چیخ مارتے ہوئے کہا۔

''اکو...... میں تیری خالی چارپائی کو کیسے دیکھوں گی، اے اللہ...... مجھے صبر دے۔'' باجیوں کی چیخوں کی آواز بھی اماں کی چیخوں میں شامل ہو گئی...... میں بوکھلا کر عجلت میں باہر نکل آیا...... چوروں جیسی چال سے شہزادی کے گھر میں داخل ہو گیا...... گھپ اندھیرا تھا داخلی دروازہ شاید میرے لیے ہی کھلا چھوڑا تھا۔ میں نے اندر آ کر کنڈی چڑھا دی اور سیدھا شہزادی کے کمرے میں آ گیا...... راستے میرے دیکھے بھالے تھے کہ بات پکی ہونے کے بعد ایک دو بار آ چکا تھا۔ اماں کے خراٹے باہر تک آ رہے تھے کمرے کو پردے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ شہزادی سرخ کپڑوں میں دلہن بنی بیٹھی تھی...... میں اپنا اشتیاق چھپاتے ہوئے چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا...... اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا...... اور یہیں سارے رومانس کا خاتمہ ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی اور طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ میری پسند تھی سہاگ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح، صبح منہ اندھیرے کسی نے دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا...... شہزادی کمرے میں موجود نہیں

تھی۔ میں نے بوکھلا کر دروازہ کھولا تو شہزادی کی بھابی کھڑی طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''آپ کے ابا آپ کو بلانے آئے تھے...... ناشتے کے لیے۔''

''اچھا......'' میں عجلت میں نیند سے بھری آنکھیں مسلتا گھر سے باہر چلا گیا......ناشتے پر سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں باتھ روم میں گھس کر فریش ہوا اور سب کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گیا...... پھر یہ روٹین بن گئی......سارا دن میں اپنے گھر پر ہوتا کھانا، ناشتا سب گھر والوں کے ساتھ کرتا، رات گئے شہزادی انجم کے گھر آتا۔ بس وہی وقت ہوتا جب ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر لیتے...... وہ عادتوں کے لحاظ سے زبردست تھی اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا کہ تم سارا دن اپنے گھر کیوں گزارتے ہو......میرے ساتھ ناشتا، کھانا کیوں نہیں کھاتے...... کبھی مجھے احساس ہوتا تو میں آفس سے کچھ وقت کی چھٹی کر لیتا...... وہ بھی اسکول سے ایک دو پیریڈ کی چھٹی کر لیتی ہم پارک میں بیٹھ کر دہی بھلے کھاتے، محبت بھری باتیں کرتے......اور بس......اتنی ہی عیاشی ہمارے بس میں تھی۔

وقت جیسے، جیسے گزرتا گیا......شہزادی کے بھیا اور بھابی، شہزادی کو تنگ کرنے لگے کہ وہ یہ گھر چھوڑ دے......شہزادی مجھ پر زور دینے لگی کہ ہمیں جلد سے جلد اپنا بندوبست کر لینا چاہیے......اس کا کہنا تھا کہ ''ہم کسی معمولی علاقے میں کسی ایک کمرے کا تو بندوبست کر ہی سکتے ہیں ناں......اور پورا گھر نہ ہو...... بھلے سے کمرا ہو......ہم گزارہ کر لیں گے لیکن......آزادی کا سانس تو لے سکیں گے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے شہزادی......لیکن سوچو تو......اماں ہم دونوں کے نوکری پر جانے کے بعد اکیلی کیسے رہیں گی جبکہ ابھی تو گھر میں بھابی اور بچے بھی ہیں......وہ ان کی دیکھ ریکھ کر لیتے ہیں۔''

''ہاں یہ مسئلہ تو ہوگا۔'' وہ سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولی۔ اگرچہ میں نے شہزادی انجم کے ذہن میں یہ

ارمان

محبت زندگی بن کر
کرے جب خواہشیں اکثر
بہت بے چین کرتی ہے
کبھی تو بین کرتی ہے
بچھڑ جائے کوئی مل کر
بکھر جائے کوئی کھل کر
کسی کی دل لگی ٹھہرے
کسی کی آنکھ میں آنسو
کہیں ہیں اجنبی چہرے
مگر بس ایک ہی حل ہے
ہمارے پاس جو پل ہے
اسے وقفِ وفا کر دیں
حسیں لمحے دعا کر دیں
محبت زندگی بن کر
فقط ارمان ہوتی ہے
جہاں اس کی تمنا ہو
وہیں مہمان ہوتی ہے

کلام: یمنیٰ احمد

بات ڈالی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر چھوٹی باجی کی شادی ہوگئی اور اس کا کمرا خالی ہوگیا (بڑی باجی کی شادی کی عمر میرے خیال میں گزر گئی تھی) تو میں شہزادی انجم کو اپنے گھر لے جاؤں گا اور یقیناً وہ اماں اور ابا کی اتنی خدمت کرے گی کہ وہ اسے اپنی انہی آنکھوں سمیت دل سے بہو مان لیں گے کیونکہ اتنے عرصے میں، میں اس کے دل کی خوب صورتی جان گیا تھا آپ کیا کہتے ہیں قارئین کہ مجھے کوئی سستا سا الگ گھر ڈھونڈ لینا چاہیے یا چھوٹی باجی کی شادی کا انتظار کرنا چاہیے یا بھابی کو اپنے رہنے کا ڈبل معاوضہ دے کر...فی الحال اسی گھر میں رہنا چاہیے......پلیز کوئی حل بتایئے۔'' آخر میں آپ سب کا بھی تو اکو ہوں۔

بس اتنی سی بات

ناہید چوہدری

ٹریفک سگنل پر گاڑی رکتے ہی پھولوں اور گجروں والوں نے یلغار کردی۔

''صاحب جی..... تازہ گجرے ہیں جی، بیگم صاحبہ کے لیے لے جائیں۔'' عدنان کی گاڑی رکتے ہی تیرہ، چودہ سالہ لڑکا لمبی سی ڈنڈی پر ڈھیر سارے مہکتے گجرے لیے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی میں گھسا..... خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

کچھ اتفاق ہی ہو رہا تھا کہ کافی دنوں سے عدنان اس سے گجرے لے رہا تھا۔ شادی کے بعد سے شاید ہی ناغہ ہوا ہو۔

روزانہ بجی سجائی حنا چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجائے اس کی منتظر ہوتی۔ اور اسے دیکھتے ہی عدنان سارے دن کی کوفت اور تھکاوٹ بھول جاتا۔

''لاؤ بھئی آج ذرا اسپیشل والے دو..... ہاں یہ موتے والے.....'' عدنان نے پوری دلچسپی اور توجہ سے دو عدد گجرے ہاتھ میں لے کر سونگھے۔

''واہ..... کیا دلفریب خوشبو ہے، یہ لو پیسے۔'' اس نے سو کا نوٹ لڑکے کی طرف بڑھایا..... گاڑیوں کی لمبی قطار دھیرے، دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔

''صاحب..... صاحب جی.....'' عدنان کی گاڑی ذرا آگے بڑھی..... لڑکے نے پھر تان لگائی۔

''آج..... آج..... آپ یہ چھوٹا پھولوں کا گلدستہ بھی لے لو صاحب جی.....'' لڑکے نے رنگ برنگے گلابوں کا گلدستہ کھڑکی میں گھسایا۔

عدنان کی گاڑی مہک اٹھی۔

''نہیں بھئی، اس کی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ سگنل نہ جانے کب کھلے گا۔'' عدنان کو بیزاری ہونے لگی۔

''اپنی امی جان کی خوشی کے لیے صاحب جی۔'' لڑکے نے گویا منت کی۔

''امی جان.....'' عدنان نے ناسمجھی سے اسے گھورا۔

''آج مدرز ڈے ہے ناں جی..... ماں کے لیے لے جائیں' خوش ہو جائیں گی.....'' لڑکا گلدستہ بیچنے کا ہر حربہ استعمال کر رہا تھا۔

''مدرز ڈے.....'' عدنان بڑبڑایا۔ اس نے تو دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ہارن پر ہارن بجنے لگے۔

''رہنے دو..... وہ مجھے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتی ہیں۔'' عدنان نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے عجلت میں کہا۔

''تو پھر اپنی بیگم صاحبہ کے لیے کیوں لیے.....'' گاڑی آگے بڑھتے، بڑھتے بھی لڑکے کا جملہ اس کے کانوں میں پڑ گیا۔ گاڑی تو آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن عدنان کا ذہن اسی ایک جملے میں اٹک گیا۔

''اونہہ..... یہ اپنی چیزیں بیچنے کے لیے کیا، کیا ڈائیلاگز بولتے ہیں..... بھلا ماں کو یاد کرنے کے لیے کسی خاص دن کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اچھا تو بھلا تم بتاؤ..... آخری بار ماں سے کب ملے تھے؟'' دماغ نے جھٹ سوال داغا۔

''اوں..... شادی کے ہنگامی دنوں میں تو آس پاس ہی ہوتی تھیں ناں۔ اُف یہ اکلوتا پن بھی کتنی بری

چیز ہے۔ کاش میرے بھی دو چار بہن، بھائی ہوتے۔"
دل میں حسرت نے سر ابھارا۔

"ویسے ایمان کی بات ہے..... کافی دنوں سے امی نظر ہی نہیں آئیں..... یا وہ مصروف ہوگئی تھیں یا..... یا....."

"ایڈیٹ..... تم بزی ہوگئے ہو اپنی زندگی میں..... اپنی نئی نویلی دلہن میں..... وہ تو اپنی جگہ پر ہی ہیں۔" صبح تیار ہو کے نکلنے لگتا تو کاریڈور سے گزرتے ہوئے یہی خیال ذہن میں آتا کہ امی سو رہی ہوں گی۔

رات دیر سے آتا تو پھر یہی خیال کہ امی سو رہی ہوں گی۔

"کبھی یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ کہیں وہ بیمار نہ ہوں؟" دماغ نے جھڑک کر پوچھا۔

"اوہ....." مین شاہراہ پہ بتی لال ہوئی تو اس نے بہ مشکل بریک لگائے۔

"نہیں، یہ خیال تو کبھی نہیں آیا....." مجرمانہ احساس نے گھیر لیا۔

"صاحب جی..... بڑا پیارا گلدستہ ہے۔"

گلابوں کی مہک ایک بار پھر ناک سے ٹکرائی۔ سگنل شاید کھل چکا تھا۔

اس کی گاڑی کے پیچھے لائن لگ چکی تھی۔

عدنان نے میکانکی انداز میں گلدستہ پکڑا اور جتنے پیسے ہاتھ میں آئے کھڑکی سے باہر اچھال دیے۔

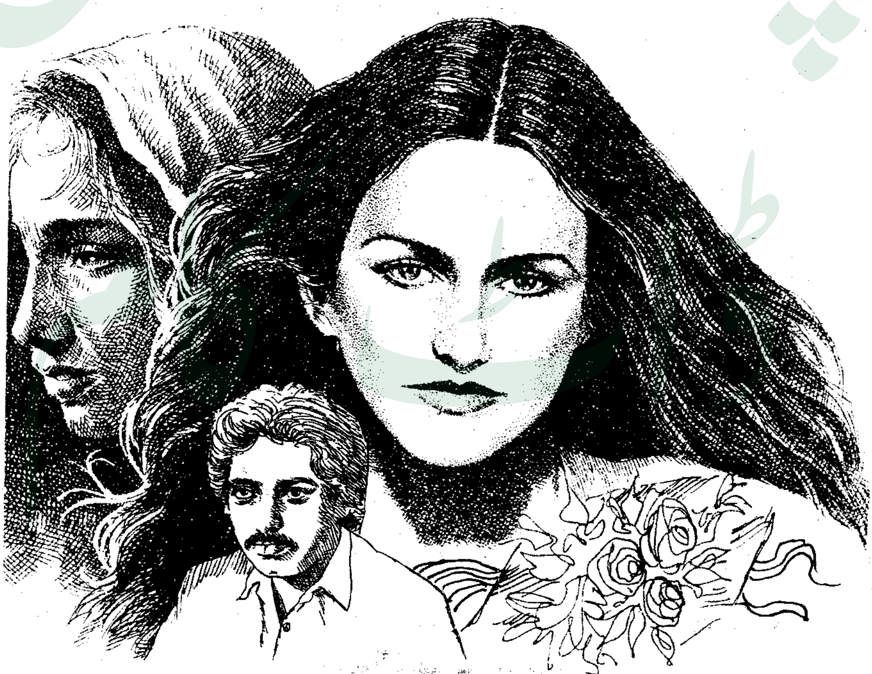
"امی!" عدنان کو پھولوں کے بیچ ماں کا چہرہ نظر آنے لگا..... اب وہ ماضی کا چھوٹا سا بچہ بن چکا تھا..... جب ابو کی حادثاتی موت پر امی نے اسے اپنے شفیق بازوؤں میں بھر کے اپنے سینے میں چھپالیا تھا۔ اس کے کانوں میں رشتے داروں کے طرح، طرح کے جملے گونجنے لگے۔

"بیچاری صفیہ..... پہاڑ سی جوانی کیسے گزارے گی....."

"میرے خیال میں تو اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔"

ایسے ہی بے شمار جملوں کے بعد اسے امی کی پتھروں جیسی مضبوط آواز سنائی دی تھی۔

"میرا..... ہاں میرا عدنان، میری کل کائنات ہے میرا مضبوط سہارا..... اسی کے سہارے ساری زندگی گزاروں گی....." باتیں بنانے والے اپنا منہ



لے کر غائب ہوگئے۔ زمانے کے سرد و گرم سے بچانے والی ماں کو آج مدرز ڈے نے یاد کروایا' وہ بھی ایک پھول بیچنے والے کی وجہ سے...... دو تین مہینوں سے تو وہ ساری دنیا بھلائے بیٹھا تھا...... امی کی یاد ہمک، ہمک کر آنے لگی...... اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھتی گئی، گیٹ کے سامنے بریک زور سے چرچرائے۔

لان میں ٹہلتی حنا گھبرا کر گیٹ کی طرف آئی۔

''واؤ...... آج تو اتنا حسین مُکھڑا بھی آیا ہے......'' حنا نے بے صبری سے ہاتھ آگے بڑھائے۔

''امی، امی کہاں ہیں حنا؟'' عدنان نے پھولوں والا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں......'' حنا نے اس کے انداز پر حیرت زدہ ہو کر کہا...... عدنان نے آج نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا امی کی یاد کا انجکشن نہ جانے کہاں سے لگوا کر آیا تھا۔ ناگواری سے سوچا۔

''یہ گجرے لو اور اپنے کمرے میں جاؤ...... میں ابھی آتا ہوں۔''

''میں...... بھی آؤں۔'' حنا نے رک رک کر پوچھا۔

''کیا صبح سے تم امی کے کمرے میں گئی تھیں۔'' عدنان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نن...... نہیں تو......'' حنا گڑبڑا گئی۔

''تو پھر اب بھی مت آؤ......'' عدنان فیصلہ کُن انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ امی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا...... عدنان گلدستہ ہاتھ میں پکڑے شرمندہ، شرمندہ سا آگے بڑھا۔

اندر گھستے ہی دوائیوں کی ناگوار بدبو ناک سے ٹکرائی۔ صفیہ دروازے کی طرف رخ کیے گویا منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''امی...... میری پیاری امی...... ہیپی مدرز ڈے......'' عدنان نے گلدستہ ان کی گود میں رکھ کر بازو ماں کے گلے میں ڈال کر سر اُن کے سینے پر رکھ دیا۔

''جیتے رہو میرے چاند...... آج نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تمہیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ٹی وی میں آرہا تھا کہ آج ماؤں کا دن ہے چلو اسی بہانے بچوں کو رشتے تو یاد آجاتے ہیں۔ بہت اچھا رواج نکالا ہے۔'' بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے صفیہ کمزور آواز میں کہہ رہی تھیں اور عدنان شرمندگی کے احساس میں ڈوبا جارہا تھا۔

اب وہ کس زبان سے پوچھتا کہ امی آپ کب سے بیمار ہیں' وہ حنا کو کس منہ سے قصوروار ٹھہراتا...... جبکہ وہ خود ہی خیال سے غافل رہا تھا۔

''امی...... آپ نے بتایا...... کیوں نہیں کہ......'' ان کے گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے ندامت سے پوچھا۔ زبان رک، رک گئی۔

''حنا آئی تو تھی...... پر اس وقت طبیعت اتنی خراب نہیں تھی۔'' صفیہ نے نرمی سے کہا۔

دروازے کے باہر کھڑی ٹوہ لیتی ہوئی حنا گڑبڑا گئی۔ اس نے تو شروع کے دنوں میں ہی چاپلوسی کی تھی، اس کے بعد ملازمہ ہی ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی...... وہ تو سارا، سارا دن ٹی وی پر ڈرامے دیکھتی رہتی یا اپنی امی سے گپ شپ لگا لیتی۔

امی کا خیال ذہن میں آتے ہی حنا کو یاد آگیا کہ اس نے اپنی امی کو وش تو کیا ہی نہیں۔

''ابھی کرتی ہوں......'' ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نمبر ملانے لگی تھی کہ بے خیالی میں دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ مزید کھل گیا۔ عدنان اور صفیہ کی نظریں دروازے کی سمت اٹھ گئیں۔

''وہ...... میں...... امی کو وش کرنے آئی تھی۔ ہیپی مدرڈے امی......'' حنا نے آگے بڑھ کر سر ساس کے آگے جھکا دیا۔

''جیتی رہو...... میری چندا...... میرے گھر کی رونق سدا سہاگن رہو...... دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو......'' صفیہ دعاؤں کی لڑی پرونے لگیں۔ بس اتنی سی بات تھی...... حنا اور عدنان نے احساسِ ندامت میں ڈوبی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... اور اتنے قیمتی رشتے کو دل کی گہرائیوں میں بند کرلیا۔ اور حنا کا دامن انمول دعاؤں کے خزانے سے بھر گیا۔

کائنات نے نیچرل پنک کلر کے لپ گلوز سے ہونٹوں کو رنگا۔ پھیلے ہوئے کاجل کو ٹشو سے صاف کیا اور تنقیدی نگاہ سے اِک بار پھر اپنا جائزہ لینے لگی۔ نوجوانی کی چمک لیے اس کی گلابی رنگت تمتما رہی تھی...... لائنر اور کاجل سے سجی آنکھیں قدرتی خم دار پلکوں سے حسین تر لگ رہی تھیں، بال سامنے کر کے فرنچ چوٹی بنائی تھی۔

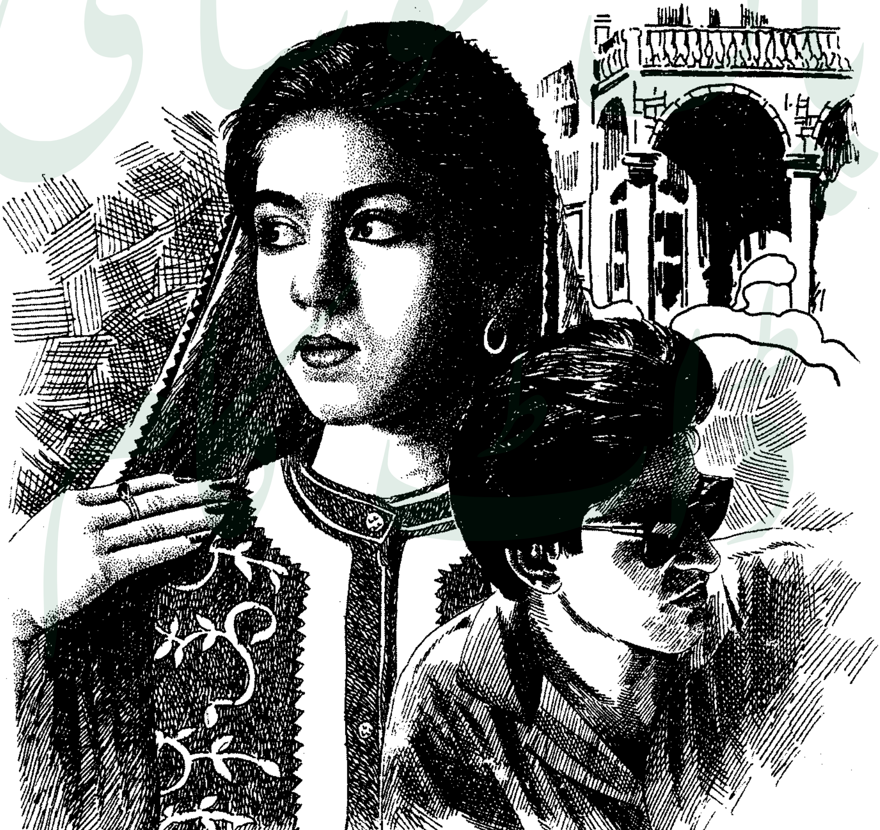
''امی کیسی لگ رہی ہوں؟'' کائنات ماں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ دوپہر کی ہانڈی کے لیے فریج سے گوشت نکال رہی تھیں۔

''ماشاء اللہ بہت حسین لگ رہی ہے میری بچی......'' انہوں نے بے ساختہ ساتھ لگا کر اس کے بالوں پہ لب رکھ دیے...... کھلے دروازے سے شعیب احمد اندر آچکے تھے۔

''شاہینہ، یہ دروازہ کیوں کھلا رکھا ہے؟'' انہوں نے آتے ہی بیوی سے باز پرس کی۔

نکلے جو قدم

ریحانہ آفتاب



''میں نے تو بند کیا تھا خود، آپ کے جانے کے بعد......'' شاہینہ جلدی سے بولیں۔

''پھر کھلا کیسے......؟'' شعیب احمد کی گھورتی نظروں سے خائف شاہینہ لب چبانے لگیں۔

''وہ، ابو میں نے کھولا تھا۔ ساتھ والی حفصہ کو آواز دینے کے لیے...... بند کرنا بھول گئی۔'' کائنات نے سچائی بیان کی۔

''آئندہ دروازے پہ آ کر کسی کو آواز دینے کی ضرورت نہیں، مجھے سخت ناپسند ہیں وہ عورتیں جو دروازے پر ٹنگی رہتی ہیں۔'' شعیب احمد کی آواز کی گونج سے دونوں چپ ہو گئیں۔

''اور تم، اتنا میک اپ کر کے کہاں جا رہی ہو؟'' یونیفارم میں ملبوس چودہ سالہ کائنات، شعیب کی نظروں کی گرفت میں تھی۔

''اسکول میں فیئر ویل پارٹی ہے، اسی میں جا رہی ہے۔'' شاہینہ نے کائنات کی مشکل آسان کی۔

''اتنا سج دھج کے؟'' وہ کھا جانے والی نظروں سے بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

''صرف کاجل اور گلوز ہی تو لگایا ہے۔'' شاہینہ منمنائی۔

''منہ بند رکھو اپنا...... اور تم؟'' شعیب نے دہاڑ کر شاہینہ کو چپ کرایا۔

''فوراً منہ دھو کر بال کھولو اور سادی چٹیا بناؤ۔'' باپ کے حکم پر وہ واش روم کی طرف بڑھی۔

''اگر میں ابھی چابی لینے واپس نہ آتا تو تم اسی حلیے میں بھیج دیتیں بیٹی کو باہر...... اور یہ دیر سے کیوں جا رہی ہے اسکول؟ خضر اور میر کہاں ہیں؟'' شعیب احمد نے آنے کی وجہ بتانے کے ساتھ تفتیش شروع کی۔

''وہ تو اپنے ٹائم پر اسکول چلے گئے۔ کائنات نہم میں ہے تو دسویں کی فیئر ویل ہے اس لیے ان کی تقریب دیر سے شروع ہو گی...... ساتھ والی حفصہ کے ساتھ جائے گی۔'' شاہینہ نے معلومات بہم پہنچائیں۔

''تم احمق عورت......! میری باتوں کا اثر نہیں ہوتا تم پر...... سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہنسی ٹھٹول کرتی جائے گی وہ اسکول...... تم سے کہا ہے ناں خضر اور میر کے بغیر اسے اکیلے نہیں نکلنے دینا۔ تربیت کرنا کب آئے گی تمہیں...... تمہیں کیا بولے بندہ...... جسے خود تربیت کی ضرورت ہے۔'' شعیب احمد کی زبان کے نشتر شاہینہ کے وجود میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔

''آئندہ اگر میں نے کوئی کوتاہی دیکھی کائنات کی طرف سے تو وہ تمہارا آخری دن ہوگا اس گھر میں سمجھیں!'' شاہینہ کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ آ گئی۔

کائنات ان کی ساری گفتگو سن رہی تھی، اچھی طرح رگڑ، رگڑ کر منہ دھو کر باہر وہ نکل آئی۔

''بال کھولو...... جلدی۔'' ہدایت دے کر شعیب احمد اندر کمرے میں چلے گئے تھے۔

کائنات چپ چاپ آئینے کے آگے کھڑی ہو کر بال کھولنے لگی۔ شاہینہ نے لب چباتے کم سن کائنات کی خاموشی کو محسوس کیا۔ آنکھوں میں گلابی پن...... اس نے نظریں جھکا رکھی تھیں۔

''امی ہم ساری سہیلیوں نے ایک جیسا ہیئر اسٹائل، کاجل، لائنر کے ساتھ میچنگ لپ گلوز پلان کیا ہے، فیئر ویل کے لیے۔'' کتنے دنوں سے وہ اس تیاری کے لیے ایکسائٹڈ تھی۔

صبح سے ہی وہ تیاری میں جت گئی تھی مگر اب...... یقیناً معصوم سی خواہش کو پانی میں بہتا دیکھ کر وہ خوب روئی تھی۔ شاہینہ کے دل میں کوئی نیزہ چبھا تھا۔ شعیب احمد کمرے سے چابی لے کر واپس آئے۔

''کائنات! جلدی آؤ۔'' باپ کی آواز پہ اس کے ہاتھ اور تیزی سے الٹی سیدھی چٹیا بنانے لگے۔

''آئی ابو!'' اس نے آواز لگائی۔ باپ کے رعب و دبدبے سے تینوں بچے کانپتے تھے۔ شاہینہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔

''کائنات کو میں چھوڑنے جا رہا ہوں، خضر اور میر آ جائیں اور اس کی پارٹی ختم نہ ہو تو تم خود جا کر لے

آنا..... کسی دوست کے آسرے پر مت بیٹھی رہنا۔'' وہ بیوی کو حکم نہیں دے رہے تھے بلکہ شاہینہ سے بات کرنے کا اُن کا انداز ہی ایسا تھا۔ کائنات دو چوٹی بنائے دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ دوپٹا سر پر لیے کھڑی تھی۔

''کوشش کرنا، بھائیوں کے ساتھ گھر لوٹ آؤ اور آئندہ سے کسی تقریب میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکول پڑھنے بھیجتا ہوں ان چونچلوں کے لیے نہیں، چلو میرے ساتھ۔'' کائنات کو ہدایت دے کر آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

''اللہ حافظ امی!'' سر جھکا کر ان کے آگے سے گزرتی کائنات نے ہولے سے رندھی ہوئی آواز میں ماں سے کہا اور باپ کے پیچھے چل دی۔ اس کی دلی کیفیت پہ وہ افسردہ تھیں، سہیلیوں کو گلابی آنکھیں اور تیاری نہ ہونے پر جانے کائنات ... کیا، کیا تاویلیں دیتی۔ گیٹ کی زوردار آواز آئی وہ بھاگیں دروازہ بند نہ کرنے پر شعیب نے گیٹ پر غصہ اتارا تھا۔

☆☆☆

شعیب احمد تین بھائی اور دو بہنیں تھیں، ان کے والد کے دو بڑے جنرل اسٹور تھے۔ جو تینوں بیٹے چلاتے تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے اِک جنرل اسٹور مزید کھول لیا تھا تاکہ تینوں بیٹوں کا ذاتی کاروبار ہوسکے۔ دونوں میاں، بیوی تینوں بیٹوں کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے اس لیے تین منزلہ گھر بنوایا تھا۔ شعیب احمد نے پہلی منزل میں رہنا پسند کیا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں انہی کے پورشن میں رہائش پزیر تھیں۔ ان کے لیے سیڑھیاں طے کرنا دشوار عمل تھا۔

دوسرے فلور پر شعیب سے چھوٹا اسد اور تیسرے پہ سب سے بڑے بھائی آصف تھے۔ دونوں بہنوں کی شادی ہوچکی تھی، وہ اپنے گھر کی تھیں۔ سسر تو شاہینہ کی خدمت گزار طبیعت پر اسے بہت سراہتے تھے۔ تینوں بہوؤں میں انہیں شاہینہ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کی وفات کے بعد شاہینہ حقیقتاً خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ اماں دو دن سے چھوٹی بیٹی کے گھر گئی ہوئی تھیں، اس کے گھر خوشخبری آنے والی تھی۔

دونوں بھائیوں کے بچے اولیول اسکول میں تھے۔ مگر شعیب احمد مخلوط اسکول کے سخت مخالف تھے۔ بھائیوں نے سمجھایا بھی مگر وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔

''یہ بچوں کے ساتھ زیادتی ہے۔'' اسد نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''رہنے دو، تم کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے ہو، ماں کا کیا اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔'' برتن سمیٹتی شاہینہ کو کینہ توز نظروں سے گھورتی صفیہ بیگم (ساس) نے چھوٹے بیٹے کو حمایت سے روکا۔

کائنات کی چوکیداری کے لیے خضر اور میر کو بھی قربانی دینا پڑی۔ وہ ساتھ والے اسکول میں پڑھتے تھے جو لڑکوں کا تھا۔ شعیب احمد کے بچوں میں اعتماد کی کمی تھی۔ وجہ اسکول نہیں بلکہ باپ کا غضب ناک رویہ تھا۔ جیٹھانی کے بچے جب اپنے اسکول کی بڑکیں مارتے تو ان کے رنگ پھیکے پڑ جاتے تھے۔

☆☆☆

''السلام علیکم امی......!'' کائنات بھائیوں کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔

''تم آگئیں...... پارٹی جلدی ختم ہوگئی؟'' شاہینہ نے چند گھنٹے بوجھل دل کے ساتھ گزارے تھے۔ صفائی سے فارغ ہوکر جلدی، جلدی کھانا بنایا تھا۔

شعیب احمد دوپہر کو گھر سے کھانا منگواتے تھے اور ان کی ذمے داری تھی کہ وہ وقت سے پہلے سب تیار رکھیں۔ کائنات کو دیکھ کر انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نہیں پارٹی تو چل رہی تھی، یہ دونوں لینے آگئے تو میں چلی آئی۔'' کائنات نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تم رک جاتیں ناں، میں خود لینے آرہی تھی تمہیں۔'' شاہینہ کو حد درجہ ملال ہوا اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر۔

''ناحق اتنی دھوپ میں آپ کو زحمت ہوتی اس

لیے چلی آئی۔ ابو کو بھی میرا زیادہ دیر باہر رہنا پسند نہیں ہے ناں۔'' اپنی دانست میں اس نے سمجھداری دکھائی تھی مگر اتنی کم سنی میں یہ سمجھداری شاہینہ کو مزید ملول کر گئی۔

''بہت بھوک لگی ہے، کیا پکایا ہے آپ نے؟'' خضر نے ان کی گفت وشنید کو بریک لگائے۔

''چکن کڑاہی۔'' شاہینہ کی نظر بیٹی کے چہرے پر تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''دادی تو نہیں آئیں ناں؟'' میر نے دبی آواز میں پوچھا۔ شاہینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' خضر نے بے ساختہ کہا۔

''اللہ کرے مزید کئی دن نہ آئیں۔'' میر نے بھی دلی خواہش بتائی۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم لوگ...... دادی ہیں وہ تمہاری......'' شاہینہ نے غصہ دکھایا۔

''صرف ہماری ہی دادی ہیں ناں..... آپ دیکھتی نہیں ہیں بڑے اور چھوٹے ابو کے بچوں کے ساتھ ان کا رویہ کتنا اچھا ہوتا ہے، ہم سے تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں۔ ہر وقت ڈانٹ پھٹکار۔'' خضر کے منہ بگاڑ کر بولنے پر شاہینہ سر پکڑ کر رہ گئیں۔ یہ کس ڈگر پر جا رہے تھے ان کے بچے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میر نے دروازہ کھولا۔ شاہینہ بھی دروازے تک آئیں۔ اسٹور پر کام کرنے والا لڑکا تھا جو کھانا لینے آیا تھا۔

''شعیب بھائی نے کہا ہے پوچھ کر آؤں کہ کائنات گھر آگئی؟'' وہ کھانا لے کر جاتے ہوئے استفسار کر رہا تھا۔ شاہینہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''کہہ دینا بھائیوں کے ساتھ ہی آگئی۔'' بادلِ ناخواستہ جواب دے کر شاہینہ نے دروازہ بند کیا۔ چینج کر کے آتی کائنات نے بھی یہ سوال سن لیا تھا۔ شاہینہ کی نظر اس پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے دونوں اِک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ کائنات نے نظر پھیر کر فریج کھول کر سر اس میں ڈال دیا۔ خضر اور میر کھانا جلدی لگانے کے لیے شور کر رہے تھے۔ شاہینہ کچن میں چلی آئیں۔

☆☆☆

''زور سے دبا لڑکی... کیا ہاتھوں میں جان نہیں ہے۔'' صفیہ بیگم شام کو لوٹ آئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے شاہینہ اور کائنات کو لگا رکھا تھا۔ کبھی ان کی ٹانگوں میں درد ہوتا، کبھی سر میں ہونے لگتا۔ اب بھی شاہینہ کو مسالے والی چائے بنانے بھیج کر وہ کائنات سے سر دبوا رہی تھیں۔ ہدایت پر وہ اور زور سے دبا رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیاں دکھنے لگی تھیں۔ کلائی میں درد ہونے لگا تھا۔

''شاہینہ، بالکل ہی پھوہڑ ہے تمہاری بیٹی، ذرا جو تم نے کچھ سکھایا ہوا ہے۔'' وہ چائے لے کر آئیں تو صفیہ بیگم نے لب کھولنا ضروری خیال کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شاہینہ اور ان کے بچوں میں کبھی کوئی خوبی انہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

وہ کچھ کہہ کر عتاب کا نشانہ نہیں بن سکتی تھیں۔ شروع، شروع میں کئی بار انہوں نے اس ناانصافی پہ آواز بلند کی تھی اور وہ صفیہ بیگم کو اتنی گراں گزری کہ جب تک شعیب نے شاہینہ کی ہڈی پسلی ایک نہ کر دی، انہوں نے حلق سے پانی اور کھانا نہیں اتارا...... سب ہی اس ذلت سے آگاہ ہوئے، تب سے شاہینہ نے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے، وہ جیٹھانی اور... دیورانی کو تفریح لینے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔

صفیہ بیگم کی شاہینہ کی نسبت دونوں بہوؤں سے زیادہ بنتی تھی۔ جیٹھانی ہدیٰ تو صفیہ بیگم کی سگی بھانجی تھیں، دیورانی نگہت کو وہ خود بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں۔

''لائیں میں دبا دیتی ہوں۔'' شاہینہ نے چائے کے ساتھ اپنی خدمات پیش کیں۔

''تم جا کر پڑھو، پیپرز کی ڈیٹ آنے والی ہے۔'' شاہینہ نے بیٹی کو جانے کا اشارہ کیا۔

''یہ کیا پڑھے گی، بھئی پڑھنے میں تو میری نواسیاں ہیں۔ یسریٰ کی رائٹنگ دیکھی ہے تم نے...... کیا موتیوں سی ہے۔'' صفیہ بیگم بڑی نواسی کے گن گانے

لگیں۔ کائنات جاچکی تھی۔ شاہینہ کے پاس ٹھنڈی سانس بھر کران کی گوہرافشانی سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ شعیب احمد گھر پر ہی تھے۔ جس دن وہ گھر پر ہوتے وہ ان چاروں کے لیے عذاب کا دن ہوتا......شعیب کی صبح دیر سے ہوتی تھی۔ صفیہ بیگم کو آٹھ بجے ناشتا چاہیے ہوتا تھا۔ سو شاہینہ کے لیے کوئی دن سکون کا نہیں تھا۔ ساس کے ناشتے کے بعد بچوں کا ناشتا بنایا۔ پھر شعیب کے اٹھنے کے بعد انہیں ناشتا کرایا۔

درمیان میں وقفے، وقفے سے ساس صاحبہ کی فرمائشیں بھی چلتی رہتیں، کبھی چائے کبھی ''اک توس مجھے بھی سینک کردو۔ انڈا بھی فرائی کردینا، صبح ٹھیک طرح سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔'' وغیرہ، وغیرہ......

شاہینہ ناشتے کی ٹرے لے کر آئیں تو سیڑھیوں سے جیٹھانی ہدیٰ مع اپنے تینوں بچوں کے پیچھے تشریف لارہی تھیں۔

''آصف دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے ہیں، بھئی ہم نے سوچا کیوں ناں آج لنچ تمہاری طرف کریں......تم لوگ تو اوپر آتے نہیں ہو سو ہم ہی چلے آئے۔'' جیٹھانی مکمل میک اپ کیے تیار کھڑی تھیں جیسے نیچے نہیں کہیں پارٹی میں جارہی ہوں، بچے بھی نک سک سے تیار تھے۔

''اچھا کیا بھابی، جو چلی آئیں۔'' شعیب بچھ بچھ گئے......دوسروں کے سامنے وہ ہنستے مسکراتے تھے۔ ساری کڑواہٹ تو بیوی، بچوں کے لیے ہوتی تھی۔ شاہینہ نے ٹرے صفیہ بیگم کے سامنے رکھی۔

''خالہ اتنی دیر سے ناشتا کررہی ہیں۔'' ہدیٰ، صفیہ بیگم کی طرف متوجہ تھیں، شعیب کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر ہدیٰ کے بیٹے نے میوزک چینل لگالیا تھا۔ کسی گانے پر تینوں بچے جھوم رہے تھے۔ شاہینہ لاچار کھڑی تھیں۔

''لنچ میں کیا بناؤں؟'' شعیب، ہدیٰ سے باتوں میں مگن تھے۔ جب شاہینہ نے سوال کیا......

''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔ بھابی اور بچوں سے پوچھو۔'' شعیب نے بھاوج کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم بھی آجایا کرو کبھی اوپر......'' ہدیٰ کو بھی اس کا خیال آگیا۔

''بھابی فرصت نہیں ملتی۔'' شاہینہ نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں اس کے گھر کے کام ہی نہیں نمٹتے۔ سستی کی ماری ہے۔'' صفیہ بیگم زہرخند ہوئیں۔

''شعیب تمہیں سمجھایا بھی تھا۔ اپنوں میں رشتہ کرو، میری بہن کشف تو پاگل تھی تم سے شادی کے لیے......لیکن تم نے کہیں اور ٹانکا جوڑ رکھا تھا۔ اگر میری بات مان لی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔'' ہدیٰ کے ہاتھ لہرا کر بولنے پر شاہینہ کا خون کھول اٹھا۔

''بس بھابی غلطی ہوگئی اب تک پچھتا رہا ہوں۔'' شعیب نے عجب انداز سے کہا۔ ہدیٰ کے قہقہے پر شاہینہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہوگیا۔

''بھابی آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟'' شاہینہ نے لہجے کو شیریں بنا کر پوچھا۔

''میرے لیے تو بریانی اور نہاری بنالو، باقی بچوں سے پوچھ لو۔'' ہدیٰ نے اپنی فرمائش بتائی۔

''میں نگٹس اور ڈرم اسٹک کھاؤں گی۔'' ہدیٰ کی بڑی بیٹی حرا نے اپنی فرمائش بتائی۔

''میں پزا اور زنگر برگر کھاؤں گی۔'' چھوٹی نے بھی حسرت پوری کی۔

''مجھے تو شاشلک ود رائس چاہیے۔'' بیٹا کیوں پیچھے رہتا۔

''کاشان کے لیے کسٹرڈ اور تھوڑا یخنی پلاؤ بنالو، وہ اوپر پڑھ رہا ہے کہہ رہا تھا کھانے پر بلالیجیے گا۔'' ہدیٰ نے مزید فرمائشی چٹ پکڑائی۔ شاہینہ بیچارگی سے شعیب احمد کو دیکھ رہی تھیں۔

''اتنا سارا کچھ......اتنی جلدی بنانا اور پھر کچھ سامان گھر میں ہے بھی نہیں۔'' شاہینہ نے مجبوری بتائی۔ ہدیٰ اور باقی سب سن کر بھی لاتعلق بن گئے۔

''جو گھر میں بن سکتا ہے بنالو، باقی میں آرڈر کردیتا ہوں، ہوم ڈلیوری ہوجائے گی۔ کھانا بن جائے تو خضر اور میر کو روٹیاں لینے بھیج دینا۔ بھابی کو نہاری کے ساتھ نان اچھے لگتے ہیں۔'' شعیب نے جیسے اس پر احسان کیا۔

''بھئی کولڈ ڈرنک ضرور ہونی چاہیے۔ گلے میں پھنستا ہے میرے اور میرے بچوں کا کھانا...... شاہینہ رائتہ سلاد تو تم بناؤ گی ہی پودینے کی چٹنی بھی ہوجائے املی کے ساتھ تو مزہ آجائے۔'' ہدیٰ مسلسل ہدایت دے رہی تھیں۔

''جی ضرور......'' شاہینہ نے شکل گم کرنے میں عافیت جانی، ورنہ اس کی شکل دیکھ کر انہیں اور کوئی فرمائش یاد آجاتی۔

''کیا یہ لوگ مہینوں کا فاقہ کرکے آئے ہیں، ہمارا راشن ختم کرنے۔'' کچن میں موجود تینوں بچے سب سن رہے تھے۔ ماں کی شکل دیکھتے ہی خضر نے لب کھولے۔

''چپ کرو، سن لیں گی۔'' شاہینہ نے پیشانی دباتے ہوئے کہا...... انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کام کہاں سے شروع کریں۔

''میں نے چکن فریج سے نکال کر پانی میں رکھ دیا ہے۔ بونگ کا گوشت بھی نکال دیا ہے پہلے پیاز فرائی کرلیتے ہیں دونوں کے لیے...... بریانی اور نہاری کے بعد یخنی بنالیں گے۔ پلاؤ کے لیے......'' پیاز چھیلتی کائنات نے اس کی مشکل آسان کی۔

''کتنے بھلکو ہیں یہ لوگ...... کیسے بے شرموں کی طرح منہ بھر، بھر کر فرمائش کی ہے۔ یاد ہے پچھلی بار ہم گئے تھے تو گھنٹوں بیٹھنے کے بعد حرا کو دس بار بڑی امی نے چائے بنانے کا کہا تھا۔ تب وہ بدمزہ سا محلول چائے کے کپ میں ہمارے سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں پڑھنے کے بہانے گم ہوگئی تھی۔'' میرا نہیں پچھلا واقعہ یاد دلا رہا تھا۔

''چپ کر جاؤ تم دونوں، پٹو گے اپنے باپ سے اگر سن لیا کسی نے۔'' شاہینہ کو شعیب احمد کا حوالہ دینا پڑا۔ وہ جلدی، جلدی ہاتھ چلانے لگیں۔ بیچ میں ان کے تو صبح کے لیے شربت کا دور بھی چلا تھا۔

کھانا تیار ہوچکا تھا۔ ''بریانی، نہاری، یخنی پلاؤ، رائتہ، سلاد، پودینے کی چٹنی، شاشلک، بوائل رائس سب تیار ہے۔ کسٹرڈ فریج میں ہے۔ کچھ رہ تو نہیں گیا؟'' وہ فکرمندی سے تمام ڈشز کو کھول کر چیک کررہی تھی۔

''خضر اور میر روٹیاں اور کولڈ ڈرنکس لینے گئے ہیں باقی سب تیار ہے، باقی کھانے جو ہوم ڈلیوری پہ آئے ہیں، انہیں چیک کرلیں۔'' کائنات نے پورا ساتھ دیا تھا تیاری میں۔ اب بھی وہ برتن صاف کررہی تھی۔ بیچ میں جا کر ان سب کے حضور سلام بھی کر آئی تھی۔ ورنہ بدتمیزی پہ لیکچر سننے کو ملتا۔

حرا اور فزا نے اس کے پرنٹڈ سوٹ کو تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''کتنا تھرڈ کلاس، لاسٹ ائیر کا سوٹ پہنا ہوا ہے اس نے۔'' فزا، حرا کے کان میں گھسی کہہ رہی تھی۔ جسے شعیب نے بھی سن لیا تھا۔ دونوں کی ہنسی پہ اس نے اِک نظر فزا اور حرا کی جدید فراکس پر ڈالی اور دوسری نظر کائنات پر جو اس کی نظروں کی حدت سے جلدی کچن میں روپوش ہوگئی۔ دونوں ماں، بیٹی کھانا لگارہی تھیں۔

''بھابی کاشان کو بھی بلالیں۔'' شعیب نے ہدیٰ سے کہا۔

''جاؤ کوئی بھائی کو بلالاؤ۔'' ہدیٰ نے تینوں بچوں سے کہا۔

''ہم نہیں جارہے ہمارا فیورٹ پروگرام آرہا ہے۔'' تینوں چپکے بیٹھے رہے۔

''خضر یا میر میں سے کسی کو بھیج دو۔'' شعیب کی طرف سے اگلا حکم آیا۔

''وہ روٹیاں لینے گئے ہیں۔'' شاہینہ نے آگاہ کیا اور ان کی ناخلف اولاد پہ ایک نظر ڈالی جو بڑے چھوٹوں کا لحاظ کیے بغیر فضول چینل لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی اپنی اولاد تو باپ کو دیکھتے ہی ٹی وی کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی کجا کے ساتھ بیٹھ کر واہی تباہی دیکھتے۔

''جاؤ کائنات......! تم بلالاؤ بھائی کو۔'' ہدیٰ نے حکم دیا تو وہ شاہینہ کو دیکھنے لگی۔

''خضر یا میر آجاتے ہیں تو چلے جائیں گے بلانے۔'' شاہینہ نے ٹالا۔

''کون سا مرغ پر بھیج رہی ہوں تمہاری بیٹی کو جو منع کر رہی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اس کا یخنی پلاؤ ٹھنڈا نہ ہو جائے......شاید ہم نے آکر غلطی کی۔'' ہدیٰ برا مان گئیں۔ شاہینہ ڈر گئیں۔

''بھابی ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود بلالاتی ہوں کاشان بیٹے کو۔'' شاہینہ نے شعیب کی گھورتی نظروں سے خائف ہو کر کہا۔

''آپ رہنے دیں، میں بلالاتی ہوں۔'' ماں کے لیے ہر گھڑی تیار رہنے والی کائنات جلدی سے سیڑھاں طے کرنے لگی۔

''ارے بھابی، موڈ ٹھیک کریں۔'' شعیب کی آواز اوپر تک آرہی تھی۔

''کاشان بھائی!'' وہ آواز دیتی ہر کمرے میں جھانک رہی تھی۔ وہ اوپر بہت کم آتی تھی۔ اسے کاشان کا کمرا پتا نہیں تھا۔ ایک کمرے میں کاشان کی بڑی سی تصویر دیکھ کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرا خالی تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی وہ دہلیز پر رک گئی۔ کاشان اندر سے برآمد ہوا۔

''السلام علیکم!'' اس نے سلیقے سے سلام کیا۔ کاشان آواز سن چکا تھا۔ کائنات کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر مسکرایا۔

''وعلیکم السلام......! اندر آؤ، کھڑی کیوں ہو؟''

''میں آپ کو بلانے آئی تھی۔ سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آپ آجائیں جلدی۔'' اس کی نظروں سے خائف ہو کر کائنات غیر ارادی طور پر دوپٹا شانوں پر برابر کرنے لگی۔

''ارے، رکو، ساتھ چلتے ہیں۔'' اس کے مڑتے قدموں کو رکنے کا اشارہ ہوا۔ کائنات انگلیاں مروڑتی حکم کی تعمیل میں کھڑی رہی۔ بال بنا کر کاشان نے دل کھول کر پرفیوم اسپرے کیا۔ کائنات کو سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔

''میں چلتی ہوں، آپ آجایئے گا۔'' کائنات جلدی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے، چلتے ہیں۔'' کاشان نے اسے سیڑھیوں پر جالیا۔ کاشان کے بڑھتے ہاتھ کو دیکھتے کائنات نے تقریباً بھاگتے ہوئے دو تین سیڑھیاں عبور کیں۔ نتیجے میں کائنات کا دوپٹا کاشان کے ہاتھ لگ گیا۔

''اوپر آکر لے لو......'' کاشان دوپٹا لہراتے آفر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی خباثت سے کانپتی کائنات نے باقی کی سیڑھیاں بھی تقریباً بھاگتے ہوئے طے کی تھیں۔

سب دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ شاہینہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی اوپر ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جب بھاگتی ہوئی کائنات آکر اُن سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا...... دوپٹا کہاں ہے تمہارا؟'' شاہینہ اس کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر چیخنے لگیں۔ کاشان کی حرکات وسکنات انہیں پہلے ہی اچھی نہیں لگی تھیں۔ اس لیے وہ کائنات کو بھیجنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

کاشان دوپٹا ہاتھ میں لیے نیچے آرہا تھا۔

''چاچی سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ یہ رہا دوپٹا......'' باقی سب کی نظریں بھی اسی طرف تھیں۔

''کیا دیوانی ہو گئی تھی جو سیڑھیوں پر ریس لگا رہی تھی...... یہ دوڑنے، بھاگنے کی عمر ہے اس کی۔'' صفیہ بیگم نے کائنات کی پشت کو گھورتے ہوئے لب کھولے۔

''امی! کاشان بھائی نے بدتمیزی کی کوشش کی۔'' کائنات کے جملے پہ جہاں شاہینہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہیں ہدیٰ کسٹرڈ کا باؤل فرش پر مار کے چنگھاڑتی کھڑی ہو گئیں۔

''بدذات' تیری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے پر الزام لگانے کی۔'' ہدیٰ آگے بڑھیں تاکہ کائنات کو شاہینہ سے الگ کر کے اس کی پٹائی کر سکیں جو ماں سے

چمٹی کھڑی تھی۔

''مام! میں تو اس کی عزت رکھنے کے لیے بہانہ کر رہا تھا لیکن جب یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے تو میں بھی سچ بتا دوں کہ یہ میرے کمرے میں خود دوپٹا اتار کر بیٹھی تھی۔ شعیب چاچو کے رویّے کا گلہ کرتے مجھ سے محبت کا اظہار کر رہی تھی...... میں نے سمجھایا کہ ابھی بہت چھوٹی ہو تو برا مان کے چلی آئی۔''

کاشان کے سفید جھوٹ پر شاہینہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، کائنات کے وجود کی کپکپاہٹ مزید بڑھ گئی۔

''بے غیرت ماں کا خون جو ہے اس کی رگوں میں، یہ تو کرے گی ہی ایسی حرکتیں، میرے پوتے پر الزام تراشی کرتے تجھے موت نہ آئی۔'' صفیہ بیگم نے کائنات کو شاہینہ کی پناہ سے کھینچا......وہ جھول کر نیچے آ رہی تھی۔ شاہینہ نے بازو پھیلا کر اسے گرنے سے بچالیا۔

ہدیٰ اور صفیہ بیگم دونوں ماں، بیٹی کے کردار کی دھجیاں اڑا رہی تھیں۔ خضر اور میر آچکے تھے، وہ بھی ناسمجھی سے سارا معاملہ دیکھ رہے تھے۔ شاہینہ بیٹی کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہی تھیں۔ لمبا چوڑا دستر خوان یونہی سجا ہوا تھا۔ شاہینہ نے اسے کمرے میں لٹا دیا۔ خضر اور میر زمین سے کسٹرڈ صاف کر رہے تھے۔ اس سارے قصے میں شعیب احمد کی خاموشی شاہینہ کو بہت چبھی تھی۔

☆☆☆

شاہینہ چار بھائیوں کے بعد دنیا میں آئی تھی۔ سو سب کی آنکھ کا تارہ تھی۔ شاہینہ کے والد فیروز صاحب کی الیکٹرانکس آئٹم کی شاپ تھی جو بہت اچھی چلتی تھی۔ شاہینہ کے بعد دو اور بہنوں کا اضافہ ہوا۔ مگر جتنے ناز نخرے اس کے اٹھائے جاتے تھے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ گھر میں ہر چیز کی فراوانی تھی۔

تین سو گز پر مشتمل گھر میں محبت کا سکہ چلتا تھا۔ شاہینہ بہت شوخ و شرارتی تھی۔ اس کی بہت ساری دوستیں تھیں۔ جن کے جھرمٹ میں وہ اسکول جاتی اور واپس آتی تھی۔ راہ چلتا کوئی من چلا ان کے بلند و بانگ قہقہے پر کوئی فقرہ چست کرتا تو وہ جواب دینا اپنا فرض سمجھتی۔ کئی ایک کو گریبان سے پکڑ کر تھپڑ بھی جڑ دیا کرتی تھی۔ اور جو کوئی بدتمیزی کی کوشش کرتا تو اس کے چاروں بھائی شکایت پہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے کہ وہ بیچارہ پھر کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر پاتا۔

ان دنوں وہ میٹرک میں تھی۔ جب ایک لڑکا مسلسل ان کے گروپ کے انتظار میں کھڑا نظر آتا۔ تمام سہیلیاں ایک دوسرے کو اشارہ کرتی رہتیں کہ پتا تو چلے اس کا منظورِ نظر کون ہے......سب کا خیال تھا کہ وہ شاہینہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ سب میں ممتاز نظر آتی تھی۔ یہ ابہام بھی جلد دور ہو گیا۔ جب شاہینہ کے دو دن اسکول نہ جانے پر تیسرے دن وہ ان سب سے استفسار کرنے لگا۔

''آپ کے گروپ میں جو شاہینہ ہیں، وہ دو دن سے نظر نہیں آ رہیں؟''

''کیوں، تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' لبنیٰ نے بھویں اچکا کر پوچھا۔

''وہ مجھے اچھی لگتی ہیں، محبت کرتا ہوں ان سے۔'' اس کے دوٹوک لفظوں پر سب آنکھیں پھاڑے اسے گھورنے لگیں۔

''وہ اپنی کزن کی شادی میں گئی ہوئی ہے، کل آئے گی اسکول۔'' افشاں نے اطلاع دی۔

''بہت شکریہ......!'' وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اگلے دن اسکول میں ان کا گروپ سارا دن اسی لڑکے کے متعلق چرچا کرتا رہا۔

''تم لوگوں نے آرام سے سن لی اس کی بکواس، کچھ کہا نہیں۔'' شاہینہ قصہ جاننے کے بعد تفتیش کر رہی تھی۔

''ہم سب تو اس کی بہادری پہ دنگ رہ گئے۔ کیا ہیرو کی طرح بھرم تھا، کچھ سوجھا ہی نہیں۔'' گروپ میں سے کسی نے کہا......واپسی میں وہ پھر اپنے مخصوص مقام

پر نظر آیا تو سب نے ایک دوسرے کو ٹھوکا دیا۔

''آ گیا تیرا مجنوں، دیکھتے ہیں کیا کرتی ہے تو۔'' کسی نے شاہینہ کو اکسایا۔ اپنے لفظوں کا بھرم اور سہیلیوں کے اکسانے پر شاہینہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کل کیا بکواس کی تم نے میری سہیلیوں سے؟'' دھوپ کی تمازت سے گلابی چہرہ لیے سر پر فائل سے روک بنائے وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔

''سچ کہا تھا۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

''میں نے اپنے بھائیوں سے شکایت لگائی تو اتنی مار پڑے گی کہ ساری ہیرو پنتی نکل جائے گی۔'' شاہینہ نے ڈرانا چاہا۔

''اگر مجھے پٹوا کر آپ کو خوشی ملے گی تو یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ لیکن اسپتال ملنے ضرور آیئے گا۔ میں انتظار کروں گا آپ کا۔'' وہ پُرشوق نگاہوں سے اس کی چھوٹی، چھوٹی بکھری ہوئی لٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کل سے نظر مت آنا، ورنہ پٹنے کی حسرت پوری ہو جائے گی۔'' اپنے تئیں اس نے دھما کا کیا۔ وہ مڑ گئی تھی۔

اگلے روز وہ حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

''رہنے دو کھڑا، تمہیں کچھ کہتا تو نہیں ہے ناں...... سڑک کسی کے باپ کی تھوڑی ہے۔ جو کھڑا ہونے پر جرمانہ لگا دیں۔'' کسی دوست نے کہا تھا۔ بات درست تھی۔ وہ کوئی بدتمیزی نہیں کرتا تھا، نہ فقرے کستا تھا، بس خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہتا تھا۔

شاہینہ ارادی اور غیر ارادی طور پر اس کی موجودگی کی عادی ہو گئی تھی۔ کبھی وہ جگہ بدل کر کھڑا ہوتا یا آنے میں دیر ہو جاتی تو اس کی نظریں بے اختیار چاروں اطراف اسے ڈھونڈنے لگیں۔

بالآخر بورڈ کے امتحان شروع ہوئے اور ہو کر ختم بھی ہو گئے۔ اسکول جانا بند ہو گیا اور اس لڑکے سے ملنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یمنیٰ ایک دن اس کے گھر آئی تو اس کی مٹھی میں اِک تہ کیا ہوا پرچہ دبا گئی۔

''تمہارا مجنوں ملا تھا۔ بہت اصرار کر کے اس نے کہا ہے تمہیں دینے کو۔'' شاہینہ نے پرچہ پڑھا۔ محبت و جنون کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ اس کی صورت نظر نہ آنے پر بے قراری رقم تھی۔ شاہینہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس طرح مہکتے لفظوں میں پہلی بار کسی نے اظہار کیا تھا۔ خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور دیوانگی درج تھی۔

''یہ تو بری طرح مرمٹا ہے تجھ پر...... جواب دے گی؟'' یمنیٰ نے بھی خط پڑھا تھا اور استفسار کرنے لگی۔

''میں ان خرافات میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' کاغذ کو مٹھی میں دبا کر توڑ مروڑ کر اس نے کمرے کے کونے میں پھینک کر کہا۔

''تجھے اس سے محبت نہیں ہے؟'' یمنیٰ کے استفسار پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے پھر میں تمہارا پیغام دے دوں گی اسے۔''

یمنیٰ کے جانے کے بعد اس نے ڈھونڈ کر مڑا تڑا کاغذ نکالا اور اس کی شکنیں دور کر کے پھر سے پڑھنے لگی۔ تکیے کے نیچے رکھے اس پرچے نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا۔

شعیب احمد کا نام ساری رات دماغ میں گھومتا رہا۔ اس سے پہلے وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھی۔ اگلی بار یمنیٰ پھر ایک پرچہ لے آئی۔ اس نے غالباً پہلے خط کے ساتھ کیا گیا سلوک سنا دیا تھا۔ تب ہی خط میں افسردگی تھی، مرجانے کی دھمکی تھی۔ اک بار ملنے کی درخواست تھی۔

''اسے کہہ دو پاگل نہ بنے...... ابو اور بھائیوں کو خبر ہو گئی تو جان سے جائے گا......'' اس نے یمنیٰ کو تلقین کی۔

''میرے سمجھانے سے نہیں سمجھنے والا ایسا کر تو اسے خط لکھ دے، میں دے دوں گی شاید وہ تیری بات مان لے۔'' یمنیٰ کے سمجھانے پر شاہینہ نے اسے خط لکھ کر سمجھانے کی سعی کی پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ یمنیٰ ڈاک

خانے کے فرائض انجام دینے لگی۔ کالج میں ایڈمیشن اوپن ہوگئے۔

میٹرک میں اس کے اچھے نمبر آئے تھے۔ کالج میں آسانی سے داخلہ مل گیا تھا۔ کورس مشکل تھا جس کے باعث اس کے گروپ نے نزدیکی کوچنگ سینٹر میں شام کی کلاسز لے لیں۔

شاہینہ کی حیرت اس وقت سوا ہوگئی جب اس نے شعیب احمد کو بھی اسی کوچنگ سینٹر میں دیکھا۔ یہ سینٹر اس کے علاقے سے بہت دور تھا۔ بعد میں شعیب نے بتایا کہ ایسا اس نے صرف شاہینہ کے لیے کیا تھا۔

دونوں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں کوچنگ کی کلاسز بنک کر کے اکثر وہ اور شعیب ڈیٹ پر چلے جاتے تھے۔ وہ اسی رنگ کے کپڑے پہنتی جو شعیب اسے کہتا۔ ایسے ہی بال بناتی جیسے اسے پسند تھے۔ ان دنوں اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ شعیب کے لفظوں سے تراشی گئی دنیا کا حصہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

حسبِ معمول اس روز بھی وہ کلاسز بنک کیے آئس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ جب اپنے دوستوں کے ساتھ شاہینہ کا بڑا بھائی بھی داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ شاہینہ خود کو چھپاتی وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' شعیب نے اس کی اڑتی رنگت پہ استفسار کیا۔

''بھائی اور اس کے دوستوں نے دیکھ لیا ہے ہمیں۔'' شاہینہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

بے شک وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی مگر اسے خبر تھی، اس کے والد اور بھائی ان معاملات میں کتنے سخت تھے۔

''اوہ...... پھر......؟'' شعیب بھی کسی قدر پریشان ہوگیا۔

''میں گھر جا رہی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئس کریم تو کھالو، میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔''

''نہیں پھر کسی نے دیکھ لیا تو مزید شامت آجائے گی، مجھے آٹو کروا دو۔'' شاہینہ کتابیں اٹھا کر باہر نکل آئی۔

گھر پہنچی تو خلافِ توقع فیروز صاحب گھر پر تھے۔ حالانکہ اس وقت وہ شاپ پر ہوتے تھے۔ بھائی نے دیر کیے بغیر بات ان کے کانوں میں ڈال دی تھی۔

بھائی اور باپ کی عدالت میں اس کی پیشی ہوئی۔ سخت فیصلوں کی دھمکی کے بعد اسے ایک موقع دیا گیا اپنی غلطی کو سدھارنے کا۔

دوسری طرف شعیب مسلسل رابطے میں تھا۔ یمنیٰ کے ذریعے اس نے گھر کا فون نمبر بھی لے لیا تھا۔ سب کے سو جانے کے بعد وہ شعیب سے بات کرتی تھی۔ پابندی اور مسلسل نگرانی کے باوجود وہ شعیب کے خیال کو دل سے نہیں نکال پارہی تھی۔

کوچنگ جانا بند ہوگیا تھا سو شعیب سے ملاقات کی سبیل نہیں بن رہی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے ملنے نہ آئی تو وہ زہر پی لے گا۔ ساری رات بے آرامی میں کٹی۔

ایک بار پھر یمنیٰ نے اس کی مدد کی اور اپنی جھوٹی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے شاہینہ کے ابا سے اجازت لینے چلی آئی تھی۔

وہ دونوں یمنیٰ کے گھر کے نزدیک آئس کریم پارلر میں ملے تھے۔ جہاں شعیب بے چین و بے قرار اس کا منتظر تھا۔ اس کے بغیر مرجانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ کورٹ میرج کی پیشکش کر رہا تھا۔ شاہینہ بھی اب اس دوری سے تنگ آگئی تھی۔ اس نے سوچنے کا ٹائم لے لیا۔ شعیب کی جنوں خیز محبت جس شدت سے شاہینہ کے دل میں جڑ پکڑ گئی تھی، وہ ایک کڑا فیصلہ کرنے پر راضی ہوگئی۔

ایک صبح وہ کالج کے لیے تو نکلی مگر کالج کے بجائے یمنیٰ کے گھر پہنچ کر اس نے یونیفارم چینج کیا اور ضروری سامان جو وہ پہلے ہی یمنیٰ کے ہاتھوں اس کے حوالے کر چکی تھی لے کر شعیب کے ساتھ بائیک پہ بیٹھ کر نئی

دنیا کے سفر پر نکل گئی۔ پیچھے رہ جانے والوں کے۔ سود وزیاں کا احساس کیے بغیر۔

کورٹ میرج کے بعد شعیب اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے آیا تھا۔ جہاں وہ دو دن رہے۔

''دوست اور اس کی گھر سے بھاگی معشوقہ کو تو میاں، بیوی کہہ کر دو دن ہمارے گھر رکھتا رہا۔ آنے دے تیرے باپ کو...... کرتی ہوں تیرا حساب کتاب......'' دوست کی ماں نے جب دوست کو رگیدا تو ناچار انہیں اگلی منزل کی طرف چلنا پڑا۔ تمام دوستوں نے ساتھ دینے سے معذرت کرلی تھی۔ شعیب کی جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ کوئی کرایے کا گھر افورڈ کرسکتا۔ وہ ایک ہفتے کی پکنک ٹرپ کے بہانے گھر سے دور تھا۔ بیچ سڑک پہ کھڑے رہنے سے بہتر اسے گھر جانا لگا۔

شاہینہ کو متعارف کرانے پہ صفیہ بیگم نے جتنی گالیاں دی تھیں یہ الگ قصہ تھا۔ جیٹھانی ہدیٰ کی طنز بھری باتیں شاہینہ کو باور کرا رہی تھیں کہ سفر دشوار ہے۔ شعیب کے والد انیس صاحب نے معاملے کو سلجھانے کے لیے شاہینہ کے والد سے رابطہ کیا تھا تا کہ دونوں گھرانوں کی عزت بنی رہے

''ہماری بیٹی، ہمارے لیے اسی وقت مرگئی جب اس نے آپ کے بیٹے کے ساتھ بھاگنے کے لیے گھر کی دہلیز عبور کی۔ ہماری دو بیٹیاں اور ہیں اور ہم کوشش کریں گے جو غلطی ہم نے آپ کی بہو کی پرورش میں کی وہ نہ دُہرائیں۔ اپنے بیٹا، بہو سے کہہ دیجیے گا کہ غلطی سے بھی ہمارے گھر کی طرف نہ آئیں ورنہ آپ کو ان کی لاشیں وصول کرنے کے لیے آنا پڑے گا۔ اپنے بیٹوں کو بہت مشکل سے روکا ہے، آپ کی طرف سے ذرا سی غلطی سے خون کی نہریں بہہ جائیں گی۔'' فیروز صاحب کے بے لچک رویّے پہ انیس صاحب کی آس دم توڑ گئی۔ شاہینہ نے بھی ساری گفتگو سن لی تھی۔ شاہینہ نے محبت کی بانہیں پکڑ کر جس راہ پہ قدم رکھا تھا اس سے اس کے پیر لہولہان ہونے لگے تھے۔ صفیہ بیگم اور جیٹھانی کی دل جلانے والی باتیں جب وہ شعیب سے کرتی تو وہ الٹا برہم ہونے لگتا۔ شعیب میں بھی بہت تبدیلی آنے لگی تھی۔

''پاگل ہوگیا تھا میں...... جب عشق، محبت، چاہت کا خمار چڑھتا ہے تو ساری سمجھ بوجھ چور دروازے سے بھاگ جاتی ہے۔ بہت بڑی غلطی کردی میں نے...... اپنی ساری زندگی داؤ پر لگادی، پڑھنے لکھنے کی عمر میں تم سے دل لگا بیٹھا۔ انٹر بھی کرپاؤں گا یا نہیں...... اٹھارہ سال کی عمر میں باپ بننے کی خوشخبری دے رہی ہو مجھے......'' شاہینہ کے خوشخبری سنانے اور اس کے رویّے پر گلہ کرنے پر شعیب پھٹ پڑا تھا۔

بہت جلد اس نے محبت کا چولا اتار پھینکا تھا۔ شاہینہ اپنی محبت کے ملبے تلے ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی عمر کون سی زیادہ تھی۔ پندرہ یا سولہ سال...... لیکن اب احساس ہورہا تھا کہ کتنے سالوں کا بھگتان بھگتنا ہے۔

رفتہ رفتہ شعیب کا نرم گرم رویّہ سخت تر ہوتا گیا۔ جن ہونٹوں سے فقط اس کے لیے پھول جھڑتے تھے ان سے نشتر نکلنے لگے جو شاہینہ کے دل میں پیوست ہوجاتے تھے۔

دیور کی شادی پر شاہینہ کو کتنی دل خراش باتیں سننے کو ملی تھیں یہ وہ ہی جانتی تھی سارا خاندان جمع تھا جب جیٹھانی کی بہن نے شاہینہ کو رگیدا۔

''ارے، تم بھی تو اپنی شادی کی وڈیو لاؤ، دیکھتے ہیں دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھیں۔''

''گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی شادی کی وڈیو کون بناتا ہے بھلا...... بات تو سوچ سمجھ کر کرو۔'' ہدیٰ نے بہن کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''دلہن بنتی ہیں ہائے نصیبوں والیاں......'' کسی نے تان لگائی تھی۔

کمرے کی حدت سب کی دبی ہنسی سے بڑھ گئی تھی۔ شاہینہ کے قدم من، من بھر کے ہوگئے۔ ٹی وی پہ چلتی شادی کی وڈیو کو اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ کچھ پل کچھ لمحے کتنے اہم ہوتے ہیں اور جب وہ ریت کی طرح ہاتھ سے پھسل جائیں تو ان کی محرومی پر آنکھیں سدا برستی رہتی ہیں مگر ان لمحوں کی کسک کبھی دل سے ختم نہیں ہوتی۔

ان باتوں کا ادراک کئی بار تکیہ بھگوتے شاہینہ نے کیا تھا مگر وقت بیت چکا تھا، اس نے اپنے لیے وقت کے کشکول سے فقط کنکر چنے تھے اور ان کنکروں کی چبھن شاہینہ کو تاحیات برداشت کرنی تھی۔

کائنات کی پیدائش کے بعد شعیب مزید پاگل ہوگیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب شعیب نے سلیولیس اور ماڈرن کپڑے پہنانے پہ پابندی لگادی۔ اسے لڑکیوں کے اسکول میں ڈالا۔ دو بیٹوں کے بعد بھی اس کا مزاج نہ بدلا...... کائنات کو دوست بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ اکیلے آنے جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس درجہ پابندی پہ شاہینہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”جس طرح میں اپنی بیٹی کو پال رہا ہوں اگر تمہارے باپ نے اسی طرح تم پر نظر رکھی ہوتی تو تم میرے ساتھ بائیک پر سیر سپاٹے نہ کر رہی ہوتیں...... وہ تو میں تھا جس نے شادی بھی کی اور تم جیسی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رکھا ہے۔ کوئی اور ہوتا ناں تو عیش کر کے پھینک چکا ہوتا اور تم کسی بدنام زمانہ جگہ کا حصہ ہوتیں۔ میں تمہارے باپ جیسی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔“ شعیب کے لفظوں کے شعلوں میں گھری شاہینہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

صفیہ بیگم الگ اس کی جان کی دشمن تھیں۔ وہ اکثر کونوں میں بیٹھی روتی رہتی تھی۔ کائنات کے ساتھ ہونے والی حق تلفی کی ذمے دار خود کو گردانتی تھی۔

کائنات اب چودہ سال کی تھی۔ وہ کہیں سے تین بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ شعیب نے اسے سسرال میں مقام دلانے کے لیے کچھ نہ کیا تھا۔ بلکہ تضحیک اڑانے میں وہ پیش، پیش ہوتا تھا۔ بیوی اور بچوں کا اس نے کسی محاذ پر ساتھ نہیں دیا تھا اور آج تو حد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

کائنات ہوش میں آچکی تھی لیکن اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو سوتا ظاہر کیا۔ شاہینہ اس کے سرہانے ہی بیٹھی تھیں۔ خضر اور میر بھی سہمے ہوئے اپنے کمروں میں تھے۔ صفیہ بیگم کو اس عالم میں بھی اپنی ضرورتوں کی پڑی تھی۔ وہ بیٹے سے بہو کی شکایت لگا رہی تھیں... پر شاہینہ ان سنی کیے بیٹھی رہیں۔

جی حضوری کی زندگی جی کر شاہینہ نے دیکھ لیا تھا۔ فقط ذلت ہی مقدر ہوئی تھی۔ ماں کی شکایت پہ شعیب نے آواز بھی دی پر وہ ان کے بلاوے کو بھی نظرانداز کر کے بیٹھی رہیں۔

ساری رات اپنا احتساب اور خود کو لعنت ملامت کرتے گزر گئی۔ صبح، رات کی طرح بوجھل تھی۔ صفیہ بیگم ناشتا وقت پر نہ ملنے پر آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔

”آپ جائیں میں ٹھیک ہوں، تھوڑی دیر میں اٹھتی ہوں۔“ کائنات کے سمجھانے پر شاہینہ کچن میں آگئی تھیں۔

”کون مرگیا، کس کا سوگ منا رہی ہو تم ماں، بیٹی۔“ ناشتا ان کے سامنے رکھا تو وہ حسبِ عادت زہر خند ہوئیں۔

شاہینہ نے باقی سب کا ناشتا بنایا۔ بیٹے اسکول جاچکے تھے۔ شعیب احمد ابھی تک سو رہے تھے۔ غالباً دکان جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ شاہینہ اپنا اور بیٹی کا ناشتا لے آئیں۔ بصد اصرار اسے تھوڑا سا کھلایا۔ اسکول کا ٹائم نکل گیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو مدِنظر رکھ کر شاہینہ نے چھٹی کرانا مناسب سمجھا تھا۔

”کل تو سمجھو حد ہی ہوگئی۔ ان بدبخت ماں، بیٹی نے میرے کاشان پہ بدکرداری کا بہتان لگایا۔ باقی کی تفصیل میں تمہیں آنے کے بعد سناؤں گی۔ بس تم چلی آؤ۔ بہت کڑا وقت گزرا کل مجھ پہ، بے وقوف ہوں جو گناہ کو پالتی آرہی ہوں۔ اسی وقت طلاق دلوا کے گھر سے باہر نکال پھینکتی تو آج ہمیں یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔“ صفیہ بیگم بیٹی کو فون پر سنا رہی تھیں۔

شاہینہ نے گزرتے ہوئے ان کے کلمات سننے

کے لیے قدم روک لیے تھے۔ عین اسی وقت شعیب بھی فریش ہو کر اسی طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی ساری باتیں سن لی تھیں۔ شاہینہ نے ایک تلخ نگاہ شعیب پر ڈالی۔ پھر اپنے معمول میں لگ گئیں۔

دن چڑھنے کی دیر تھی۔ شاہینہ کی دونوں نندیں آ گئی تھیں۔ آصف بھی شکار سے لوٹ آئے تھے اور انہوں نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شعیب سے جلد بات کریں گے۔ دیورانی کے کانوں تک بات پہنچی تو وہ بھی میکے سے لوٹ آئی۔ صفیہ سے کل کا احوال جاننے کے لیے چلی آئی۔

''خدا جانے کیسا نصیب ہے میرے بھائی کا، جب سے یہ منحوس اس کی زندگی میں آئی ہے کھا گئی میرے بھائی کی خوشیوں کو...... جب لڑکے کرکٹ، فٹ بال کھیلتے ہیں تب اس پر باپ بننے کی ذمّے داری آ پڑی...... تعلیم ادھوری چھوڑ کر کاروبار میں لگ گیا۔ اکتیس سال کی عمر میں چودہ سال کی بیٹی ہو گئی۔ اور اب بیٹی کے کرتوت دیکھو......'' بڑی نند بھائی کو پاس بٹھائے غالباً اس کی نادیدہ خوشیوں کا ماتم کرنے آئی تھیں۔ جو بیان کر کر کے ماتھا پیٹ رہی تھی۔

''گھر میں تو اب تمہاری بیٹی کھپے گی نہیں...... اتنا کچھ ہونے کے بعد آصف بھائی اور بھابی تمہاری بیٹی کو پوچھیں گے بھی نہیں...... تم کسی راہ چلتے سے بیٹی کے دو بول پڑھا کر رخصت کرو، ورنہ ماں کی طرح کوئی چاند چڑھا کر زندہ درگور کر جائے گی تمہیں، بھائیوں کے بیچ تو یوں بھی پھوٹ ڈلوا دی۔'' چھوٹی بہن، شعیب احمد کو صلاح دے رہی تھی۔

''کسی کی بچی کے بارے میں ذکر کرتے اپنی اولاد کو نہ بھولو، کائنات بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے کاشان پر بالکل اعتماد نہیں۔'' اسد نے ناگواری سے ٹوکا تو آخری جملے پہ سب اس کے سر ہو گئیں۔ کچن میں ان سب کے لیے کھانے کا اہتمام کرتی شاہینہ اور پیڑھی پہ سر جھکائے بیٹھی کائنات ساری گفتگو سن رہی تھی۔

دعوتی کھانا کھا کر اپنی، اپنی زبانوں سے زہر ان

غزل

محبت کا شکستہ پن نظر کیا آئے باہر سے
یہ دیمک تو بدن کو چاٹتی رہتی ہے اندر سے
میری ترتیب میں صحرا مزاجی کارفرما ہے
بجھے کی پیاس کیا میری بھلا اشکوں کے ساگر سے
تمہارے ہجر کا یہ دردِ سر تو مستقل ٹھہرا
مجھے لگتا ہے جاں لے کے یہ اترے گا مرے سر سے
تیری دہلیز پر میں منتظر اپنی نہ رہ جاؤں
یہی سب سوچتی ہوں لوٹ آتی ہوں تیرے در سے
ثمینہ مسئلہ یہ ہے میری قامت سے کمتر ہے
ہمیشہ پیاس پی کر لوٹ آتی ہوں سمندر سے

کلام: ثمینہ سید، لاہور

کے جسموں میں انڈیل کر سب باقی کا وقت اوپر گزار کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

رات نے تاروں بھرا آنچل اوڑھ لیا تھا۔ سب سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ شعیب ٹی وی پہ نیوز دیکھ رہے تھے۔ چائے کا مگ ان کے سامنے رکھتی شاہینہ کمرے کی بکھری چیزوں کو جگہ پر رکھ رہی تھیں۔

دروازے پر دستک دے کر کائنات اندر آ چکی تھی۔

''کچھ چاہیے بیٹا......؟'' شاہینہ اسے دیکھ کر چونکیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ، بیٹی دونوں کا سامنا ہو۔ مگر اب کائنات خود چلی آئی تھی۔

''میں ابو سے کچھ کہنے آئی تھی۔ آپ مصروف تو نہیں ہیں، بات کر لوں؟'' شاہینہ کو جواب دے کر وہ باپ کی طرف آ گئی۔ شعیب گہری نظروں سے کائنات کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ آج اس کے انداز میں جو خود اعتمادی نظر آئی وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی انہوں نے۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بعد میں بات کر لینا۔'' شاہینہ نہیں چاہتی تھیں کہ شعیب کے تلخ لفظوں سے مزید اس کی روح چھلنی ہو۔ شعیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کائنات سے کہا۔

''بولو......!''

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو اور دونوں بھائیوں کو نا کردہ گناہوں کی سزا پاتے دیکھا۔ ہر ظلم، ہر زیادتی پہ ہمارے لیے کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ آپ آقا بن کر ہمارے نصیبوں کا فیصلہ کرتے رہے اور میں سر جھکا کر مانتی رہی کہ آپ میرے والد ہیں۔ آپ کی ڈانٹ پھٹکار سہتی رہی کہ یقین جو تھا آپ میرے لیے شجرِ سایہ دار ہیں۔ زمانے کی ہر سرد گرم سے مجھے بچائیں گے لیکن کل میرا یقین پاش، پاش ہو گیا ابو...... آپ نے اعتبار کی چادر میرے سر پر نہیں ڈالی......'' کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔ صرف کائنات کی بے تاثر آواز تھی۔ چوٹ اس کے ننھے دل پر لگی تھی۔ جس کی صدا کمرے میں گونج رہی تھی۔

''جب پیدا کرنے والے کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں باہر والوں سے کیسے عزت طلب کروں...... سب آئے میرے کردار پہ انگلی اٹھانے اور سب نے مجھے بہت اچھے القابات سے نوازا...... اپنے بہن، بھائیوں کے آگے آپ نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لفظ بھی نہیں نکالا...... کیونکہ آپ کو بھی مجھ پر اعتبار نہیں...... میں اگر سولی بھی چڑھ جاؤں گی تو بھی آپ کو اپنے حق میں بولنے پر راغب نہیں کر سکوں گی...... وجہ آپ اور امی کا ماضی ہے...... جہاں آپ نے ایک لڑکی کو محبت کے سپنے دکھا کر، ورغلا کر اسے گھر بدر کرایا اور پھر سب کے ساتھ خود پتھر مارنے لگے۔''

شاہینہ کے لب سل گئے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر ٹک گئیں۔ کائنات کے اندر کون سا آتش فشاں پھٹ چکا تھا وہ لاعلم تھیں شعیب بھی دم سادھے بیٹھے تھے۔

''جو گناہ، جو جرم آپ دونوں نے کیا تھا اس کی سزا اس عورت نے بھگتی۔ گالیاں، کوسنے، ذلت سب اس عورت کا مقدر بن گئے، اور واقعی یہ اس کی حق دار بھی ہیں...... یہ بے وقوف' عاقبت نا اندیش تھیں۔ جنہوں نے ایک مرد کی باتوں میں آ کر نہ صرف اپنی بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ نہ پیچھے رہ جانے والوں کے درد، تکلیف کا سوچا، نہ ان کی محبت کا صلہ دیا۔ خود غرضی سے صرف اپنے لیے سوچا...... آپ دونوں نے کبھی ہم بچوں کی محرومی کا گمان بھی کیا ہے؟'' وہ کسی پچیس سالہ لڑکی کے مانند...... بے تکان بولے جا رہی تھی۔

''جب بچے نانا، نانی، خالہ، ماموں ان کی محبتوں کا ذکر کرتے ہیں، چھٹیاں بتانے جاتے ہیں تب ہمارے اندر کیسی محرومی پیدا ہوتی ہے جانتے ہیں آپ لوگ...... دنیا کی ہزار نعمتوں کے باوجود جس کے پاس رشتوں کی دولت نہیں ہو وہ خود کو کتنا قلاش گردانتا ہے، جانتے ہیں آپ لوگ؟'' دونوں کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

شعیب کا دل تھا اس جرأت پہ کائنات کو دو تھپڑ لگائے مگر اس میں بالکل ہمت نہیں تھی۔

''سب نے آپ کو جلد سے جلد میری شادی کا مشورہ دیا لیکن میں اپنے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے پڑھنا ہے، بہت سارا پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے کیونکہ میں جان گئی ہوں باپ، بھائی، شوہر...... بچے، عورت کا کوئی سہارا نہیں بنتا...... اسے اپنے لیے خود مضبوط ہونا پڑتا ہے۔ آپ بھلے مجھ پر لاکھ پابندیاں لگائیں، گارڈز کے ساتھ مجھے تعلیمی ادارے بھیجیں مجھے کوئی پروا نہیں، میں پڑھوں گی شعور حاصل کروں گی۔''

وہ کچھ لمحے رک کر دوبارہ گویا ہوئی۔

''مرد اور شادی...... یہ دونوں چیزیں میرے لیے غیر اہم ہیں، میں نفس پرست نہیں ہوں، بھلے میں یہاں بیٹھی بوڑھی ہو جاؤں لیکن میں کبھی آپ لوگوں کی حرکت نہیں دُہراؤں گی۔ کیونکہ مجھے میری آنے والی نسلوں کی فکر ہے۔ کل کو انہیں یہ نہ سننا پڑے۔

''ارے اس کی ماں بھاگ کر آئی ہے، اس کے باپ نے اس کی ماں کو بھگا کر شادی......''

شادی جیسے مقدس لفظ کو میں اپنے اور اپنی نسلوں

کے لیے گالی نہیں بنانا چاہتی۔ مجھے سکون سے پڑھنے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے آپ کو شکایت کا موقع جس دن بھی ملے ثبوت کے ساتھ آپ میرا سر قلم کردیں۔ میں اُف نہیں کروں گی..... لیکن کسی کی الزام تراشی کی پاداش میں مجرم نہیں بنوں گی' نہ سزا جھیلوں گی..... تعلیم کے بعد آپ لوگ جس سے چاہیں، جہاں چاہیں میری شادی کردیں میں آپ لوگوں کے حکم کی تعمیل کروں گی..... اب بھی میں تعلیم کی قربانی دے کر سزا کے طور پر شادی کر سکتی ہوں لیکن ناکردہ گناہوں کی سزا پہ ساری زندگی صرف سسکتی رہوں گی۔ اور میں اتنی مضبوط نہیں کہ اپنے کردار پہ لگا بدنما داغ برداشت کرسکوں..... میں کائنات شعیب ہوں..... شاہینہ فیروز نہیں۔''

مضبوط لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے کائنات رکی نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔ دو نفوس کے ہوتے ہوئے بھی کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔

☆☆☆

شعیب میں ملنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے جانے کیسے سو رہے تھے۔ شاہینہ کو نرم گرم بستر کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا..... انہیں کسی کل چین نصیب نہیں تھا۔

گھر کے پچھلے حصے میں آ کر وہ کھلے آسمان تلے گھٹنوں کے بل کچی زمین پر بیٹھ گئیں۔ اِک دل خراش چیخ لبوں سے آزاد ہوئی اگر یہ چیخ اندر دب جاتی تو شاید ان کے دماغ کی نسیں پھٹ جاتیں۔

پندرہ سال ہو گئے تھے انہیں یہ ذلت بھری زندگی گزارتے۔ منہ زور جذبوں نے ان کے مقدر میں سیاہی لکھ دی تھی۔ ہزار بار وہ روئی تھیں مگر آج جس تڑپ کے ساتھ آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ کائنات کے لفظوں کے باعث تھے۔

معصوم، کم سن سی چودہ سالہ لڑکی جب بول رہی تھی تو لگ رہا تھا کہ چونتیس سالہ کوئی عورت بول رہی ہے۔ اتنی سمجھ بوجھ تھی اس میں..... اور اس سے اس کی معصومیت چھیننے والے کون تھے، اس کے والدین جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات اور جذباتیت کے ہاتھوں ایک نسل کو دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

آنسوؤں سے شاہینہ کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ تب ہی ان کے ہاتھ پہ اک ہاتھ آ پڑا تھا۔

''کائنات!'' پکار دل سے نکلی تھی۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ شعیب تھے..... تھکے اور پژمردہ.....

''ماں بچوں کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور میرا وجود میرے بچوں کے لیے ایک بدنما داغ کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' وہ پھر تڑپ کر رو پڑیں۔

''جتنی قصوروار تم ہو، اتنا ہی میں بھی ہوں۔ لیکن کائنات نے سچ کہا ناں سزا صرف تم نے بھگتی۔'' ان کے ہاتھوں پہ دباؤ ڈالتے شعیب نے اعتراف کیا..... شاہینہ کے آنسو تھم گئے۔ وہ اقبالِ جرم کر رہے تھے۔ اس جرم کا جس کی وہ اکیلی عمر قید کی سزا بھگت رہی تھیں۔

''معافی تلافی، گناہ سزا کو پیچھے چھوڑ کر، کیا ہم آنے والے کل میں اپنے بچوں کے لیے خوشی کشید نہیں کر سکتے؟ ان کے معصوم ذہنوں سے تلخ یادوں، باتوں کو مٹانا مشکل سہی، کیا ہم کچھ اچھی یادیں نہیں بنا سکتے.....؟'' شعیب آس سے پوچھ رہے تھے۔ کائنات کے بے تاثر لیکن نم لہجے نے انہیں عرقِ ندامت میں بھگو دیا تھا۔ شاہینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اِک نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔ بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ شعیب کی ہدایت پر شاہینہ نے سب کا ناشتا ساتھ ہی لگایا تھا۔ صفیہ بیگم اپنی ٹرے لیے صوفے پر چڑھ بیٹھی تھیں۔ شعیب بھی اپنے کمرے سے تیار آ گئے تو تینوں بچوں کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ دیر سے اٹھتے تھے۔ آج تک شاید ہی انہوں نے بچوں کے ساتھ ایک وقت بیٹھ کر کھایا ہو۔

''تم بھی آ جاؤ۔'' شاہینہ کو چائے لاتا دیکھ کر شعیب نے ہدایت دی تو صفیہ بیگم بھویں اچکا کر دونوں

کو دیکھنے لگیں۔

''جتنی تم تینوں بچوں کے ساتھ زیادتی ہو چکی اس کا ازالہ تو شاید ممکن نہیں لیکن میں کوشش ضرور کروں گا۔ اگر تم لوگ اپنے اسکول سے خوش نہیں ہو تو مجھے بتا دینا میں دوسرے اسکول میں ایڈمیشن کرادوں گا۔'' بچے حق دق باپ کو دیکھے گئے۔

''کائنات! تم پر بھائیوں کے ساتھ آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے، تم ماشاء اللہ بہت سمجھدار بچی ہو میری۔'' شعیب نے کہتے ہوئے اسے ساتھ لگا لیا تو اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

جوشِ جذبات میں رات وہ جانے کیا، کیا کہہ گئی تھی۔ دل میں ڈر بھی تھا مگر جو ہو رہا تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔

''یہ کون سا نیا ناٹک ہے بھئی۔'' صفیہ بیگم نے تیر پھینکا۔

''میں لنچ تم لوگوں کے ساتھ کرنے آؤں گا۔ پھر شام کو ہم باہر جائیں گے، ڈنر باہر کریں گے۔ شاپنگ، پارک جہاں تم تینوں کہو گے وہاں جائیں گے۔'' صفیہ کی بات نظر انداز کر کے شعیب بول رہے تھے۔ تینوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

''میری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیا، جو اس بدذات، گھر سے بھاگی ہوئی عورت کے بچوں کے چونچلے اٹھانے کو باؤلے ہوئے جا رہے ہو۔'' صفیہ بیگم تڑے پٹخ کر تنک کر بولیں۔ شعیب کے ماتھے کی لکیریں گہری ہونے لگیں۔

''اماں یہ عورت گھر سے کسی اور کے لیے نہیں میرے لیے بھاگی تھی۔ میرے کہنے پر...... اور یہ میرے بھی بچے ہیں، مجھے ان کے نازنخرے اٹھانے ہیں۔ آئندہ آپ میرے بچوں کو ان کی ماں کے نام کا طعنہ نہیں دیں گی...... اور نہ میں اب شاہینہ کے لیے کوئی غلط بات سنوں گا، یہ میری بیوی ہے۔'' شعیب نے قطعیت سے کہا۔

''آپ ایک جگہ رہ کر قنوطیت کا شکار ہو گئی ہیں، کچھ دن اسد اور آصف بھائی کے پورشن میں بھی رونق بخشنے جائیں۔ ہدیٰ اور نگہت بھابی کو بھی خدمت کا موقع دیجیے...... شاہینہ یوں بھی پھوہڑ اور سست عورت ہے بقول آپ کے۔'' شعیب کی صلاح پہ صفیہ بیگم کو آگ لگ گئی۔ وہ بڑبڑانے لگیں۔

''جلدی کرو...... دیر ہو جائے گی۔ اسکول سے۔'' شاہینہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے تینوں کو جلدی کرنے کو کہا۔

''آج میں خود ڈراپ کروں گا اپنے بچوں کو......'' گاڑی کی چابی اٹھاتے شعیب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''شاہینہ! تم بھی چلو...... اسی بہانے صبح کی تازہ ہوا میں سانس بھی لے پاؤ گی۔'' شاہینہ پیروں میں چپل ڈالے کھڑی ہو گئیں۔

''شعیب! مجھے تم سے کل کے قصے کے متعلق بات کرنی ہے۔'' آصف اوپری منزل سے نیچے آرہے تھے۔ جب وہ سب نکلنے لگے تھے۔

''مجھے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ کاشان میرا سگا بھتیجا نہ ہوتا تو اب تک میں اس کا خون کر چکا ہوتا۔ آئندہ اس قسم کی حرکت تو دور، بری نظر ڈالنے پر بھی میں سارے رشتے بھولنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ مجھے اپنی بچی پر مکمل بھروسا ہے۔ چلو......''

شعیب نے رک کر آصف کو سخت لفظوں میں تنبیہ کی۔ کائنات کا سر بلند ہو گیا تھا۔ سب تھوڑے فاصلے پر موجود اسکول کی طرف سفر کر رہے تھے۔ ان پانچوں کی زندگی کی یہ حسین صبح تھی۔ چند کلومیٹر کا سفر ان کی زندگی کا یادگار سفر بن گیا تھا۔

شاہینہ نے بھی کھل کر فضا میں آسودگی سے سانس لی تھی۔ ان کی ذات پر لگا بدنما داغ دھلا تو نہیں تھا۔ مگر مان، محبت، آسودگی، اعتبار کے عکس سے دھندلا ضرور گیا تھا۔

دیا جلتا رہا

سیما بنت عاصم



"سن رہے ہیں ناں ابا..... کُل ملا کے چالیس، پینتالیس ہزار ماہوار سے زیادہ کا خرچ بنتا ہے..... مکان کا رینٹ، بچوں کی فیس، کچن کا راشن اور گوشت ترکاری الگ..... یہ سب اس کے علاوہ بل اور اوپر کے خرچے..... کیا یہ سب صرف آپ کا ہی سر درد ہے..... اس دور میں ایک نہ دو، سات افراد کے کنبے کو سپورٹ کرنا آسان کام ہے بھلا..... ماں، باپ کی اگر جائداد ہے بھی تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ بھیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہے..... کتنی بار کاروبار کرائے، ڈبو دیے، لاکھوں کی تعلیم خاک کردی..... اب ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کہ شاہی نوکری کوئی تھال میں سجا کے پیش کرے تو راجا صاحب کھسکیں..... صاف بہانے ہیں، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی..... میں تو کہتی ہوں انہیں ان کے کنبے سمیت انہی کے حال پر چھوڑ دیجیے..... جب سر پر پڑے گی تو خود ہی بھگتیں گے۔ یوں مفت کے نوالے کھلا، کھلا کے انہیں ناکارہ بنانے والے بھی ہم خود ہی ہیں۔" سبین کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ سفید براق کرتا پاجامے میں ایزی چیئر پر جھولتے سگریٹ کے

کش لیتے افتخار صاحب تائیدی انداز میں سر ہلاتے بیٹی سے صد فی صد متفق نظر آرہے تھے۔ صفیہ بیگم لب بھینچ کر اٹھ گئیں۔ سبین کی ساری باتیں اپنی جگہ درست سہی مگر وہ صرف سبین ہی نہیں ثمیر کی بھی ماں بن کر سوچتی تھیں۔ ہر ماہ ان کی آمدنی کے دس فی صد سے نہ جانے کتنے گھروں کا چولھا جلتا تھا۔ پھر ثمیر تو ان کا اپنا بیٹا تھا۔

سبین کی ان ہی باتوں کے سبب ان کے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا...... سارہ ان کی اکلوتے بیٹے ثمیر کی من پسند سہی مگر اس نے خود کو ان کی منشا کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی...... جبکہ ان کی اپنی بیٹی سبین منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والوں میں سے تھی۔

افتخار صاحب خود اِک شپنگ کمپنی سے ریٹائرڈ تھے اور صفیہ بیگم نے تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ کر پچیس سال بھگتائے تھے مگر اس کا کیا، کیا جائے کہ سبین کو سارہ کے مڈل کلاس ہونے سے پرخاش تھی، اسے والدین کی دولت کا زعم تھا، وہ دنیا کو پیسے کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتی اور اسی کی بدلت دوسروں کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کی خواہش مند رہتی، چاہے وہ اس کا اپنا خاوند ہی کیوں نہ ہو...... شہزاد سے سبین کی مکمل ارینج میرج تھی۔ اب اسے سبین کی قسمت نہیں تو اور کیا، کہا جائے کہ بیس، پچیس ہزار ماہوار کے ملازم شہزاد کو شادی کے فوراً بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے ملازمت کی آفر ہوئی تو اس میں افتخار صاحب کے تعلقات کا بھی بڑا کمال تھا۔ اور سبین کی دوررس نظروں نے یقیناً اس کی علمی قابلیت کے بموجب اس کا شاندار مستقبل ہی جانچا تھا۔ چند ہی سالوں میں شہزاد اپنی فیملی کا ذمہ انہیں سونپ کر تین سال کے کانٹریکٹ پر دبئی سدھار گیا تھا......اور یہیں سے سارا بگاڑ شروع ہوا......سارہ، سبین کے طعنوں تشنوں، بلاوجہ کی روک ٹوک اور نکتہ چینیوں کو صبر کے گھونٹ پی کر جھیلتی تو صرف صفیہ بیگم کی ہدایت کے سبب کہ وہ سدا سے سارہ کے لیے ساس سے بڑھ کر اِک ہمدرد رہنما بن کر رہی تھیں۔ اتنا تو صفیہ بیگم بھی جان ہی گئی تھیں کہ شہزاد کی امید کا محور و مرکز سبین سے بڑھ کر اس کے والدین کا پیسہ تھا...... جس کی سبین برابر کی وارث تھی کہ کل دو ہی اولاد تو افتخار صاحب و صفیہ بیگم کی کائنات تھیں یعنی ثمیر اور سبین، اس پر سبین نے باپ کو مٹھی میں بھی لے رکھا تھا، وہ اسی کے کانوں سے سنتے اور اسی کی بولتے تھے۔ اور یہیں آکر ثمیر اور اس کی فیملی کا استحصال ہوتا تھا بہت جلد ان کی گھر میں خانہ جنگی کی سی صورتِ حال چل پڑی تھی۔

خیر سبین کی باتیں کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھیں......ثمیر کی طبیعت میں سدا سے بے پروائی و...... بے نیازی رہی تھی...... جس کے سبب وہ کبھی کہیں قدم نہ جما پایا تھا۔ گھر کا نظام سدا سے صفیہ بیگم کے ہاتھ تھا، سو ہنوز رہا...... رفتہ، رفتہ ثمیر کے کنبے کا بار بھی ان ہی کے سر پر پڑا تھا......ایک دو بھی نہیں پورے پانچ بچے...... اخراجات کا انبار......اور اس سب کے سبب جو چخ، چخ سر اٹھاتی......انہیں مرچ مسالا لگا کر ہائی لائٹ کرتے رہنے میں سبین کو کمال حاصل تھا......اور آخر کار اسی سب کی بدولت ان کی فیملی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

سبین کا شوہر، شہزاد پیسے سے پیسہ بنانے والا آدمی تھا، اسی کی دی ہوئی تجویز سے افتخار صاحب نے اپنے ہزار گز کے بنگلے کے کئی پورشن بنا کر کرایے پر اٹھائے تو کئی لاکھ کی آمدنی کی سبیل نکل آئی لیکن ثمیر بیچارے کو...... کرایے کے گھر پھینکنے میں ان کے اخراجات سے دامن بچانے کی ترکیب بھی انہی کے دماغ کی تھی......خود افتخار صاحب و صفیہ بیگم اپنا اسباب سمیٹ کر سبین کے تین کمروں کے فلیٹ میں اٹھ آئے تھے۔ شہزاد کے دبئی سدھارنے کے بعد مانو سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا تھا۔ سبین نے دوسراہٹ کے بہانے انہیں اپنی جانب کھینچ کر ثمیر کی فیملی کا بار نہ صرف اس کے سر پر ڈال دیا تھا بلکہ ہزار گز کے بنگلے کو ان کی آمدنی کا وسیلہ بھی بنا دیا تھا۔ اور اس سب میں مارے گئے تو بیچارے ثمیر و سارہ...صفیہ بیگم و افتخار صاحب کا جو پیسہ ان کی زندگی بھر کی محنت کا نچوڑ تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اب کہیں سکھ کی چھاؤں

لینے کا وقت آیا تو بے خبری میں دُہری ذمّے داری کا باران کے سر پر آپڑا تھا۔

بیٹا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ذمّے داریاں اٹھانے میں ناکام رہا تھا کہ اس کے مطلب کی نوکری ہی نہیں مل پارہی تھی۔

☆☆☆

''پھر کیا ہوا امی......؟'' غزالہ کے برابر لیٹی سات سالہ زینب خوف سے اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ہونا کیا تھا، لکڑہارا ہر روز یہ منظر دیکھتا کہ شیر شکار کر کے لاتا، اسے بھنبھوڑ کے کھاتا اور بچا کھچا وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، تب جھاڑیوں میں چھپا معذور گیدڑ کھسک کھسک کر باہر آتا اور اس بچے کھچے سے اپنا پیٹ بھرتا۔ لکڑہارے نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اِک معذور گیدڑ کی خوراک کے لیے اس شیر کو وسیلہ بنا رکھا ہے تو اسے ہر روز اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اس نے اپنے اوزار سمیٹے اور گھر کو لوٹ آیا...... ایسی ہی غیبی امداد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا...... مگر یہ کیا...... ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ گزر گیا...... مسلسل فاقے سے لکڑہارے اور اس کے بیوی بچوں کا دم لبوں پر آگیا...... تب لکڑہارے نے رب سے شکوہ کیا، اے پروردگار یہ کیا...... تو نے ایک معذور گیدڑ کے لیے تو رزق کی سبیل بنادی...... مگر میں تیرا عاجز بندہ، تجھ پر توکل کر کے بیٹھ گیا تو بھوکا مر رہا ہوں؟ اسی وقت غیب سے آواز آئی...... اے نادان، تو نے گیدڑ اور شیر کی مثال سے گیدڑ کی زندگی کو چنا، بجائے اس کے کہ تو شیر بن کے دوسروں کے لیے وسیلہ بنتا تو معذور گیدڑ بن کے رب کی امداد کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ یاد رکھ، پروردگار بھی اس انسان کے حالات بدلتا ہے جو خود اپنے حالات بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی دوسروں کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے چنتا ہے۔'' وہ آنکھیں موندے کہانی سناتی خود بھی نیم غنودگی میں تھی۔ تب ہی سرہانے آہٹ ہوئی۔

''امی، زینب سوگئی......'' علی نے غزالہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سرعت سے اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔

''تم آگئے......'' اس نے چندھیائی نظروں سے قد اٹھاتے سپوت کو دیکھا تھا۔ کیا شے ہوتے ہیں یہ بیٹے بھی...... مائیں ان کی بابت خواب دیکھتی کتنی دور نکل جاتی ہیں...... علی اس کا پہلا بیٹا تھا اور اس کی آمد کی نوید پر سلیم خود بھی کتنا مسرور و شاداں نظر آتا تھا۔

''اے سنتی ہے...... جب ''وہ'' آئے گا ناں تو دیکھنا ہم دونوں باپ، بیٹا مل کر تجھے کتنا ستائیں گے۔''

اور اس کی ایک بات جو اسے رہ، رہ کر یاد آتی...... ''جب وہ بڑا ہو جائے گا ناں تو میں اسے بھی ڈرائیوری سکھاؤں گا۔'' اور سلیم کے فرشتوں کو بھی کیا خبر تھی کہ وہ وقت آنے تک زندگی ہی دغا دے جائے گی...... سلیم کمپنی کا لوڈنگ ٹرک چلاتا تھا...... بس ایک حادثہ جو اس کی ساری خوشیوں کو نگل گیا...... سلیم کے ٹرک کا اِک ٹرالر سے تصادم شاید یہی قسمت ہے، انسان جو سوچتا ہے، وہ ہوتا نہیں ہے، علی کی عمر ابھی چودہ برس تھی، اس نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھا کر کسی کمپنی میں لگا دیا تھا۔

مکان کا کرایہ، بچوں کے تعلیمی و دیگر اخراجات، سب سے بڑھ کر پیٹ کا ایندھن سر سے سایہ کیا اٹھا تھا لگتا تھا زندگی اپنے منوں وزن سمیت اس کے سر پر آپڑی تھی۔ خود وہ گھر، گھر جا کر اوپری کام نمٹاتی، چند ہی سالوں نے اسے نچوڑ ڈالا تھا۔ چار بچوں کے ساتھ بیوگی کا عذاب......

سسرال برائے نام تھی...... اور میکا تو شاید بیٹی کو وداع کرتے ہی پرایا ہو جاتا ہے، اب وہاں پرایوں کا ہی راج تھا، بھاوجوں کی حکومت تھی، ماں کی حیثیت معزول حکمران کی سی تھی۔ بچے چھوٹے تھے، باپ کی بابت پوچھتے اور وہ، وہ سوال جن کے جواب اسے تو کیا اس فرشتوں کے پاس نہیں تھے، وہ ان کی امیدوں کو نہیں توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ سو ہزار جگہ بہلاوے دیتی۔

زینب لاڈلی کو اب بھی یہی امید تھی کہ اِک روز ان کا باپ پردیس سے ڈھیروں ڈھیر تحائف لے کر لوٹے

گا، ان کی فرمائشوں پر اس کی زندگی تنگ پڑتی تھی۔

موسم سرما کی آمد، آمد تھی۔ اسکول میں نئے سیشن کا آغاز ہونے کو تھا اور ان سب نے مل کر ماں کی جان کھارکھی تھی۔ وہ ہزار جگہ انہیں امیدیں تھماتی، تھک جاتی، ہار جاتی...... مگر حوصلہ نہ چھوڑتی اور علی کہتا، اِک دن وہ، اس کے سارے دکھ درد دور کردے گا۔ وہ ہنس دیتی...... مڈل پاس کوئی افسر، منسٹر تو لگنے سے رہا۔

☆☆☆

مال کے مختلف کاؤنٹرز پر ٹرالی دھکیلتی سارہ نے اِک نظر ہاتھ میں تھمی خریداری کی لسٹ اور دوسری شاپنگ کی ٹرالی پر ڈالی تھی۔

وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنی ساس صفیہ بیگم کی دستِ نگر تھی، یہ بات کبھی اس کے ذہن و دل سے محو نہیں ہوتی تھی۔ سو وہ ہمیشہ اپنے وسائل محدود رکھتے ہوئے ہاتھ کھینچ کے ہی چلتی۔ مہینے کی اولین تاریخوں میں کچھ دن صفیہ بیگم کا قیام سارہ و ثمر کے گھر رہتا...... وہ سارے اخراجات بھگتا کر ہی لوٹتیں۔

سارہ نے کبھی کسی معاملے میں ان سے سوال نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے خود کو اور نہ ہی بچوں کو آسائشات کا عادی بنایا تھا...... ان کی تعلیم پر ہزاروں کا خرچ تھا۔ وہ اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے...... پوش علاقے کے دو سو بیس گز کے گھر کا رینٹ بھی کم نہیں تھا...... اور صفیہ بیگم کا اتنا کرنا بھی بہت تھا...... وہ ہمیشہ سے بہو کے لیے ساس سے بڑھ کر رہنما رہی تھیں...... سنا تھا کہ میکا ماں سے ہوتا ہے اس کی ماں نہیں تھی، کوئی بہن نہ تھی گویا پیچھے کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اور ثمیر کا بس ایک جملہ......

”تمہیں یہاں تک لانا میرا کام تھا اب ان سب کے دلوں میں جگہ بنانا تم پر ہے۔“ سو سارہ نے ان سب کو اپنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر بات وہیں آکے رکتی ہے کہ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ سارہ کے لیے زندگی تنگ پڑتی تو اس کی نند کے رویّے اور اس کی لے دے کے سبب...... سبین جیسی اسٹیٹس کانشس لڑکی نے شہزاد جیسے معمولی آدمی کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کے لیے اپنایا تھا۔ تو شہزاد کی نظریں بھی بیوی سے بڑھ کر اس کے والدین کی لاکھوں کی جائداد پر تھیں...... وہ ہلکی پڑتی تو اپنی کم مائیگی سے بڑھ کر ثمیر کے ناکارہ پن کے سبب، ثمیر کے اپنے لیل و نہار تھے...... کھانا، سونا، عیش کرنا، گھنٹوں نیٹ پر جاب سرچ کرتا اِدھر، اُدھر کے تعلقات‘ سیر و تفریح...... وغیرہ، وغیرہ......

ماں، باپ دونوں نے خود کئی جگہ اس کی جاب کی کوشش کی، لاکھوں لگا کر انسٹیٹیوٹ‘ کو چنگ کھلوا کر دیے...... مگر وہ اپنے انہی خواص کے سبب سب ٹھپ کردیتا...... لاکھوں کی جائداد کے وارث کے بچوں کا نصیب کھینچ تان تھی تو یہ وقت تھا اور ثمیر اس وقت کا منتظر تھا جب سب کچھ اس کا ہوتا...... اور یہی بات ساری خرابی کی جڑ تھی۔

سارہ نے برا وقت جھیلا تھا اور جھیل رہی تھی...... برے وقت کی سفاکیوں سے واقف تھی...... سو غزالہ اس کی دوست ہر وقت اس کے ذہن میں گھومتی، کبھی ایک کی جگہ دو چیزیں آجاتیں تو اگلی پر غزالہ کے نام کی مہر ہوتی...... یہی دوستی ہے، اب بھی پندرہ سو نکل ہی آئے...... اس نے کچھ ضروری سامان کا اِک شاپر الگ سے بنالیا...... اور ٹرالی کا سامان لے کر مال سے نکل آئی۔

☆☆☆

”پھر کیا تھا...... بیٹے نے باپ سے جو دوستی کا مطلب پوچھا تو باپ اسی اندھیری رات میں اسے لیے اِک جانب چل پڑا...... کئی کوس چل کر اِک گاؤں پہنچا اور اِک دروازے پر دستک دی اندر سے آواز آئی کون ہے، اس نے کہا میں ہوں تمہارا دوست اور اپنا نام بتایا...... پھر خاموشی چھا گئی...... دروازہ بڑی دیر نہ کھلا...... بیٹے نے باپ کو طنزیہ نظروں سے دیکھا اور کہا ’یہ ہے دوستی......؟“

”تو امی پھر کیا ہوا؟“

”ارے سنتی تو جاؤ......“

”باپ نے اسے کچھ صبر کا اشارہ کیا، کافی دیر بعد دروازہ کھلا اور دوست باہر آیا اور کہا۔

”تاخیر پر معذرت چاہتا ہوں میرے دوست، دراصل تم نے رات کے اس پہر دستک دی تو مجھے لگا میرا دوست کسی مصیبت میں ہے...... سو میں اسی تیاری میں

لگ گیا تھا۔ اگر کسی کا قرض چکانا ہے تو میں نے صندوق سے رقم نکال کر رکھ لی ہے۔ اگر کسی سے بدلہ لینا ہے تو میں نے تلوار کو آب دے لی ہے اور اگر بیٹے کا رشتہ درکار ہے تو میں نے بیٹی کو دلہن بنا کر بٹھا دیا ہے۔ کہو میرے دوست، رات کے اس پہر میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟'' باپ نے بیٹے کو فخریہ دیکھا...... اور کہا ''دیکھا یہ ہوتی ہے دوستی......'' غزالہ کی کہانی ختم ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی...... ولی لپک کر گیا...... سارہ کا بڑا بیٹا دانیال کئی شاپرز لیے کھڑا تھا۔ اس کے اوپری لب پر ہلکا، ہلکا رواں ابھر رہا تھا۔ اب اسکوٹر اڑائے پھرتا...... سارہ مہینہ دو مہینے میں گھر کی صفائی دھلائی بھگتاتی تو بہت کچھ نکل آتا، پانچ بچوں کے جلدی، جلدی چھوٹے ہوتے کپڑے...... غزالہ ٹکے، ٹکے کے لیے ہڈیاں رگڑتی...... سارہ دو سو گز کے بنگلے میں رہتی...... یہ قسمت تھی اب بھی کافی سامان بھیجا تھا۔ بچوں کے کپڑے...... کچھ پرانے جوتے، کم استعمال شدہ کا پیاں اور اب بھی کچھ چھوٹا موٹا سامان اور راشن کا تھیلا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کلو بھر فریز کیا گوشت لو جی...... ہوگئیں بچوں کی ضروریات پوری...... اس کے بچے یوں بھی کم میں گزارہ کر لیتے، سمجھا بجھا دو مان جاتے...... وہ جھٹ پھٹ سارا سامان ٹھکانے لگانے بیٹھ گئی۔ گوشت کے دو حصے کیے گن کر تین تین کے حساب سے بوٹیاں کر کے دیگچی میں ڈالیں۔ بچے دنوں گوشت کو ترستے، اِدھر اُدھر کے بچے کھچے کھانوں میں کیا سیر ہوتے...... اس نے چاؤ سے سالن کے لیے گوشت چڑھا دیا تھا۔ بقیہ کے شامی کباب، کافی دیر چولھے کے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ اِک خالی ایس ایم ایس آیا تھا...... اور یہ غزالہ ہی کی ہدایت تھی بوقتِ ضرورت اسے پکارو...... کہ دیوار ملی تھی، پڑوس کا بڑا حق ہوتا ہے، وہ ذکیہ تھی، مالک مکان نے گھر کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھولی خدا ترسی کو دے رکھی تھی۔ دینو اسے بھگا کر لایا تھا اسی کی سزا بھگت رہی تھی۔ بدکماؤ دینو نشہ کر کے کسی کونے میں اوندھا پڑا رہتا، ذکیہ کی زبان کھلتی تو وجود پر نیل پڑ جاتے، کس حال سے تھی پہلا

بچہ تھا اور دینو کو خاک بھی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایس ایم ایس پڑھا پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ذکیہ بھوکی تھی، کھانا پک گیا تو...... غزالہ نے دستر خوان بچھایا تھا۔ اس بار دستک ہوئی۔ ذکیہ ہی تھی۔

''باجی کچھ کھانے کو ہے تو دے دو......''

ناچار اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔ دیگچی میں گنتی کی بوٹیاں تھیں۔ اِک اور کی گنجائش کہاں سے نکلتی...... شام کو سہی...... غزالہ نے کرلاتے ضمیر کو بہلایا...... وہ مایوس پلٹ گئی...... بچے ترس، ترس کر ڈھنگ کا کھاتے...... اب بھی بوٹی، بوٹی پر تکرار تھی۔ وہ دستر خوان پر بیٹھی مگر ذکیہ کا خیال آتے ہی اس کے حلق میں نوالے اٹکنے لگے...... ڈھیر سارا ٹھنڈا ٹھار پانی غٹا غٹ چڑھا گئی۔ سالن ڈھانک کر رکھ دیا۔ بچے گلی میں بندر کا تماشا دیکھنے کو لپک گئے...... اس نے علی کو ہرے مسالا کے لیے مارکیٹ دوڑایا خود کبابوں کا مسالا پیسنے بیٹھ گئی۔ مگر دھیان ذکیہ میں اٹک گیا تھا۔ کباب بناتے، تلتے شام پڑ جاتی۔ آج اتوار تھا، اسے جانے کتنے بنگلوں میں اضافی کام نمٹانے تھے۔ کچھ اشیا اور پیسے اضافی مل جاتے۔ کچھ دیر کو کمر ٹکائی مگر نیند، قرار سب لٹ گیا تھا۔ آس پاس جیسے چیخیں ہی چیخیں گونجنے لگی تھیں۔ اس کے اندر کوئی دھیمے، دھیمے کرلایا تھا، رو رہا تھا۔ ہر بچے کی پیدائش پر سلیم تربوز چیر کر اسے علی الصباح کھلانے کو رات بھر اوس میں رکھتا اس کا کتنا خیال رکھتا تھا اور ایک جملہ جو وہ کبھی بھولتی نہیں تھی۔ ''بس تو خوش رہا کر۔''

''اور خوشیاں تو بس مقدر والوں کو ملتی ہیں، یہ اسے اب پتا چلا تھا...... اس کے پاس سلیم کی محبت اس محبت کی یادتھی اور ذکیہ کے پاس شاید وہ بھی نہیں تھی۔ اس کے اندر کوئی شے آہستہ، آہستہ پگھلنے لگی۔ سنا تھا کہ اِک بھوکا ہی بھوکے کو روٹی کھلا سکتا ہے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی...... اپنے حصے کا سالن، روٹی، پلیٹ سے ڈھک کر گھر سے نکل آئی۔ اس کا رخ یقیناً ذکیہ کی کھولی کی طرف تھا۔

شاید اسی طرح دیے سے دیا جلتا ہے۔



مکمل ناول

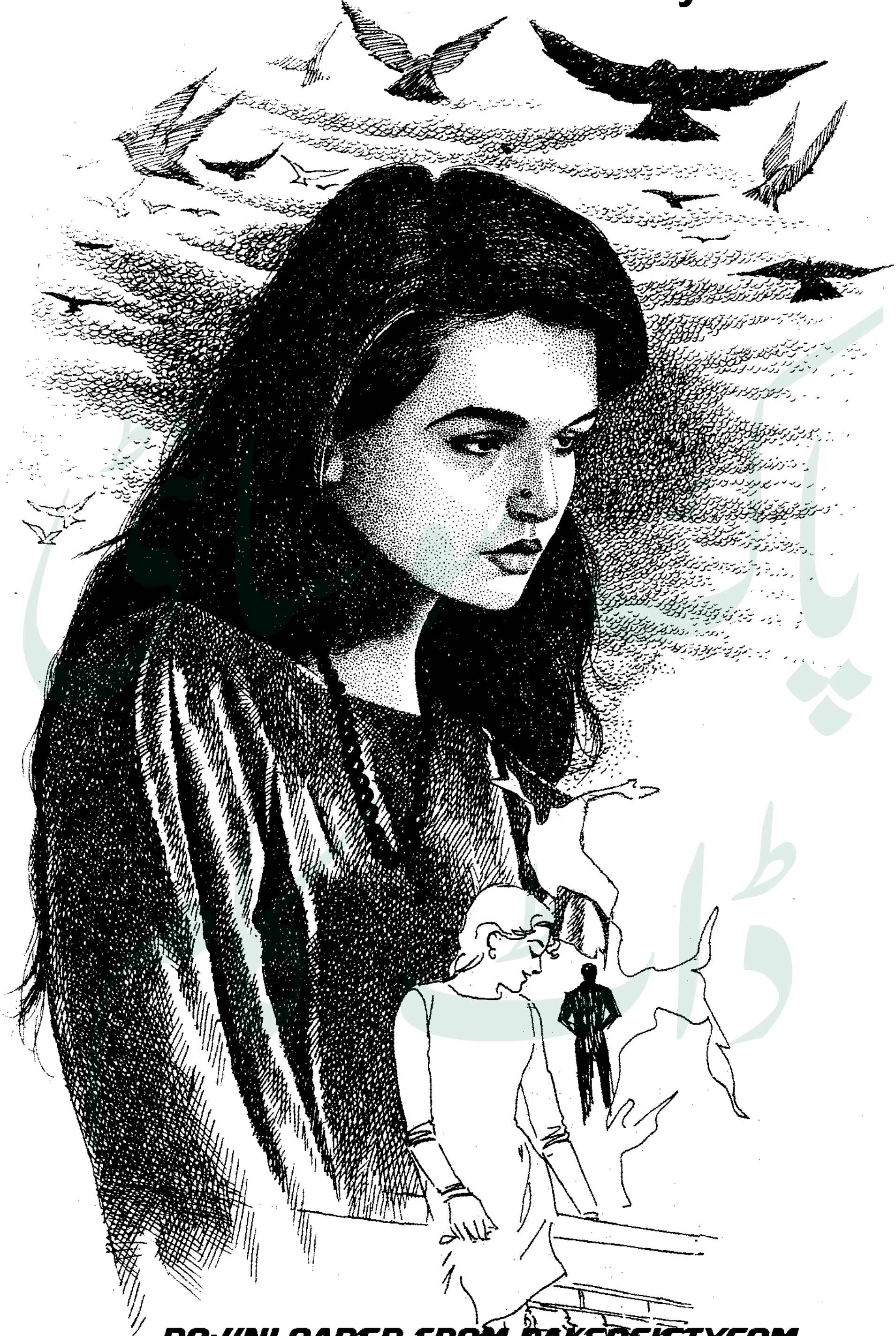
کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا

سمیرا یونس ہارون

اپنی رہائش گاہ سے دس منٹ کے پیدل سفر پر واقع اس جھیل کنارے، شام سے آنا اس کا معمول تھا۔ اور پچھلے نو دنوں سے یہ شعر نوکِ زباں پر آنا بھی جیسے معمول بن گیا تھا۔

کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

اس براؤن ریشمی بال، براؤن ہی آنکھیں اور سنہری رنگت والے اس دیوتاؤں جیسے وجیہہ شخص کو پچھلے



سترہ روز سے ایثار مصطفیٰ اسی جھیل کنارے دیکھتی چلی آرہی تھی مگر پچھلے نو روز سے ہی اس شخص پہ اس کی نگاہ پڑتے ہی بغیر کسی ارادے، بِنا کسی شعوری کوشش کے بے اختیار یہ شعر اس کے ذہن کے قفس میں کسی...... بے تاب پنچھی کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تو وہ اپنے اختیار، ارادے اور کوشش سے دلِ ناداں کو بہلاتی۔

''ایثار مصطفیٰ! حسین صورتیں سب ہی کو دلکش لگتی ہیں سو اگر تم بھی متاثر ہوگئی ہو تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہ اسے محبت کا نام دے دیا جائے۔'' محبت کا سحر جینا دوبھر کر دے گا، اس اندیشے کے تحت وہ پچھلے نو دن سے اس جادو کے توڑ کے لیے یہی ایک منتر پڑھتی آرہی تھی۔ سو اس وقت بھی پڑھ ڈالا اور نگاہیں خدا کے اس ''شاہکار'' سے ہٹ کر اپنے اردگرد پھیلے حسین مناظر سے حظ اٹھانے لگیں۔

''اس ایک بات کا تو تمہیں اعتراف کرنا ہی پڑے گا ایثار!'' اس کے اندر کوئی بولا تھا۔ ''اس جھیل کا حسن بھی اس دیوتا کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔'' گزرے نو دنوں کی طرح آج بھی اس نے اپنے اندر سے اٹھتی اس آواز پر گہری سانس بھری تھی۔ اس سے انکار ہو سکتا تھا نہ اعتراف۔

انکار کی صورت میں اپنی بات ثابت نہ کر سکنے کا اندیشہ تھا اور اعتراف اس منتر کے اثر کو زائل کر دیتا جو وہ پچھلے کئی روز سے محبت کے جادو کے توڑ کے لیے پڑھتی آرہی تھی۔ عجب بے بسی سی بے بسی تھی۔ سر جھٹک کے وہ جھیل کے اس حصے کی سمت بڑھنے لگی۔ جہاں رکھی بینچ پر بیٹھ کر پانی سے الوداعی مصافحہ کرتی، سورج کی کرنوں کا نظارہ کرنا اب اس کی ایسی پختہ عادت بن گئی تھی۔ جو بڑی دقتوں سے چھوٹ پاتی۔

وہ حسنِ مجسم، سر پر پی کیپ پہنے، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، اپنی بھوری آنکھیں نیلی جھیل پہ جمائے درخت سے اسی جگہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ جہاں اس نے اسے اول روز دیکھا تھا۔

اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور یہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی پچھلے نو روز سے غیر محسوس طریقے سے عادت کا حصہ ہی بنتا جارہا تھا۔ وہ شخص اب اس سے اتنے فاصلے پر تھا کہ جہاں سے صورتیں واضح دکھائی نہ دیں۔

''مجھے اب یہ اپنی مخصوص جگہ بدل لینی چاہیے اور کسی ایسی جگہ کو چننا چاہیے جہاں سے اس کی صورت واضح دکھے۔'' اپنی مخصوص جگہ بیٹھتے ہوئے اس کے دل میں خیال ابھرا۔ (حالانکہ وہ گزر کے اس کے پاس سے ہی جاتی تھی)

''ایثار مصطفیٰ! جادو بڑا زور آور ہے اور اس کے کاٹے کے منتر میں دم نہیں۔ سو کچھ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو اس سحر کے اثر کو زائل کر کے کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچالے۔'' اس کے پاس سوچنے کے لیے اتنی باتیں ہوتی تھیں کہ بعض اوقات کئی اہم باتوں پر دھیان دینے کی باری ہی نہیں آپاتی تھی سو اس وقت بھی وہ نہیں جان پائی کہ اس فقرے کی عمر بھی نو دن ہے مگر اس کے جواب میں نزول ہونے والے خیال کا آج پہلا روز تھا۔

''ممکنہ خطرہ......؟ بھلا محبت کا جادو چل جانے کی صورت میں ایسا کون سا نقصان ہوگا جو کاٹے کا منتر... ازبس ضروری ٹھہرا ہے۔'' اس نے دور کھڑے اس شخص پر نگاہ ڈالی۔ فاصلہ ہونے کے باعث اس کے نقوش واضح نہیں تھے مگر ایثار مصطفیٰ کو اس کی صورت ازبر تھی۔ اس کے خدوخال انگریزوں سے مماثل تھے۔ وہ غیر ملکی تھا اور شاید غیر مسلم بھی۔ اس کے ظاہری حلیے اور مغربی نقوش سے ہر اجنبی یہی اندازہ لگاتا اور وہ شخص اس کے لیے اجنبی ہی تو تھا۔ سو پھر قیاس کیونکر باقی اجنبیوں سے جدا ہوتا۔

''اگر یہ غیر ملکی، غیر مسلم بھی ہے تو یہ محبت مجھے خوار کر کے رکھ دے گی۔ لاحاصل محبت جی کا جنجال ہوتی ہے اور محبت کے حصول کے لیے ہم مذہبی ازبس ضروری سو لازم یہی ٹھہرا کہ اس ممکنہ خطرے سے خود کو بچالیا جائے۔'' جھیل میں کنکر پھینک کر وہ دائرے گننے

لگی۔ایک،دو،تین......

"یوں بھی محبت کے معاملے میں میرے نصیب نے کب اتنا ساتھ دیا ہے کہ کسی قسم کی خوش گمانی کی گنجائش بھی نکلتی۔" اس نے گہری سانس بھر کے سوچا تو چار برسوں کی دوری پر کھڑی مجتبیٰ مسعود کی آواز قریب ہی سے سنائی دی جو اس نے ایثار کے خونی رشتوں کی بے حسی پہ گوش گزار کی تھی۔

"ایثار جن بے حس لوگوں سے تم محبت کرتی ہو ناں، ان سے بدلے میں محبت کی خواہش، تمہاری حماقت ہے۔اسی حماقت کے سبب تم نے اپنی زندگی اجیرن کردی ہے۔اب تمہیں خدا کا واسطہ ہے اگر کسی سے محبت کرنے لگو تو مقابل سے بدلے میں محبت کی خواہش نہ رکھنا یا پھر محبت ہی کسی ایسے شخص سے کرنا جس کے نزدیک تم پہلے ہی بہت اہم ہو۔" مجتبیٰ مسعود کی بہت پہلے کہی گئی بات اسے بڑے ہی غلط وقت پر یاد آکر بے کل کرگئی جو اگر اس وقت یاد نہیں آتی تو وہ دل کو بہلانے کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیتی۔

"اگر میں بدلے میں محبت پانے کی تمنا سے تائب ہو بھی جاؤں تو ایسے کئی اور معاملات بھی ہیں جو جینا دشوار کیے ہوئے ہیں۔" مجتبیٰ مسعود کی بات کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

"جانتا ہوں بخوبی! تمہارے ساتھ مسئلہ پتا ہے کیا ہے؟" ایثار مصطفیٰ کو خود اس سے زیادہ جاننے کا دعویدار اب اس کی ذات کے متعلق تجزیہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

"تم اکثر چیزوں کو "جو ہے" اور "جیسا ہے" کی بنیاد پر قبول کرلینے کے بجائے "کیوں ہے؟" اور "کیسے ہے؟" کی کھوج میں نکل پڑتی ہو۔سوچنا اور گہرائی میں اتر کر سوچنا جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہو تم۔" مجتبیٰ نے مرض تشخیص کرکے اسے آگاہ کیا تھا اور ایثار مصطفیٰ کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویدار بھلا غلط کیسے ہوسکتا تھا۔

چار برس پہلے وہ اگر مجتبیٰ کی تشخیص کردہ بیماری کی حقیقت کو تسلیم نہیں بھی کر پائی تھی تو اس کے چند روز بعد ہی اسے قبول کرنا پڑا تھا کہ جب کھانے کی میز پر اس کی ممی، بابا کے درمیان ہونے والی جھڑپ نے اسے افسردگی کی انتہاؤں پر پہنچا دیا تھا۔

یہ جھڑپ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔یہ تو روزمرہ کی ان کی جیسے کوئی ڈیوٹی تھی۔جسے دونوں ہی کسی فرض کی طرح پوری ذمے داری سے نبھاتے تھے۔نئی بات تو یہ بھی نہیں تھی کہ دونوں ہی غصے کی انتہا میں جہالت کے پاتال میں اتر کر ایک دوسرے کی کردارکشی میں سبقت لے جانے کی دُھن میں بے قابو ہورہے تھے۔

مگر یہ قصہ ضرور نیا تھا کہ بابا نے ایک دم ضبط کھوتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی تیز دھار چھری ممی کی طرف پھینکنی چاہی تھی۔وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو بھی جاتے اگر جو مجتبیٰ سرعت سے اٹھ کر انہیں قابو نہ کرتا۔اس صورتِ حال پر زارا اور ابراہیم نے فقط چند لمحوں کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا تھا اور دوبارہ پلیٹ پر جھک گئے۔ان دونوں کے پاس اس سارے ڈرامے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔اس نے نہایت دل گرفتگی سے یہ سارا منظر دیکھا اور پھر اداسیوں میں گھر کے سوچا۔

"یہ تو روز کا قصہ ہے تو میرا دل اس کا عادی کیوں نہیں ہو پاتا؟ میرا من کیوں برسوں سے اس گھر کے امن کے ناممکن قیام کے لیے ہمکتا ہے؟ جتنی محنت، کوشش یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کرتے ہیں اگر اس سے نصف جدوجہد خود کو اچھا ثابت کرنے میں کریں تو زندگی اتنی بیزار ہو نہ اتنی دشوار۔" مایوسی اور قنوطیت کا دورہ آج پھر پڑا تھا۔

مجتبیٰ، بابا کو لے کر ان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔کچھ لمحوں بعد ممی نے بھی بڑبڑاتے ہوئے ڈائننگ روم چھوڑ دیا۔

اس نے چمچ پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دور کھسکائی۔کھانے سے دل اچاٹ تو جھگڑے کی ابتدا سے ہی ہوگیا تھا۔ڈائننگ روم اس وقت جنگ کے بعد

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بابا، ممی پر چھری کا وار کرنے کی کوشش میں ٹیبل پر رکھی سوئٹ ڈش کے علاوہ پانی کا جگ بھی گرا چکے تھے۔ جسے اب ملازمہ سمیٹ رہی تھی۔ اس نے لاتعلقی سے ڈنر کرتے اپنے بھائی ابراہیم اور بہن زارا کو ایک نظر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''الٰہی! میرے والدین کی فضول ضد کہاں جا کے رکے گی؟'' بڑے ضبط کے باوجود بھی ایک موتی پلک پر آٹھہرا تھا۔ بابا سے خلع کا مطالبہ کر کے ممی اپنی حق مہر کی رقم گنوانا نہیں چاہتی تھیں اور بابا، ممی سے انتہائی حد تک بیزار ہو چکنے کے باوجود اگر ممی کے دل میں پلتی خواہش کو پورا کر دیتے تو انہیں حق مہر کے پانچ لاکھ دینے پڑتے مگر کروڑوں کا کاروبار کرنے والے بابا کے لیے پانچ لاکھ کی ادائیگی کیوں مسئلہ بنی ہوئی ہے؟ وہ اس سوال کے متعلق سوچتی تو جواباً ضد اور انا کے سوا کوئی تیسرا لفظ اس حوالے سے ذہن میں جگہ نہیں بنا پاتا تھا۔

ضد اور انا کی اس دوڑ میں ہارنا کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو ممی گھر چھوڑنے کے بجائے دن میں تین بار تو کم از کم ضرور بابا کو اپنی صورت دکھاتی تھیں۔ کیونکہ بابا نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ''مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے، اپنی شکل ذرا کم ہی دکھایا کرو۔'' اسی لیے وہ بابا کو زیادہ سے زیادہ نہ صرف اپنے درشن کراتی تھیں بلکہ ہر بار سامنا ہونے پر اپنی زبان کی کرامات بھی ضرور دکھاتی تھیں۔ وہ بابا کو اتنا زچ کر دینا چاہتی تھیں کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر کے اور ان کا کہا مطالبہ مان کر انہیں فاتح قرار دے دیں۔ لیکن بابا میں بڑا اسٹیمنا تھا۔ وہ ممی کی حرکتوں سے زچ ہو جانے کے بعد بھی ان کا ان کہا مطالبہ ماننے پر رضامند تھے، نہ اپنی ہار......

''مگر شاید بابا اب ہارنے لگے ہیں۔ آج جس طرح انہوں نے ضبط کھو دیا اس سے لگتا ہے وہ اب ممی کا وجود زیادہ برداشت نہیں کر پائیں گے۔'' کمرے میں گھٹن کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر کھڑکی کھول دی اور آسمان پر تیرتے بادلوں سے شیر، بھالو اور جولاہا بنانے لگی۔

''یا پھر شاید ممی ہی ہار مان لیں۔ آخر بابا نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا جو کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔'' بادلوں کا ''گھوڑا'' چاند پر سوار ہوا تو چاندنی چند لمحوں کے لیے قید ہوئی۔

''اگر جو حملہ کامیاب ہو جاتا تو......؟'' اس سے آگے سوچ کے ساتھ سانس بھی رک جاتی تھی۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔

''یہ بھی مقام شکر ہے کہ مجتبیٰ آج ڈنر کے لیے یہاں رک گیا تھا۔ ورنہ بابا کو بروقت ان کے ارادے سے باز رکھنا کیسے ممکن ہو پاتا۔'' بادلوں کا گھوڑا چاند سے اترا تو چاندنی بھی آزاد ہو کر چاروں اور پھیل گئی مگر چند پل کے لیے ہی... اس کے پیچھے بادلوں کی پری سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''اور یہ بھی صد شکر کہ پھپو ان دنوں دادو سے ملنے راولاکوٹ گئی ہیں، اگر جو یہیں ہوتیں تو مجتبیٰ کی یہاں موجودگی ممکن نہیں تھی۔'' وہ آفس سے واپسی پر ہمیشہ سب سے پہلے اپنی صورت اپنی ماں کو ہی دکھانے میں آسودگی محسوس کرتا تھا۔

''پری'' نے چاند کی سواری چھوڑی تو چاروں اور پھیلی ٹھنڈی چاندنی میں اس نے ابراہیم اور زارا کو پورچ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ خوش باش، شاد، مگن سے...... فردا کی کسی بھی قسم کی فکر سے آزاد...... ہنسی، قہقہے کی مالا جپتے ہوئے جو ہوگا، دیکھا جائے گا کا زندہ اشتہار......

''یہ بھی خوب زندگی جی رہے ہیں۔ کسی بھی پریشان کن بات کو زیادہ اہمیت دیے بغیر مگر میرے لیے ایسی زندگی جینا کیوں دشوار ہے؟'' کھڑکی سے آسمان کی وسعتوں پر نگاہیں جمائے گویا وہ خدا سے استفسار کر رہی تھی۔

''شاید اس لیے کہ میں گہرائی میں اتر کر سوچنے جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہوں۔'' جواب میں... بے اختیار ہی اسے مجتبیٰ کی کہی بات یاد آئی تو وہ مسکرا دی۔

''خدا جانے یہ بندہ اس قدر درست اندازے

کیسے لگا لیتا ہے؟'' اس نے تسلیم کیا۔ اس کی صلاحیت کو بھی اور اپنے عارضے کو بھی۔

''گوتم بدھ کے گیان دھیان میں اگر خلل نہ پڑے تو میں اندر آجاؤں؟'' مجتبیٰ نے کمرے میں داخل ہو جانے کے بعد اجازت طلب کی اور آ کر مسہری کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا اور اس کی مخالف سمت میں مسہری کی پائنتی بیٹھ گئی۔

''بابا کے انداز سے لگتا ہے کہ اب وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچ کر ہی رہیں گے۔'' دل میں پلتے خدشے کو اس نے زبان دی۔

''کیا کہہ سکتے ہیں؟'' اس نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے۔ ''ویسے ماموں کہہ رہے تھے وہ اب تک یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ چکے ہوتے مگر کوئی وجہ ہے جو انہیں روکے ہوئے ہے۔ اپنے دونوں بڑے بچوں کو وہ کافی سمجھدار سمجھتے ہیں جو اپنے والدین کی چپقلش کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ مگر ایثار مصطفیٰ کی وجہ سے وہ اپنے ضبط کو بہت آزماتے ہیں۔ وہ اسے کسی صورت دکھی نہیں کرنا چاہتے۔'' مجتبیٰ مسعود نے اس کو کسی قسم کے برے خیال سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ خدا جانے کامیاب یا ناکام......؟ اس نے بغور ایثار کی صورت دیکھی۔

''اچھا......؟'' طنزیہ ہنسی کے ساتھ اس نے سر جھٹکا۔

''اس کے والدین اپنی اولاد کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔'' اس ایک بات پر اعتبار شاید وہ اس وقت بھی نہ کرے جب اس بات کی سچائی میں کوئی شک نہ ہو۔

''میں چند دنوں میں امی کو لینے راولاکوٹ جا رہا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے لب بھینچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم چلو گی؟'' مجتبیٰ نے استفہامیہ نگاہیں اس پر جمائیں۔

طبیعت پر عجب بیزاری سی طاری رہتی تھی۔ دل بہلنے پہ کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔ سو اس نے انکار کرنا چاہا۔

''میری بات مانو! چلی چلو۔'' اس نے ایثار کا ارادہ بھانپتے ہوئے مشورہ دیا۔

''بیکار فکروں سے دور رہو گی تو وہاں تمہارے دن یہاں سے بہتر گزریں گے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں پُرسکون رہا کرتی تھی۔ ٹینشن زدہ ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے بھی اور دادو کی پُرشفقت اور مہربان وجود کے زیرِ سایہ ہونے کے سبب بھی۔ مگر پھر بھی دل یوں لمحوں میں رضامند ہو جانے پر متامل تھا سو وہ اتنی جلدی حامی کیسے بھرتی۔

''اوہ گوتم بدھ!'' وہ زچ ہوا اس کے اتنا سوچنے پر۔ ''میں تمہیں یونہی تو گوتم بدھ نہیں کہتا۔ اتنا غور و فکر تو کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ آنے پر بھی نہیں کرتی ہوگی۔'' اس کے چڑنے پر وہ ہنس دی۔

''جب کوئی فیصلہ کر لو تو مجھے آگاہ کر دینا، میں چلا۔'' وہ ہنوز چڑا ہوا تھا۔

اور پھر دادو کی شفیق بانہوں میں ساتے ہوئے اور پھپو سے پُرخلوص پیار وصول کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

''بابا اس فیملی کا حصہ ہوتے ہوئے ان سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ بقول دادو کے دادا ابھی محبتوں کے معاملے میں دوسروں کو مقروض کر دیا کرتے تھے تو پھر بابا کیوں حقدار کو بھی محبت خیرات کے مانند دیتے ہیں؟''

ان سوالات کے جوابات اسے نہ پہلے کبھی مل سکے تھے نہ اس وقت...... مگر اس کے باوجود اس نے اتنا ضرور محسوس کیا تھا کہ اس کے لیے راولاکوٹ کی فضا میں افسردگی اور ٹینشن کا تناسب کراچی کے مقابلے میں کافی کم تھا۔

''سنو تم نانی امی کے پاس مستقل رہنے کا فیصلہ کر لو۔ شاد رہو گی۔'' یہ بات اگلی شام وہ جھیل کنارے اس کے ہم قدم، چہل قدمی کرتے ہوئے اور اسے تروتازہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''انٹر تمہارا تمام ہوا، اب گریجویشن یہیں کسی اچھے کالج سے کر لینا۔'' وہ کس طرح خوش رہ سکتی ہے؟ اس بات کے متعلق سوچنا اور کوشش کرنا مجتبیٰ کی آرزو بنتی جا رہی تھی۔

''مجتبیٰ! بوٹنگ کریں؟'' اس کا مشورہ مناسب

لگنے کے باوجود وہ اپنی عادت کے مطابق فوری فیصلہ نہیں کر پائی۔ سو بات بدل کر اس نے مجتبیٰ کا دھیان بھی اس طرف سے ہٹانا چاہا۔

مجتبیٰ اس کی اس کوشش پہ ہنس دیا۔

''اور اگر تم میرا مشورہ مان لوگی تو میرا وجدان کہتا ہے کہ تم نانا ابو کی طرح روز اس خوب صورت جھیل کو خراجِ تحسین پیش کرنے ضرور آؤ گی کہ اس کی دلکشی تمہاری کلفت دور کرنے کا سبب ثابت ہوگی۔''

اس کے دادا عمر کے اس حصے میں جب ناتوانی جسم کا اضافی عضو بن جاتی ہے، اپنے سارے کاروبار کی ذمے داری بیٹے مصطفیٰ شاہد کو سونپ کر فارغ ہوئے تو ڈپریشن نے کسی ان چاہے وجود کی طرح ان کے اندر گویا ڈیرا ہی جمالیا۔ اپنے ڈاکٹر دوست کے مشورے پر جب وہ تبدیلیِ آب وہوا کی غرض سے راولاکوٹ پہنچے تو بنجوسہ جھیل نے انہیں اپنے سحر میں جکڑ کر گویا عمر قید کی سزا سنادی۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر کراچی نہیں جاسکے۔

جھیل کے قریب خوب صورت گھر کی تعمیر اور بلاناغہ جھیل کی سیر ڈپریشن کا بہترین علاج ثابت ہوئی۔ یہاں کے شدید موسم نے قوتِ برداشت بڑھائی تو برفباری اور جمی ہوئی جھیل کا نظارہ بھی دشوار نہ رہا۔

عمر قید کی یہ خوب صورت سزا انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک کاٹی اور اگلے جہاں کا رختِ سفر باندھا تو دادو کو لگا کہ وہ بھی اب راولاکوٹ کی ہی عادی ہوگئی ہیں۔ اور اسی لیے شاید مجتبیٰ کو یقین ہو چلا تھا کہ ایثار بھی یہاں خوش رہے گی۔

اس نے مجتبیٰ کا مشورہ مان لیا تھا۔ اور آج چار برس بیت جانے کے بعد مجتبیٰ کی پیش گوئی بھی سچ ثابت ہوگئی تھی، وہ مطمئن رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ مغرب کی اذان میں وقت اتنا زیادہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس سیاحوں کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے اپالو (وہی دیوتاؤں ..... کے جیسے حسن والا) کی جانب دیکھا اور واپسی کی راہ پر قدم بڑھائے۔ وہ ماتھے پر ٹکے گاگلز، شرٹ کے گریبان میں اٹکا کر ہاتھوں سے بال سنوار رہا تھا۔

اِک چہرہ میری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے

دل پھر من مانی پر اتر آیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا، نگاہوں کا رخ بدلا اور اپنی راہ چل دی۔

محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔'' دل کا دھیان پھر محبت میں اٹک گیا۔

''اُف! تم خاموش کیوں نہیں ہوجاتے؟'' اس نے نگاہیں نیچی رکھے دل کو ڈپٹا۔

''پیور بلیک۔'' کی خوشبو بتدریج قریب آرہی تھی۔ اپنی راہ پر چلتے ہوئے وہ اس کے قریب سے گزری تھی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اپالو نے بھی واپسی کی راہ لی ہے اور اس کے پیچھے قدم بڑھائے ہیں۔ پیور بلیک کی مہک اس کے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کی بغلی راہ سے ہوتے ہوئے سرسبز پہاڑ سے گزر کر اور سڑک تک پہنچنے تک، وہ کسی کے قدموں کی چاپ اپنے عقب میں سنتی آئی۔ پھر دفعتاً ایک آواز نے متوجہ کیا۔

''ایکسکیوزمی میم!'' وہ بے اختیار پلٹی۔

''اس نے مجھے مخاطب کیا ہے؟'' وہ بے یقین تھی۔ مگر اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد موجود نہیں سو اسے یہ یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے۔

''وہ مجھ سے ہوئے ہمکلام اللہ، اللہ.....'' اسے معروف گائیکہ فریدہ خانم کسی پکی سہیلی کی طرح یاد آئیں۔

''یہاں قریب ہی کہیں مسٹر جوزف کا گھر ہے۔ مگر میں راہ بھول گیا ہوں۔ آپ اگر رہنمائی فرمادیں تو عنایت ہوگی۔''

شستہ اردو، نرم لہجہ اور رہنمائی کی بات۔ اس کے حیران ہونے کے لیے کوئی ایک بات تو تھی نہیں۔ سو وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

''انگریزی خدوخال، انگریزی وضع قطع اور اتنی بہترین اردو۔'' پہلی حیران کُن بات۔

''اردو بولتے ہوئے اس کے لہجے پر انگریز ہونے کا بس گمان ہی گزرتا تھا، یقین میں نہ بدلنے والا شک۔'' دوسری حیران کُن بات۔

''مسٹر جوزف کے گھر تک رہنمائی اور راہ بھول جانا۔'' یہ ایک ایسی بات تھی جو اس کے لیے حیران کُن ہونے کے ساتھ، ساتھ کئی وجوہ کی بِنا پر نا قابلِ قبول بھی تھی۔

''پچھلے سترہ روز سے کسی معمول کی طرح مخصوص راہ پر آنے والا شخص واپسی کی راہ کیسے بھول سکتا ہے؟'' وہ متحیر تھی۔

''اور راستہ اگر پیچیدہ ہو تب بھی یقین کی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ سڑک کی سیدھ میں چلتے ہوئے بائیں سمت پہلا موڑ مڑتے ہی دور سے دکھائی دینے والا خوب صورت کاٹیج نہ اتنی دور تھا نہ ہی آڑھی ٹیڑھی گلیوں میں آباد کہ راستہ بھٹکنے کا اندیشہ ہو۔'' اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر باقی کسی بھی تاثر سے گہرا تھا۔

''یہ شخص راہ بھٹک گیا ہے، کیا یہ بات ایسی ہے کہ اس پر اعتبار کرلیا جائے؟'' وہ بے یقین تھی۔

''بہت ممکن ہے کہ یہ شخص بھی آج محبت کے توڑ کا منتر پڑھ، پڑھ کر بیزار ہوگیا ہو اور آج بے بس ہو کر مجھ سے گفتگو کی چاہ میں یہ بہانہ بنا بیٹھا ہو۔'' یہ دل اور اس کی خوش فہمیاں اسے اپنے دل میں وارد ہونے والے اس اچانک خیال پر ہنسی آئی۔

''کہاں تو محبت کا جذبہ مغلوب نہ ہو جانے کے لیے ''وظیفہ'' پڑھا جا رہا تھا۔ اور کہاں سیدھی سادی مدد کی درخواست کو بھی محبت کے معنوں میں ڈھالا جا رہا ہے، تم بھی ناں ایثار..... کبھی، کبھی کمال کر جاتی ہو۔'' اس نے اپنا ہی مذاق اڑایا۔

''میں دراصل پچھلے کئی روز سے ریسٹ ہاؤس میں رہائش پزیر تھا۔ کل شب میرے نانا مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ اب پہلی دفعہ میں ہی راستہ ذہن نشین کرلینا میرے لیے کافی دشوار ہے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں کافی کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ پلیز آپ مدد کردیں۔'' اس نے ایثار کے تاثرات سے خدا جانے کیا اندازہ لگایا تھا جواب سر کھجاتے ہوئے کسی قدر شرمندگی سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

مسٹر جوزف نہ سماجی کارکن تھے، نہ ٹی وی پر آنے والی کوئی معروف شخصیت جو وہ بِنا اپنے ذہن پر زور دیے محض نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ جاتی۔ مگر وہ فقط نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ گئی تھی کیونکہ بقول دادو، دادا کی ان سے اچھی صاحب سلامت تھی۔ جس کے سبب دادو کی شناسائی بھی ہوگئی۔ جواب دادا کی وفات کے بعد دور کی سلام دعا تک رہ گئی تھی۔

اس نے گردن ہلا کر رخ موڑا اور راستہ بتانے کا قصد کیا۔

''میں ڈالاس سے آیا ہوں اور یہاں کشمیریوں کا مہمان ہوں، مہمان ہونے کی حیثیت سے میں آپ سے ایک درخواست کرسکتا ہوں؟'' اس نے ایثار کا ارادہ بھانپتے ہوئے عاجزانہ کہا۔

ایثار کے کچھ کہتے لب باہم پیوست ہوئے اور سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

''آپ اگر راستہ بتانے کے بجائے میرے گھر تک کمپنی ہی دے دیں تو......'' اس نے سر کھجایا۔ جھجک کر کی گئی فرمائش شاید وہ اسی طرح سر کھجا کر ہی بیان کرتا تھا۔

ایثار نے گہری سانس فضا کے سپرد کی اور آگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''بہت شکریہ......'' مسکرا کر اس نے ایثار کے پیچھے قدم بڑھائے۔

''میں اتنی اچھی تو نہیں کہ کسی بھی اجنبی کی ایسی فرمائش بغیر کوئی عذر پیش کیے مان جاؤں۔'' اپنے ہم قدم چلتے ہوئے شخص کو اس نے کن انکھیوں سے دیکھتے

ہوئے سوچا۔ ''بہت بہتر ہوتا اگر جو میں کوئی بھی وجہ بیان کر کے سہولت سے انکار کر دیتی۔'' وہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے راستہ طے کرنے لگی۔

''میرا نام ڈیوڈ ہے۔ امریکی نژاد ہوں۔ یہاں اپنے نانا سے ملنے آیا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور نگاہوں میں ''اور آپ؟'' کا سوال سموئے اس کی سمت دیکھا۔

ایثار نے اس کی مسکراہٹ کا جواب لبوں پر مسکان سجا کے ضرور دیا مگر اس کی آنکھوں میں مچلتے تعارف کے سوال کو بہت خوبی سے نظر انداز کر کے نگاہوں کا رخ بدلا۔

''محض تعارف ہی تو چاہ رہا ہے۔ سو کیا قباحت ہے جو تم اپنا تعارف نہیں کروا رہیں؟'' ڈیوڈ کی ہمراہی میں مسرور دل، دماغ کے اس فیصلے پر تلملایا۔

''اس شخص سے روابط کہیں جان کا عذاب نہ بن جائیں۔'' اس نے ضدی دل کو سمجھانے کی بیکار سی سعی کی۔ مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ بدستور مچلنے لگا۔

''دل کی ایک مانو۔ تو وہ اپنی منواتا چلا جاتا ہے۔'' اس کے قدم سست پڑنے لگے۔ اس کے برابر چلتا شخص جو اس کی خاموشی اور سنجیدگی کے باعث اب خود ہی خاموش تھا۔ ایثار کے سست پڑتے قدموں کے باعث اس سے دو قدم آگے بڑھ گیا اور اس سے اگلے قدم پر ہی وہ موڑ تھا جس کے مڑتے ہی انکل جوزف کا خوب صورت کاٹیج نگاہوں کے سامنے آجاتا۔

ڈیوڈ، ایثار سے قبل ہی وہ موڑ مڑ گیا اور اچانک ہی چونک کے پلٹا۔

ایثار متحیر سی موڑ پر ہی رک گئی۔ اس نے ایثار کی متحیر صورت دیکھی اور لب بھینچے۔

''تو کیا یہ شخص راستہ نہیں بھولا تھا......؟ تو کیا یہ شخص میرے اندازے کے مطابق واقعی آج جادو کے توڑ میں ناکام ہونے کے بعد یہ حرکت کر بیٹھا ہے......؟ کیا واقعی؟'' پیشتر اس کے کہ دل خوش گمانیوں کے محل تعمیر کرتا وہ بول اٹھا۔

''یہ سچ ہے کہ میں راہ بھول گیا تھا مگر اس موڑ کو دیکھ کر میری میموری ری فریش ہوگئی۔ سو......'' اس نے مسکرا کر کاندھے اچکائے۔

''میرے خدا! حد ہوتی ہے خوش فہمی کی بھی۔'' اس کا اپنا دل اس کے کہے میں بالکل نہیں تھا سو وہ جھنجلائی۔

''بھلا ایک انگریز، مغربی معاشرے کا پروردہ، ایک لڑکی سے بات کرنے کے لیے ڈرامے کیوں کرے گا؟ کبھی تو عقل کو بھی کام میں لے آیا کرو۔ پڑے، پڑے موٹی بھی ہوگئی ہے اور زنگ آلود بھی۔'' اس نے خود اپنے آپ کو ہی لتاڑا۔ اور تیزی سے مڑ کر واپسی کی راہ لی۔ وہ دل کو مزید بے وقوفیاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

سو اپنے پیچھے ''رکیے، سنیے'' کی آواز کو سن کر بھی ان سنی کر گئی۔

☆☆☆

اس کے اندر کوئی خوف تھا، جو روز کے معمول میں مخل ہوا اور چار برسوں سے جھیل کنارے کی سیر کی روٹین، پچھلے دو روز سے ترک ہوئی۔

اور شاید جھیل کی سیر ہمیشہ کے لیے ترک ہو جاتی کیونکہ خوف شدید تھا مگر دل کی من مانیاں اس سے زیادہ شدید، سو تیسرے روز اس کے قدم پھر جھیل کی سمت بڑھنے لگے۔

وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مسکرایا تھا۔

ایثار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی مخصوص جگہ کی سمت بڑھنے لگی تو وہ دائیں جانب سے اس کے ہم قدم ہوا۔

''ہیلو!'' اس نے دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائی جواباً ایثار نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''آپ دو دن سے آئیں نہیں، خیریت رہی؟''

''اس نے میری عدم موجودگی محسوس کی۔'' دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔ ''ہاں کی مگر اس کا مطلب یہ

ہر گز نہیں کہ تم اس کے اس عمل کو کوئی الٹے سیدھے معنی پہناؤ۔'' اس کی اب اپنے دل سے کم ہی بنتی تھی۔ سو اس نے نظروں کا رخ بائیں جانب موڑا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اس روز میری راہ بھول جانے کی بات کو آپ جھوٹ جان کر شاید برا مان گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جھوٹ بالکل نہیں تھا مگر پھر بھی معذرت۔'' وہ شرمندہ تھا، ایثار نے اس کی سمت دیکھا اور گویا ہوئی۔

''میں نے آپ کی بات کو سچ ہی مانا سو برا لگنے کا کیا سوال؟''

''اوہ خدا......! تیرا شکر ہے۔'' اس نے ایثار کی بات کے جواب میں بے اختیار شکرادا کیا۔

''آپ کچھ بولیں تو...... ورنہ پچھلے تین روز سے میں اس ایک بات پر خدا کی بہت ناشکری کر چکا ہوں کہ اتنی حسین صورت اور قوت گویائی سے محروم۔'' وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر شرارت سے گویا ہوا۔

''حسین صورت۔'' اسے اپنا سانولا، عام سے نقوش والا چہرہ یاد آیا۔''کمال ہے یہ شخص بھی۔'' وہ سر جھٹک کے مسکرا دی۔ ڈیوڈ نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور حوصلہ پا کر گویا ہوا۔

''آپ کا نام پتا چل سکتا ہے؟'' وہ جھجک کر اور سر کھجا کر کی گئی فرمائش جسے وہ دو روز قبل نظر انداز کر گئی تھی۔

''ایثار۔'' وہ دھیمے سے گویا ہوئی۔

''ایثار...... گڈ! یعنی قربانی؟'' اس نے نام کا مفہوم بتا کر اس سے تائید چاہی تو ایثار حیران رہ گئی۔ کسی اردو بولنے والے کی انگریزی بہت اچھی ہو تو یہ بات کوئی ایسے اچنبھے کی نہیں۔ کوئی انگریز اگر اردو بولے تو یہ بھی کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اگر اردو بولنے والا انگریز شخص اپنا لب ولہجہ بھی اردو بنا لے اور مشکل الفاظ کے معنی بھی بہ آسانی بتا دے تو سننے والا کسی قدر حیران ضرور ہوتا ہے سو اسے بھی حیرانی ہوئی۔

''حیران نہ ہوں۔'' وہ اس کی حیران صورت سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''سات سے سولہ سال تک کی عمر کا عرصہ میرا کراچی میں بیتا ہے۔ اردو سے واقفیت ہوئی تو مجھے یہ زبان اتنی اچھی لگی کہ واپس ڈالاس چلے جانے کے بعد بھی اس زبان کو مزید سیکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ سو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔'' اس نے اترانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

وہ اس بینچ کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں سیاحوں کی تعداد نسبتاً کم ہونے کے باعث ایثار کی نشستِ خاص تھی۔

''نو برس تک کا عرصہ کراچی میں گزارنے کے باعث میں یہاں کے رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن، مذہب اسلام اور عورتوں کے مقام و مرتبے سے بھی کسی حد تک آگاہ ہوں۔''

وہ ایثار کے ساتھ بینچ پر کافی فاصلہ چھوڑ کر بیٹھا اور اپنی بات کو ثابت کر دیا۔ ایثار مسکرا دی۔

''آپ کی مسکراہٹ بہت دلکش ہے۔'' ایثار کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اس کے دل میں جو خیال ابھرا، اس کا اس نے برملا اظہار بھی کر دیا۔ بے اختیار ہی ایثار نے لب بھینچ لیے۔

اس مغربی معاشرے کے پروردہ شخص کے لیے یہاں کے اقدار و روایات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کے مطابق چلنا مشکل نہیں بھی تھا تو اسے یاد رکھنا دشوار ضرور تھا۔

''اوہ گاڈ......!'' ایثار کے لب بھینچ لینے پر اسے اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر گویا اپنی کمزور یادداشت کا ماتم کیا۔

''یا اللہ! یہ شخص اور اس کے انداز......'' اس نے اپنے بچاؤ کے لیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

''ہمارے یہاں لڑکیاں کسی غیر مرد کے یوں سراہنے پر برا مناتی ہیں۔''

''میرے علم میں تھا مگر میں بھول گیا۔'' وہ شرمندہ تھا۔ ''سوری۔'' اس نے اپنے کان پکڑ کر اپنی براؤن آنکھیں اس پر جما دیں تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

''یارب! یہ میرے لیے کوئی راہِ فرار چھوڑے گا یا یونہی چاروں جانب سے گھیرا تنگ کرتا جائے گا؟'' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور واپسی کے لیے بہانہ تلاش کرنے لگی۔

''وہ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔'' اس نے کلائی موڑ کے وقت دیکھا۔ ''چلوں گی اب۔'' اس کی سمت دیکھے بغیر وہ تیزی سے چلتی چلی گئی۔

''یہ شخص کسی بھوت کی طرح میرے ذہن سے کیوں چمٹ گیا ہے؟'' اس نے بے بسی سے سوچا۔ ایسا کیا کروں کہ اس کا خیال دل و دماغ سے نکل جائے۔'' گھر کی سمت بڑھتے ہوئے وہ لاچاری سے سوچ گئی۔

''چند روز یہاں کا رخ نہ کرو، وہ مہمان ہی ہے۔ چلا جائے گا۔'' دماغ نے راہ سجھائی۔

''بہت خوب......! ایسا کرنے سے میں تمہیں چین لینے دوں گا کیا؟'' دل آج کل اس کا دشمن بنا ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں، میں بے چینی سے رہ لوں گی۔'' اس نے بیچارگی سے دل کو جواب دیا۔

''اس سے کیا ہوگا؟ دل و دماغ سے اس کا قبضہ ہٹانے کے لیے یہ طریقۂ علاج کامیاب نہیں ہوگا۔''

''کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔'' وہ دل پر غلبہ پانے کے چکر میں تھی۔

''یہ کوشش بھی تم دو روز قبل کر کے دیکھ چکی ہو۔'' دل غالب ہونے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

ہم نے اے دل! تجھے سینے سے لگایا ہوا ہے
اور تو ہے کہ میری جان کو آیا ہوا ہے

انہی سوچوں میں الجھتے ہوئے وہ مخصوص راہ پر چلتی چلی گئی۔ دھیان اردگرد کے بجائے کہیں اور ہی تھا۔

''شکر ہے تمہیں گھر کا راستہ مل گیا۔ میں بس ابھی آدھے گھنٹے میں نکلنے ہی والا تھا۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پر بیٹھے مجتبیٰ نے اسے دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا۔ مجتبیٰ کی آواز پر اس نے بڑی دقتوں سے منتشر دھیان کو سمیٹا اور مسکرائی۔

''کب آئے؟'' وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔'' مجتبیٰ نے اس کے کھوئے، کھوئے انداز کا نوٹس لیا۔

بابا کے کاروبار میں مجتبیٰ کے والد برابر کے حصے دار تھے۔ دو برس قبل اسلام آباد میں ان کی کمپنی کی برانچ

کھولی گئی تھی۔ تب سے وہ جب بھی کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تو کئی گھنٹوں کا سفر طے کر کے راولا کوٹ بھی ضرور آتا۔ اکثر وہ اتنی عجلت میں ہوتا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہی واپس جانے کے لیے تیار ہوتا۔

''کراچی میں سب ٹھیک ہیں؟'' ہمیشہ کی طرح آج بھی مجتبیٰ سے ملاقات کے بعد اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

''ہاں......''

''اور ممی، بابا؟'' مجتبیٰ اس کے آدھے سوال سے پورے سوال تک پہنچا۔

اگرچہ وہ اس کا جواب جانتی تھی مگر اس سوال سے وابستہ امید سے وہ کبھی جھگڑا نہیں کرتی تھی۔

''ان کے تعلقات ہنوز ویسے ہی ہیں۔ بہتری کے آثار دور تک دکھائی نہیں دیتے۔'' مجتبیٰ یہ جاننے کے باوجود کہ ایسے حقائق اس کی افسردگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، اس سے کوئی بھی بات چھپا نہیں پاتا تھا۔

وہ چپ سی ہوگئی۔

''زارا نے اپنے انٹیریئر ڈیزائننگ شوروم کھولنے کے ارادے پر اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر عمل کر ڈالا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی افتتاحی تقریب تھی۔'' مجتبیٰ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے نسبتاً اچھی خبر سنائی۔

''یعنی اس بار اچھی خبر بھی لائے ہو ساتھ۔'' وہ مسکرائی۔

''ماموں نے تمہارے لیے یہ کتابیں بھجوائی ہیں۔'' تھوڑی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس نے سائڈ ٹیبل سے چند کتابیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔

اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ بابا اس پر ایسی کوئی عنایت نہیں کر سکتے، اس نے مجتبیٰ کی بات کو سچ مان لینے کا بھرپور تاثر دیا تھا۔

اگر کوئی شخص محض آپ کی خوشی کے لیے آپ سے جھوٹ بولے تو پھر آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اس شخص کی خوشی کے لیے حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر مجتبیٰ تو وہ تھا جو اس کے تاثرات سے اس کے دل کی بات تک پہنچتا تھا سو ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

''کراچی کی خبریں تم نے سن لیں، اب تم مجھے یہاں کی خبریں سناؤ۔'' اس کے ذہن میں ایثار کا کھویا، کھویا، الجھا، الجھا سا انداز پھر نمودار ہوا۔

''یہاں کی خبروں میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں جو گوش گزار کیا جائے۔''

''لیکن آج یقیناً کچھ ایسا خاص ہوا ہے جس نے تمہارے ذہن پر اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔'' مجتبیٰ کے یقین سے کہنے پر اس کا دل یک بارگی دھڑکا۔

اس سے حقیقت چھپانا دشوار تھا اور سچائی بتا دینا اس سے زیادہ دشوار......

''نہیں تو ایسا کچھ خاص تو نہیں ہوا۔'' اس ایک لمحے اس پر منکشف ہوا کہ وہ یہ حقیقت اسے کبھی نہیں بتا پائے گی۔ سو نگاہیں چرانے لگی۔

مجتبیٰ نے شدت سے اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایثار کوئی بات اس سے پوشیدہ رکھنا چاہ رہی تھی۔

''اوکے......شاید میرا وہم ہی ہو۔'' وہ ایثار پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ اسے اس کی بات پر اعتبار نہیں سو مسکرا کر اس کے جھوٹ کو قبول کر لیا۔

☆☆☆

''میں جب سات برس کا تھا تب میری ماں نے مجھے میرے نانا، نانی کے پاس کراچی بھیج دیا کیونکہ تب وہ بیمار رہتی تھیں۔'' اس نے اپنے گاگلز اتار کر اپنے اور ایثار کے درمیان رکھے۔

دل و دماغ کے درمیان جاری جنگ میں جیت ضدی دل کی ہوئی تھی۔ اب یہ اس کی ڈیوڈ سے کون سی ویں ملاقات تھی اسے یاد نہیں تھا۔

''کراچی میں میرے دن اچھے گزرے۔ اپنے نانا سے میری خوب دوستی ہوگئی۔ آج بھی میرے بہترین دوست میرے نانا ہی ہیں۔'' اس نے دور جھیل میں کنکر پھینکا۔

''جب میں سولہ سال کا تھا تب نانی کے انتقال کے بعد نانا اداس رہنے لگے تھے۔ تب میں نے حد درجہ

بور ہو کر بے وفائی کی حد کر دی اور نانا کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔'' وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

''ڈالاس پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میری ماں کسی مسلمان شخص سے شادی کر کے خود بھی مسلمان ہو گئی ہے۔'' اپنی ماں کی دوسری شادی کی بات وہ بڑے آرام سے، عام سے لہجے میں کر رہا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

''میری ماں کی دوسری شادی میرے لیے اتنی حیران کُن نہیں تھی، وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے مگر میری ماں کے مذہب بدل دینے نے مجھے حیران کیا تھا۔ میری ماں اچھی خاصی مذہبی عورت تھی، اس نے کیسے اتنی آسانی سے اپنا مذہب چھوڑ دیا؟ یہ بات اکثر مجھے حیران کرتی۔''

''آپ کی ماں کو اس مسلمان شخص سے محبت ہو گئی ہو گی اور محبت ایسا کروا دیتی ہے۔'' کچھ جاننے کی جستجو میں وہ بے اختیار کہہ گئی۔

''محبت......؟'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

''ایسی کسی محبت کو میں نہیں مانتا۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''محبت ہر مذہبی شخص کو اپنے مذہب سے بھی تو ہوتی ہے۔ مگر یہ کیسی محبت ہے جو آپ کو اپنے محبوب مذہب سے موڑ دیتی ہے، جس سے آپ کا تعلق اپنی پیدائش سے ہوتا ہے۔''

''یارب! کیا ضروری تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہوتی جس سے ملن کی امید ایک فی صد بھی نہیں۔'' ڈیوڈ کے خیالات جان کر وہ بے اختیار ہی خدا سے شکوہ کر گئی۔

''لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی بھی تو نہیں جنہوں نے اپنا مذہب بدل دیا ہے۔ صرف ایک آپ کی والدہ تو نہیں۔''

''لیکن میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو بہت مذہبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے مذہب سے بھی محبت ہوتی ہے۔ مذہب کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینے والوں کے لیے تو یہ عمل شاید کچھ ایسا مشکل نہیں ہو جبکہ میری ماں تو مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔'' اس نے اپنی پچھلی بات کی وضاحت کی۔

''پھر تو آپ خود بھی کافی مذہبی ہوں گے؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا۔

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''میں زیادہ تر اپنے نانا کے ساتھ رہا ہوں تو مذہب سے میں بھی ان کی طرح کوسوں دور ہوں۔'' اس کے جواب نے ایثار کے دل میں کسی قدر اطمینان اتارا تو امید بھی آس پاس ہی منڈلانے لگی۔

''یہ کہتا ہے کہ میں مذہب سے دور ہوں اور مذہب سے دور رہنے والوں کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی اہمت نہیں رکھتی۔ سو یہ ناممکن تو نہیں کہ یہ اپنا مذہب چھوڑ دے۔'' آس پاس منڈلانے والی امید نے سرگوشی کی۔

''یعنی مذہب کی تبدیلی آپ کے لیے بھی دشوار ثابت نہیں ہو گی؟'' اس نے نگاہیں چراتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بھی امید افزا ہو۔

''نہیں، میرے لیے ایسا عمل دشوار نہیں ہو گا۔'' دل ایسا ہی کچھ سننے کا متمنی تھا۔

مگر...... یہ دل اور اس کی تمنائیں۔

''مگر میم! میں کیوں بلاوجہ ہی اپنا مذہب بدلنے لگا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''بلاوجہ نہیں۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔ ''ایسا ہونا ناممکن تو نہیں کہ کوئی آپ پر اپنا دل ہار دے۔''

''نہیں ......! ایسا بالکل نہیں ہو سکتا۔'' اسے گویا یقین تھا۔

''ایسا ہو چکا ہے۔'' رواروی میں اس کے لبوں سے پھسلا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

''اُف خدا! یہ زباں سے ادا ہو جانے والے

الفاظ واپس کیوں نہیں ہوتے۔‘‘ اس نے دل میں خود کو ملامت کی۔

’’میں کہنا دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ فرض کریں ایسا ہو چکا ہے تو......‘‘

’’چلو فرض کرلیا کہ ایسا ہو چکا ہے۔‘‘ وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ’’تب بھی مذہب تو وہ بدلے ناں جس کے ساتھ محبت کا حادثہ ہوگیا ہو۔‘‘ وہ ہنوز مسکرائے جارہا تھا۔

ایثار کا دل یکبارگی دھڑک کر رکا۔ اس لمحے اس پر کھلا کہ وہ اپنے مذہب سے محبت اس شخص سے زیادہ کرتی ہے۔

’’تو پھر یہ فرض کرلیتے ہیں کہ محبت کا حادثہ آپ کے ساتھ پیش آگیا ہے۔‘‘ اسے جو جواب درکار تھا وہ پچھلے سوال سے نہ مل سکا تو اس نے سوال بدل ڈالا۔ اس کے خوابوں کی زندگی کا انحصار ڈیوڈ کے جواب پر تھا سو وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

اس نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

’’شاید مذہب کو اہمیت دوں۔‘‘ وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت کے درمیان بولا۔

ایثار کے دل میں اداسی بڑے اطمینان سے لمبے قیام کے لیے پاؤں پسارے بیٹھ گئی۔

’’شاید کیوں......؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟‘‘ دل میں ایک موہوم سی امید اب بھی باقی تھی۔

’’نہیں، مجھے یقین ہے کہ میں شاید ایسا نہیں کرسکوں۔‘‘ الجھتے ہوئے وہ پھر ’’شاید‘‘ کہہ گیا۔

موہوم سی ٹمٹماتی امید ایک دم بجھ گئی۔ دل میں ملال اتر آیا اور آنکھوں میں نمکین پانی۔

’’چلیں......؟‘‘ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخ موڑے جانے کے لیے بالکل تیار۔

آنکھوں کے کنارے ٹھہرے اشکوں کو اس نے بڑی دقت سے حد پار کرنے سے روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

دو قدم اٹھانے کے بعد وہ تیسرے قدم پر ٹھٹک کر رک گئی۔ نگاہ دور سے آتے مجتبیٰ پر پڑ گئی تھی اور دل بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ یہیں متوجہ تھا۔

اس کے اس طرح ٹھہر جانے پر ڈیوڈ بھی رکا۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجتبیٰ عین اس کے سامنے آرکا۔ چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات لیے وہ اسے کچھ برہم بھی لگا۔ دل میں موجود چور کے باعث ایثار کو اس سے نگاہیں ملانا دشوار ہوا۔ ورنہ بظاہر ایسی کوئی بات تو نہیں تھی جو یوں نگاہیں چرائی جائیں۔

’’السلام علیکم......! مجتبیٰ کیسے ہو؟‘‘ بالآخر وہ ہی بولی۔

مجتبیٰ نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی کھوجتی سنجیدہ نگاہوں سے ڈیوڈ کو گھورے گیا۔ ایثار کو اس کے انداز بڑے عجیب لگے۔

’’یہ ڈیوڈ ہیں۔‘‘ ایثار نے پلٹ کر ڈیوڈ کی سمت دیکھ کر کہا۔ ’’ڈالاس سے آئے ہوئے ہمارے مہمان۔‘‘ مجتبیٰ سپاٹ چہرہ لیے کھڑا رہا۔ ایثار کو اس کے انداز الجھن میں مبتلا کرنے لگے۔

’’اور مسٹر ڈیوڈ...... یہ میرے کزن ہیں مجتبیٰ۔‘‘

ڈیوڈ نے مسکرا کر آگے بڑھ کر خوش دلی سے مجتبیٰ کی سمت ہاتھ بڑھایا۔ جسے بغیر گرم جوشی بلکہ کسی قدر سرد مہری سے تھاما گیا۔

’’میں پچھلے بیس منٹ سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہاں نہیں آتا تو تم سے ملے بغیر ہی جانا پڑتا۔ اور ایسا میں چاہتا نہیں تھا سو یہاں آگیا۔‘‘ ڈیوڈ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ایثار کی جانب مڑا۔

’’اوکے...... مس ایثار......! میں چلا...... آپ سے ملاقات اب کل ہوگی...... اوکے بائے۔‘‘ اس نے گاگلز آنکھوں پر جمائے اور آگے بڑھ گیا۔

’’کیوں ہوگی ہماری ملاقات کل؟ ان بے مقصد ملاقاتوں سے بھلا کیا فائدہ حاصل ہوگا ہمیں؟‘‘ وہ لحہ بہ لحہ دور ہوتے، ڈیوڈ کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچ گئی۔

’’کہتے ہیں محبت ملن کی محتاج نہیں، وہ خدا جانے محبت کا کون سا درجہ ہوتا ہے؟ میں تو یارب اس سوچ سے ہی ہلکان ہوجاتی ہوں۔‘‘ اس نے لب بھینچے۔

مجتبیٰ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پیچھے مڑ

کر دیکھا اور ناگوار سی نگاہ ڈال کر اس کے اور ڈیوڈ کے درمیان آیا۔

ایثار نے خود کو کمپوز کیا اور مسکرائی۔

''تم میں بڑا اسٹیمنا ہے مجتبیٰ! خدا جانے محض تیس، پینتیس منٹ کی ملاقات کے لیے تم اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیتے ہو؟''

''تم بھی تو روز، بلاناغہ ہی یہاں آنا فرض کی طرح نبھاتی ہو، تم میں بھی تو بڑا اسٹیمنا ہے۔'' اس کے فقرے میں طنز اور تلخی کی آمیزش بڑی واضح تھی۔

''میری بات اور ہے...... میں تو......'' ایثار نے اس کے طنز اور تلخی کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا اور کچھ کہنا چاہا...... مگر مجتبیٰ نے اسے فقرہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

''بات اور نہیں ہے ایثار......! بات ایک ہی ہے۔ میرے یوں پندرہ، بیس منٹ کی ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر طے کرنے میں بھی اور تمہارے......'' اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''یہ مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہا ہے؟'' اس کا تلخ لہجہ ایثار کو رنج پہنچا رہا تھا۔

''میرے علم میں نہیں تھا کہ تمہیں میری آمد اتنی ناگوار گزرے گی۔'' وہی تلخ و ترش لب و لہجہ......

''مجھے تمہاری آمد کبھی بری نہیں لگی مجتبیٰ...! تم بات کو غلط معنوں میں کیوں لے رہے ہو؟'' اسے مجتبیٰ کے ایسے رویّے پہ دکھ بھی تھا اور حیرت بھی۔

''اور یہ شخص کہتا ہے کہ میں تمہیں خود سے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تمہارے چہرے کے رنگوں سے تمہارے دل کی بات آرام سے پالیتا ہوں پھر آج اسے دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟'' وہ دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے سوچ گئی۔

دشواری تو درحقیقت اسے ہی پیش آرہی تھی مجتبیٰ کے اس نازیبا رویّے کو سمجھنے کے لیے ورنہ مجتبیٰ تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے چہرے سے اس کے دل کا راز پا گیا تھا...... اور نتیجتاً رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

''مگر آج تمہیں میری آمد بری لگی ہے اور اس کی وجہ وہ انگریز کا بچہ ہے، جس سے تمہاری آج بھی ملاقات ادھوری رہ گئی۔'' طیش میں اس کے تند لب و لہجے سے جن الفاظ کی ادائیگی ہوئی، اس نے ایثار کے لہو کی گردش تیز کر دی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ غصے سے بھی اور اپنی ہتک کے احساس سے بھی۔

''یوں آپے سے باہر تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوا بھی تھا تو وہ ایسی زباں......؟'' وہ متحیر تھی اس کے لب و لہجے پر......

''مجتبیٰ! غصے کے سبب تم اپنی عقل کھو رہے ہو، تمہارے الفاظ مجھے دکھ پہنچا رہے ہیں۔'' اس نے مجتبیٰ کو اس کے بدترین رویّے کا احساس دلانا چاہا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔'' اس نے نہایت درشتی سے کہا۔

''مجتبیٰ!'' دکھ اور صدمے سے اس کی زباں.... بے جان ہوئی اور حرکت کرنے سے معذور ٹھہری۔

مجتبیٰ پلٹا اور تیز قدموں سے واپسی کی راہوں پر چل پڑا۔ آنکھیں جو کب سے برسنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ اردگرد کا منظر دھندلا گیا اور دکھ کی کہر سے اندر کی دنیا بھی۔

☆☆☆

''رات، تمہارے باپ کا فون آیا تھا۔'' دادو نے صوفے پر اس کے برابر نشست سنبھالی اور ہاتھ میں پکڑے سیب کی ایک قاش کاٹ کر اس کی سمت بڑھائی۔

''حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ تمہارے باپ کو میرا نمبر یاد رہا۔''

دادو کو بھی اس کی طرح، اس کے باپ سے دوسری کئی شکایتوں کے ساتھ، یہ شکوہ بھی تھا کہ وہ شاذ و نادر ہی فون کیا کرتے تھے۔

''کہہ رہا تھا، مریم نے مجتبیٰ کے لیے تمہیں مانگا ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں...... تمہاری مرضی پوچھ کے بتادوں۔'' دادو نے بلاوجہ کی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھے سبھاؤ مطلب کی بات کی۔ وہ بے چین

ہو اٹھی۔ ہاتھ میں پکڑی سیب کی قاش اس نے سامنے ٹیبل پر پلیٹ میں رکھ دی۔

''نہ جانے کیوں؟ دل میں پلتی وہ شدید خواہش، جس کی تکمیل کا دور تک کوئی امکان ہوتا ہے نہ اشارہ، اسی خواہش کے پورا ہونے کے لیے لاشعور کسی معجزے کا ہمہ وقت منتظر کیوں رہتا ہے؟''

''جتنی ذہنی ہم آہنگی تم دونوں کے درمیان ہے اس کے بعد لگتا تو نہیں کہ تمہاری مرضی، ہماری مرضی سے الگ ہوگی۔ مگر پھر بھی میرا خیال اگر غلط ہے تو بتادو۔''

دادو کی بات پر اسے چند روز قبل کے مجتبیٰ کے وہ دل دکھانے والے الفاظ پھر سے تنگ کرنے لگے جسے بھلانا بڑی دقتوں سے ممکن ہوا تھا۔ غصے کا احساس ایک بار پھر تمام احساسات پر حاوی ہوا۔

''اسے احساس کیوں نہیں ہوا اب تک کہ اس نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔'' مجتبیٰ کی طرف سے معذرت کی امید بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم ہوتی جارہی تھی۔

''پھر کیا جواب ہے تمہارا؟'' اس کی خاموشی پر دادو کو پھر پوچھنا پڑا۔

''دادو پلیز......!'' وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایسی کسی بات کا جواب میں فی الحال نہیں دے سکتی۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے باہر کی سمت قدم بڑھائے۔

دادو نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسے چڑچڑے پن کا مظاہرہ تو اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

''میں کچھ دیر میں آئی دادو۔'' اس نے دروازے کے پاس رک کر انہیں اطلاع دی اور باہر نکل گئی۔

''قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں، کبھی نہ سمجھ میں آنے والے۔'' اس نے بے بسی سے لب کچلتے ہوئے راہ میں آئے پتھر کو ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔

''آخر ایسے لوگ ہماری زندگی میں آتے ہی کیوں ہیں جو قسمت میں کسی حساب سے بھی نہیں آتے۔'' ایک نہایت ضدی اور سرکش آنسو بڑے ضبط کے باوجود پلکوں پر آن ٹھہرا۔

''اور اگر زندگی میں آ بھی جاتے ہیں تو پھر دل میں یہ خواہش ہی کیوں پیدا ہوتی ہے کہ یہ ہماری زندگی سے کبھی نہیں جائیں۔'' عجب بے بسی سی بے بسی تھی۔

''یاالٰہی آپ کے اختیارات میں تو سب کچھ ہے پھر آپ نے اپنے اختیارات کو میرے خلاف ہی کیوں استعمال کیا؟'' اس حوالے سے اپنے خدا سے شکوے شکایات کا سلسلہ بھی اب پرانا ہو چکا تھا۔

زندگی بھر بھی اگر ہم خدا کی نعمتوں، احسانوں اور عنایتوں کے سائے تلے رہیں بھی تو شکر کا کلمہ زباں پر شاذ ہی آتا ہے اور اگر دکھ کی مشکل کی یا تکلیف کی پرچھائی بھی دیکھ لیں تو شکوے، شکایات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی تو انسان کا ناشکرا پن ہے اور انسان کی ایسی کوتاہیوں سے صرفِ نظر صرف وہی کرسکتا ہے جو ماں سے بڑھ کر چاہے۔ سوچ ہے کہ خدا اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے بڑھ کر چاہتا ہے۔

وہ مخصوص راہوں پر چلتی ہوئی مخصوص جگہ پر پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔ جس سے اب کبھی نہیں ملنے کا اس نے گیارہ روز پہلے قصد کیا تھا۔

وہ بے دھیانی میں اس سمت نہیں آئی تھی مگر یہ خیال دل میں ضرور موجود تھا، یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں اس کی موجودگی کا امکان بھی ہو۔ سو وہ اس سمت آگئی اور اگر وہ اسے دیکھ نہ لیتا تو وہ خاموشی سے پلٹ بھی جاتی۔ مگر اس نے اسے دیکھ لیا تھا سو وہ خاموشی سے بینچ پر بیٹھ گئی۔

''تھینک گاڈ! آپ نظر تو آئیں۔ آج اگر آپ نہ آتیں تو میں نے پکا ارادہ کرلیا تھا آپ کی طرف آنے کا۔'' اس نے بڑی بے ساختگی سے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

وہ خاموش ہی رہی۔ دل کچھ بھی کہنے سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''ویسے خیریت تو تھی ناں؟''

''ہاں......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''کراچی گئی ہوئی تھی۔'' اسے اندازہ تھا کہ اگلا سوال کیا ہوگا۔ سو اس نے بغیر پوچھے ہی ذہن میں آنے والے اس بروقت جواب کو گوش گزار کیا۔
''اچھا......'' وہ ہلکے سے ہنسا۔
''میں تو پچھلے کئی روز سے بڑی مستقل مزاجی سے دن میں کئی بار یہاں کے چکر لگا تا رہا ہوں، آپ آگاہ کر کے بھی تو نہیں گئی تھیں ناں...... اپنے کراچی جانے کے متعلق......'' اس نے شکوہ کیا۔
''کیوں آگاہ کرتی؟'' طبیعت کا چڑچڑا پن بڑھا اور مزید بڑھ کر کمال کو پہنچا۔
''میں یہاں آپ سے ملنے کے ارادے سے تو کبھی نہیں آئی۔'' اسے اس شخص پر شدید غصہ آیا جس کے باعث اس کا جینا ازحد دشوار ہوا تھا۔
''پچھلے چار برسوں سے یہاں آنا میرا معمول ہے اور آپ سے ملاقات اسی معمول کے سبب ہوتی رہی ہے۔'' آنکھوں میں نمی اترنے کا احساس ہوا تو اس نے رخ موڑ لیا۔
اس کے یوں معمولی بات پر اتنا برہم ہونے پر ڈیوڈ نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔
''اوکے جو کچھ آپ نے کہا سو فی صد درست...... میں اس سے انکاری نہیں مگر......'' اس نے ایثار کا مزاج ٹھنڈا کرنے کی ایک کوشش کی۔
''مگر جتنا آپ میری بات سے ناراض ہوئیں ناں، بات اس قدر ناراضی والی تھی نہیں۔'' اس خدشے کے تحت کہ وہ مزید مشتعل نہ ہو جائے، ڈیوڈ نے جھجکتے ہوئے سر کھجاتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کیا۔
''پھر بھی بہت معذرت......'' ایثار نے رخ موڑ کر اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور نادم ہوئی۔
خواب جتنے مرضی اونچے دیکھ لو مگر قسمت پہ بس نہیں چلتا۔ اس کے مزاج کی تلخی اور چڑچڑا پن اسی بے بسی کے باعث تھا۔ قسمت کی بے رخی کا احساس اس وقت شدت سے ہو رہا تھا سو اسے خود کو کمپوز کرنے میں وقت لگا۔
''سوری......'' ایثار نے بیچارگی سے لب کاٹے۔
''دراصل کبھی کبھار مجھے دورہ پڑتا ہے، بے سبب ہی، بلاوجہ ہی غصہ کرنے کا۔'' وہ دانستہ مسکرائی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
''آپ کی بات پر مجھے اپنی زندگی کی پہلی محبت یاد آگئی۔'' اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھی۔
''پہلی محبت...؟ یعنی کئی محبتیں نمٹا چکا ہے۔'' اس نے سوچا مگر خاموش رہی تو وہ از خود کہنے لگا۔
''مجھے زندگی میں پہلی محبت بیس برس کی عمر میں ڈورتھی سے ہوئی تھی۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے میں جس شاپنگ سینٹر میں کام کرتا تھا وہاں وہ سیلز گرل تھی۔'' لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ جیسے ماضی کے کسی واقعے سے محظوظ ہو رہا تھا۔
''اچھی لڑکی تھی۔ سنہری بالوں اور گوری رنگت والی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہوں۔ اسی قسم کے احساسات وہ بھی میرے متعلق رکھتی تھی۔ اسے بھی اکثر بلاوجہ ہی غصہ ہونے کا دورہ پڑتا تھا اور میری بھی یہ عادت نہیں رہی کہ میں کسی کی اونچی آواز آسانی سے برداشت کرلوں۔ سو ایک روز وہ غصے سے مجھ پر چلائی تو میں بالکل برداشت نہیں کرسکا اور گھما کے ایک ہاتھ جڑ دیا۔'' بات کی ابتدا سے لبوں پر سجی محظوظ سی مسکراہٹ جو درمیان میں دھیمی پڑی تھی، وہ دوبارہ سے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔
ایثار کو افسوس ہونے لگا کہ وہ ایک کمزور لڑکی پہ ہاتھ اٹھا کے اب تک محظوظ ہو رہا تھا۔
''نتیجتاً وہ غصے سے پاگل ہو گئی اور پاس پڑا ہوا ایش ٹرے اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور جب تک تکلیف کچھ کم ہوئی اور آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تب تک وہ فرار ہو چکی تھی اور کچھ ایسی فرار ہوئی کہ آج تک نہیں مل سکی۔'' وہ اب ہنس رہا تھا۔
''میرے خدا......'' وہ اس کمزور سی لڑکی کی ایسی

زورآوری پر متحیر ہوئی۔

''شروع میں تو میں نے اسے بہت ڈھونڈا کیونکہ سر پر موجود زخم تکلیف دیتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بھولتا گیا۔ اب جب کبھی اس سارے معاملے کو سوچتا ہوں تو نہ جانے کیوں غصے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔''
اس کی بات کی صداقت کا اندازہ لبوں سے جدا نہ ہونے والی مسکراہٹ سے بخوبی ہو رہا تھا۔

''کبھی کبھی تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ آخر گئی کہاں؟ اس خوب صورتی سے غائب تو صرف جادوگر ہی ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ سچ مچ جادوگرنی تو نہیں تھی؟'' اس نے شرارت سے استفسار کیا۔

ایثار نے کاندھے اچکائے تو وہ ہنس دیا۔

''یہ پہلی محبت، آخری بھی تھی یا......؟'' وہی قسمت کی بے بسی جو اس وقت لفظوں میں طنز بن کر اتری۔

''خدا نہ کرے، آخری کیوں ہونے لگی؟'' اس نے دہلنے کا ڈراما کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے ایثار کو گھورا۔

''ڈورتھی کی جادوگری کا تو علم نہیں مگر اتنا ضرور یقین ہے کہ تمہارا جادو مجھ پر کچھ یوں اثر انداز ہوا ہے کہ توڑ کا کوئی عمل بھی اثر انگیز ثابت نہیں ہو رہا۔'' ایثار نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

''دوسری محبت کا آغاز، پہلی محبت کے اختتام کے چند روز بعد ہی ہوگیا تھا۔'' وہ اپنا دوسرا کارنامہ بیان کرنے لگا۔

''خدا جانے یہ محبت کسے سمجھتا ہے۔ یہاں تو ایک محبت ہی جان کو آگئی ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''دوسری بار بھی مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں جولیا سے شدید محبت کرنے لگا ہوں جب جولیا کو بھی یہ وہم ستانے لگا تو ہم دونوں ہی شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہوگئے۔'' ہر بات پر مسکراتے ہوئے وہ ایثار کو آج بڑے ہی خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا جبکہ خود اس کا دل بڑا ہی مضطرب اور بے کل تھا۔

''ہم دونوں ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہنے لگے۔ شروع، شروع میں تو ہم اچھے دوستوں کی طرح بڑے ہی پیار و محبت سے رہے۔''

''ایک ساتھ، ایک ہی فلیٹ میں؟'' ایثار ایک دم چونکی۔ ''خدا جانے یہ شادی سے قبل کا ذکر کر رہا ہے یا بعد کا؟''

''مگر بعد میں، میں بور ہونے لگا۔ اس کی قربت سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی، وہ میرے قریب بھی آتی تو مجھ پر بیزاری طاری ہونے لگتی۔''

اس کی گفتگو سے ایثار کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''اس لیے میں نے جولیا سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ مجھے لگنے لگا تھا کہ میری دوسری محبت کی مدت بھی ختم ہوگئی ہے۔'' وہی مسکراتا لہجہ......

''یعنی شادی سے پہلے ہی......'' اسے شاک لگا...... ''یارب! یہ مجھے کس شخص سے محبت ہوگئی ہے؟'' اسے بے انتہا افسوس ہوا۔

وہ جانتی تھی وہ جس ملک کا شہری ہے وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے مگر یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا کہ وہ خود بھی ایسی برائیوں میں ملوث ہوسکتا ہے۔

''اور اس محبت کو بھی آپ میری آخری محبت مت سمجھیے گا۔'' وہ اس کے خیالات سے بے خبر کہے گیا۔

''آخر میرا دل اس کی طرف مائل ہی کیوں ہوا؟ کاش یہ میرے لیے اِک عام سا شخص ہوتا، اتنا خاص نہیں ہوتا تو میرا دل یوں دکھی تو نہیں ہوتا......ان انکشافات پر۔'' وہ مضطرب بھی ہوئی اور اس کی بات ازسرِنو سوچ کر مشتعل بھی۔

''دوسری کے بعد بھی کئی محبتیں ہوئیں...... مگر اب پتا چلتا ہے کہ جب واقعی محبت ہوتی ہے تو ہم اس سے اکتاتے ہیں، نہ بیزار ہوتے ہیں بلکہ مزاج کے برخلاف اونچی آواز بھی برداشت کرلیتے ہیں۔''

''اور اب یہ ''واقعی محبت'' اللہ جانے کیسی محبت ہوگی اور کیا کچھ سننا پڑے گا۔'' غصہ جو تھما نہیں تھا مزید بڑھا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' اس کے یوں اچانک اٹھ جانے پر ڈیوڈ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے گویا کرنٹ

لگا۔ ایک دم جلال میں اس نے ڈیوڈ کا ہاتھ پوری شدت سے جھٹکا۔

''آئم سوری......'' اسے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہوگیا۔ مگر ایثار نے اس کی نادم صورت پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا......اور نہایت ناگواری سے رخ موڑ کر تیز قدموں سے اُس سے دور ہوتی گئی۔

''بیہودہ گھٹیا انسان۔'' اس کا خون کھولنے لگا۔ ''بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہوجانا چاہیے تھا کہ یہ کس کردار کا ہوگا۔'' اس نے لب کاٹے۔

''لیکن مجھے اگر اندازہ بھی ہوتا تو میں کیا کرلیتی؟'' دل پھر اس کے آگے تن کے کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا۔ اس شخص سے نفرت کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ بیچارگی سے سوچ گئی۔

''شکر ہے، شہزادی صاحبہ آج جلدی لوٹ آئیں۔'' اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجتبیٰ جو دادو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، ٹھٹک کے رکا اور مسکرا کے گویا ہوا۔

''اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے......اپنی جاگیر یا کوئی غلام جو یوں طنز کررہا ہے۔'' غصہ، بے بسی...... بے کلی اور نارسائی کے ملے جلے احساسات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ناکارہ کیا۔

وہ آج اپنے پچھلے رویّے پر معذرت کرنے کے موڈ میں تھا سو طنزیہ گفتگو کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اب تو تم سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا پڑے گا۔''

''پچھلی بار بھی میں بے سبب ہی اس کے عتاب کا نشانہ بنی تھی۔'' غصہ تمام احساسات پہ غالب آیا اور نقطۂ عروج پر پہنچا سو وہ کہیں تو نکلنا تھا۔ اس لیے مجتبیٰ پر ہی نکلا اور اس نے مجتبیٰ کو طمانچہ جڑ دیا۔

مجتبیٰ ہکا بکا اس کی صورت تکتے گیا اور وہ تیزی سے اس کی سائڈ سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

''ایثار......! آخر ایسی کون سی وجہ ہے جو تم مجتبیٰ سے شادی کے لیے رضامند ہی نہیں ہورہی ہیں؟'' دادو آج اچھی خاصی جھنجلائی ہوئی تھیں۔

''میں نے انکار تو نہیں کیا دادو۔''

''تو ہامی بھی تو نہیں بھری......کوئی فیصلہ کرلو......چاہے ہم سب کو مایوس کردینے والا ہی۔'' دادو کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا تھا اور اب ان کی گفتگو سے ناراضی جھلکتی تھی۔

''ہامی کیسے بھرلوں دادو؟ مجتبیٰ میرے دل میں کسی اور کے بسیرے کا سراغ پاگیا ہے۔ اب وہ بہت بدل گیا ہے۔''

''دادو......'' اس کا دل چاہا وہ یہ سب دادو سے شیئر کرکے اپنے من کا بوجھ ہلکا کرلے......مگر اسے اپنے اس خیال پر عمل کرنا دشوار لگا سو وہ خاموش رہی۔

''اسے اب میری پروا نہیں رہی......ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہوچلا ہے مگر اسے بالکل احساس ہی نہیں ہے کہ اس کے الفاظ نے مجھے اتنا دکھی کیا تھا کہ بلاارادہ ہی میرا ہاتھ اٹھ گیا۔'' اسے اپنی خطا کا احساس نہیں تھا۔ اس نے سارا قصور مجتبیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

''جو کچھ دل چاہتا ہے وہ تو ممکن ہے ہی نہیں تو پھر میں کوئی ایسا فیصلہ کیوں کروں جو سب کو مایوس کردے۔ ہامی تو بھرنی ہی ہے اس رشتے پر مگر بس ایک معصوم سی خواہش تھی کہ وہ اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے ناروا رویّے پر شرمندگی کا اظہار کرے جو اگر اس کے لیے مشکل ہے تو یونہی سہی۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی معصوم خواہش سے دستبردار ہوئی۔

''دادو......'' دادو جو اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر جانے لگی تھیں اس کی پکار پر رکیں۔

''بابا تک میری بات پہنچادیں کہ میری مرضی ان کی مرضی سے مختلف نہیں......وہ میرے لیے جو مناسب سمجھیں اس پر عمل کرڈالیں۔'' بات کے اختتام تک نمی لہجے میں گھل سی گئی۔ نہ جانے کس دکھ پہ وہ اس کا اندازہ نہیں لگا پائی۔

دادو نے مسکراتے ہوئے آسودگی سے اس کی پیشانی چومی۔

''میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو اپنی ایثار کو آسودہ و مسرور دیکھنا ہے۔ اس ایک بات کی صداقت پہ تم کبھی شبہ نہ کرنا کہ میرے لب ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعاگو رہیں گے۔''

انتظار صرف اس کے ہامی بھرنے کا تھا سو بات فوراً کراچی پہنچی اور ایک ہفتے بعد کا دن مقرر ہوگیا۔

''منگنی کی تقریب میں ہی شادی کی تاریخ بھی طے کردیں گے۔'' منگنی سے ایک روز قبل صبح ناشتے کے بعد دادو نے جو خبر سنائی اس نے اسے حواس باختہ کردیا۔

''دادو! یہ بہت جلدی ہے، میں شادی ابھی نہیں چاہتی۔''

''شادی ابھی نہیں ہو رہی..... صرف ڈیٹ فکس کی جائے گی۔'' دادو نے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔

''تو ٹھیک ہے پھر ڈھائی، دو سال بعد کی ڈیٹ فکس کیجیے گا۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔'' اس نے تند لہجے میں ہٹ دھرمی سے کہا۔

''ایثار..... فضول ضد کیوں کرنے لگی ہو؟ جب سب کچھ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ چکی ہو تو اب اس انتہائی غیر اہم بات کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔'' دادو ان دنوں اس کے وجہ بے وجہ کے چڑچڑے پن سے عاجز آگئی تھیں سو اپنے لہجے کو تیز ہونے سے نہ بچا سکیں۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ اس قدر بے تکا فیصلہ آپ کو میرے لیے مناسب لگے گا۔'' وہ جھنجلائی۔

''ایثار..... مجھے بحث و مباحثے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، اپنے باپ سے کہو۔'' دادو ناگواری سے کہتے ہوئے لاؤنج ہی چھوڑ گئیں۔

اس نے برہمی سے گود میں دھرا کشن سائڈ پہ پھینکا اور سر ہاتھوں میں گرالیا۔

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے
لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب

''جو کچھ دل کی خواہش ہے وہ کسی طور ممکن نہیں، خدا جانے اب اطمینانِ قلب نصیب ہوگا بھی یا نہیں؟''

بے بسی سے اس نے لب کچلے۔

''لاحاصل محبت بھی کسی گناہ کی سزا سے کم نہیں۔''

افسردگی اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرنے لگی۔

''اور اب یہ اللہ ہی جانے کہ کسی کو بھلانا واقعی اتنا دشوار ہوتا ہے یا میں ہی اس معاملے میں بہت کمزور ثابت ہو رہی ہوں۔'' اپنی کوششوں میں پیہم ناکامی اسے مایوس کرنے لگی۔

''اور اب بابا کا یہ فیصلہ.....'' اس نے بیزاری سے اپنی پشت صوفے کی بیک سے لگائی۔

''یوں لگتا ہے جیسے تقدیر مجھے سنبھلنے کا وقت دینے کو بھی تیار نہیں۔''

اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے چونک کر گھڑی کی سمت دیکھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ کراچی سے اس کی فیملی کے آنے میں۔ دادو سے خودساختہ ناراضی کا دور چل رہا تھا سو اس نے بڑی ڈھٹائی سے بیل کی آواز کو نظر انداز کیا اور بدستور صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں موندلیں۔

''ڈیوڈ تم سے ملنے آیا ہے۔'' دادو کی آواز پہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ دل کی دھڑکنوں کی ترتیب بری طرح بگڑی۔

''ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے جا کے مل لو.....''

ڈیوڈ کا ذکر وہ سرسری طور پر دادو سے کرچکی تھی سو وہ اس سے غائبانہ متعارف تھیں۔

''جی اچھا.....'' یکلخت بیزاری نے اڑان بھری تھی۔ اکتاہٹ..... اکتا کر بھاگی اور افسردگی اپنا محاصرہ توڑ کر۔ دادو کچن کی جانب چل دیں اور اس نے ڈرائنگ روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

وہ سیٹی پر دھیمے سُروں میں کوئی دھن بجاتا، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، طائرانہ نگاہوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا وقت گزاری مقصود ہو۔

وہ اسے مدتوں بعد دیکھ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو یہی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے دلکش انداز میں

خوش دلی سے مسکرایا۔

''السلام علیکم......!'' ڈیوڈ نے بڑے بشاش لہجے میں سلام کیا۔

''وعلیکم......!'' ایثار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ افسردہ دل کی کیفیت آن کی آن میں بدلنے پر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔

''خوشی اگر یونہی اس کی ملاقات سے مشروط رہی تو آنے والے شب و روز کیسے ہوں گے؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔'' پریشانی کی بات یہی تھی۔

''سوری ایثار......!'' بیٹھتے ساتھ وہ بولا۔

''ایثار......! میں اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہوں جو آپ کے مزاج پر اتنی گراں گزری کہ آپ نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ حالانکہ وہ ایک غیر اختیاری حرکت تھی، جس پر میں بعد میں بہت پشیمان ہوا۔'' شرمندگی اس کے الفاظ سے ہی نہیں چہرے سے بھی عیاں تھی۔

''مجھے اگر کوئی بات ناگوار گزری بھی تھی تو اب تو میں اسے بالکل بھول گئی ہوں سو آپ بھی بھول جائیں۔'' اس کی شرمندہ صورت ہی ایثار کے لیے کافی تھی۔

''شکر ہے آپ کی کمزور یادداشت میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی ہے۔ ورنہ میں تو گھر سے ناک سے لکیریں کھینچنے کی مشق بھی کر کے آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر شرارت سے کہا۔

''تو پھر لکیریں کھینچ ہی لیں، ورنہ آپ کی مشق تو رائگاں جائے گی۔''

''اس کی پروا نہیں...... مجھے فکر ہے آج کا دن نہ رائگاں جائے۔'' وہ سنجیدہ ہوا اور اس کی معنی خیزی پر ایثار چونکی۔

''آج میرے نانا کی بہترویں سالگرہ ہے۔''

اسی پل دادو ٹی ٹرالی سمیت نمودار ہوئیں۔ وہ مؤدب ہو کے بیٹھا۔

''باقاعدہ طور پر تو کبھی نہیں منائی اور آج بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں......لیکن اگر آپ میری گزارش پر سالگرہ اٹینڈ کرنے آجائیں تو......'' سر کھجاتے ہوئے اس نے جھجک کر اپنی خواہش گوش گزار کی۔

''آپ بلائیں اور ہم نہیں آئیں...... ایسے تو حالات نہیں۔'' بے اختیار ہی زبان کی نوک تک آجانے والے الفاظ کو اس نے لب بھینچ کے روکا۔ ''تم اپنے دل کے آگے اتنا مجبور نہ ہوا کرو، تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم نے اب اس سے کبھی نہیں ملنے کا قصد کیا تھا۔'' اندر سے اٹھنے والی آواز کو اس نے واضح طور پر سنا اور گہری سانس بھری۔

دادو نے ایک نظر ڈیوڈ کو دیکھا اور پھر اس کی متذبذب صورت کو۔

''تقریب کتنے بجے ہے؟'' دادو نے اس کی سمت چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''تقریب وقریب کچھ نہیں ہے دادو......! بس میں وش کروں گا اور نانا کیک کاٹیں گے۔'' اس نے مسکرا کر واضح کیا۔

''اچھا......'' دادو بھی مسکرادیں۔

''چلی جانا ایثار......! شام میں۔'' دادو نے گویا اس کی مشکل سہل کی۔

''شام میں نہیں دادو......! ابھی میرے ہمراہ......میرے نانا میرے ساتھ، ساتھ ایثار کے بھی منتظر ہوں گے کیونکہ میں یہاں اسی مقصد کے تحت آیا ہوں اور انہیں بتا کر آیا ہوں۔'' اس نے دادو کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

''آئندہ کبھی نہ ملنے کے فیصلے پہ عمل میں آج تک نہیں کر پائی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے جو سارے ارادے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔'' دل نے کسی بھی الزام سے خود کو بری کیا۔

''لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا جو تمہارا جانا لازمی ٹھہرے، تم معذرت بھی کر سکتی ہو جانے سے۔'' اس کے اندر کی یہ مانوس آواز بڑی فرض شناسی سے موقع پر وارد ہو جاتی تھی۔

''مگر میں کیسے انکار کر کے اسے مایوس کر دوں؟ وہ بڑی آس سے آیا ہے۔'' دل کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

''تم جب ایک فیصلہ کر چکی ہو تو پھر تمہیں کسی کی آس، نہ اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔'' دل و دماغ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند ہو گئے تھے۔ اب پسپائی کس کا مقدر ٹھہرتی تھی؟ یہ دیکھنا تھا۔

''چلی جاؤ ایثار! مگر جلدی آ جانا...... اپنی ماں اور بہن کے آنے سے پہلے ہی۔'' جس سے وہ نہ جانے کا پکا ارادہ کر کے انکار کا بہانہ سوچ رہی تھی، اسی سے دادو نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی مگر اس سے دادو کی بات ٹالی نہ گئی۔ سو چند پل متذبذب رہنے کے بعد اس نے نہ چاہتے ہوئے دادو کی بات مان لی۔

''موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔'' گھر سے نکلتے ہی ڈیوڈ نے کہا۔

موسم بہار کے اوائل دن تھے۔ ابر آلود فضا کی بنا پر بارش کا امکان تھا۔

''ویسے کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے۔ باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگے گی۔'' اس کی جگر جگر کرتی بھوری آنکھوں میں آج کچھ ایسا ضرور تھا جو اس کے دل کی بے پناہ خوشی کا پتا دے رہا تھا۔

''اب معلوم نہیں موسم واقعی اچھا ہے یا مجھے ہی لگ رہا ہے۔''

ایثار نے اپنے ہم قدم چلتے اس خوش باش سے شخص کو نظر بھر کر دیکھا۔

''کیا آپ ہمیشہ ہی اپنے نانا کی سالگرہ پر اتنا ہی خوش ہوتے ہیں؟'' اس نے کسی قدر حیرت سے استفسار کیا تو جواباً وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''اچھا! یعنی آپ کے خیال میں میری غیر معمولی خوشی کا سبب یہی ہے؟''

''ظاہر ہے پھر اور کیا سمجھوں؟ کوئی اور وجہ ہے بھی تو آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔'' یہ شکوہ نہیں تھا وجہ جاننے کی ایک کوشش تھی۔

''نہیں...... یہی وجہ ہے کوئی اور نہیں۔'' متبسم

لہجے میں اس نے اصل وجہ جتاتے ہوئے چھپائی۔

''اب ایسی بھلا کیا وجہ ہوگی جو یوں مخفی رکھی جا رہی ہے۔'' اس کے یوں پوشیدہ رکھنے پر وہ بدمزہ ہوئی۔

''ایک بات پوچھوں؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ایثار سے استفسار کیا۔

جواباً ایثار نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ سر کھجا کے کہنے لگا۔

''بیتے دن میرے بغیر کیسے گزرے؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے ایثار کو چونکا دیا۔

''کہیں اسے شک تو نہیں پڑ گیا کہ میرے وہ دن بڑے بے کیف و بے رونق گزرے ہیں۔'' ایثار نے اس کا چہرہ ایک نظر میں کھوجنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی تو بنا جواب دیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

''میرے خدا......'' ڈیوڈ نے لب بھینچ کر کسی قدر افسوس سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''شاید پھر آپ کے مزاج کے خلاف بول گیا ہوں۔'' ایثار کی خاموشی اسے خفگی لگی۔

''اُفوہ......اب اتنی سی بات پر اسے خفگی کا گمان ہونے لگا ہے۔'' وہ جھنجلائی۔

''سوری......معافی چاہتا ہوں، آئندہ ایسی کوئی بات نہیں بولوں گا جس میں آپ کی ناراضی کا شبہ بھی موجود ہو۔'' وہ پشیمان تھا اپنے لفظوں کی ادائیگی پر۔

''کیا مصیبت ہے۔'' بظاہر ہنستے کھیلتے ہوئے بھی کوئی احساس ضرور تھا جو بے کل رکھتا تھا۔ سو مزاج کا... چڑچڑاپن از سر نو عود آیا۔

''مجھے کوئی بات گراں نہیں گزری ......آپ برائے کرم......'' لب کاٹتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس کے بیزار لب و لہجے پر ڈیوڈ نے لب بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

''آخر کیوں میں اس کے احساس سے خود کو آزاد نہیں کر پا رہی؟'' بے بس سی سوچ دماغ میں اِدھر سے اُدھر چکرانے لگی۔

''بہتر ہوتا جو میں اس کے ساتھ نہ آتی۔ اس سے مل کر تو احساسِ زیاں مزید شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔'' وہ عاجز ہوئی۔

تمام راستہ اسی قسم کی سوچیں دامن گیر رہیں سو موڈ بھی آف رہا۔

ڈیوڈ کی چپ نے بڑی وفاداری سے رہائش گاہ تک ساتھ نبھایا۔ مگر مزید اس کے نانا نے ڈیوڈ کی خاموشی کو ساتھ نہیں نبھانے دیا۔

''تم ان دنوں اپنی من مانی بہت کرنے لگے ہو۔ چھوٹی باتوں میں بھی اور اہم معاملات میں بھی۔'' جوزف انکل نے اس وقت قدرے ناراضی سے کہا جب ڈیوڈ نے انہیں زبردستی چھری تھماتے ہوئے باقاعدہ کیک کاٹنے کو کہا۔

''اس سالگرہ کا اہتمام جوزف انکل کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے۔'' جوزف انکل کے برہم مزاج سے اس نے اندازہ لگایا۔

''میری تو کسی بات کو بھی تم قابلِ عمل نہیں سمجھتے۔ جو دل میں سما جائے پھر اس پر عمل مجھے دکھ پہنچا کر بھی ضرور کرتے ہو۔'' وہ کسی بات کی وجہ سے ڈیوڈ سے ناراض تھے۔ سو اس کا اظہار برملا......بغیر کسی لحاظ کے کر رہے تھے۔

''کچھ خیال کرلیں۔ مہمان کے سامنے ہی میری عزت رکھ لیں۔ میری بقیہ ''تعریف'' بعد میں کر لیجیے گا۔'' شاکی لہجے میں اس نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

''ہاں......مہمان کے دل میں کوئی برا خیال نہ آئے۔'' انہوں نے چبھتی ہوئی نگاہ ایثار پر ڈالی۔ ''باقیوں کی خیر ہے...... ان کی تمہیں پروا بھی کب ہے۔ ایک بس یہی اہم ہے۔'' جوزف انکل کے لب و لہجے پر ایثار کے پورے جسم کا لہو چہرے پر سمٹ آیا۔

ڈیوڈ نے ہڑبڑا کر پہلے اسے اور پھر اپنے نانا کی سمت دیکھا۔

''آپ کی ناراضی مجھ سے ہے تو پلیز اسے مجھ تک ہی محدود رکھیں۔'' اس نے التجا کی۔

''تمہاری زندگی میں ان چند دنوں میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں سو اب مزاج کی تبدیلی معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اب تمہارا رویّہ بہت کم تکلیف دیتا ہے۔ حالانکہ کسی اور کو بہت اہمیت دینا میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔'' بات کے اختتام پر انہوں نے پھر اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔

ان دونوں کے درمیان وجۂ ناراضی اس کی ذات ہے۔ اس نے ٹھیک، ٹھیک اندازہ لگایا۔ مشفق سے جوزف انکل جو ہمیشہ ہی اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے مگر آج ان کا ناقابلِ فہم رویّہ اسے متحیر کر رہا تھا ان کی ناراضی اپنے نواسے سے تھی مگر وہ اسے کیوں بیچ میں.... رگید رہے تھے؟ وہ یہ جاننے سے قاصر تھی۔

''میں چلتی ہوں...... دادو راہ تک رہی ہوں گی۔'' وہ پلٹی اور تیز قدموں سے واپسی کی راہ لی۔

''ایثار......'' وہ پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ ''مس ایثار......! پلیز بات سنیں۔'' اس کے عقب میں وہ باہر تک آیا۔ ایثار نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''سوری ایثارِ! میں بہت شرمندہ ہوں اپنے نانا کے رویّے پر۔'' ایثار نے اس وقت بھی اس کی سمت نہیں دیکھا جب، جب وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں...... مجھے ناگوار نہیں گزرا...... وہ میرے بزرگ ہیں۔'' جوزف انکل کی تلخ باتیں پھر سے ذہن میں ابھریں تو رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک بار پھر بڑھی...... مگر اس نے دل میں کچھ زباں پہ کچھ کے مصداق منافقت سے کام لیا۔

''پھر آپ یوں اچانک کیوں اٹھ آئیں؟'' اس نے چند لمحوں تک خاموشی سے ایثار کی سمت دیکھنے کے بعد استفسار کیا۔

''مجھے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ دادو نے جلد آنے کا کہا تھا۔ کراچی سے میری فیملی آ رہی ہے ناں...... میری منگنی کے سلسلے میں۔ کل منگنی ہے میری۔'' وہ اب اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریزاں رہتی تھی سو اس وقت بھی نگاہیں سامنے راستے پر جمی رہیں۔

ایثار کے انکشاف پہ ایک لمبی چپ ان دونوں کے بیچ دبک کے بیٹھ گئی۔

''اسے ایک دم چپ کیوں لگ گئی ہے؟'' خوش فہمی پھر سر اٹھانے لگی۔ ''کہیں اسے میری منگنی کی خبر نے رنج تو نہیں پہنچایا۔'' اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر اس کی چابی گھما رہا تھا۔

اسے اپنی جانب متوجہ پا کے مسکرایا۔

''بند ہو گئی ہے۔'' وہی خوش باش بے فکرا لہجہ...... جس میں کسی بھی قسم کے ہلکے سے دکھ کی رمق کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا...... ٹھنڈی آہ بھر کے اس نے نگاہیں دوبارہ سامنے کی جانب موڑ لیں۔

''جی تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' اس نے گھڑی جیب میں رکھی اور سابقہ موضوع کی طرف آیا۔ ''کل آپ کی منگنی ہے۔ یہ تو خوشی کی خبر مجھے تو شاید برسبیلِ تذکرہ مطلع کیا جا رہا ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں ہچکچاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ شکوے کا بالکل حق ہی نہیں رکھتا ہو۔ بات سچ تھی، سو وہ خاموش رہی۔ اس سے مروتاً بھی تردید نہ ہو سکی۔

''اب شاید یہ مجھ سے مدعو کرنے سے متعلق استفسار کرے۔'' یہ اس کا خیال تھا سو وہ منتظر بھی رہی مگر وہ پھر مزید کچھ اس وقت تک نہیں بولا جب تک ایثار کی رہائش گاہ تک نہیں پہنچ گیا۔

''اوکے مس ایثار......!'' اس نے الوداعی لہجے میں کہا اور گیٹ کے باہر ہی اپنے قدم روک لیے۔

''میں اب چلوں۔'' وہ مسکرایا۔

نارسائی کا کرب دل میں اس وقت اپنی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلانے لگا۔ اس نے بے بسی سے لب کچلے۔

''سدا خوش رہنا۔'' دھیمے لہجے میں آخری فقرہ کہہ کر وہ پلٹا اور قدم بقدم اس سے دور ہونے لگا۔

''سدا خوش رہنا۔'' ایثار نے اس کے الفاظ زیرِ لب دُہرائے اور سوچا۔ ''یہ التجا تھی، دعا یا ہدایت؟'' وہ یہ بات اس کے لب و لہجے سے پہچان سکی نہ تاثرات سے، سو بے دلی سے سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''جوزف صاحب آئے تھے، تم سے ملنے۔'' وہ قیلولے کے بعد اٹھی تو دادو نے اسے مطلع کیا۔ وہ ایک دم چونکی۔

''کیوں...... خیریت؟'' ذکر چھڑتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ ان کے وہ کئی روز پہلے کے دل دکھانے والے الفاظ آج بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہیں۔

''خدا جانے۔'' دادو نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

''تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے شاید......'' دادو نے خیال ظاہر کیا۔

''تو مجھے اٹھا دیتیں ناں......'' اس نے بے چینی چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہیں جگانا چاہا تھا مگر انہوں نے خود ہی روک دیا۔'' دادو نے اس کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

''تنہا تھے یا......؟'' اس نے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ہاں تنہا تھے، تم تو شاید آگاہ ہو کہ ان کا نواسہ تو اپنے وطن لوٹ گیا ہے۔'' دادو کے جواب پر دل کی سرزمین پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

''ہاں مجھے اندازہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی تو اپنے وطن لوٹ جائے گا۔'' اس نے اداسی سے سوچا۔ ''مگر دلِ خوش فہم کو لگتا تھا کہ وہ جانے سے قبل ملنے ضرور آئے گا۔ سو اب پتا چلا کہ میں اس کے لیے نہایت غیر اہم تھی۔'' اس نے کپ جوں کا توں میز پر رکھ دیا۔

''جاتے سے پیغام چھوڑ گئے تھے تمہارے لیے۔''

''کون......؟'' دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں...... دھیان ڈیوڈ کی طرف تھا سو اسے لگا دادو، ڈیوڈ کے متعلق کہہ رہی ہیں۔

''جوزف صاحب اور کون......؟'' دادو نے اس کی غائب دماغی پر کسی قدر حیرت سے کہا۔

''اچھا......'' وہ سنبھلی۔ ''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے کہ مجھ سے آ کے مل لے...... کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' دادو نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہو آؤں دادو......؟'' بے اختیاری میں وہ اپنی بے تابی پہ قابو پانا بھولی۔

اس کی بے تابی پر دادو نے کسی قدر تعجب سے گھور کے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

''خدا جانے ضروری بات کیا ہو؟'' شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''بیکار کا سسپنس بے چین کیے دے رہا ہے۔'' اس نے اپنی بے تابی کے مظاہرے پر گویا صفائی پیش کی۔

''چلی جاؤ۔ میں نے کب تم پر پابندی لگائی ہے۔'' دادو بھلا کب اسے شرمندہ دیکھ سکتی تھیں سو خالی کپ اٹھا کے وہاں سے چل دیں۔ گہری سانس لے کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی راہ لی۔

آسمان مکمل بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔'' اس کے کان کے قریب جیسے کوئی بولا۔ اس نے بے بسی سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا اور دانستہ اپنا دھیان سامنے درخت پر بیٹھے پرندوں کی جانب مبذول کیا۔

''انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے، باہر کی رُت خود بخود خوب صورت لگے گی۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پُرتکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ ضروری بات جاننے کے لیے بے چین تھی سو اسے ان کی یہ بلاوجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

''آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟'' بالآخر

اسے استفسار کرنا پڑا۔ چند پل انہوں نے اس کی صورت تکی پھر گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

''اپنے نواسے کی زندگی کی چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، سو سوچا آج اس ضرورت کو پورا کرلوں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''خدا خیر کرے۔'' اس کا دل بلاوجہ ہی وسوسوں میں گھرا۔

''ڈیوڈ سے متعلق......؟'' اس نے استفسار کیا۔

''خیریت؟''

''ڈیوڈ نہیں عبداللہ......'' انہوں نے گویا تصحیح کی۔

''عبداللہ......'' ناسمجھی کے عالم میں اس نے زیرلب دہرایا۔

''ہاں...... وہ اب مسلمان ہوگیا ہے۔'' ان کے سپاٹ چہرے کو وہ چند ثانیوں تک بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

''اچھا......؟'' یقین آنے کے بعد اس نے اپنی بے ساختہ خوشی کو بڑے جتنوں سے چھپایا۔

''کیسے......؟'' ان کے ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کو دیکھ کر اس نے جھجک کر پوچھا۔

''یہ سب بتانے کے لیے تو آپ کو بلایا ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لے کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی۔ یوں جیسے یہ ذکر ان کے لیے ناپسندیدہ ہو یا پھر یوں جیسے کوئی مجبوری حقیقت بتانے پر مصر ہو۔

''ڈیوڈ، میری چہیتی بیٹی ''میری'' کا بیٹا ہے۔ میری کی تربیت میں بچپن ہی سے اس کی ماں نے مسیحی مذہب کی محبت کا درس دیا جو اس کے مذہب سے لگاؤ سے ظاہر بھی تھا مگر اس کی ایک عادت سے میں خائف بھی رہتا تھا اور نالاں بھی...... وہ اکثر اپنے مذہب کا مذہب اسلام سے موازنہ کرتی رہتی اور پھر الجھتی رہتی۔'' انہوں نے تھکی تھکی سی سرد آہ بھری۔

''وہ نہیں جانتی تھی کہ بے خبری میں وہ مذہب اسلام سے متاثر ہونے لگی تھی...... مگر میں بے خبر نہیں تھا۔ میں اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگا تھا۔ سو جلد ہی اس کی شادی ڈالاس میں مقیم اپنے خالہ زاد کے بیٹے سے کردی۔ شادی کے بعد اس کی فون کالز سے اس کی خیریت اور اپنے مذہب سے اس کی انسیت کی خبر نے مجھے کافی مطمئن کردیا۔'' وہ بات اپنے اطمینان کی کر رہے تھے مگر وہ ایثار کو اس سمے حد درجہ آزردہ خاطر لگے۔ وہ ایک دم خاموش ہوگئے تھے۔

''شاید ماضی کے واقعات اس وقت ذہن پر تسلط جمائے ہوئے ہیں۔'' اس نے ان کی پُرسوچ نگاہوں سے اندازہ لگایا۔

''گزرتے وقت نے اسے ایک بیٹے سے نوازا جو سات برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی ماں نے اگلے بچے کی آمد کے سبب اسے ہمارے پاس کراچی بھیج دیا۔ وہ وقت بڑا حسین تھا۔'' ان خوب صورت دنوں کی یاد بھی ان کی رنجیدگی میں کمی کی وجہ نہیں بن پا رہی تھی۔ وہ مسلسل افسردگی کے حصار میں ہی تھے۔

''اور وقت کو تو یوں بھی گزرنے کی جلدی ہوتی ہے سو حسین وقت اور بھی سُبک رو ہوا۔ ایک روز اطلاع ملی میری مسلمان ہوگئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً میری بیوی کے لیے۔ اس کے لیے یہ صدمہ سہارنا حد درجہ دشوار تھا سو میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ میری بیوی کی موت کا سبب یہی خبر تھی۔ پھر تو جیسے زندگی سے ساری رونق ہی اٹھ گئی۔ ڈیوڈ ابھی کم عمر تھا۔ یہ بے رونقی قبول نہیں کرپایا اور واپس اپنے وطن لوٹ گیا۔ زندگی بے کیف تو تھی ہی سو ڈیوڈ کے جانے کے بعد مزید ہوئی بہرحال......'' انہوں نے آہ سرد بھری۔

''وہ وقت بھی بالآخر گزر ہی گیا مگر اب کراچی کی فضا میں میرے لیے پہلے جیسا سکون نہیں تھا سو میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ ڈیوڈ سے میرا ٹیلی فونک رابطہ برقرار تھا۔ سو بارہ برس بعد اس کی آمد کی اطلاع نے میرا دل خوشی سے بھر دیا...... وہ یہاں صرف مجھ سے ملنے کی خاطر، صرف میری محبت میں آیا تھا مگر پھر یہاں اس کے طویل

قیام کا سبب محض میری ہی محبت نہیں تھی۔ کسی اور کی محبت بھی تھی جو اس کے واپسی کے ارادے کو متزلزل کرنے کا موجب بن رہی تھی۔'' وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئے تھے مگر محض دم لینے کے لیے پل بھر کو ہی۔

''شروع کے چند دن اسے جھیل کا سحر اپنی جانب کھینچتا تھا مگر رفتہ، رفتہ جھیل کے سحر پر کسی اور کا سحر غالب آنے لگا۔ جس روز اسے اس بات کا ادراک ہوا اس نے مجھ سے آ کے کہا۔'' ان کی نگاہوں کے سامنے وہ دن پوری جزئیات کے ساتھ ابھرا۔

''نانا! روز شام سے جھیل کنارے ایک لڑکی آتی ہے۔ نہ اس کی آنکھیں جھیل سی گہری ہیں، نہ رنگت سونے جیسی مگر اس میں کوئی بات ایسی ضرور ہے جو اس کی موجودگی تک مجھے صرف اسی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔'' اس نے سیب پر اپنے دانت گاڑے۔

''بیٹا جی! ذرا دھیان سے...... یہ ڈالاس نہیں، کشمیر ہے۔ یہاں اگر کسی لڑکے کو کوئی دوشیزہ اچھی لگتی بھی ہے تو وہ اس کا اظہار اسی صورت کر سکتا ہے اگر جو وہ لڑکی اس کی بیوی ہو۔'' نانا نے اپنے لیے کافی چھینٹتے ہوئے، مصروف سے انداز میں اسے آگاہ کیا۔

''جانتا ہوں۔'' اس نے اپنے نانا کو اپنی آگاہی سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

''تبھی مجھے اس سے بات کرنے کے لیے ڈراما کرنا پڑا۔'' وہ اپنا ''کارنامہ'' یاد کر کے محظوظ سے انداز میں مسکرایا۔

''میں نے اس سے کہا میں راہ بھول گیا ہوں۔ برائے مہربانی مسٹر جوزف کے گھر تک رہنمائی کر دیں۔ میرا خیال تھا وہ استفسار کرے گی۔ ''کون مسٹر جوزف......؟'' مگر آپ تو کافی مشہور شخصیت ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف پہچان گئی بلکہ گھر تک پہنچا دیا۔''

اس انکشاف پر ایشار نے چونک کر جوزف انکل کی سمت دیکھا۔

''تو کیا میں جسے اپنے دل کی خوش فہمی سمجھ رہی تھی وہ حقیقت تھی۔'' اس کے دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوئی۔

''اس کے حلیہ بتانے پر میں پہچان گیا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔'' جوزف انکل اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی بپتا سناتے ہوئے گویا یہ طے کیے ہوئے تھے کہ اسے ہر بات سے آگاہ کرنا ہے۔

''یہ مجھے اس حقیقت سے کیوں آگاہ کر رہے ہیں جو میری بے کلی میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔'' اس کی بے چینی بڑھی۔

''لیکن میں زیادہ فکرمند اس لیے نہیں ہوا کہ یہ اس کی پہلی محبت نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی لڑکیوں سے اس لحاظ سے متاثر ہو چکا تھا سو میرا خیال تھا یہ محبت بھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ مگر بڑی غلطی پر تھا میں۔'' وہ زہر خند ہوئے۔

''اس کا احساس مجھے تب ہوا جب ایک روز اس سے ملاقات کے بعد وہ بڑا مسرور سا لوٹا۔'' ان کی نگاہوں کے سامنے ماضی کا وہ منظر پھر چلنے لگا۔

''اس کی محبت میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑنے لگی ہے۔ میں اسے پانے کے لیے سنجیدگی اختیار کر چکا ہوں۔ مگر نانا! میرے اس ارادے میں عمل میں سوائے مذہب کے کوئی اور رکاوٹ نہیں...... یہ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ سو دل کی خوشی کی خاطر میرا مذہب بدلنا از بس ضروری ہو گیا ہے۔''

''میرے خدا!'' یہ انکشاف اس کی اداسی بڑھانے کا باعث بن رہا تھا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اگر اسے اسی وقت پتا چل جاتا تو وہ اسے پانے کی ہر ممکن سعی کرتی مگر وہ تو بنا کسی کوشش کے اس سے دستبردار ہو گئی تھی۔ اس کا حصول ناممکن سمجھ کر۔

''اس کے ارادے کی پختگی اس کے لفظوں سے ہی نہیں...... اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھی۔ سو اس کے فیصلے سے شدید اختلاف کے باوجود میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا اگلی ملاقات پر یہ سب کچھ

اس کے گوش گزار کرنے کا مگر وہ اپنے اس ارادے پر عمل نہیں کر پایا۔ کیونکہ اس لڑکی نے جھیل کنارے آنا چھوڑ دیا تھا جبکہ ڈیوڈ روز بلا ناغہ اس سے ملنے کی چاہ میں وہاں پہنچ جاتا تھا مگر وہ اسے نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں وہ حد درجہ بے چین و مضطرب رہنے لگا تھا۔ وہ دن میں کئی بار ہر اس جگہ سے گزرتا جہاں سے اس کے گزرنے کا امکان بھی ہوتا۔ کئی روز بعد جب ملاقات ہوئی تو حد درجہ خوشی کے سبب وہ اپنے آپے میں نہیں رہا سو اپنی بے اختیاری حرکت سے اسے ناراض کر بیٹھا۔'' انہوں نے نگاہ اٹھا کر اپنی بات کی اثر انگیزی اس کے چہرے پر کھوجنی چاہی تو انہیں سوائے.... بے قراری کے کچھ نہیں ملا۔

''کاش......اے کاش یہ سب اگر مجھے اسی وقت پتا چل جاتا تو زندگی میں یہ اضطراب مقدر نہ ٹھہرتا۔'' اس نے لب کاٹتے ہوئے آنسوؤں پر پابندی لگانے کی سعی کی۔

''پھر تو گویا بے چینی اس کے اندر اپنا مسکن بنا بیٹھی۔ وہ اس سے ملنے کی چاہ میں سارا، سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ مگر سب کچھ بیکار جاتا رہا۔ اسی بے چینی کی حالت میں اس نے مذہب اسلام اپنا لیا۔ اس روز قدرے سکون کی حالت میں اس نے مجھ سے کہا۔

''مذہب کی تبدیلی کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا آدھا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ بڑا پریشان تھا میں اس حوالے سے۔'' اس پل میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام اس کے لیے بھی اتنا سہل نہیں تھا۔'' بولتے، بولتے ان کے لہجے میں تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ انہوں نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

''خدا کی دین کا حال بھی عجب ہے۔ وہ، وہ چیزیں نواز دیتا ہے، جہاں تک سوچوں کی رسائی کا بھی امکان نہیں ہوتا۔'' ڈیوڈ کو یوں بہ آسانی ہدایت مل جانے پر دل چند لمحوں کے لیے ہی سہی اداسی سے کنارہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بغور انہیں سن رہی تھی۔

''اس کی اس حرکت پہ میرا ضبط جواب دے گیا تھا۔ میں نے اس پر خوب چیخ چلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ میری کڑوی کسیلی سر جھکا کے سننے کے باوجود اپنی من مانی سے باز نہیں آیا تھا۔'' وہ خاموش ہوئے اور اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہو میری سالگرہ والے دن وہ تمہیں یہاں کیوں لایا تھا؟'' اس نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

''تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کرنے کے لیے اور تمہاری مرضی معلوم کرنے کے لیے۔'' اس نے گہری سانس لے کر نظریں جھکائیں۔

''وہ مجھے اس حد تک چاہتا رہا اور میں بے خبری رہی۔ جب اس وقت لاعلم رہی تو یا رب اب اس حقیقت سے آگاہی کیوں ہوئی؟ اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے منزل دو گام پر تھی مگر میں اپنی کم عقلی کے سبب خود اسے کھو بیٹھی۔'' اسے لگا دل کی سرزمین سے رخصت ہونے والا اطمینان اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔

''وہ اس روز بے انتہا خوش تھا۔ مگر تمہاری منگنی کی خبر نے اس کے ارادے ملیا میٹ کیے اور ساری خوشی بھی۔ اس کی شوخی، مسکراہٹ، بے فکری کہیں دور دیس جا کے بس گئیں۔'' نواسے کے اضطراب کا اثر ان کے لب و لہجے پر بھی پڑ گیا تھا۔

''اسے یقین تھا کہ وہ اگر اس وقت بھی تمہیں پرپوز کرتا تو تم اپنے منگیتر کے مقابلے میں اسے ترجیح دیتیں مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ عین منگنی والے روز تمہارا اس طرح کا کوئی بھی فیصلہ تمہارے لیے کئی مشکلات پیدا کر دے گا۔ اور وہ تمہیں کسی بھی طرح کی آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

اسے ہر بات سے آگاہ کر دینے کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو کر کسی سوچ میں ڈوبے۔ خاموشی کا وقفہ جب سیکنڈز سے منٹوں تک پہنچا تو وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی دل پر دھرا بوجھ اب آنسوؤں کے ذریعے کم ہونا چاہتا تھا۔

''کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلوں گی اب۔'' مڑ کے

اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''آپ جانتی ہیں ان سب باتوں سے میں نے آپ کو کیوں آگاہ کیا ہے؟'' اس نے اپنے عقب میں ان کی آواز سنی تو ٹھٹک کے رکی۔

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سب باتوں سے تمہیں لاعلم ہی رکھوں، ورنہ حقیقت جان کر تمہارے دل کی کسک مزید بڑھ جائے گی۔ اس کے خیال میں بظاہر جس خواہش کا پورا ہونا ناممکن لگ رہا ہو اور پھر ہمیں پتا چلے کہ اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن تو کیا مشکل بھی نہیں تھا بس ہماری لاعلمی اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں حائل رہی تو اس وقت کا افسوس ایک ''کاش'' کی صورت ساری زندگی ساتھ نبھاتا ہے۔ وہ تمہاری زندگی کو اس ''کاش'' سے بچانا چاہتا تھا۔''

''کس قدر درست اندازہ لگایا ہے اس نے...... یہ ایک ''کاش'' اب پیچھا چھوڑنے والا نہیں۔'' اس نے افسردگی سے سوچا۔

''مگر انہوں نے اس کی ہدایت کے برخلاف مجھے حرف بہ حرف حقیقت کیوں بتادی؟'' وہ حیران تھی۔

''اسی لیے میں نے تم کو تمام حقیقت بتادی۔'' وہ اس کی حیرانی بھانپتے ہوئے بولے۔

''دل پہ مت لینا مگر ایثار حقیقت یہی ہے کہ میں اپنے نواسے کی محبت میں بہت خودغرض ہوگیا ہوں۔ میری نگاہوں سے اس کا اداس چہرہ ہٹتا نہیں۔'' ان کے لہجے میں وہی بیگانگی اور درشتی سمٹ آئی تھی جو اس نے ان کی سالگرہ والے دن سہی تھی۔

''جس ہستی کے سبب میرے نواسے کا چین و سکون برباد ہوا، اسے پُرسکون دیکھنے کا میں خود میں حوصلہ نہیں پاتا تھا۔ اب آپ چاہے میری اس حرکت پہ کچھ بھی سوچیں مجھے اس کی پروا نہیں۔'' ان کا حسد۔ جوبن پہ پہنچ چکا تھا۔ ان کے تیکھے لہجے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں پر چھب دکھلائی اور وہ مڑ کے دوبارہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

''خدا جانے میں انہیں اتنی پُرسکون کب لگی جو یہ مجھے بے سکون کرنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔'' چہرے پر چند بوندیں گری تھیں۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ بادل پانی سے لبالب بھرے ہوئے تھے بالکل اس کے دل کی طرح۔

''مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں جوزف انکل کہ آپ کی محنت بھی رائگاں نہیں گئی۔'' اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا۔

''آپ کی ''محنت'' کے ''کاش'' کا پچھتاوا اب تمام عمر مجھے اپنی کوتاہی یاد دلائے گا۔ میں کیوں اتنی بے خبر رہی؟ مجتبیٰ تو بغیر کہے میرے دل کی بات پالیتا ہے۔ ڈیوڈ میرے جذبات سے باخبر تھا پھر میں ہی کیوں نہ جان پائی؟'' برستی بارش کا فائدہ اٹھا کے اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

''کیا میری محبت اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی کہ میں اس کی ان کہی تک بھی بہ آسانی پہنچ پاتی؟'' برسات کے پانی میں نمکین پانی گھلتا جارہا تھا۔

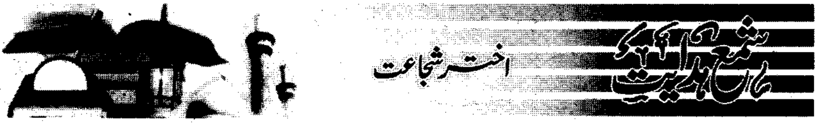
''اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ برسات کے سبب تمہارے آنسو نظروں میں نہیں آسکیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔'' اس کے برابر چلتا شخص نہ جانے کب سے اس کا ہم قدم ہوا تھا وہ محسوس ہی نہیں کرسکی۔

''تمہارے آنسو میری نظروں میں بہنے سے پہلے آجاتے ہیں۔''

''یہ شخص ہر بات سے آگاہ ہے۔ سو اس سے کوئی بات مخفی رکھنے کی کوشش بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

''ایثار......'' وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل رکا۔ اس نے رک کر نگاہ اٹھائی۔

''تمہارے آنسو مجھے تکلیف میں مبتلا کردیتے ہیں۔'' ایثار نے دھندلی نگاہوں سے سامنے دیکھا اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ اس شخص کے لیے جو اسے شدید اور بے لوث چاہتا تھا۔



حُبِ دنیا...... غفلتِ الٰہی

تمام تر حمد وثنا اللہ عزوجل کے لیے ہے۔ جو ہمارا پیارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق، ہمارا رازق ہے۔ ہمارا اللہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ وہ ہمارا ولی، ہمارا نگہبان جو ہمارے اندر سے واقف ہے جو ہمارے تمام احساسات سے آگاہ ہے۔ اسے منانے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی صرف چند آنسو اس کی بارگاہ میں سچے دل سے پیش کردیے جائیں تو وہ ہمیں بخش دیتا ہے...... کتنا مہربان ہے ہمارا آقا......

اے اللہ......! تو رحمت اور برکت نازل فرما سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کی آلؓ پر درودوسلام ہو۔

ہمارا آج کا موضوع ''حُبِ دنیا'' یعنی دنیا کی محبت ہے۔ دنیا کے لغوی معنی ہیں کرۂ ارض، جہان، عالم، کائنات...... لوگ، بہت سی چیزیں۔ یہ لفظ ادنیٰ کا مونث ہے جس کے معنی کم رتبے کا یعنی اعلیٰ کی ضد ہے۔

''اللہ'' کتنی ٹھنڈک ہے اس لفظ میں کتنی تسکین، کتنی راحت ہے سکون وطمانیت ہے اور کتنی زیادہ ممتا ہے۔ اللہ وہ خالقِ کائنات، جس نے ہمیں بنانے سے پہلے ہمارے لیے ایک خوب صورت دنیا تخلیق کی...... اسے خوب صورت مناظر سے سجایا۔ یہ برف پوش چوٹیاں، اونچی نیچی پہاڑیاں بوجھل بادل، ٹھنڈی مہکتی ہوائیں، سرسبز میدان...... دریا، جنگل بیابان، صحرا، جھیلیں اور وسیع سمندر...... یہ سب کچھ ہمارے پروردگار نے ہمارے لیے بنایا تاکہ ہم اس کی قدرت کو دیکھ سکیں اس کی بڑائیوں کو محسوس کرسکیں اسے پہچان سکیں اور پھر اپنے اس عظیم رب کا شکر ادا کرسکیں...... اس نے ہماری ہدایات کے لیے عظیم کتاب قرآن مجید عطا کی...... اور ہماری رہنمائی کے لیے ایک کامل ترین ہستی کو اپنا نمائندہ اپنا محبوب یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ ہم بھٹک نہ جائیں...... اب ہمیں اپنی تخلیق کا مقصد سمجھنا ہے کہ جس رب نے ہمیں بے تحاشا رحمتوں سے نعمتوں سے نوازا ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس کے شکر گزار بن جائیں اور شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے فرماں بردار بن جائیں اور فرماں برداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی ناپسندیدہ باتوں سے اپنے آپ کو روک دیں۔ اور اس کی اطاعت گزاری کریں تاکہ وہ ہم سے ناراض نہ ہوجائے تو ہمارا اصل مقصد اپنے رب کو راضی کرنا ہے تو زندگی امتحان ہے اور یہ دنیا دارالامتحان، سوالنامہ مشکل ہے اور مہلتِ عمر محدود...... کامیابی کا انحصار ایک، ایک لمحے کے صحیح استعمال پر ہے...... اس امتحان میں انسان کی ناکامی کے لیے شیطانی قوتیں بھی سرگرم ہیں۔

ایک بار سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مُردار بکری کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا...... ''تم میں سے کون ہے جو اسے ایک درہم کے بدلے میں لینا چاہتا ہو......'' صحابہؓ نے عرض کیا...... ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو کون لے گا عیب دار ہونے کی وجہ سے اسے کوئی نہیں خریدے گا کیونکہ اس کے کان کٹے ہوئے ہیں اور یہ مردہ ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''خدا کی قسم جتنی ذلیل تمہاری نظر میں یہ ہے، دنیا اللہ کے نزدیک اس مردہ بکری سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی نہ ملتا۔''

یہ دنیا اللہ کے بندوں کی دشمن ہے۔ اللہ کے بندوں کی دشمن اس لیے ہے کہ اس کے بندوں کو راہِ راست پر چلنے نہیں دیتی۔ یہ اللہ کے دوستوں کی اس لیے دشمن ہے کہ ان کے سامنے اپنی زینت، رونق اور شادابی سے اپنے فریب میں مبتلا کردیتی ہے اور وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ اور آخرت کی رسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار مواقع پر دنیا کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ دنیا سے اعراض کریں اور اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔

انبیا کی بعثت کا مقصد بھی یہی رہا کہ وہ اللہ کے بندوں کو دنیا سے منحرف کر کے آخرت کے راستے پر چلائیں۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ....

''دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔''

''دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے۔ بجز اس کے جو اللہ کے لیے ہو۔''

''دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔''

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں.....''دنیا کو اپنا مالک نہ بناؤ وہ تمہیں اپنا غلام بنا لے گی۔ اپنا خزانہ اس کے پاس امانت رکھو جو ضائع نہ کرے اور تمہارے مال کی حفاظت کرے..... جس کا خزانہ خدا کے پاس ہے اسے کسی طرح کا خوف نہیں ہے۔''

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا''اے حواریو......! میں نے تمہارے لیے دنیا کو اوندھے منہ کر دیا۔ تم میرے بعد اسے اٹھا نہ دینا...... دنیا کی خباثت میں سے یہ بات ہے کہ آدمی دنیا کی خاطر خدا کی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ جب تک دنیا نہیں چھٹتی آخرت نہیں ملتی...... اگر تم آخرت چاہتے ہو تو دنیا کو گزرگاہ سمجھ کر رہو اسے آباد مت کرو...... اور یہ بات جان لو کہ ہر گناہ کی جڑ یہ دنیا کی محبت ہے۔ ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کے ہمراہ کسی عابد کے پاس تشریف لے گئے، آپ کے دائیں بائیں جن وانس صفیں بنائے ہوئے تھے اور پرندے آپؑ کے اوپر سایہ کر رہے تھے...... عابد نے عرض کیا۔ اے ابن داؤدؑ...... اللہ نے آپ کو بڑی سلطنت عطا فرمائی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ''مومن کے اعمال میں ایک تسبیح اس تمام دنیا سے بہتر ہے جو ابن داؤد کو عطا کی گئی ہے اس لیے جو کچھ ابن داؤد کے پاس ہے وہ ضائع ہونے والا ہے۔ اور تسبیح باقی رہنے والی ہے۔''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔''غفلت میں رکھا تم کو زیادتی کی حرص نے...... ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال ہے حالانکہ تیرا اسی قدر ہے جتنا تو نے کھا کر ضائع کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا۔ صدقہ کر کے باقی رکھ چھوڑا۔''

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ ''اے ابو ہریرہؓ کیا میں تجھے دنیا اور اس کی تمام چیزیں دکھاؤں؟ میں نے عرض کیا ضرور دکھائیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مدینے کی ایک وادی میں لے گئے وہاں ایک کوڑی تھی جس میں کھوپڑیاں، نجاستیں، ہڈیاں اور گندے چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا۔''یہ سر ایسے ہی حرص کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو اور ایسے ہی امیدیں کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو پھر وہ آج بغیر کھال کے ہڈیاں بن گئے ہیں پھر راکھ ہو جائیں گے اور یہ وہ نجاستیں ہیں جو ان کے انواع و اقسام کے کھانے تھے،نہ جانے کہاں، کہاں سے کمائے تھے پھر ان کھانوں کو انہوں نے اپنے پیٹوں میں انڈیلا اور آج ان کی یہ حالت ہوگئی کہ لوگ ان سے بچتے ہیں اور یہ بوسیدہ چیتھڑے ان کا لباس تھے آج یہ ہوا سے مارے، مارے پھرتے ہیں اور یہ ہڈیاں ان کے جانوروں کی ہڈیاں جن پر سوار ہو کر وہ شہر، شہر گھوما کرتے تھے جو شخص دنیا پر رو سکے روئے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب تک ہم خوب رو نہ لیے وہاں سے نہیں ہٹے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے۔ ارشاد ربِ دو جہاں ہے۔''اے دنیا! تو نیک لوگوں کی نظر میں بڑی ذلیل ہے جن کے لیے تو بن سنور کر نکلتی ہے میں نے ان کے دلوں میں تیری طرف سے نفرت پیدا کر دی ہے اور وہ تجھ سے اعراض کرتے ہیں کوئی مخلوق میں نے تجھ سے زیادہ ذلیل پیدا نہیں کی' تیری ہر حالت ذلیل ہے تو فنا ہونے والی ہے جس روز میں نے تجھے پیدا کیا تھا اسی روز یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ تو کبھی کسی کے پاس نہیں رہے گی نہ کوئی تیرے پاس رہے گا اگرچہ کوئی دنیا دار کتنا ہی بخیل کیوں نہ ہو...... خوش خبری ان نیکو کاروں کے لیے ہے جن کے دل میری رضا اور جن کے ضمیر صدق واستقامت سے پُر ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کی جزا میرے پاس یہ ہوگی کہ جب وہ اپنی قبروں سے نکل کر میری طرف چلیں گے تو ایک نور ان کے آگے، آگے ہوگا اور ملائکہ انہیں اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ جس قدر وہ مجھ سے رحمت کی امید رکھتے تھے میں انہیں عطا کروں گا۔''

☆☆☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعض خطبوں میں ارشاد فرمایا۔

''مومن دو خوف کے درمیان ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس مدت کے درمیان جو گزر چکی ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا کرے گا اور اس مدت کے درمیان جو باقی ہے وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں کیا حکم جاری کرے گا۔ بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کے لیے اپنے نفس سے اپنی آخرت کے

لیے اپنی دنیا سے اپنی موت کے لیے اپنی زندگی سے اور اپنے بڑھاپے کے لیے اپنی جوانی سے توشہ لے۔ لے کیونکہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو...... اس ذات کی قسم......! جس کے قبضے میں میری جان ہے موت کے بعد معافی چاہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ دنیا کے بعد جنت اور دوزخ کے علاوہ کوئی گھر ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "مومن کے دل میں دنیا و آخرت کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جس طرح کسی ایک برتن میں آگ اور پانی کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔" مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ "دنیا والے پر حیرت ہے وہ موت کے یقین کے باوجود دنیا کے فریب میں آ جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر مر جاتا ہے۔"

حضور اقدس کا ارشاد ہے کہ "زیادہ تر میں تم پر اس چیز سے خوف کرتا ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ... برکاتِ ارض میں سے تمہارے لیے نکالے گا...... عرض کیا گیا برکاتِ ارض کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا...... دنیا کی تروتازگی......"

ایک حدیث میں ہے کہ "اپنے دلوں کو دنیا کے ذکر میں مشغول مت کرو......" حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک شخص کے پاس سے گزرے۔ وہ رو رہا تھا جب آپ واپس آئے تب بھی اسے روتے ہوئے پایا...... آپ نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا۔ "اے اللہ...... تیرا یہ بندہ خوف سے رو رہا ہے۔ وحی آئی کہ اگر یہ شخص آنسوؤں کے ساتھ اپنا مغز بھی بہا دے گا یا اتنی دیر ہاتھ اٹھائے رکھے گا کہ کمر اکڑ جائے تب بھی میں اس کی مغفرت نہیں کروں گا کیونکہ یہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ "جس نے اپنے اندر چھ خصلتیں جمع کر لیں اس نے جنت حاصل کرنے اور دوزخ سے بچنے کے سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی...... پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ کو پہچان کر اس کی اطاعت کی...... دوسری شیطان کو پہچان کر اس کی نافرمانی کی۔ تیسری حق کو پہچان کر اس کا اتباع کیا۔ چوتھی باطل کو پہچان کر اس سے اجتناب کیا...... پانچویں دنیا کو پہچان کر اس کو ٹھکرا دیا۔ چھٹی آخرت کو پہچان کر اس کی جستجو کی۔"

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ کے کچھ ملنے والے ان کی خدمت میں پہنچے اور دنیا کی برائی کرنے لگے۔ آپؒ نے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا اور فرمایا...... "اگر تمہارے دلوں میں دنیا کی برتری کا احساس نہ ہوتا تو تم ہرگز اس کا ذکر نہ کرتے...... قاعدہ ہے جو شخص کسی چیز سے محبت رکھتا ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔"

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت کی کہ "اے بیٹے! دنیا ایک سمندر ہے اس میں بہت سے لوگ ڈوب چکے ہیں اس میں خوفِ خدا کی کشتی میں سفر کرو...... ایمان کو ہم سفر بناؤ...... اور توکل کو بادبانی قرار دو۔ اس طرح شاید تم غرق ہونے سے بچ جاؤ۔"

ایک مرتبہ حضرت چراغ دہلویؒ نے شیخ عبداللہ خفیفؒ کا قصہ سنایا۔ حضرت شیخ عبداللہ خفیفؒ کو کہیں دعوت میں بلایا گیا۔ وہاں قسم قسم کے کھانے تھے۔ حلوائے لوزینہ سب کھانوں سے زیادہ شیخ کے قریب تھا۔ شیخ نے ایک لوزینہ اٹھا کر نوش کیا اچھا لگا تو دوسرا بھی اٹھا کر کھایا۔ اس وقت یہ خیال آیا کہ یہ دوسرا لوزینہ خدا کے واسطے نہیں کھایا بلکہ لذت کو کھایا دل کو پسند آیا تھا...... ابھی وہ لوزینہ آپؒ کے منہ میں تھا کہ آپؒ نے اپنی زبان چبالی۔ خون نکلنے لگا۔ لوگ پریشان ہو گئے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "پہلے ایک لوزینہ کھایا تھا بہت لذیذ تھا دوبارہ پھر وہی کھایا تو خیال آیا کہ یہ کھانا خدا کے واسطے نہیں بلکہ لذت کو تھا لہٰذا نفس کو سزا دیتے ہوئے زبان چبالی تھی۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ مخلوقِ خدا کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ایک روز جبکہ خانقاہ میں سیکڑوں طالبانِ حقیقت جمع تھے۔ کسی درویش نے عرض کیا۔

"شیخ......! ترکِ دنیا کیا ہے؟" جواب میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔

"میرے ایک دوست خواجہ محمود ہیں ایک دن راستے میں انہوں نے ایک درویش کو دیکھا جو اپنے فقر کے باعث فاقہ کشی میں مبتلا تھا۔ اکثر اوقات بھوکا رہنے کے سبب اس کا پیٹ کمر سے جا لگا تھا۔ خواجہ محمود نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے ایک تانبے کا سکہ دینا چاہا...... درویش نے خواجہ سے کہا۔ "آج میں نے کٹھل (جنگلی پھل) جی بھر کے کھایا ہے۔ اور روزی کی طرف سے آج کے لیے استغنیٰ حاصل کر لیا ہے۔ اس لیے اے خواجہ مجھے اس سکے کی حاجت نہیں، یہ کسی ضرورت مند کو دے دو۔" اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔ یہ ہے صبر اور قناعت...... اور اسی صبر و قناعت کو ترکِ دنیا کہتے ہیں۔"

مجلس کے اختتام پر حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ "ترکِ دنیا کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ انسان ننگا ہو کر لنگوٹ باندھ کر ایک جگہ بیٹھ رہے...... بلکہ ترکِ دنیا یہ ہے کہ ستر پوشی

کو لباس پہنے..... کھانا کھائے اور جو فتوحات حاصل ہوں انہیں بندگانِ خدا میں تقسیم کرتا رہے جمع نہ کرے اور اپنی طبیعت کو کسی دنیاوی شے کی جانب مائل نہ ہونے دے۔''

ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ ''مجھے دنیا کے بارے میں کچھ بتائیں آپؓ نے ارشاد فرمایا...... میں ایسے مکان کی کیا تعریف کروں جس میں صحت مند بیمار ہو جاتا ہے۔ جو محفوظ رہتا ہے وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ اور جو محتاج ہوتا ہے وہ غم کرتا ہے، اس کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عذاب ہے۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر تمام دنیا مجھے حلال طریقے سے مل جائے اور آخرت میں محاسبے کا خوف بھی نہ ہو تب بھی میں اس سے اتنی نفرت کروں جتنی تم سڑے ہوئے مردہ جانور سے کرتے ہو اور اس سے بچ کر چلتے ہو کہ کہیں اس کی نجاست سے تمہارے کپڑے آلودہ نہ ہو جائیں۔''

حضرت سعید ابن مسعودؒ کہتے ہیں کہ ''جب تو کسی کو دیکھے کہ اس کی دنیا بڑھ رہی ہے اور دین کم ہو رہا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہے تو وہ شخص بڑے خسارے میں ہے۔ اپنی زندگی سے کھیل رہا ہے اور اس کا ذرا احساس نہیں ہے۔''

حضرت یحییٰ ابن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ ''عقلمند تین ہیں...... ایک وہ جو دنیا کو چھوڑ دے اس سے پہلے کہ دنیا اسے چھوڑ دے۔ دوسرا وہ جو قبر میں جانے سے پہلے اپنی قبر بنا لے...... تیسرا وہ جو خالق کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے اسے راضی کر لے...... یہ بھی فرمایا کہ دنیا اس قدر منحوس ہے کہ محض اس کی تمنا ہی اللہ کی اطاعت سے روک دیتی ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ''دنیا میں چھ چیزیں ہوتی ہیں کھانا، پینا، لباس، سواری، نکاح اور خوشبو تو سب کھانوں میں عمدہ شہد ہے اور یہ ایک مکھی کا لعاب ہے۔ مشروبات میں سب سے اعلیٰ پانی ہے۔ جس میں نیک و بد سب برابر ہیں۔ لباس میں عمدہ ریشم ہے جسے ایک حقیر کیڑا اپنے لعاب سے بُنتا ہے۔ بہترین سواری گھوڑا ہے اس پر بیٹھ کر لوگ لڑتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ نکاح میں اہم چیز عورت سے صحبت ہے، عورت اپنے آپ کو تو سنوارتی ہے لیکن اس کی بری چیز کی طلب ہوتی ہے...... سونگھنے کی چیزوں میں عمدہ مشک ہے اور یہ ایک جانور کا جما ہوا خون ہے۔'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک بار دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے دنیا! میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں۔ میں جانتا ہوں کہ تو نے کسی سے وفا نہیں کی...... تو وہ بوڑھی اور بدشکل عورت ہے۔ جس نے اپنی بدصورتی کو فریب و زینت میں چھپا رکھا ہے تو وہ سانپ ہے جس کی کھال نرم مگر اندر زہر گھلا ہوا ہے تو وہ مردہ ہے، جس کی قبر کو چونا مل کر اجلا کیا گیا ہے۔ جا...... میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں تو میرے لیے نہیں اور میں تیرے لیے نہیں۔''

☆☆☆

حضرت محمد ابن حسینؒ فرماتے ہیں کہ ''جب علم و فضل اور اہلِ معرفت کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو حقیر سمجھا ہے اور اسے اپنے دوستوں کے لیے پسند نہیں فرمایا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس دنیا سے متنفر رہے ہیں اور اپنے رفقا کو بھی دنیا میں لگنے سے منع فرمایا ہے تو ان حضرات نے میانہ روی اختیار کی جو زائد بچا اسے آخرت کا توشہ بنا کر رکھا...... صرف اتنا لیا جو کفایت کر جائے اور عیش کوشی کے تمام وسائل ترک کر دیے۔ غذا میں معمولی کھانا کھایا اور وہ بھی اتنا جس سے بھوک ختم ہو اور اعضا اپنا وظیفہ ادا کرنے کے قابل رہیں۔ انہوں نے دنیا کو اس نگاہ سے دیکھا کہ وہ فنا ہونے والی ہے۔ اور آخرت کو اس خیال سے دیکھا کہ وہ باقی رہنے والی ہے۔ انہوں نے کچھ دنوں کی مشقت سے ابدی راحت خریدی، انہوں نے وہ بات پسند کی جو اُن کے رب کو پسند تھی اور وہ بات ناپسند کی جو اُن کے رب کو ناپسند تھی۔

تو اے لوگو...... آہستہ اور اچھے عمل کرو...... اللہ سے ڈرتے رہو، آرزو سے فریب مت کھاؤ...... موت کو نہ بھولو اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے رب کو نہ بھول جاؤ۔'' اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اور ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں اور بے ہوشی کا لبادہ اتار کر اپنے رب کی رضا تلاش کرنے میں لگ جائیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی توفیق کی بدولت ممکن ہوگا......

اللہ رب العزت ہمیں دنیا کے فریب سے بچائے رکھے...... اور ہمیں اپنی محبت میں مبتلا کر دے کہ حقیقی مومن تو صرف اللہ کی رضا کا طلب گار ہوتا ہے...... الٰہی آمین!

حرفِ آخر......

اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون کی تیاری میں کہیں کوئی غلطی کوئی کمی ہو گئی ہو تو وہ مجھے معاف فرما دے...... کہ وہ اپنے بندوں کو معاف کرنا پسند فرماتا ہے...... اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے توشۂ آخرت بنا دے...... آمین۔

عمرے کا سفر

سنبل ملک اعوان

میں اپنے رب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے عمرے کی سعادت نصیب کی۔ میرے اللہ نے مجھ گناہ گار، مجھ خطا کار کو چن لیا۔ میں گزشتہ چھ سالوں سے پیسے جمع کر رہی تھی عمرے کے لیے۔ میری ماما بھی میرے ساتھ جا رہی تھیں۔ ہم نے دبئی سے ہوتے ہوئے جدہ جانا تھا۔ دبئی ائرپورٹ پر ہم نے فرض و نوافل پڑھ کر احرام باندھا۔ ہم صبح ڈھائی بج بجے مکہ مکرمہ اپنے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ اور جمعہ کا دن شروع ہوگیا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ چار بجے کے قریب سب لوگ حرم پاک میں فجر کی نماز ادا کر کے عمرے کا طواف کریں گے۔ لہٰذا اپنے ،اپنے کمروں میں جا کر تازہ دم ہوئے۔ دوبارہ سے وضو کر کے حرم پاک میں جانے کے لیے تیار تھے۔ چونکہ ہوٹل بہت قریب تھا۔ صرف دس منٹ لگتے ابراہیم خلیل اللہ روڈ سے ہم حرم کے صحن میں پہنچ جاتے۔

سب اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ دل کی حالت تو عجیب تھی۔ لبوں پر سوائے اللہ کی وحدانیت کے کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے ماما کا ہاتھ تھام لیا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آنسو بہہ رہے تھے۔ باب فہد سے سیدھا چلتے، چلتے ہم اندر داخل ہوگئے۔ آہ میرے اللہ تو کس قدر جاہ و جلال والا ہے۔ پوری آب و تاب سے خانہ کعبہ سامنے تھا۔ مجھے تو کچھ ہوش نہیں تھا میں نے زار و قطار رونا شروع کردیا۔ اپنا سارا درد اپنا سارا غم آنسوؤں کے ساتھ بہا دیا۔ یہ گھر جسے اذان کے وقت ٹی وی اسکرین پر دیکھا کرتے تھے آج یہاں پہنچ گئے۔ میرا اللہ بہت مہربان اور بزرگی والا ہے۔ میں حقیقت میں اللہ کے گھر آچکی ہوں۔ تیرا شکر ہے مالک، میری بڑی خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی جو تو نے پوری کردی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے اللہ تیرا کرم ہے۔ یا اللہ بڑی مہربانی ہے تیری۔

پہلی نظر کی دعا قبولیت کی ہوتی ہے اور میں نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر تمام دعائیں مانگ لیں۔

پھر پورا گروپ عمرے کی نیت کر کے سبز بتی کے پاس آیا۔ اور طواف شروع کیا۔ میں نے بھی طواف کی نیت کی اور طواف کا آغاز کیا۔ دوسرے چکر میں مقامِ ابراہیم تک بھی پہنچ گئے۔ سات چکروں کے بعد نفل ادا کیے۔ غلافِ کعبہ کو بھی چوما۔ دعا کی پھر سائڈ پر رکھے ٹھنڈے پانی کے کولر سے آبِ زم زم پیا۔ پھر صفا و مروہ کی سعی سے پہلے نیت کی اور توبہ واستغفار کا ورد کرتے، کرتے چکر لگائے ساتھ، ساتھ دعائیں بھی مانگیں۔ سات چکروں کے بعد اُدھر ہی ایک سائڈ پر بیٹھ گئے۔ چونکہ جمعہ کا دن تھا تو لوگ جمعہ کی نماز کے لیے دس بجے ہی آنا شروع ہوگئے۔

جب ہم سعی کر کے بیٹھے تو ہر طرف لوگ ہی لوگ ہی نظر آرہے تھے جب باہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پیدائش دیکھنے گئے تو جہاں لوگ ہی لوگ تھے چونکہ ہم لوگ بھی احرام میں ہی تھے تو بال کٹوا کر ہی ہم احرام سے نکل سکتے تھے۔ ہم قینچی اپنے ساتھ لے کر گئے تھے پہلے میں نے اپنے گروپ کی ساری عورتوں کے بال کاٹے آخر میں ماما نے میرے بال کاٹے۔ اب ہم عمرے کا احرام اتار سکتے تھے مگر چونکہ آج جمعہ تھا اگر ہم لوگ واپس ہوٹل چلے جاتے تو ہمیں واپس حرم کے صحن میں بھی جگہ نہیں ملنی تھی۔

اور یہ جگہ تو ایسی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ بس دیکھتے جاؤ اور دل نہ بھرے، ہم لوگ واپس حرم میں آئے اور

نیچے بچھے قالینوں پر بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ سامنے خانۂ کعبہ تھا اور آنسوؤں کی جھڑی پھر لگ گئی۔ ہر بندہ اللہ کی عبادت میں مشغول تھا۔ کوئی نوافل ادا کر رہا ہے تو کوئی قرآن پاک کی تلاوت، کوئی آنسوؤں سے اپنی فریاد پہنچا رہا ہے تو کوئی ہاتھ اٹھا کر۔ ندامت سے کھڑا معافی کا طلبگار ہے۔ ہر شخص اپنی جبیں اللہ کے حضور جھکائے ہوئے ہے۔ اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ غفور الرحیم ہے، وہ تو انسان کی معافی کا انتظار کرتا ہے، خود بلاتا ہے کہ اے میرے بندے مجھ سے مانگ میں عطا کروں گا۔ دعاؤں کے بعد نوافل پڑھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کی اور جب خانۂ کعبہ کو دیکھ، دیکھ کر دل نہ بھرا تو میں اٹھ کر سیڑھیوں سے پہلی منزل پر آ گئی۔ ماما کے ساتھ کھڑے ہو کر اللہ کے گھر کا نظارہ کرنے لگی۔ اتنی دیر میں نماز جمعہ کا خطبہ شروع ہوا پھر نماز کے لیے جماعت کھڑی ہو گئی۔

کیا بتاؤں کہ کیا سکون تھا، عمرے کی ادائیگی...... سبحان اللہ اور شکر الحمد للہ...... مکہ مکرمہ میں قیام ہمارا پانچ دن تک رہا اور میں صبح سے شام تک حرم میں گزارتی۔ ہر نماز حرم پاک میں ادا کرتی، صبح فجر سے گھنٹا پہلے آ کر طواف کرتی اور خانۂ کعبہ کو تکتی رہتی۔ ہم لوگ بادام کی گریاں، خشک بھنے چنے اور ساتھ تھوڑے بھنے مکئی کے دانے بھی لے کر گئے تھے جو تھوڑی سی مقدار میں تھیلے میں پانی کی بوتل کے ساتھ ڈال کر ساتھ لے جاتے۔ فجر کی نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے اور دوسری منزل پر کبھی تیسری منزل پر میں چلی جاتی۔

پانچ دن بعد ہم مدینہ جانے کو تیار تھے۔

سامان بس میں لوڈ کروایا اور ... جب سارا گروپ بیٹھ گیا تو بس میں گروپ لیڈر نے سفر کی دعا پڑھائی اور ہمیں مدینہ منورہ کا تعارف کروا کر مدینہ کے حالات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے اور بعد کے بتائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالی۔

ظہر، عصر کی نمازیں ہم نے راستے میں پڑھیں۔ راستے میں پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ کہیں اونٹ بھی نظر آئے۔ جس راستے سے آپؐ نے ہجرت کی وہ تفصیل سے بتایا۔ جب حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ خیر ہم لوگ مغرب کے وقت مدینہ پہنچ گئے، الحمد للہ کہ ہوٹل بھی قریب تھا۔ کمرے میں جا کر سامان رکھ کر تازہ دم ہوئے اور مسجد نبوی کی جانب چل پڑے چونکہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا ہم لوگ لیٹ ہو گئے۔ نماز بیرونی دروازہ نمبر 26 پر پڑھی۔

پھر قریبی ہوٹل پر جا کر کھانا کھایا اور مسجد نبوی میں واپس گیٹ نمبر 22 میں آئے اور نماز عشا پڑھی۔

سنا تھا کہ ریاض الجنہ کا دروازہ 3 بار کھلتا ہے ایک فجر، دوسرا ظہر، تیسرا عشا کے بعد...... فیصلہ ہوا کہ تازہ دم ہو کر فجر کے وقت آئیں گے لہٰذا ہم نے نماز عشا پڑھی۔ پوری مسجد کا طواف کیا۔ جنت البقیع کے باہر ہی کھڑے ہو کر دعا کی۔ عورتوں کو تو اجازت نہیں لہٰذا گیٹ کے پاس ہی کھڑے رہے۔

صبح ڈھائی بجے ہم مسجد نبوی کی جانب چل دیے کچھ دیر بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کی پھر فجر کی اذان ہوئی۔ فجر کی جماعت ہوئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہم لوگ بھی ریاض الجنہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انمول اللہ کی عنایت تھی کہ آج میں اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در پر حاضری کے لیے موجود تھی۔

سب لوگ دعاؤں میں مصروف تھے۔ اور اس انتظار میں کہ کب دروازہ کھلے اور کب زیارت نصیب ہو گی۔ اس لمحے مجھے ایک بار ایسا بھی لگا کہ میری دھڑکن رک جائے گی میں یہاں سرکار کے قدموں میں ہی ڈھیر ہو جاؤں گی۔

میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے معافی مانگ رہی تھی کہ اچانک ہلچل مچی کہ دروازہ ... کھلنے میں چند منٹ ہیں۔ اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ خوش قسمتی سے ہمارے سامنے والا ہی دروازہ کھلا اور عورتوں کا جم غفیر تھا کہ تیزی سے دوڑتا ہوتا اندر چلا گیا۔ ماما کا ہاتھ تھامے میں بھی دوڑتی گئی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ قدم

کانپ رہے تھے پھر بھی میں دوڑتی گئی۔ سامنے سفید دیوار سی بنا کر نیچے سبز قالین بچھائے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا جہاں، جہاں سبز قالین ہیں وہ ہی ریاض الجنہ ہے۔ میں اسی دیوار کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئی۔ میں نے ماما کو بولا کہ پہلے آپ نوافل پڑھ لیں میں کھڑی ہوتی ہوں پھر میں پڑھ لوں گی۔ چنانچہ ماما نے نیت باندھی اور میں بازو کھڑے کرکے کھڑی رہی کہ کوئی عورت دھکوں کی وجہ سے ماما پر نہ گر جائے۔ ماما نے چھ نوافل پڑھے۔ پھر میں نے نوافل ادا کیے اور ہم لوگ بہ مشکل ہجوم سے نکل کر باہر آئے۔ میں خوب دل کھول کر روئی، آنسو بہائے دوبارہ سے نوافل پڑھے کہ اللہ پاک نے توفیق عطا کی۔ اپنے نبیؐ کے در پر بلایا۔ مسجد نبوی ہو یا کہ حرم پاک ہر وقت ہجوم ہی رہتا ہے ہر طرف رونق سی رونق تھی۔

سب سے خوب صورت نظارہ جورات کو پہنچنے کی وجہ سے ہم لوگ نہیں دیکھ پائے تھے۔ وہ چھتریاں کھلنے کا تھا۔ اتنا خوب صورت منظر کہ دل موہ لے۔ میں نے اپنے کیمرے میں یہ منظر مقید کر لیا۔ ساری چھتریاں ایک ہی وقت میں ایک ہی آواز اور رفتار سے کھلنے اور بند ہونے کا منظر بہت دلفریب تھا۔ اسی طرح ان چھتریوں کے بند ہونے کا منظر بھی منفرد تھا۔ کمال کی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔

دیگر زیارتوں کا سفر بھی بڑا ہی اچھا رہا۔ مسجد قبا، مسجد قبلتین گئے کھجوریں خریدیں۔ احد کا پہاڑ اور حضرت حمزہؓ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے بھی گئے۔ اللہ کی رحمت ہر جگہ نظر آئی۔ کتنا رحیم اور کریم ہے میرا رب جو کہ بہت بزرگی والا اور مہربان ہے۔ جس نے ہم گناہ گاروں پر کرم کیا۔ اور حضرت محمد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔

ان دونوں مقامات پر آپ کو دنیا جہاں سے آئے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ مگر ہر بندہ اپنی، اپنی عبادات میں مشغول، نماز کے اوقات میں تمام دکانیں کاروبار بند کرکے یا پھر آگے کپڑا لگا کر ہر کوئی نماز کی طرف بھاگتا نظر آئے گا۔ جیسے کوئی بچہ ماں کی پکار پر اس کی طرف لپکتا ہے۔

مدینہ شریف میں بہت سکون اور اطمینان نظر آیا۔ ہم نے دس دن مدینہ منورہ میں گزارے۔ آتے ہوئے الوداعی زیارت بھی کی اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اپنے گھر والوں، ملنے جلنے والوں، اولاد والوں، بے اولاد...... جن کے رشتہ ہوئے ہیں، جن کے نہیں ہوئے سب کے لیے دعائیں کی۔ کھجوریں وغیرہ مدینہ سے ہی لے لیں۔ عجوہ کھجور کا ذائقہ پہلی بار مدینہ میں چکھا اور ماما سے ضد کرکے عجوہ ایک کلو خرید بھی لی۔ کیونکہ مہنگی تھی یہ کھجور۔ گیارھویں دن فجر پڑھ کر ہم لوگ دوبارہ مکہ شریف روانہ ہوئے پھر وہاں کی زیارت میں...... مسجد بلال، غار حرا، غار ثور اور حاجیوں کے قیام کی جگہ مزدلفہ، منیٰ کی بھی زیارت کی جہاں پر حاجیوں کے لیے مستقل شیڈ کیمپ بنے ہیں وہ دیکھے، حاجیوں کے لیے بنائی گئی ریل کو دیکھا نہر زبیدہ...... اور جہاں حضرت حوا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ملاقات ہوئی اس پہاڑ پر بھی گئے۔ غرض یہ کہ خوب دل لگا کر ہر جگہ عبادت کی، خانہ کعبہ کو چوما، غلاف کعبہ کو ہاتھ لگایا۔ حطیم کی دیوار کے اندر مقام ابراہیم پر نوافل ادا کیے۔ یہ سب اللہ کا کرم تھا اللہ کی مہربانی تھی۔ مکہ سے مدینہ اور پھر مکہ جاتے ہوئے پہاڑوں سے گزرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہمارے پیارے آقا نے ہمارے لیے کس قدر تکلیفیں برداشت کیں۔ آج کل تو پھر بھی سفر کے لیے سڑکیں بنا دی گئی ہیں ہم قربان ہو جائیں اپنے پیارے آقا پر۔

اب واپسی کا سفر شروع تھا۔ جدہ جانے سے پہلے الوداعی طواف کیا۔ گناہوں کی معافی مانگی۔ دوبارہ آنے کی دعا کی۔ پھر یہ سفر براستہ دبئی واپس تمام ہوا۔ یوں ہم 21 دن کے بعد 29 مارچ کی صبح 3.30 بجے لاہور ائیرپورٹ پر موجود تھے۔ بس اللہ کا کرم تھا اور بلاوا تھا کہ ہم نے بہت سکون سے عمرے کی سعادت حاصل کر لی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آخر میں دعا ہے کہ اللہ پاک مجھے اتنی توفیق دے کہ میں کسی کو عمرہ کرا سکوں (آمین)

☆☆☆

احوالِ کلیوں کی مہک کا

رُخ چوہدری کے معطر قلم سے



تقریب کی روحِ رواں عذرا رسول اپنی ایڈیٹرز کے ساتھ

دائیں سے آمنہ حماد، لبنیٰ خیال (عذرا صاحبہ) نزہت اصغر اور یمنیٰ احمد

عزیز قارئین! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اب آپ کو اس محفل کی جانب لیے چلتے ہیں جس کی بابت آپ مختصراً گزشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں۔

حسبِ روایت ادارہ پاکیزہ کی جانب سے سن سیٹ کلب ڈیفنس، کراچی میں ایک تقریب عید ملن کا اہتمام کیا گیا بلکہ اسے ہم سالانہ گیٹ ٹو گیدر کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا...... کراچی میں مقیم ہماری رائٹرز اور ریڈرز کو تو انتظار رہتا ہے ایسی محفلوں کا سو پاکیزہ کی روحِ رواں محترمہ عذرا رسول کی پلاننگ میں یہ سرِفہرست ہوتا ہے کہ کب تقریب کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔ عیدالفطر کے بعد سے اس کے بارے میں سوچا جا رہا تھا مگر کبھی رائٹرز کی مصروفیات اور کبھی دفتری یا نجی مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ کراچی سے باہر رہنے والی ہماری معزز رائٹرز اور تبصرہ نگار بہنیں تو صرف تمنا کر کے رہ

جاتی ہیں کہ ہم کیوں نہیں شامل ہو پاتے ۔ ارے بھئی آپ سب بھی اپنے آپ کو شامل ہی سمجھا کریں۔

12 ستمبر 2017ء بروز منگل بوقت چار بجے اس خوب صورت تقریب کا انعقاد طے پایا۔ ہم یعنی نزہت اصغر، آمنہ حماد، معاون مدیرہ پاکیزہ، لبنیٰ خیال، مدیرہ جاسوسی ڈائجسٹ ۔یمنیٰ احمد، مدیرہ سسپنس ڈائجسٹ اور ہماری مہمان رائٹر عالیہ حرا ان کی پیاری بیٹی (جو آفس ہی آ گئی تھیں) کے ہمراہ سن سیٹ کلب پہنچے تو وقت کی پابند سیما مناف اسی لمحے پہنچی تھیں۔ بس اس کے بعد رائٹرز کی پُر بہار آمد شروع ہو گئی۔ دس منٹ کے وقفے سے عذرا صاحبہ بھی تشریف لے آئیں پھر تو آہستہ آہستہ ہال میں خوب صورت رنگا رنگ آنچلوں کی بہار، خوشبوؤں سے مہکتے خوب صورت و دلکش ملبوسات کی دمک اور خوش رنگ و گلگوں چہروں کی چمک اترتی چلی گئی۔ کبھی دبی، دبی سرگوشیاں تو کبھی پُر مسرت ہنسی کے جلترنگ بجتے سنائی دینے لگے۔ جلترنگ سے انجم انصار کی یاد ابھری جو اسلام آباد اپنی بھتیجی کی شادی کے سلسلے میں گئی ہوئی تھیں انہوں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ انشاء اللہ پھر کسی موقع پر وہ ضرور آئیں گی۔ عظمیٰ آفاق اپنی نجی مصروفیات کے باعث نہ آسکیں کمی تو رفعت سراج کی بھی بہت محسوس ہوئی۔ ان کے شوہر نامدار کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی اور عطیہ عمر کے بلند ہوتے بلڈ پریشر نے انہیں آنے کی اجازت نہ دی۔ زہرہ جنید، اسلام آباد سے واپس نہ آپائیں تو معذرت کر ڈالی۔ فرحین اظفر، نگہت اعظمی، غزالہ عزیز، سکینہ فرخ، یاسمین رشید، عذرا آفتاب کوئی ہم راہی میسر نہ ہونے کے باعث نہ آسکیں۔ ہم نے تو نہ آسکنے والوں کے اسمائے گرامی تحریر کر دیے ہیں اب تقریب کا باقی احوال رخ چوہدری نے اپنے ماہرانہ انداز میں لکھا ہے۔ مزید تفصیلات ان کے قلم سے پڑھیے گا۔

یہاں ہم خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں اپنی سینئر ترین رائٹر فریدہ اشفاق کا کہ جو ادبی حلقوں میں کم، کم ہی نکلتی ہیں اور لکھنا تقریباً ترک ہی کر دیا ہے۔ اب اس محفل میں آنے کے بعد اور کچھ، کچھ رائٹرز کے کہنے کے باعث شاید دوبارہ سے لکھنے پر آمادہ ہو جائیں ۔ اس کے ساتھ، ساتھ دوشیزہ ڈائجسٹ کی روح رواں منزہ سہام کا شکریہ کہ جنہوں نے عذرا رسول سے دوستی کا دم بھرتے ہوئے تقریب میں شرکت کی باقی تمام معزز رائٹرز اور قابلِ قدر تبصرہ نگار ان کا



دائیں سے منزہ سہام مرزا، نزہت جبین ضیا، نزہت اصغر، سیما مناف، عقیلہ حق، افسر سلطانہ، عذرا رسول، غزالہ رشید، صبیحہ شاہ اور عالیہ حرا



دائیں سے (استادہ) ناہید فاطمہ حسنین، سعدیہ رئیس، عقیلہ حق، سیما مناف، عذرا رسول، شگفتہ شفیق، نزہت شاہ، عالیہ حرا، شائستہ اعجاز، تسنیم ماپارا (نشستوں پر) دائیں سے منزہ سہام مرزا (مدیر اعلیٰ دوشیزہ ڈائجسٹ) صبیحہ شاہ، رضوانہ پرنس، سیما رضا ردا (مصروف کار) اور ہما بیگ

بھی شکریہ کہ جن کے معتبر ناموں اور دیگر احوال سے رخ چوہدری آگاہ کر رہی ہیں۔

ایک ضروری بات یہ کہ ہم نے اپنے مہمانوں سے پاکیزہ کے بارے میں چند جامع تجاویز بھی مانگیں تو جن مہمانوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے بعد فرصت کے لمحات میسر آگئے تھے انہوں نے تو فوراً رائے دے دی باقیوں نے باقی آئندہ کہہ کر ہاتھ اٹھالیا...... چلیں کوئی بات نہیں، یہ ملنا ملانا تو ہوتا ہی رہتا ہے پھر کبھی دیگران کی قیمتی رائے بھی جان لیں گے آپ فی الحال ان چند مہمانوں کی ہی آرا پڑھ لیجیے......

(مدیرہ پاکیزہ)

☆ سیما مناف کی رائے کچھ یوں تھی۔

1۔ ایسی تقریبات ہر ماہ ہونی چاہئیں۔

2۔ مشہور و معروف پاکیزہ رائٹرز کے پرانے افسانوں میں سے ہر ماہ ایک افسانہ لگایا جائے۔

☆ ناہید فاطمہ حسنین نے کیا کہا آپ بھی پڑھیں۔

1۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پاکیزہ سے پوری طرح مطمئن ہوں، میرے ذہن میں کچھ نیا یا الگ نہیں آرہا۔ ہاں البتہ میں چاہتی ہوں تبصرہ نگار بہنیں ہماری تحریر پر تنقید ضرور کریں اور یہ بھی بتائیں کہ ہم سے تحریر میں کب اور کہاں کوتاہی ہوئی۔ کہاں، کہاں تحریر میں جھول ہے۔

☆ تسنیم ماپارا نے بہت عمدہ تجاویز دی ہیں۔

1۔ الحمدللہ ویسے تو کوئی گنجائش نہیں ماشاء اللہ پرفیکٹ رسالہ ہے۔

2۔ کیونکہ دنیا میں رنج والم کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ کچھ مزاحیہ تحریروں کا اضافہ ہونا چاہیے۔

3۔ ہماری ان پرانی مصنفات کی تحریریں ہر ماہ شائع ہونی چاہئیں جو جب چھپی تھیں تو داد سمیٹی تھی چاہے وہ مرحومہ ہوں یا اللہ تعالیٰ انہیں زندگی دے، سلامت ہوں۔

☆ افسر سلطانہ نے سب کے خیالات کی ترجمانی کچھ یوں کی۔

1۔ سب کچھ بہت اچھا ہے...... بس اگر یہ فنکشن ورکنگ ڈے میں نہ ہو تو بہت اچھا ہے۔ (ہاہاہا)

2۔ غیر ملکی قلم کاروں کے تراجم پیش کیے جائیں۔

3۔ ہر رائٹر کے فیملی ممبرز پر مشتمل انٹرویو، مع تصاویر ضرور شائع ہوں۔

☆ ڈاکٹر ممتاز ضیا نے ہماری رہبری کچھ یوں کی۔

1۔ عذرا کی ہر ماہ حاضری، اس سے بہت، بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

2۔ جس محبت اور خلوص کا یہ مظہر ہے اسے قائم رہنا چاہیے۔

3۔ پرانے لوگوں کو یاد رکھنا (جو کہ رکھا جاتا ہے) اسے قائم رکھنا چاہیے۔

☆ غزالہ رشید نے اپنے خوب صورت خیالات کا بہت خوب صورتی سے اظہار کیا آپ بھی پڑھیں۔

1۔ گیٹ ٹو گیدر کی تفصیل اچھے انداز میں، اچھے عنوان کے ساتھ شائع کریں۔

2۔ افسانوں کے انتخاب میں خصوصی طور پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ایک ہی خیال، پیغام کو بار، بار دہرایا نہ جائے۔

3۔ مصنفین کی عزتِ نفس اور ان کو کہانی کے معیار پر ہی پزیرائی ملے تو یقین کریں رنگ باتیں کریں گے، ملاقاتوں میں بھی رنگ مہکیں گے۔

☆ عقیلہ حق نے تجاویز کے ساتھ فرمائشیں بھی کی ہیں۔

1۔ الحمدللہ پاکیزہ ہمیشہ سے ایک مکمل رسالہ رہا ہے پھر بھی کچھ تجاویز ہیں جو میں دینے کی ہمت کر رہی ہوں۔

2۔ رسالے میں ہر ماہ ایک بہترین افسانے کو خصوصی اعزاز دینا چاہیے ضروری نہیں کوئی تقریب ہو، سالانہ ہائی ٹی میں بھی ایوارڈ دیا جا سکتا ہے۔

3۔ سروے کے سوالات قارئین کی رائے سے بھی بنائیں جائیں تو ایک خوشگوار تبدیلی اور اپنائیت کا احساس بڑھے گا۔

4۔ میرا افسانہ ہر ماہ ہونا چاہیے۔ (ہاہاہا)

☆ نگہت غفار دعاؤں کے خزانوں کے ساتھ، ساتھ بہت پیاری تجاویز دے رہی ہیں۔

1۔ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کیونکہ الحمدللہ یہ نہایت قد آور اور ہر لحاظ سے بہتر ہے، ہر قسم کا مواد موجود ہے ہمارے پاکیزہ میں۔



دائیں سے نگہت غفار، حمیرا طارق، نزہت اصغر، ناہید فاطمہ حسنین، سعدیہ عیس، عذرا رسول، رخ چوہدری، شائستہ اعجاز



دائیں سے عالیہ حرا، عذرا رسول اور حمنہ (بیٹی عالیہ حرا)

2 ۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ ہر رائٹر کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ اس محفل میں شامل ہوتا رہے۔

3 ۔ پاکیزہ ڈائری میں اچھی تحریر پر ہر ماہ نہ سہی تین مہینے میں ایک انعام ہونا چاہیے سب سے اچھے خط پر بھی انعام ہونا چاہیے۔

☆ شائستہ اعجاز کی محبت بھری تعریف کے ساتھ ایک تجویز آپ بھی پڑھیں۔

1 ۔ پاکیزہ ماشاء اللہ کافی شاندار جارہا ہے۔ آپ نے جو چیزیں رکھی ہیں سب اچھی ہیں۔

2 ۔ تجویز کی گنجائش تو نہیں ہے پھر بھی ایک آدھ مزاحیہ کالم کا اضافہ ہو جائے۔

عذرا رسول اور نزہت اصغر ماشاء اللہ ویل ڈن......

☆ سعدیہ رئیس بہت منفرد تجاویز لے کر آئی ہیں۔

1 ۔ پاکیزہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ سلسلے وار ناولز کے علاوہ مکمل ناول یا ناولٹ زیادہ تر قسط وار نہیں ہونے چاہئیں۔ کبھی، کبھی ٹھیک رہتے ہیں۔

2 ۔ پاکیزہ کا نیا سلسلہ طنز و مزاح کی ادبی کاوشیں قابلِ تعریف ہے۔

3 ۔ رائٹرز سے کوئی ایک سوال پوچھا جائے اور تمام رائٹرز اپنے، اپنے جوابات دیں...... سب رائٹرز کے جوابات ایک ساتھ شائع ہوں جو دلچسپ اور مزے دار بھی ہوں۔

☆ نزہت جبیں ضیا نے مختصر اظہارِ رائے کچھ یوں کیا ہے۔

1 پہلی تجویز کے ساتھ، ساتھ درخواست ہے کہ ایسی تقاریب کا سلسلہ جاری و ساری رکھا جائے۔ (انشاءاللہ)

2 ۔ انعامی سلسلے شروع کیے جائیں۔

☆ عالیہ حرا نے تجویز تو تقریب کی دی ہے مگر تعریفی کلمات ضرور کہے (بہت شکریہ)

1 ۔ ایسی تقریب جلدی ،جلدی کیا کریں، درمیانی وقفہ رائٹرز کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔ تمام رائٹرز کے کھلکھلاتے قہقہے، لفظوں کے چٹکلے اور جملوں کی گل کاریاں اِک سماں تھا افسانوی رومانس تھا۔ سب رائٹرز کم اور سہیلیاں زیادہ لگ رہی تھیں۔

2 ۔ یہ تقریب سال میں دوبار تو ضرور ہونی چاہیے ایسا لگتا ہے جیسے لکھنے کا حق ادا ہو رہا ہے۔ عذرا رسول آپا کا والہانہ انداز دل موہ رہا تھا۔ ویسے اسے کسی تجویز کی ضرورت تو نہیں ہے یہ اپنی مثال آپ ہے۔

3 ۔ شائستہ زریں کے انٹرویوز اور سروے..... بے حد مکمل اور دلچسپ ہوتے ہیں تمام سلسلے ہی اپنی جگہ بہت مکمل ہیں۔ پاکیزہ اِک ایسا رسالہ ہے جس میں ہر عمر کے پڑھنے والے کے لیے تحریر ملے گی۔

پاکیزہ کی دوشیزائیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں بہت اچھا اور مکمل لکھتی ہیں۔ خدا کرے تمام رائٹرز

کا زورِ قلم اور زیادہ...... (ماشاء اللہ)

☆☆☆

احوال کلیوں کی مہک کا
رخ چوہدری کے قلم سے

انسان بنیادی طور پر متحرک رہنا پسند کرتا ہے اور یوں بھی حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ سکوت اور جمود انسانی معدے کے آسمان پر غبار اور بخارات بن کر دماغ کو چڑھ جاتا ہے تو پھر بندے کو ہولناک خواب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی ہی جمودی کیفیت ہم پر بھی سوار تھی۔ سستی کے مارے کہیں کچھ لکھا جا رہا تھا نہ کہیں آنا جانا تھا۔ گھر تھا اور اس میں جمائیاں لیتے ہم...... بس بلیوں کی طرح تانک جھانک رہے تھے کہ کہیں سے کوئی بلا لے...... کیونکہ کافی دنوں سے کوئی تقریب اٹینڈ نہیں کی تھی۔ پاکیزہ کی طرف سے کچھ انتظار تھا۔ چھوٹی عید گزر گئی...... بڑی بھی گزر گئی۔ کوئی بلاوا ہی نہیں...... اور پھر ہمارے انتظار کے سکوت کو ہماری پیاری سی نزہت اصغر نے توڑ ڈالا اور پاکیزہ کی جانب سے حسبِ سابق ہائی ٹی پرسن سیٹ کلب میں شرکت کی دعوت دی...... تو دل چونکہ بچہ ہے بچوں کی طرح خوش بھی ہوا اور خوشی کی یہ شیرینی ہم نے ناہید کو بھی بانٹی یوں تو تقریبات میں آنا جانا ہوتا ہی ہے مگر جو مزہ اپنے ہم سخن، ہم نواؤں میں بیٹھ کر آتا ہے اس کی بات ہی اور ہے...... اور اس سلسلے میں عذرا رسول کی محبتوں کی ہمیشہ ہی سے میں معترف رہی ہوں کہ وہ اپنی رائٹرز کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ اور گاہے بہ گاہے تقریبات کا گلشن سجا کر پاکیزہ لکھاریوں کا گلدستہ سجا کر خود بھی اس مہک سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور رائٹرز کو بھی ایک دوسرے سے جھوٹے سچے شکوے (ہاہاہا) کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

اور اس موقع کی احوال نگاری کے لیے ہم جیسے احوال نگار کو موقع پر پہنچ کر پیاری، پیاری دوستوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہیے تھا مگر کیا کیجیے کہ اس احوال نگار کا تعلق پاکستانی قوم سے ہے جو کوئی بھی بل جمع کرانے کے لیے آخری ڈیٹ کی شدت سے منتظر رہتی ہے۔

خیر جی احوال نگار کے ساتھ ایسا ہی ہوا میزبان نزہت نے ایک ہفتہ قبل دعوت دی احتیاطاً وقت پر پہنچنے کی نصیحت بھی سینڈ کر دی تاکہ تمام رائٹرز سہیلیاں آپس میں گھل مل جائیں۔

خیر سے گلابی جوڑے پا کے دو چوہدرانیاں سن سیٹ کلب، ڈیفنس کو چلیں...... مگر ہماری ہوشیاری کو گی



دائیں سے ہما بیگ، نامور شاعرہ ثمین سیف، آمنہ حماد، عذرا رسول، لبنیٰ خیال، فریدہ اشفاق، نزہت اصغر، یمنیٰ احمد اور ڈاکٹر ممتاز ضیا

ٹریفک کی نظر۔پورا ایک گھنٹا ظالم ٹریفک نے ہمیں روکے رکھا۔وقت گزرا جا رہا تھا، ہماری ہارٹ بیٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔چشم تصور میں عذرا رسول اور نزہت اصغر کو سب سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ٹریفک کھلا اور گاڑی ابھی تھوڑی دور اور چلی ہی تھی کہ ٹائر صاحب اپنی ہوا نکالے سڑک بوس تھے۔اففف......

آج تو تقریب میں پہنچنا ناممکن، یہ دل و دماغ کا متفقہ فیصلہ تھا۔اب سعودی عرب سے آئے ہوئے ہمارے بھیا جی اکیلے ہی ٹائر کی تبدیلی کے عمل میں مصروف تھے۔بیگم بھی ویسے حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

بھئی رائٹرز بورمت ہونا جب احوال نگاری کرنا ٹھہری تو یہ احوال بیان کرنا بھی ضروری......خیر جب ہمارے ''F.16'' نے ہمیں سن سیٹ کلب کے گیٹ پراتارا تو لگتا تھا تقریب کا ہاتھی گزر چکا ہے پر دم باقی تھی۔

اب اندر جاتے ہوئے ندامت نے دامن تھام کر گھورا......یہ کوئی وقت ہے......ایک ہفتہ پہلے بتایا گیا اور محترمہ اب تشریف لا رہی ہیں، ناہید سے مشورہ کیا کہ واپس چلتے ہیں اور ایک معذرت کال کر کے نزہت اور عذرا رسول کی ہمدردی سمیٹ لیتے ہیں مگر یہ جو ضمیر صاحب ہیں ناں اکثر اوقات نامناسب موقع پر جاگ جاتے ہیں......انہوں نے ہمارے بال نوچ کر کہا۔''جب یہاں تک پہنچ ہی گئی ہو......تو......اندر جاؤ، مرو''میری سکھیوں یقین کرو......ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سر ندامت سے جھک رہا تھا۔اندر پہنچے تو......''واؤ......زبردست'' کی آوازوں کے ساتھ مختلف قسم کی خوشبویات نے ہمارا استقبال کیا۔

''ارے رخ اتنی دیر کردی بھئی تم نے......ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی......''یہ وہ جملہ تھا جس نے پل بھر میں ہمارے اندر ٹائر والی ہوا بھر دی......یہ جملہ پاکیزہ کی روح رواں عذرا رسول صاحبہ کا تھا جو گہرے گلابی پھولوں والے آف وائٹ رنگ کے خوب صورت لباس میں مثلِ گلاب ہی لگ رہی تھیں۔ماشاء اللہ ان کے حسینِ اخلاق نے ان کی شخصیت اور چہرے کو ماند نہ پڑنے والا حسن دیا ہے۔ان کا جملہ مجھے معتبر کر گیا۔''شکریہ عذرا!''

سب ہی دوست رائٹرز باتوں میں مصروف تھیں۔ہماری آمد سے پہلے نہ جانے ان خواتین نے کیا......کیا باتیں کی ہوں گی کچھ دیر کے لیے میری سونی پیاری سہیلیاں میری طرف متوجہ ہوئیں......دل چاہا سب کو دل میں بٹھا لوں جو اتنی محبت سے مل رہی تھیں......سب سے پہلے فریدہ اشفاق ملیں، ارے فریدہ ایک مدت کے بعد دیکھا، وہی پیاری شکل وہی شفیق مسکراہٹ......بہت خوشی ہوئی انہیں دیکھ کر......اور خوشی تو مجھے اس وقت ہوئی جب عالیہ حرا بھی اپنی ہم شکل بیٹی کے ساتھ گلے مل رہی تھیں سچ، سچ عذرا آپ کا بے حد شکریہ آپ بڑے اچھے پیارے دوستوں سے ملواتی ہیں......''کیسی ہو گڑیا؟'' یہ جملہ کہہ کر مجھے گلے لگانی والی نزہت جبیں ضیا تھیں......پیاری نزہت نے ساری محبت لفظ گڑیا میں سمیٹ دی......نگہت غفار آپا، دعاؤں کا ہار پہنائے ملیں۔اس دوران عذرا بار، بار یہ کہتی رہیں......''ارے بھئی پہلے کچھ کھالو پھر سب سے ملنا۔''ایک تو یہ کہ کھانے پر قیامت گزر چکی تھی اور دوسرے میری سکھیاں اب اپنے، اپنے ڈرائیورز کو فون کر رہی تھیں۔پھر میں نے منزہ سہام کو دیکھا سوائے سلام کچھ اور بات نہ ہوئی کہ وہ فلائی کر گئیں پھر سیما مناف پر نظر گئی جنہوں نے بے خودی لکھ کر سب کو...... بے حد متاثر کر دیا تھا۔اب غزالہ رشید کے ساتھ بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔رضوانہ پرنس جانو سی سہیلی سیما رضا ردا دل گردہ ''ہاں، ہاں ابھی ملتی ہوں ارے، ارے تسنیم ماپا رارک جائیں بھئی......میں تو آپ سے ملی بھی نہیں......وہ عذرا سے گلے مل رہی تھیں تقریب سے رخصت چاہ رہی تھیں۔عقیلہ حق نے قسم کھائی تھی کہ خوب صورتی اور شاندار تیاری کے سارے ریکارڈ توڑ دوں گی......قارئین تصویریں بھی خوب لی جا رہی



دائیں سے (بیٹی ناہید فاطمہ حسنین) عذرا رسول ناہید فاطمہ حسنین اور شبین سیف

تھیں...... سیلفیاں بھی ہو رہی تھیں مگر...... مگر ایک خاتون غیر حاضر ہیں جن کی تحریر کی اٹکھیلیوں کی جلترنگ چاندنی بکھیرتی ہے تو ”بہت اچھا لگتا ہے۔“

جی انجم انصار جن کو مجھ سمیت سب نے ہی بہت، بہت مس کیا...... نزہت نے بتایا انجم اپنی بھتیجی کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی ہیں۔ انجم آپ کو بہت مس کیا (جی بالکل) ذکر آیا نزہت کا تو...... میں اس خاتون سے باقاعدہ جیلس ہوں۔ بھئی اس لیے کہ ہر ملاقات میں اسمارٹ سے اسمارٹ ہو رہی ہیں...... اور دوسری خاتون، حسین سے حسین تر...... یعنی عذرا رسول...... لیکن عالیہ حرا کو دیکھ کر قدرے تسلی ہوئی کہ ہماری طرح کوئی اور بھی وزن بڑھانے پر تلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز ضیا اپنی بہن اور بھانجی کے ساتھ تھیں۔ حمیرا طارق...... شائستہ اعجاز جو عذرا کی دوستیں ہیں بہت محبت سے ملیں لیکن یاسمین رشید نظر نہیں آئیں...... وہ بھی عذرا کی عزیز دوست ہیں اور ہمیں بھی بہت پسند ہیں۔ پاکیزہ کی تبصرہ نگار نگینہ ضیا بنگش اپنی پیاری سی بیٹی کے ساتھ نظر آئیں...... بے حد پیاری، محبت کرنے والی خاتون ناہید حسنین اپنی بیٹی جس کو عذرا بار، بار حسینہ کہہ رہی تھیں۔ ماشاء اللہ حسنین بچی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی کی نوید سال بھر پہلے مجھ جیسی رائٹر کو سنادی تا کہ ہال کی بتیاں بند ہونے سے پہلے پہنچ جاؤں...... شکریہ ناہید!

رائٹر اسما قادری سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔

اور یہ ایک اور حسینہ کہنے کو نانی جان، دادی جان ہیں لیکن دیکھنے میں ٹنیار ہیں نرم لہجے کی خوب صورت سی شاعرہ شگفتہ شفیق ہیں۔

سعدیہ رئیس کیسی ہو بھئی اس ابتدائیہ جلسے پر ان کا خدا حافظ کہنا احساسِ جرم دلا گیا۔ اور دیر سے پہنچو...... ”اللہ تو انوں پچھے ٹریفک والو...... تے ٹائر پاجی......“ ان کی وجہ سے میں اپنی پیاری، پیاری دوستوں سے جی بھر کے بات بھی نہیں کر پائی۔ میری عدم موجودگی میں سب نے کتنی مزے، مزے کی باتیں کی ہوں گی۔ عذرا رسول کے مزے دار چٹکلے...... رضوانہ پرنس کی باتیں باوقار سی صبیحہ شاہ... پرخلوص اختر شجاعت، جن کی دینی تحریروں کی وجہ سے دل میں ان کا ایک خاص مقام ہے...... مجال ہے جو ان سے زیادہ بات ہو سکی ہو۔ صبیحہ شاہ کی مہربان سی مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ ان کا انٹرویو بھی زبردست تھا۔ ہما بیگ اپنی شاعرہ دوست شبین کے ہمراہ تھیں۔

بھئی آمنہ حماد تم نے احوال لکھنے کو کہا تھا اور پابند کر دیا تھا مجھے تین، صفحات کا...... تو لڑکی ایسا کیسے ہوسکتا ہے عذرا رسول کی پاکیزہ محفل ہو ان کی پیاری سی پاکیزہ رائٹرز ہوں اور جو تشریف نہیں لاسکیں ان کو بھی تو مس کیا ہے ناں...... سکینہ فرخ تو کینٹ میں ہماری ہی پڑوسی ہیں وہ بھی نہ آسکیں۔ عطیہ عمر، اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے اور افسر سلطانہ سے اتنی سی بات ہوئی کہ صرف فون نمبر ہی لیے جاسکے۔ سیما رضا ردا میں نے تمہارے خوب صورت لہجے میں خوب صورت اور اچھی باتیں بہت مس کیں۔ اب میں اپنی پیاری سہیلیوں غزالہ رشید اور سیما مناف سے کچھ بات کرنے لگی ہوں۔ سیما مناف کے مشورے میرے لیے بہت قیمتی ہوتے ہیں ان سے کی گئی گفتگو قارئین آف دی ریکارڈ ہے۔

میں ان تمام مہکتی کلیوں سے مطلب رائٹرز سے معذرت خواہ جن کو میری کوئی بات بری لگی ہو دست بستہ معذرت خواہ ہوں...... اور اگر پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو دل میں خوب ''یہ'' ''وہ'' کہہ لیجیے گا۔ (ہاہاہا)

بھئی آمنہ حماد اور نزہت اصغر تم لوگ مجھے گھورو مت...... ہاں اپنا غصہ دل میں اتار لو...... میں تو احوالِ یاراں پورا کر کے ہی دم لوں گی جو اتنے دنوں سے روکا ہوا ہے۔ ارے بھئی میں بھول جاؤں مجھے اپنی بھانجی عالیہ حرا کی بیٹی کو ڈانٹنا ہے، بچی نہ وڈیو اچھی بنی ہے نہ ہی کوئی ڈھنگ کی تصویر آئی ہے...... اب یہ نہ کہنا آنٹی آپ جیسی ہیں ایسی آئی، چلو اگلی ملاقات میں تم اپنی اس غلطی کا ازالہ کرلینا ورنہ تمہاری ماں کی خیر نہیں...... ارے ہاں یاد آیا اس تقریب میں میرے ساتھ ایک خاتون آئی تھیں ناہید چوہدری کے نام سے...... محبتوں کی بھیڑ میں وہ نظر ہی نہیں آئیں۔

''ارے بھئی ناہید، رخ ایک تو دیر سے آئی ہو اب تصویریں تو بنوالو......'' عذرا صاحبہ کی آواز آئی۔

لیجیے جناب آدھے پون گھنٹے میں ادھوری ملاقاتیں ہوئیں ادھوری شکایتیں ہوئیں مگر ملاقات میں مکمل محبت سمیٹی۔ کھلتے گلاب کی طرح عذرا رسول آخر میں صرف ہماری وجہ سے رکی ہوئی تھیں مگر گھر سے محترم معراج رسول کے ملازم کے فون آنے پر معذرت کرتی اٹھ گئیں...... کہ ''بھئی میں رک تو جاتی مگر معراج صاحب کو کھانا خود کھلاتی ہوں۔'' ان کے جاتے ہی ہم بھائی، بھابی کو جلد آنے کے لیے فون کرنے لگے۔

نزہت جبیں اور نگہت غفار ہمارے ساتھ، ساتھ رہیں۔ ہاں جانے سے پہلے قارئین کے منہ میں پانی لانے والی اشیائے خوردنی تو گنوادوں جسے سب نے مزے لے، لے کر کھایا جیسے مزیدار حلیم مسالوں کی ورائٹی کے ہمراہ، گرما گرم خستہ سموسے، الفریڈو پاستا، جو بہت ہی لذیز تھا، چکن سینڈوچز، گرم، گرم گلاب جامنیں اور کریمی پیسٹریز اس کے علاوہ کولڈ ڈرنک، چائے، قہوہ، وغیرہ الگ ٹیبل پر تھا۔

میں عذرا رسول صاحبہ سے یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ جو گاہے بہ گاہے دوستوں کو، رائٹرز کو جمع کرتی ہیں سب ملتے ہیں نئی دوستیاں وجود میں آتی ہیں تعلقات بنتے ہیں پرانے فریش ہوتے ہیں، یہ ایک کارِ خیر ہے محبتیں بانٹنا، سیٹنا کارِ خیر ہے اور مل کر بیٹھنا اور پھر اہتمام کرنا اللہ کریم کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارِ خیر کا اجرِ عظیم دے اور آپ کی ذاتی زندگی کے آنگن میں ہمیشہ خوشیوں کے پھول مہکتے رہیں، آمین ثم آمین...... اب مجھے راستہ دیں، نزہت اور آمنہ سے چھپ جانے دیں۔

آخر میں میری کیا بلکہ سب کی پُرخلوص دعا ہے کہ عذرا رسول صاحبہ، معراج رسول صاحب اور ان کے بیٹے، بہو خوش رہیں، سلامت رہیں اور ایسی پاکیزہ محفلیں سجاتے رہیں۔ پاکیزہ والوں کی یہ ادا سب سے اچھی ہے کہ ڈھیر ساری پاکیزاؤں کو ایک چھت کے نیچے اکٹھا کرتے ہیں۔ ایسی پیاری محفلیں سجانے والے سلامت رہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ پیارے قارئین مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆☆

اکیسویں صدی کے تقاضے اور بچوں کی تربیت

شائستہ زرّیں

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

بیسویں صدی میں تخلیق کیا جانے والا پروین شاکر کا یہ شعر اس عہد کے بچوں کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب الیکٹرانک میڈیا نے بڑوں، بچوں سب پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ اس کے باوجود ماؤں کے لیے بچوں کی تربیت کا عمل کارِ محال نہ تھا۔ بچے والدین کی زیادہ سنتے اور اپنی کم سناتے تھے۔ لیکن اکیسویں صدی کے سوشل میڈیا اور خود ارادیت (اپنے معاملات خود سنبھالنا) کے زعم میں مبتلا بچوں کی تربیت ماؤں کے لیے جاں کاہی سے کم نہیں۔ آج کے باشعور بچوں سے کسی معاملے میں اگر جواب طلبی کی جائے تو اپنی خود اعتمادی اور علمیت کے گمان میں گرفتار یہ بچے جواب میں سوال در سوال کر کے بڑوں کو حیرت اور آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

نونہال ہوں یا نوجوان اب سب کا شیوہ یہی ہے۔ آج کے بچے خود کو ہر معاملے میں اپنے والدین سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کی ان باریکیوں سے بھی باخبر ہیں جن کی ابجد سے اکثر والدین بھی واقف نہیں۔ ان حالات میں ان بچوں کی ماؤں پر ان کی تربیت کی ذمے داری پہلے کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی کہ انہیں اپنے بچوں کو اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھانا ہے اور اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات کا امرت بھی ان کے اندر گھولنا ہے کہ کہیں ان کے یہ بچے ترقی یافتہ دور میں سوشل میڈیا کے برق رفتار ارتقا تک غیر ضروری رسائی حاصل کر کے تنزلی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس ضمن میں اکثر ماؤں کو پریشان دیکھا گیا ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور ماؤں سے دریافت کیا کہ......

اکیسویں صدی کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے بچوں کی تربیت میں آپ کن امور کو پیشِ نظر رکھتی ہیں؟

شگفتہ فرحت
(صدر انجمن محبان بھوپال)

اکیسویں صدی میں جتنی ضرورت بچوں کی تربیت کی ہے پہلے شاید کبھی نہیں رہی۔ آج کا زمانہ کمپیوٹر کا ہے ہر چیز تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ منٹوں کا کام سیکنڈوں میں ہو رہا ہے۔ بچے بڑے سب موبائل کی دنیا میں مگن ہیں۔ مختلف ایپس چل رہے ہیں۔ تقریباً ہر گھر میں کھانے کے وقت، چائے کے وقت غرض مختلف کاموں کے وقت سب موبائل میں مصروف ہیں۔ موبائل کوئی بری چیز نہیں اس

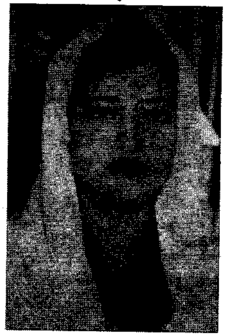


کے بے شمار فائدے ہیں لیکن آج افراتفری اور محبتوں سے دوری کے اس ماحول میں ہمیں بچوں کی تربیت کے لیے انہیں سمجھانا ہوگا کہ موبائل کے ساتھ، ساتھ گھر والوں اور گھر آئے مہمانوں کو وقت دینا بھی بہت ضروری ہے۔ ہر وقت کے موبائل کے استعمال نے بچوں کو گھر، بھائی چارگی، محبتوں اور ایک دوسرے کے مسائل سے بیگانہ کر دیا ہے۔ بچوں کو سمجھانا بہت ضروری ہے کہ موبائل اور کمپیوٹر کی اپنی اہمیت ہے اور رشتے ناتوں کی اپنی۔ دونوں طرف توازن رکھنا بہت ضروری ہے۔

سعدیہ ہما شیخ
(ایڈووکیٹ، شاعرہ)

صدی کوئی بھی ہو بچوں کی تربیت میں اسلامی امور کو

پیشِ نظر رکھوں گی کہ ہماری بقا دین اسلام میں ہے۔ اپنے بچوں کو دین سے جوڑیں گے تب ہی کامیابی ملے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ



بچوں کو دینی مدرسوں میں داخل کرادیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین کے ساتھ، ساتھ دنیاوی تعلیم بھی بہت ضروری ہے اور ہمارے دین کو پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے جو اچھے طریقے سے دین کا احیا کرسکیں۔ آج ہم دُہرے معیار میں مبتلا ہیں۔ معاشرتی تقاضے کچھ اور ہیں اور دین کے کچھ اور ایسے میں اکیسویں صدی کا ساتھ نبھانے اور بچوں کو.... بے حیائی اور فحاشی کے اس طوفان سے جہاں ایک فنگر ٹچ سے سب آپ کے سامنے ہے اس سب سے بچنے کے لیے تربیت میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے دین کی چھتری بھیگنے سے روک سکتی ہے۔ ورنہ ہماری نسلیں بے باکی کے اس سمندر میں غرق ہوجائیں گی۔

سحر فاطمہ

(ایگزیکٹو انجینئر پاکستان ریفائنری لمیٹڈ)

موجودہ دور کے پیشِ نظر آج اکیسویں صدی میں بچوں کو نہایت سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے مرہونِ منت بچوں میں وقت سے پہلے ہی ہر چیز کی آگہی اور سمجھ بوجھ ہے۔ جس کی وجہ



سے بچوں کو ہر میدان میں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور نمایاں صلاحیتیں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر میری اولین ترجیح تعلیم ہے۔ میرے خیال سے والدین کو تعلیم میں بچوں پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے بچے کلاس میں ہر امتحان میں شروع ہی سے ممتاز رہیں۔

کیونکہ یہ چیز بچوں میں خود اعتمادی کا باعث بنتی ہے۔ دوسرے نمبر پر میری کوشش ہوتی ہے بچوں میں اخلاقیات کی پاسداری اور اقدار کی پابندی پیدا کی جائے۔ کیونکہ موجودہ صدی میں یہ روایات کھو چکی ہیں۔ والدین غلط حرکت پر اپنے بچوں کی حمایت کرتے ہیں۔ جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور آخر میں ہمیں اپنے بچوں میں مذہبی فرائض کی تعلیم اور آگہی بھی دینی چاہیے۔ کیونکہ اسلام کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

عقیلہ حق

(مصنفہ)

جن لوگوں نے بیسویں اور اکیسویں صدی کے درمیان سفر کیا ہے۔ وہ ان حیرت انگیز تبدیلیوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی اکیسویں صدی کی ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس صدی کے بچوں کو ماورائی کہانیاں نہیں سنا سکتے۔ اس صدی کے الیکٹرانک دور کے بہت... پُراعتماد، بولڈ اور چیلنجز کو پسند کرنے والے بچے ہر چیز کو دسترس میں رکھتے ہیں۔ چند لمحوں میں ان کی انگلیاں مشرق سے مغرب کا سفر کی بورڈ کے ذریعے طے کرلیتی ہیں۔ کیونکہ میں اکیسویں صدی کی ماں ہوں اس لیے میں ان کی پڑھائی کے ساتھ، ساتھ ان کے مشاغل پر بھی نظر رکھتی ہوں۔ ان کے دوستوں سے بھی دوستی رکھتی ہوں اور اکثر ان کے دوستوں کی لسٹ کم کرتی رہتی ہوں۔ میں اپنے بچوں کو مارتی نہیں بلکہ سمجھاتی ہوں ان کی دوست بن کر، ان کے دل میں اتر جاتی ہوں اور ان کے دل میں چھپے خدشات اور جذبات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بولتی جو مسئلہ ہو وہ ان کے ساتھ شیئر کرتی ہوں۔ بہت چھوٹی عمر سے میرے بچوں میں احساسِ ذمے داری پیدا ہوگیا ہے۔ اگر وہ بارہ سو روپے کے پزا کی فرمائش کرتے ہیں تو میں ان کو بتاتی ہوں کہ بارہ سو روپے میں بعض لوگ ایک ہفتے کا راشن خریدتے ہیں تاکہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھیں تو آسائشات کے ساتھ، ساتھ دوسروں



کی ضروریات کا خیال بھی رکھیں۔
سوشل میڈیا، الیکٹرانک ترقی، گلوبل دنیا کے ریموٹ، موبائل فون اور ایسی بہت ساری چیزوں کی موجودگی میں سب سے اہم چیز اور بات یہ ہے کہ میں ان کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی ہوں کہ یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسان کا کردار ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ ایک دن ہم سب کو اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اکیسویں صدی ہو یا بیسویں صدی ہر صدی کی ماں ایک جیسی ہوتی ہے اور میں بھی ہوں۔

عرشی زبیر

(معلمہ)

سچ تو یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں بچوں کی تربیت ماؤں کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ میری کوشش اور دعا یہی ہے کہ اس آزمائش میں اللہ کے کرم سے سرخرو رہوں (آمین)۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بے شک انسان اس کی کشش سے دامن نہیں چھڑا سکتا لیکن اس کے ساتھ، ساتھ ہم ماؤں کی بڑی ذمے داری ہے کہ اپنے بچوں سے اس کا درست اور ایک حد تک استعمال کرائیں اور جہاں اس کا استعمال ضروری نہیں اس سے گریز کی تاکید بھی کریں۔ بالخصوص قرآن حکیم کی تلاوت کے وقت اور کھانے کے وقت موبائل ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے یہ بات ادب اور تہذیب دونوں کے خلاف ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے مسلمان بچوں کو جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ بچوں کی اس سے واقفیت بے حد ضروری ہے تاکہ مسلمان کسی سے بھی پیچھے نہ رہیں۔ بس ضرورت ہے تو ان اشیا کے استعمال میں توازن کی کہ توازن کامیاب زندگی کی بنیاد ہی نہیں اس کا اہم حصہ بھی ہے۔

مونا وسیم

(قلمکار)

آج کے دور میں بچوں کی اچھی اور جدید تعلیم جسے حاصل کر کے وہ دنیا میں اپنا مقام بنائیں ہر والدین کی خواہش ہے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا کم پڑھے لکھے۔ میں خود ایک پڑھی لکھی خاتون ہوں اور میرے بچے اچھے اور بڑے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں اس کے ساتھ ہی دینی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دنیاوی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشرے میں کوئی



حیثیت نہیں۔ لیکن دنیاوی تعلیم سے بڑھ کر دینی تعلیم ضروری ہے کہ بچے کے پاس دنیا تو ہے مگر دین نہیں تو ایسا ہے کہ گاڑی تو ہے لیکن وہ چلتی نہیں، ایک ایسا پھول ہے جس میں خوشبو نہیں۔ دینی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے کے حوالے سے ایک، ایک چیز سکھائی جاتی ہے قرآن حکیم مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اعلیٰ دنیاوی تعلیم حاصل کر آج کے بچے والدین کی عزت نہیں کرتے کیا فائدہ ایسی تعلیم کا کہ جس سے بچے دنیا تو سنوار لیں مگر عاقبت نہیں۔ دینی تعلیم حاصل کر کے صرف بچوں کی ہی عاقبت نہیں سنورے گی بلکہ والدین کی دنیا بھی سنورے گی اور یہی بچے ان کے لیے صدقۂ جاریہ بن جائیں گے۔ اور والدین دنیا میں عزت سے زندگی گزار سکیں گے۔

فصیحہ آصف خان

(شاعرہ و مصنفہ)

آج کا دور بہت تیز جا رہا ہے۔ نیٹ اور میڈیا کا

زمانہ ہے۔ بچے اس میں بری طرح پھنستے اور دھنستے جا رہے ہیں ۔میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر گھر کا ماحول دیندار اور اصلاحی ہو تو بچوں کی اعلیٰ تربیت ممکن ہے۔ والدین بچوں کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں یہ تب ہی ممکن ہے جب والدین خود راہِ راست اور صراط مستقیم پہ عمل پیرا ہوں۔ اپنے بچوں کو اسلام کی شخصیات سے روشناس کرائیں۔ برے بھلے کی تمیز سکھائیں ان پر نظر رکھیں۔ ان کو وقت دیں، تاکہ دوستانہ واچھے ماحول میں رہ کر وہ ان فضولیات سے دور رہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے بچوں کے ساتھ محبت آمیز رویہ استوار کریں۔

اسما ناصر
(گھریلو خاتون)

آج کے دور میں بچوں کی شخصیت بنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس کے لیے بچوں کی یکساں دینی و دنیاوی تعلیم بہت اہم ہے۔ بچوں کی تربیت میں یہ بات شامل کرنی چاہیے کہ ان کے سب سے زیادہ سچے اور مخلص دوست ان کے والدین ہیں۔ جو برے بھلے وقت میں آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اور کبھی بچوں سے کوئی غلطی ہو جائے تب انہیں یہ اعتماد ضرور دلائیں گے کہ اگر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ آئندہ اسے نہیں دُہرائیں گے تو والدین ان کی مشکل حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ بچے والدین سے کبھی کچھ نہ چھپائیں کیونکہ اس صورت میں وہ خود مزید مشکل میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی بڑی اور اہم ضرورت بیٹوں کے ساتھ، ساتھ بیٹیوں کی اچھی جدید تعلیم ہے جو والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے۔



اور بیٹوں کے ساتھ، ساتھ بیٹوں کی اچھی تربیت بھی ازحد ضروری ہے اور اگر بیٹوں کی تربیت میں خواتین کی عزت کرنا بھی شامل ہو جائے تو بہت سی سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آج کل کے مادی دور میں جبکہ ہر دوسرا شخص پیسوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ ایسے میں اولاد کو پیسوں سے زیادہ انسان اور اپنی قدر کرانی چاہیے۔ انسان کی قدر جدید ایجادات کی کئی برائیوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

☆☆☆

عزیز قارئین! بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ماؤں نے بچوں کی تربیت میں دنیا کے ساتھ، ساتھ دین کو بھی شامل کیا ہے۔ بلاشبہ اسلامی تعلیمات، روایات اور مشرقی تہذیب کو غیر محسوس طریقے سے اگر تربیت کا حصہ بنالیا جائے، انہیں خیر وشر کا فرق سمجھایا جائے اور اس کے ساتھ، ساتھ اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا جائے کہ دنیا کی بہترین اور کارآمد ایجادات مسلمان سائنسدانوں کی مرہونِ منت ہیں...... اس کے علاوہ مسلمان حکمرانوں کی اپنے دور میں کیے جانے والے ترقی کے کاموں سے بھی بچوں کو باخبر کیا جائے تو یقیناً احساسِ کمتری اور کم مائیگی کا شکار یہ بچے اس اعتماد سے اکیسویں صدی کے تقاضوں کے تحت ترقی کا سفر طے کریں گے کہ دنیا کی اس ترقی میں مسلمانوں کا کردار بہت اہم ہے۔

اور جو کہیں تربیت میں کجی رہ جائے تو جدید ٹیکنالوجی کا بکثرت استعمال، سوشل میڈیا کی برق رفتاری اور قبل از وقت غیر ضروری معلومات کی بچوں کے ذہنوں تک رسائی ان کے لیے سم قاتل بن جائے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مائیں نہایت دانشمندی سے بچوں کو ان اشیا کے متوازن اور درست استعمال کی تلقین کریں کہ اس سے بچوں میں احساسِ ذمے داری پیدا ہوگا۔

بے شک یہ بچے ہماری کائنات ہیں ہمارے دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی روشنی ہی نہیں ہماری زندگی بھی ہیں اور زندگی کی حرارت کے لیے تناسب کے ساتھ، ساتھ دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت کا ٹانک بہت ضروری ہے کہ یہی توانائی ہمارے آج کے بچوں کو آنے والے کل میں مسلم طاقت بن کر عالمی سطح پر خود کو منوانے کا اہل ثابت کرے گی، انشاءاللہ۔

☆☆☆

فکاہیہ کالم — گوشۂ ظرافت — ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

ممتاز نثر نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا شمار ملک کے معروف ومقبول مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ماہ انہی مزاح نگار کی بہترین کاوشوں میں سے ایک باب ''خندہ پیش آنیاں'' منتخب کیا گیا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ فوجی دانشور مارٹن وین کے بقول اکیسویں صدی میں افراتفری اور بدنظمی کا دور دورہ ہوگا، کوئی ملک دوسرے ملک پر حملہ نہ کرے گا بلکہ ملک کے اندر ہی نسلی، لسانی، مذہبی وسیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی آپس میں لڑائیاں ہوں گی۔ یہ سن کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اس حساب سے ہمارا پاکستان اکیسویں صدی میں پہنچ بھی چکا ہے۔

امریکی ماہرین نے اکیسویں صدی کی یہ نشانی بتائی ہے کہ اس میں مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ نظر آئیں گی۔ خواتین ملکی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقام بھی ریڑھ کی ہڈی والا یعنی پیچھے ہی رہتی ہیں لیکن اس تیز رفتار دور کا مقابلہ کرنے کی ان میں پیدائشی صلاحیتیں ہیں۔ ایک بار ہمارے کالج میں باکسنگ کے مقابلے میں رننگ کمنٹری کے لیے مائیک ہماری کلاس فیلو کو دیا گیا۔ تیسرے راؤنڈ کے بعد ایک باکسر نے اس سے کہا۔ ''بی بی آہستہ، آہستہ کمنٹری کریں، آپ اتنی تیز ہیں کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' ہمارے ہاں زیادہ حادثات زبان کی تیز رفتاری کی وجہ ہی سے ہوتے ہیں۔ عورت کی شرم اس کے دانتوں کے درمیان ہوتی ہے جبکہ مرد کی آنکھوں میں۔ کہتے ہیں ''عورت کوئی راز نہیں رکھ سکتی۔'' حالانکہ عورت کہتی ہے۔ ''میں تو راز رکھ سکتی ہوں، وہ لوگ نہیں رکھتے جنہیں میں بتاتی ہوں۔'' ایک عورت نے اپنی سہیلی سے شکایت کی کہ تم نے اس سے وہ بات کہہ دی ہے حالانکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس سے مت کہنا۔ ''اچھا'' سہیلی افسوس سے بولی۔ ''میں نے تو اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں ہرگز نہ بتائے کہ میں نے اسے یہ بات بتادی ہے۔'' اس پر عورت نے طویل آہ کھینچی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے اب تم اسے مت بتانا کہ میں تم سے شکایت کررہی تھی۔'' اکیلی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے لیے پرفیوم خود خریدتی ہے۔ عورت سب سے زیادہ توجہ اپنے آپ کو دیتی ہے۔ سقراط نے کہا تھا۔ ''ایک بار آپ نے مرد کو عورت کے برابر کردیا تو پھر مرد کبھی اس کے برابر نہ ہوسکے گا۔'' بیسویں صدی میں جو عورت خود کو ذہین سمجھتی ہے، وہ مردوں کے برابر حقوق مانگتی ہے۔ جو ذہین ہے، وہ نہیں مانگتی۔ بیوی کے روپ میں ذہانت اور خوب صورتی یکجا ہوسکتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ دو شادیاں کرنا اتنا بھی آسان نہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کہا۔ ''میں شادی کرنے کے معاملے میں ہاف مائنڈڈ ہوں۔'' تو

دوسرے بولے۔ ''شادی کے لیے اتنا ہی مائنڈ چاہیے۔'' ہیلری کلنٹن کے بقول ''مرد اتنا بد صورت عورتوں سے نہیں گھبراتے جتنے انٹیلکچوئیل عورتوں سے گھبراتے ہیں۔'' مرد بازار میں دو قسم کے تحفے خریدتے ہیں، ایک وہ جو بیوی کے لیے خریدتے ہیں اور دوسرے وہ جو مہنگے خریدتے ہیں' عورتیں تو خیر بازار سے بیزار ہوتی ہی نہیں۔ الزبتھ ٹیلر کے خاوند سے کسی نے پوچھا تھا۔

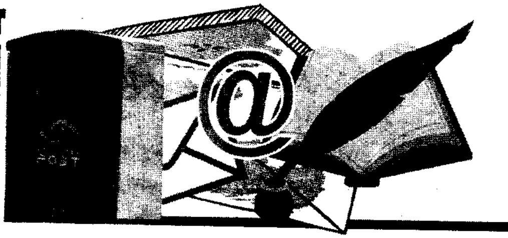
''دنیا کی وہ خاتون جس سے مل کر دل چاہا ہو کہ کاش میں کنوارہ ہوتا وہ کون تھی؟''

وہ بولا۔ ''میری بیوی۔'' کہتے ہیں جب مرد کو عورت کی سمجھ آتی ہے، اس کی بیوی اسے گھر سے نکلنے نہیں دیتی۔ اس کے باوجود کولمبس عورت کے بغیر امریکا تو تلاش کرسکتا ہے مگر دھلی ہوئی جرابیں نہیں۔ ہر عورت میں دو روحیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کی اپنی اور ایک اپنے خاوند کی، زنانہ صدی کا سن کر لگتا ہے اس صدی میں عورت سے عمر پوچھنا، قابلِ دست درازی پولیس ہوگا۔ ویسے عورت کو کبھی انڈر اسٹیمیٹ نہ کریں، سوائے اس وقت کہ جب اس کے وزن یا عمر کی بات کی جائے۔ چالیس سال کی عمر میں عورتوں کو اکثر بیماریاں شروع ہونے لگتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ بیماریاں اکثر پچاس سال کی عمر میں ہوجاتی ہیں۔ عورتوں کو چپ کرانے کا واحد طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کردیا جائے کہ زیادہ بولنے سے عمر بڑھتی ہے۔

کاسمو پولیٹن میگزین کی تازہ رپورٹ کے مطابق اگر مرد پہلے اظہارِ محبت نہ کرتا ہوتا تو نسلِ انسانی کئی ہزار سال پہلے معدوم ہوچکی ہوتی لیکن آنے والی صدی میں عورتوں کی شائی نیس (جھجک، شرم، کم آمیزی) بھی ختم ہوجائے گی۔ ہم نے ایک تقریب میں پڑھنے کے لیے شائی نیس پر مضمون لکھا تھا لیکن شائی نیس کی وجہ سے پڑھ نہ سکے۔ اب تو شائی نیس کے جین بھی دریافت کرلیے گئے ہیں۔ یہ بہت پہلے دریافت ہوجاتے لیکن جب سائنس دان دیکھتے، یہ دوسرے جینز کے پیچھے چھپ جاتے۔ آج کل تو سینماؤں کے باہر بورڈ ہوتے ہیں۔'' صرف بالغوں کے لیے'' اکیسویں صدی میں یہ بورڈ میٹرنٹی اسپتالوں کے دروازوں پر ہوں گے..... عورتیں کپڑے دھونے کے لیے صابن اور سرف استعمال نہیں کریں گی۔ ٹیلیفون استعمال کریں گی، لانڈری والے کو بلانے کے لیے۔

سگمنڈ فرائیڈ نے کہا تھا۔ ''میں اپنی تیس سالہ ریسرچ کے بعد اس سوال کا جوب نہیں پاسکا کہ عورت چاہتی کیا ہے؟'' مرد غلطی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ مرد کتنا احمق ہے، عورت غلطی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ عورتیں کتنی احمق ہوتی ہیں۔ مرد جب برے کام کرتا ہے تو اپنا نام پتا بدل لیتا ہے یا تخلص رکھ لیتا ہے۔ عورتیں بھی شادی کے بعد اپنا نام بدل لیتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عورت، مرد سے اچھی نہیں ہے، یہ کہتے ہیں کہ وہ مرد سے بری نہیں ہے۔ وہ گھر سے باہر جاکر ملازمت کرنا اور ملازم کہلانا زیادہ پسند کرتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ گھر میں رہے اور باس بنے۔ عورتیں ہی ایسی تحریریں نہیں لکھتیں جن میں دوسری عورتوں کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔ یقین کریں مردوں کو بھی دوسری عورتوں کے مسائل درپیش ہیں۔ اکیسویں صدی میں صنفِ نازک زیادہ ہوں گی۔ اس حساب سے امید ہے کہ حالات بھی سخت نہ ہوں گے، نازک ہی ہوں گے۔ اس صدی کی خواتین تو مائنڈ میک اپ کرنے کے لیے بھی بیوٹی پارلر جائیں گی۔ شاید اس لیے یہ بھی پیش گوئی ہے کہ اکیسویں صدی کی عورتیں ذہین سے زیادہ حسین ہوں گی جس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس صدی میں بھی عام مرد زیادہ بہتر دیکھ سکے گا بہ نسبت زیادہ بہتر سوچنے کے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو زیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالمین کا پروردگار ہے۔ اور کروڑ ہا درود وسلام رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کہ جن کی آمد سے جہالت وظلمت کے اندھیرے چھٹے اور دنیا میں حق کا بول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخروئی نصیب فرمائے اور ہمارے وطنِ عزیز کو اپنی امان میں رکھے۔ (الٰہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! السلام علیکم...... پُرخلوص دعاؤں کا تحفہ لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں...... کیسے کیا حال ہیں، موسم کی تبدیلیاں کس طرح اثر انداز ہو رہی ہیں؟ یہاں کراچی میں تو ابھی تک موسم گرما ہی چل رہا ہے جبکہ ملک کے دیگر شہروں میں تو موسم بدلنے کی خبریں ہیں، اسی بدلتے موسم کے اثرات کے نتیجے میں فلو بھی کافی پھیل رہا ہے۔ دعا ہے آپ سب لوگ ان تکالیف سے محفوظ رہیں۔

اب آتے ہیں پاکیزہ کے گزشتہ ایشو کی طرف کہ جس کی بہت ہی پزیرائی ہوئی۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک رہے اور آپ بہنوں کی طرف سے موصول ہونے والے مراسلات بھی بہت خوب رہے اور یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں بلکہ سب کی رائے کی روشنی میں، میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ ہماری رائٹرز نے بڑی محنت اور لگن سے کہانیاں تحریر کیں۔ بہت عمدہ موضوعات پر قلم اٹھایا۔ میں تو خیر اپنی رائٹرز کی تعریف کر ہی رہی ہوں مگر دیگر لوگوں نے مجھ تک ذاتی طور پر جو تعریفیں پہنچائی ہیں یہاں فرداً فرداً تو نہیں لکھ سکتی ہاں مجموعی طور پر تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ اتنی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور رائے بھی دیتے ہیں جو ہماری رائٹرز کی حوصلہ افزائی کے لیے واقعی ایک ٹانک ہے۔

ہماری بے حد سینئر تبصرہ نگار ڈاکٹر ممتاز ضیا اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر مجھے فون کرتی ہیں اور ہماری فیملی کی خیریت لیتی رہتی ہیں' میں ان کے خلوص کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اسی طرح میں اپنی تمام قاری بہنوں کی ممنون ہوں جو اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھے رہتی ہیں۔ اللہ آپ سب کو خوش آباد رکھے اور ایک دوسرے کا ہمدرد، غم گسار اور پُرخلوص ساتھی بنائے رکھے، الٰہی آمین...... اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو......

دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

عزیز قارئین اس گزرتے ماہ اکتوبر میں دل بے حد غمگین رہا۔ جی ہاں ہماری بہت پیاری رائٹر فرحانہ ناز ملک کی یادیں ساتھ، ساتھ رہیں۔ 11 اکتوبر کا دن بہت مشکل سے کٹا کہ دو سال پہلے اسی صبح فرحانہ ناز کا آخری میسج مجھے آیا تھا...... اب تو بس یادیں ہی یادیں ہیں۔ ہمارے بہت سے قارئین نے فرحانہ کو یاد کیا۔ ان کی فیملی کے متعلق پوچھا۔ ان کے بچے اللہ کی مدد سے تعلیمی مدارج طے کر رہے ہیں۔ تو بس بہنوں اللہ تعالیٰ صبر کی سل رکھ کر ہی غم بھیجا کرتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے بندوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور حیات و موت کا یہ سلسلہ ازل سے جاری و ساری ہے بس اس کے دوران ہمیں وہ اعمال سرانجام دینے ہیں جو خالص خوشنودیِ رب غفور کا باعث ہوں۔ اللہ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا کرے' الٰہی آمین۔

بہنو! آپ کے بہت پیارے خطوط اور اس میں دیے گئے مشورے، نصیحتیں، حکایتیں، باتیں سب بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ محفل تو گھر آنگن کی طرح ہیں۔ جہاں مل بیٹھ کر مسائل حل ہوتے ہیں، دکھ بانٹے جاتے ہیں، حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس سب کا بے حد شکریہ...... اسی سے ہم رسالے کو بہتر بناتے ہیں، تبدیلیاں لاتے ہیں اور اپنی خامیاں بھی دور کرتے ہیں۔
نئی لکھنے والیوں سے مؤدبانہ عرض ہے کہ اپنی تحریروں کی ایک کاپی اپنے پاس رکھیں اصل مسودہ ہمیں بھیجیں اور ایک سے ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کی اشاعت کے بارے میں معلوم کریں۔ پاکیزہ کا مطالعہ جاری رکھیں کسی بھی مہینے آپ کی کہانی لگ سکتی ہے۔
پیارے، پیارے خطوط پڑھنے سے پہلے اپنے بچوں کے اور چھوٹے بہن بھائیوں کے ضروری امور نمٹا دیں تاکہ آپ سکون سے مطالعہ کرسکیں۔ ٹھیک ہے ناں بہنو......! ہاں بزم پاکیزہ کے متعلق آپ کی تجاویز بھی ملیں انشاء اللہ نیا سال پاکیزہ کے لیے خوش آئند ہوگا کہ اس میں ہم اپنی بہنوں کے لیے مشاق رائٹرز کی تحریریں اور دلچسپ سلسلے لے کر آرہے ہیں۔ آپ کی پسند کو اولیت دینا ہی ہماری ترجیح ہے۔ آپ بس مثبت و تعمیری تنقید سے ہمیں نوازتی رہیے۔ آپ کو ہر آن خوش آمدید کہنے کے لیے ہماری ٹیلی فون لائنز مستعد ہیں۔ نزہت اصغر 03316266612۔ دفتر کال کرنے کے لیے......
021.35802552/35386783 ایکسٹینشن 122.107

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نامور شاعرہ ثمین سیف کے گھر شاعرہ ناہید فاطمہ حسنین کی کتاب کی پزیرائی کے سلسلے میں بطور خاص شام منائی گئی جس میں شہلا رضا، ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی مہمانِ خصوصی تھیں۔ اس تقریب میں عذرا رسول صاحبہ نے بھی خصوصی شرکت کی اور دیگر شہروں سے آئی ہوئی مہمان خواتین شعرا نے بھی شرکت کی، یہ خوب صورت تقریب بہت باوقار طریقے سے انجام پائی۔ (مبارک ہو ناہید آپ کو)

☆ رائٹر ثریا فرخ کے بیٹا، بہو نے اس سال حج کی سعادت حاصل کی۔ (مبارک باد)

☆ اس سال کافی پاکیزہ قارئین کی بچیوں اور بہنوں نے انٹر میڈیکل اور انجینئرنگ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اب بچیاں انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالجز کے لیے انٹری ٹیسٹ دے رہی ہیں۔ دعا کریں انہیں اس میں بھی کامیابی ملے۔ (الٰہی آمین)

☆ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ کی کزن نورین، جنڈیال فیض اللہ کی بیٹی شانزے نے بہت مہارت اور لگن سے قرآن پاک حفظ کرلیا ہے۔ (ماشاء اللہ اور مبارک باد) نرگس کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کے کزن کامران عجائب آف سوسیاں کی شادی بالآخر اپنی من پسند لڑکی سے بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے کوہ مری کی سیر کر کے آئی ہیں اس لیے اب قدرے بہتر ہیں۔ (الحمدللہ)

☆ مسز یٰسین، لیہ کی پیاری بھتیجیوں کائنات بتول اور قندیل فاطمہ کو اپنی، اپنی سالگرہ مبارک ہو۔

دعائے صحت کی التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار فرخندہ جعفری، گجرات کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ مستقل تبصرہ نگار انجم مشیر، کراچی کو گردن کے مہروں میں تکلیف ہے۔

☆ تبصرہ نگار صبا آصف، کراچی کی والدہ کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ رائٹر طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی کی طبیعت آج کل خراب چل رہی ہے۔

☆ مستقل تبصرہ نگار نگینہ ضیا بنگش، کراچی اور ان کی پیاری بیٹیاں ان دنوں شہر میں پھیلے ہوئے بخار چکن گونیا میں مبتلا ہیں۔ اسی میں ان کے شوہر کی آنکھ کا بھی آپریشن ہوا ہے۔ نگینہ اپنے گھر والوں کی صحت کی طرف سے کافی پریشان ہیں۔ (اللہ

پریشانی دور کرے، آمین)

☆ نرگس تسیم، صابہ موہڑہ کی والدہ کی طبیعت ناساز ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ گزشتہ ایک سال میں پاکیزہ تبصرہ نگار انجم مشیر، کراچی کے بہت قریبی اعزا کی اموات یکے بعد دیگرے ہوئیں جس کی وجہ سے وہ کافی مضمحل رہیں۔(اللہ پاک ان کے خاندان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین)

☆ مصنفہ عطیہ عمر کی خالہ جان مقیم اسلام آباد جو اُن کی تائی جان بھی تھیں اور یہ سب انہیں اماں جان ہی کہتے تھے مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

☆ رائٹر منعم ملک کے شفیق ناناجان انتقال کر گئے۔

☆ مستقل قاری صبا آصف، گلشن حدید، کراچی کے والد ماجد محمد سعید خان مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ صبا نور، لیہ کی بائیس سالہ کزن رابعہ تبسم کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ پاکیزہ رائٹر اُمّ ایمان، علی پور چٹھہ کے والد گرامی قاضی احسان احمد کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ رائٹر قانتہ رابعہ کے اکلوتے بھتیجے کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اس کی شادی کو ابھی ڈھائی ماہ ہی ہوئے تھے۔

☆ رائٹر، شاعرہ اور براڈ کاسٹر سیمار ضا ردا کی خالہ اور خالہ زاد بھائی نامعلوم افراد کی فائرنگ کا شکار ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان سے موبائل فون اور نقدی بھی لوٹ لی گئی۔

☆ فصیحہ آصف خان، ملتان کے والد ماجد کی اس ماہ برسی ہے۔

تمام مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص مع اول و آخر درود پاک پڑھ کر بخش دیں۔ اللہ پاک ان سب کی مغفرت کرے، الٰہی آمین۔

☆☆☆

بہنوں! اب آتے ہیں آپ کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

✉ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار اکتوبر کا پاکیزہ جلد ہی مل گیا آپ کا اداریہ ہمیں قمری تاریخوں کی فضیلت اور برکت پر جھنجوڑ رہا تھا۔ واقعی ہم مسلمانوں کو عیسوی سال کے بجائے قمری سال کو اپنانا چاہیے۔ دین کی باتیں، اللہ اور اس کا نور پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ کوہ گراں افسانہ واقعی زبردست تھا۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ سے کہ ہماری فریدہ جاوید فری ان کے بھائی اور معراج صاحب کو مکمل صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ پاکیزہ کی طرف سے عید ملن پارٹی کا پڑھ کر ہمارے منہ میں بھی پانی آ گیا پھر سوچا کہ کاش ہم بھی کراچی میں ہوتے اور اس پارٹی میں شامل ہوتے اور آپ لوگوں سے ملاقات کرتے۔ بزم پاکیزہ بھی جاری رکھیں اور سوال ہمارا اور جواب آپ کا بھی شروع کر دیں۔ انجم آپی کو ان کی بھتیجی کی شادی پر دلی مبارک باد دیں۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ......اس دفعہ تقریب کا احوال بھی پڑھ لیجیے گا، چلیں آپ نے تو ایک اور سلسلے کا کہہ دیا۔)

✉ تسنیم ماپارا، کراچی سے۔ ''خوب صورت سے ٹائٹل کے ساتھ اکتوبر کا پاکیزہ بے حد شاندار رہا......دین کی باتیں، ذکیہ آپا اور اختر شجاعت کے مضامین زبردست ہماری بے پناہ رہنمائی کرتے ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور ہمت اور زیادہ ہو جو باتیں ہم نہیں پڑھ سکتے ہیں وہ ایک مضمون میں دے دیتی ہیں۔ کہانیوں میں صبیحہ شاہ کی ٹپ ٹپ تو لاجواب تھی ان کی جتنی بھی پیٹھ تھپتھپاؤں کم ہے۔ بہت خوب صورتی سے بہت بڑی، بڑی باتیں کر گئیں۔ آج کل کے بچوں کی تھنگلنگ کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا۔ اور ہما بیگ کی اور نیلم احمد بشیر کی 2005ء کے زلزلے کے حوالے سے سپر کہانیاں تھیں باقی بھی بے حد حساس تحریریں اس کے علاوہ شیریں حیدر کا ناول امرت بھی بہت زبردست جا رہا ہے۔ عقیلہ حق کی کہانی درد، تکلیف اور دکھن کی چبھن دیر تک محسوس ہوتی رہی۔ ویل ڈن عقیلہ! شائستہ زریں کا کیا گیا انٹرویو بہت اچھا رہا۔ شائستہ کے خوب صورت سوال اور مدیحہ کے دلچسپ جواب دونوں بہت ہی عمدہ تھے۔ آپ کی ادارت میں پرچہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ بہنوں کی محفل بھی خوب اچھی جم رہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام سلسلے بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔'' (بہت شکریہ تفصیلی تبصرے

کا آپ کی ستائش ہمت بڑھاتی ہے۔)

نورین شہزاد، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کے تو تمام سلسلے بہترین ہیں۔ البتہ بزم پاکیزہ کی جگہ کوئی Knowledgeable سلسلہ شروع کردیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پاکستان میں اتنا ٹیلنٹ ہے اتنا کام ہو رہا ہے ہر فیلڈ میں ہمارا المیہ یہ ہے کہ اچھا کام ظاہر نہیں ہوتا افسوسناک واقعات بہت تیزی سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ (جی یہ تو ہے) پاکیزہ کی جتنی رائٹرز ہیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں ایک چھوٹی سی بات کرنا چاہوں گی بحث اور بلاوجہ بحث سے سب کو بچنا چاہیے، بحث کرنے سے آخر میں حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا ہاں دلوں میں رنجش ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔“ (جی بہت خوب صورت بات کہی آج کل سوشل میڈیا اسی بحث کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اللہ سب کو ہدایت دے۔ آپ تفصیلی تبصرہ بھی لکھیں)

فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ ملا اپنا لیٹر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ واقعی پاکیزہ دکھ سکھ کا ساتھی اور بے حد پیارا دوست بھی ہے۔ اب میری طبیعت کچھ بہتر ہے۔ (اللہ بہتر ہی رکھے) سب سے پہلے ذکیہ بلگرامی سے متعلق پڑھتی ہوں بے حد سکون ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحتمند اور لمبی زندگی عطا کرے، آمین۔ جو بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عطا ہو اور جن کی وفات ہوئی اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ انجم انصار کو بھتیجی کی شادی مبارک ہو اللہ تعالیٰ ان کو بھی صحت اور تندرستی دے اور معراج صاحب کو بھی۔ اس مرتبہ طیبہ عنصر مغل نے ناولٹ اے عشقا مجھے پارس کردے لکھ کر کمال کردیا بے حد اچھا اور منفرد موضوع تھا وہ آئیں اور چھا گئیں۔ ویلڈن طیبہ جی خوش رہو ایسا ہی اچھا، اچھا لکھتی رہو عقیلہ جی کا افسانہ بھی بے حد کمال کا لگا وہ تو لکھتی ہی بے حد اچھا ہیں بے حد سلام دعا۔ مائی فیورٹ رائٹر، اقبال بانو کے ناولٹ اور افسانے پڑھے دیر ہو گئی۔ کیا بات ہے ان کے افسانوں کی۔“ (چلیں اقبال بانو جلدی سے ایک عدد افسانے کے ساتھ آجائیں۔ شکریہ تبصرے کا، فریدہ بس آپ اسی طرح تبصرے بھیجتی رہیں)

تسنیم قریشی، کوہاٹ سے۔ ”نزہت آپی آپ کو پاکیزہ کی ایڈیٹر بننے کی مبارک باد ماشاء اللہ آپ نے بہت اچھی طرح پاکیزہ کی باگ سنبھالی ہے۔ پاکیزہ پہلے کی طرح بہت اچھا جا رہا ہے۔ (بہت شکریہ یہ آپ سب کا تعاون ہے) انجم آنٹی کے جانے کا بہت دکھ ہوا ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ (جی یہ تو ہے) پاکیزہ اور ہم ایک فیملی کی طرح ہیں اتنے عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اگر فیملی ممبر کہیں اور چلا جائے دکھ اور افسوس ہوتا ہے اور کمی محسوس ہوتی ہے۔ انجم آنٹی سے پاکیزہ کے ذریعے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ زندگی عطا فرمائے۔ (آمین) عذرا آنٹی کیسی ہیں اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کو صحت عطا فرمائے۔ عذرا آنٹی کو بھی بہت سلام۔ آپی بہنوں کی محفل پہلے کی طرح بہت خوب جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ (اب بہتر ہیں) ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو سلام کوثر خالد کا تبصرہ بڑے مزے کا ہوتا ہے امینہ عندلیب کے لیے بہت دعائیں...... سب بہنوں کو اور پورے امتِ مسلمہ کو اسلامی سال مبارک ہو اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنی امان میں رکھے۔ (الٰہی آمین، اب تبصرہ بھی لکھیے گا)

✉ میمونہ المعروف رابعہ بصری، اپنے شہر کا نام بھی بتائیں اور یہ بھی بتائیں سب آپ کو اس نام سے کیوں بلاتے ہیں؟ پاکیزہ کی تحریروں پر تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

صائمہ بخاری، سرگودھا سے۔ ”میرے شوہر ائرفورس میں ہیں سو شوہر کی پوسٹنگ کی وجہ سے ہم شہر، شہر گھومے ہیں۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ بس پاکیزہ میں کہانیاں لکھنا چاہتی ہوں۔“ (ضرور لکھیں اپنا تبصرہ بھی لکھیں۔ پاکیزہ معیاری تحریروں کو خوش آمدید کہتا ہے)

حدیث اختر، حاصل پور، بہاول پور سے۔ ”آپ کے کیا حال ہیں (ہم ٹھیک ہیں آپ کی دعائیں ہیں) کالج کی واپسی پر پاکیزہ لیا اور کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر بس ہم تھے اور ہمارا پاکیزہ...... یہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کا خون پسینہ لگتا ہے تو پاکیزہ بنتا ہے اور ایک شاہکار وجود میں آتا ہے۔ سارا ہی شمارہ بہترین تھا ابھی ایک یاد آپ سے شیئر کرتی ہوں۔ اگست 93ء میں اللہ پاک نے مجھے بیٹے سے نوازا اس سے پہلے میری دو بیٹیاں تھیں اور دونوں کی بار میرے شوہر نے مجھے گولڈ رنگ تحفے میں دی۔ بیٹے کی دفعہ پوچھا کہ اب آپ کو کیا چاہیے...... آپ یقین کیجیے میں نے کہا مجھے میرا پسندیدہ رسالہ ماہانہ لگوا دیں کیونکہ اس سے پہلے ہم چند خواتین مل کر مختلف رسالے خریدتی تھیں اور آپس میں تقسیم کر لیتی تھیں۔ اس وقت ہم گدو بیراج میں رہتے تھے۔ آپ ذرا اندازہ کریں ہماری وابستگی کا...... (ارے ڈیئر حدیث ہمیں بھرپور اندازہ ہے بلکہ آپ

کی معصوم فرمائش پر پیار آیا۔ واہ بھئی......) اللہ بخشش کرے میرے شوہر، منیر صاحب کی کہ انہوں نے فوراً لگوا دیا۔ ہم نے تو انہی رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جیسے کہ ماں سے سیکھتے ہیں۔ سوچا ہے یہ رنگ رنگیلا چمن سدا پھولے پھلے (آمین) میرا بیٹا منیب آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہے اور سلام بھی کہہ رہا ہے۔'' (ہماری طرف سے دعائیں)

✉ سعیدہ، مردان سے۔ ''باجی یہاں ہم سب پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں مطلب یہ بہت پاپولر ہے۔ آج آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں اس میں لکھنا بھی چاہ رہی ہوں۔'' (جی ضرور)

✉ سدرہ، لاہور...... آپ اپنی شاعری کسی سے اصلاح کروا کر ضرور بھیجیں۔

✉ اسما طاہر، اسلام آباد۔ آپ پریشان نہ ہوں کہانیاں بھی جلد لگ جائیں گی۔ آپ تبصرہ بھی بھیجیں۔

✉ شہناز اشرف، راولپنڈی سے۔ ''باجی اس ماہ کا پاکیزہ نمبرون ہے۔ تمام کہانیاں، دینی مضامین اور دوسرے مستقل سلسلے سب بہترین گئے اسے ایسے ہی رکھیے گا۔ سب کو میرا اسلام۔'' (جی ضرور آپ کو بھی سلام دعائیں)

✉ خدیجہ میر، پشاور آپ کی کہانیاں ضرور شائع ہوں گی۔ بس کچھ موضوع پالیسی میٹر کی وجہ سے شائع نہیں کیے جاسکتے کہ کسی طبقے کی دل شکنی نہ ہو۔

✉ حمیرا، راولپنڈی سے۔ ''باجی، انجم باجی کہاں گئیں؟ مجھے فکر تھی پھر آپ سے فون پر بھی بات ہوئی۔ میں نے وہ شمارہ نہیں پڑھا تھا جس میں انہوں نے اپنے جانے کا بتایا تھا۔ اور ایک رائٹر حمیرا راحت ہوتی تھیں وہ کہاں گئیں؟ پاکیزہ واحد رسالہ ہے جسے بچپن سے پڑھتی آرہی تھی۔ چند ماہ سے گیپ آگیا تھا اب دوبارہ سے پڑھ رہی ہوں تو سب رائٹرز یاد آرہی ہیں۔'' (بہت اچھی بات ہے کہ آپ نے دوبارہ سلسلہ جوڑا پاکیزہ سے۔ انجم باجی نے سمجھیں ریٹائرمنٹ لے لی ہے جس کا ذکر انہوں نے مئی 2017ء کے شمارے میں تفصیل سے کیا تھا۔ بے شک انہوں نے بہت عرصے بہت کام کیا ویسے ان کی طبیعت اب بہتر ہے آپ ان سے فون پر رابطہ کرسکتی ہیں۔ حمیرا راحت کبھی کبھی مشاعروں میں نظر آجاتی ہیں انہوں نے افسانہ نگاری موقوف کردی ہے۔ اب آپ پاکیزہ کا مستقل مطالعہ کریں اور اپنی رائے سے بھی آگاہ کریں)

✉ منشا محسن علی، ضلع بھکر سے۔ ''باجی پاکیزہ تو بہتر سے بہترین ہوتا جارہا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں دردانہ نوشین خان کا ناولٹ بہت اچھا تھا۔ ہاجرہ ریحان بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہر دفعہ نیا موضوع ہوتا ہے۔ آپ پرانی رائٹر آسیہ مرزا سے بھی لکھوائیں۔ (جی ضرور انہوں نے شادی کے بعد ترک کردیا تھا اب دوبارہ آمادہ ہورہی ہیں۔) سحر ساجد بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں سحرش فاطمہ کا ناولٹ روایتی اور تھوڑا اکمزور تھا۔''

✉ ثمینہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ ''اکتوبر کا پاکیزہ ملا پاکیزہ رسالے کے ٹائٹل پر ایک پاکیزہ ساچہرہ بہت خوب صورت لگا۔ دین کی باتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی اور اللہ کا نور امان کی تازگی کا سبب بنے۔ اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون حسنِ اخلاق دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ تمام سلسلے وار ناول، افسانے سب سلسلے حسبِ معمول بہترین تھے۔ مدیحہ رضوی صاحبہ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ تمام رائٹر بہنوں کی صحت کے لیے دعا خاص طور پر بہن فریدہ جاوید فری، ان کے بھائی، عطیہ عمر صاحبہ اور ان کی تائی جان کے لیے اللہ پاک اپنے نبی رحمتؐ کے وسیلے سے ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین ثم آمین اور اللہ فریدہ جاوید فری صاحبہ کے بیٹے کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے، آمین اور معراج رسول صاحب کی طبیعت بہتر ہو۔'' (آمین)

✉ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ''اکتوبر کا پاکیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اداریہ حسبِ معمول سبق آموز

اور ایمان افروز تھا۔ خاص طور پر واقعۂ کربلا کو موضوع بنا کر اچھا درس دیا گیا ہے۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان اور علم میں اضافہ ہوا۔ جبکہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآن پاک سے متعلق تحقیقات دلچسپ اور متاثر کن تھیں۔ افسانوں میں نیلم احمد بشیر کا کوہ گراں اسماء قادری کا افسانہ بدصورت اور ہما بیگ کا زنجیرِ جنوں ہی تاحال پڑھ پائی ہوں۔ ان سب نے متاثر کیا۔ اداکارہ دیبا کی اداکارہ بیٹی مدیحہ رضوی کا انٹرویو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بہت سی کام کی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ شمع ہدایت میں حسن اخلاق کے موضوع پر اختر شجاعت کا مضمون قابلِ تعریف تھا۔ اشعار کا سلسلہ، میں اکثر گنگناتی ہوں، پاکیزہ کا بہت پرانا سلسلہ ہے جس کو قارئین شوق سے پڑھتے ہیں۔ مگر اس کالم کے ساتھ بعض اوقات زیادتی کی جاتی ہے کہ اس کے لیے صرف ایک صفحہ مختص کیا جاتا ہے جس بنا پر اشعار پڑھنے کا ذوق پورا نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح بزم پاکیزہ کو بھی صرف ایک صفحہ دیا گیا۔ بہنوں کی محفل میں آپ نے بہنوں سے اس کالم میں تبدیلی کا ذکر کیا ہے یعنی اب سوال آپ پوچھیں گے اور جواب قارئین بہنیں ارسال کریں گی۔ یہ تبدیلی ہمیں ایک دم سے منظور ہے۔ آپ اس تبدیلی کا تجربہ ضرور کریں۔ امید ہے کہ اس طرح اس کالم کو چار چاند لگ جائیں گے۔ فریدہ فری اور ان کے بھائی کی علالت اور فریدہ آپی کے بیٹے کے ایکسیڈنٹ کی خبر پڑھ کر دل پریشان ہو گیا۔ دعا ہے اللہ رب العزت ان سب کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔'' (آمین، ساجدہ بہن تبصرے کا شکریہ...... اشتہار سے متعلق آپ نے بالکل درست کہا۔ اسی لیے تو آپ کی بات مان لی ہے۔)

٭ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''اکتوبر کا پاکیزہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ماشاء اللہ افسانے بھی بہت خوب ہوتے جا رہے ہیں' اسما قادری نے بدصورت زبردست لکھا اس کی اسٹوری اے ون لگی' اسی طرح دوسرا افسانہ زنجیرِ جنوں ہما بیگ نے بھی...... بے حد لاجواب لکھا ہے۔ اور نیلم احمد بشیر کی کوہ گراں نہایت شاندار تحریر لگی۔ جب مسیحا ہی لٹیرے بن جائیں تو کیا ہوگا۔ اللہ رحم کرے۔ ناولٹ میں عطیہ عنصر مغل کا اے عشقا مجھے پارس کر دے بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے علاوہ نگہت سیما کی دلکش صیدِ ضیافت نے تو گویا دھمال ڈال دیا واللہ نہایت اچھی اور بہت، بہت نایاب ترین تحریر ہمیں تو دل سے پسند آئی۔ مصنفہ مبارک کی مستحق ہیں۔ (جی مصنفہ کی طرف سے شکریہ) میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں، سحرش فاطمہ کے ناولٹ کا اینڈ بھی اچھا رہا۔ اور ہاں خاص طور پر عقیلہ حق کے دردِ تکلیف اور دکھن نے تو واقعی دل دکھا دیا۔ غضب کی تحریر تھی۔ ہم کو عبث بدنام کیا۔ سیما رضا ردا کے ناول کا کیا ہوگا میرے خیال سے کشمیرہ کی شادی اعزاز شاہ سے کرا دیں اور ریبال کی شادی جہاں نور سے کروا کر ناول کا جلدی ہی اینڈ کریں۔ (ہپی اینڈ ہو گیا) شمع ہدایت میں حسن اخلاق پر اختر شجاعت کا مضمون ہمیشہ کی طرح دل کو بہت بھایا۔ ان کی تحریر دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے آپ نے کہا ہے کہ سوال ہمارا اور جواب آپ کے شروع کیا جائے تو کیسا رہے گا تو پیاری نزہت یہ تو بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔ پلیز آپ نومبر سے یہ سلسلہ اسٹارٹ کر دیں بہت مزہ آئے گا۔ اس کے علاوہ گوشۂ ظرافت پسند نہیں آ رہا ہے۔ اس پر توجہ دیں۔'' (جی بہتری کی کوشش کریں گے، تبصرے کا شکریہ)

٭ مسز شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ''پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے اور بہت خلوص والا ہے۔ اس میں شامل تمام سلسلے بہت اچھے لگتے ہیں۔ خاص طور پر ذکیہ آپا اور اختر شجاعت کے لکھے اسلامی مضامین جن سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ یہ رسالے بچیوں کی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کہانیاں بھی سبق آموز ہوتی ہیں۔ میں تو یقین کریں اپنا فرض ضرور نبھاتی ہوں راہ چلتی لڑکیاں ہوں یا کسی تقریب میں، میں تو ان کے کھلے سر اور بے تکے لباس پر ٹوک دیتی ہوں۔ ہمیں اپنا فرض ضرور نبھانا چاہیے ہاں مگر طریقے سے اس میں کسی کو بے عزتی اور ہتک نہ محسوس ہو۔ ہمارا معاشرہ اور لوگ کس طرف جا رہے ہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ اللہ پاک سب کو ہدایت دے اور اپنی امان میں رکھے۔ آمین......'' (جی شگفتہ بالکل درست کہا...... اللہ سب کو راہِ ہدایت دکھائے)

٭ شمائلہ دلعباد، صلالہ عمان سے۔ ''اکتوبر کا سرورق بہت باوقار اور خوب صورت تھا۔ مستقل سلسلے بہترین، سلسلے وار کبھی کبھی رینگتے محسوس ہوتے ہیں خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ سلسلہ وار کہانیوں کا اسلوب ہی یہ ہوتا ہے پھر باری آ گئی افسانوں کی سب ہی شاندار...... اسما قادری، عقیلہ حق، ہما بیگ، ہاجرہ ریحان بہت اعلیٰ لکھاریوں نے لکھا۔ مجموعی طور پر اس دفعہ شمارے پر سنجیدگی کا رنگ بہت غالب رہا جو افسانہ شروع کروں اختتام افسردگی و کسک دے جائے سو مزاج اپنے آپ اداسی کی طرف مائل رہا آج کل گلا خراب ہے اور بخار اور زکام کی باقیات تاحال موجود۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں اور نیک خواہشات...... شکریہ ادارے کا جن کی بدولت یہ ڈائجسٹ ہیں جو پردیس میں اپنائیت و راحت پہنچاتے ہیں۔'' (بہت شکریہ مختصر تبصرے کا۔ اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے)

٭ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''کافی طویل عرصے کے بعد بہنوں کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں مگر بہنوں کی محفل ہر ماہ پڑھنا نہیں بھولتی۔ انجم کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے جانے کا افسوس تو رہا مگر سینئرز کو جونیئرز کے لیے جگہ خالی کرنی ہی پڑتی ہے یہی زندگی ہے اور دستورِ زمانہ بھی اچھی بات یہ ہے کہ اس خلا کو آپ نے بہت خوبی سے پُر کیا ہے۔ (شکریہ) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف...... اسما قادری، پاکیزہ ہو یا جاسوسی ڈائجسٹ لاجواب لکھتی ہیں مگر اس مرتبہ بدصورت پڑھ کر مزہ نہیں آیا عورت کی چھٹی حس بتا دیتی ہے کہ کون مخلص ہے کیا رافعہ بدشکل ہونے کے ساتھ، ساتھ بدعقل بھی تھی...... جبکہ حسن نے خبردار بھی کر دیا تھا۔ سحرش فاطمہ کی دوسری قسط اچھی تھی لیکن عقیلہ حق نے مایوس کیا بلکہ تکلیف ہوئی کیونکہ بہنوں میں جیلسی ہوسکتی ہے مگر ایسی دیکھی نہ سنی بلکہ بڑی بہنیں تو ہمیشہ ماں کا رول ادا کرتی ہیں۔ اتنی اچھی رائٹر کو کم از کم نفرت کو اس قدر نہیں بڑھانا چاہیے تھا کہ محبت کے لیے جگہ ہی نہیں بچے یہ میری ذاتی رائے ہے کوئی بہن اس قدر شقی القلب ہو ہی نہیں سکتی۔ ثمر کاظمی کا مختصر افسانہ لاجواب، ہما بیگ نے بھی اچھا لکھا، مدیحہ رضوی کا انٹرویو بھی خوب تھا۔ روحانی مشورے میں ہمیشہ شوق سے پڑھتی اور عمل بھی کرتی ہوں۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ سلمیٰ...... پاکیزہ آپ کا اپنا ماہنامہ ہے۔ کہانی بھی ضرور لگے گی)

٭ دردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ سے۔ ''قرآن پاک سے عشق کے حوالے سے ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی پر رشک کرتی رہتی ہوں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جس کو جس (مقام، کام، ہستی) کی عمر بھر کی چاہ ہوتی ہے اسے وہ مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دے دیتا ہے۔ یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ کس نوعیت کی چاہ میں عمر گنواتا یا چمکاتا ہے۔ جو دنیا کی ترقی کے حصول کے لیے توانائی خرچ کرتے ہیں ان کی منزل یہیں تک ہوتی ہے جو اخروی فلاح کا جنون پالتے ہیں وہ اسی راہ پر گامزن کر دیے جاتے ہیں (جی یہ تو ہے) اسما قادری نے بدصورت افسانہ لکھا ہے اس کا بنیادی خیال ہے کہ جس کو زندگی نے بہت ٹھکرایا ہو وہ کسی بھی نام نہاد ہمدرد پر دھوکا کھا لیتا ہے مگر دھوکا دینے والا یہ نہیں جانتا کہ اللہ کی رسی کتنی دراز ہے اور کب کھینچ لی جائے گی۔ عقیلہ حق، درد، تکلیف اور دکھن ایک خوب صورت افسانہ ہے۔ اس میں دھیما، دھیما گداز ہے۔ اس کا بیانیہ قلب میں اترنے والا ہے۔ یہ تینوں الفاظ بظاہر ہم معنی سے لگتے ہیں مگر ان کے احساسات کے پیچھے باریک مگر گہری لکیر ہے جس کو اختتام میں واضح کیا گیا ہے۔ اس انسان پر کیا بیتتی ہے جس نے اپنی زندگی کا ہر دور اور ہر روپ جس پر لٹا دیا ہو وہی اس کی ہر بہار کی جڑیں کاٹنے والا ہو۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ کوہ گراں 2005ء کے ہولناک زلزلے کے پس منظر میں افسوس ناک کہانی ہے جہاں قدرتی آفت زلزلے سے بھی بدترین دھچکا انسان کی ہوس ناکی سے پہنچتا ہے۔ صبیحہ شاہ کا افسانہ ٹپ...... ٹپ...... ٹپ بھی اعلیٰ پایہ کا افسانہ ہے۔ صرف ایک نسل پیچھے سماجی زندگی کیا تھی۔ لڑکیاں اور مائیں کیسی ہوتی تھیں؟ آئی ٹی (ٹیکنالوجی) کی چھلانگ نے سماج، رویے، معیار اور احترامات کی بھی چھلانگ لگوا دی۔ موسم سرما کی آمد ہے۔ ہم سب کا پسندیدہ اور انتظار کیا جانے والا موسم ہے۔ کیوں ناں آپ سرما کے چند مہینوں میں یہ سلسلہ شروع کریں کہ بہنیں ایک یا دو ورق موسم سرما کی اپنے علاقہ جات یا دیہات، محلہ یا گھر یا کسی پہاڑی مقام کی سیر کے حوالے سے منظر نامے لکھ کر بھیجیں۔ مثلاً جو دور دراز گاؤں میں رہتی ہیں وہ اپنے ویہڑے کی محفلیں، شامیں، لحاف سلنا، لحاف بھروانا، گڑ کا تیار ہونا اور دیگر رونقیں لکھ سکتی ہیں۔'' (بہت اچھی تجویز ہے۔ بہنیں بھیج سکتی ہیں۔ آپ کے مسئلے کے لیے عرض ہے کہ آپ اپنے طور پر کسی عالم، دینی معلمہ سے رابطہ کریں وہ آپ کو تسلی بخش جواب دیں گے۔)

٭ فریدہ ہاشمی، کراچی سے۔ ''رسالہ ماشاء اللہ بہت عمدہ طریقے سے ترقی کی راہوں کی طرف گامزن ہے۔ خاص طور سے بہن ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کی بہت شکر گزار ہوں کہ ہمارے اور خود اپنے لیے ذخیرۂ آخرت تیار کر رہی ہیں اور بہنوں کو سیدھے راستے کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ رفعت سراج کا یہ ناول بے حد اچھا ہے۔ پرنس کے کردار میں کیسا خوب صورت تصوری خاکہ پیش کیا ہے جس میں حسن بھی ہے اخلاق بھی...... دین بھی ہے ادب بھی۔ دولت بھی ہے اور علم بھی...... ساری چیزوں کا اتنا خوب صورت امتزاج جو آج کی دنیا میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے...... واہ رفعت واہ...... شیریں حیدر کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ نئے ناول بلکہ ناولٹ کا موضوع بھی اچھا ہے۔ ہالہ احمد کا افسانہ ہم بتلائیں کیا...... پڑھ کر لطف آیا۔ واقعی بعض مرتبہ بالکل یہی حال ہوتا ہے۔ صبیحہ شاہ سے ملاقات اچھی لگی۔ بہت حقیقت پسندانہ گفتگو تھی۔ عذرا بہن کے خوب صورت الفاظ اور دلنشیں انداز بہت پسند آتا ہے۔ بہت سلام اور معراج صاحب کی مزاج پرسی کر دیں۔'' (بہت شکریہ فریدہ! عذرا صاحبہ کی طرف سے بھی سلام)

٭ نگہت غفار، کراچی سے۔ ''معصومیت بھری مسکراہٹ لیے سرورق کی ماڈل اچھی لگی۔'' مجھے کچھ کہنا ہے۔'' ماشاء اللہ

بہت خوب صورتی سے حج کے بارے میں تحریر کیا نزہت جیتی رہو بیٹا اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے۔ (آمین) دین کی باتیں تام سے اس عنوان ہی سے ذہن میں سوچوں میں پاکیزگی اور تقدس کا احساس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ذکیہ آپا کی عمر دراز کرے صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ ذکیہ آپا سے عقیدت و ملاقات ماشا اللہ آپ دونوں بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ کہانیوں میں حاصل زندگی حنا دیہ احمد تو میرا نصیب ہے۔ فرحت انصاری اور بیٹی اور پٹپٹی ام ثمامہ گنگنا دی زندگی دانیہ آفرین۔ ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ شائستہ زریں کے سروے میں سیدہ ناز ظفر کاظمی صاحبہ یہ وہی تو نہیں ہیں جو آج سے کئی سال پہلے ریڈیو پاکستان سے خواتین کا پروگرام پیش کرتی تھیں۔ (جی نہیں) جن بہنوں کے پاس خوشی اور مسرت کے لمحے آئے خدا کرے ہمیشہ اسی طرح آتے رہیں۔ بہت، بہت مبارک ہو۔ بیماروں کو اللہ صحت دے۔ نگینہ ضیا آپ کو بھی اسی طرح خوشیاں میسر ہوں۔ اللہ مسز یاسین کی دلی مراد پوری کرے۔ پیاری طیبہ بیٹی کی ڈھیروں، ڈھیر مبارک باد، یمنیٰ احمد بھتیجا بہت، بہت مبارک ہو۔ یا اللہ پاک صائمہ کے بھائی کو رزق حلال عطا فرما۔ (آمین) پیاری فریدہ جی اللہ پاک چھوٹے بھائی کو صحت کلی اور لمبی عمر عطا فرمائے (آمین) اللہ تعالیٰ رفاقت جاوید کو صحت کلی عطا فرمائے۔ شیریں حیدر کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ پیاری سیما، اللہ تعالیٰ تمہیں صحت کاملہ اور شفا عطا فرمائے۔ سویرا فلک کے شوہر کو اللہ تعالیٰ مکمل صحت اور شفا عطا فرمائے۔ تمام مرحومین کو اللہ تعالیٰ اپنے دربار میں اعلیٰ درجات پر فائز کرے۔ (آمین) اب اجازت چاہوں گی اللہ تعالیٰ پاکیزہ اور اس کی فیملی پیاری نزہت اور ان کی فیملی کو اور ہم سب کو اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے حصار میں رکھے' ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت کرے۔ آمین۔'' (چھوٹے سے تبصرے اور بہت قیمتی دعاؤں کا شکریہ)

☜ ثریا فرخ، کراچی سے ''ستمبر کے شمارے میں اپنا افسانہ دیکھ کر دل کھل اٹھا۔ اتنے معیاری رسالے میں افسانہ چھپنا فخر کی بات ہے، بہت شکریہ۔ (افسانہ بہت اچھا تھا ثریا) ٹائٹل اس طرح لگا گویا دلہن شرما کے کچھ کہنے والی ہو۔ دھیمی سی مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ امرت کی یہ قسط بھی بہت شاندار رہی۔ شیریں حیدر میری ہمیشہ سے پسندیدہ رائٹر رہی ہیں۔ بہت سارے کرداروں کو لے کر چلنا اور ان سے انصاف کرنا...... مشکل کام ہے مگر شیریں صاحبہ اسے اچھی طرح نبھاتی ہیں (جی بے شک) پاکیزہ کا سب سے بہترین سلسلہ شمع ہدایت ہے۔ اختر شجاعت پر اللہ اپنی رحمتیں نازل کریں (الٰہی آمین) عذرا رسول کی خدمت میں میرا پُرخلوص سلام....'' (ان کی طرف سے بھی سلام و دعائیں)

☜ انجم مشیر، کراچی سے۔ ''ستمبر کے شمارے میں اپنی تحریر آیا ہے بلاوا کے عنوان سے دیکھی بہت شکریہ... مجھے کچھ کہنا ہے ایک مکمل سبق ہے اللہ ہم سب کو اللہ کے احکام پر چلنے کی توفیق دے۔ ذکیہ آپا سے آپ کی اور عذرا رسول کی محبتوں کا اظہار کرتی ..... ملاقات پڑھ کر اچھا لگا اللہ آپ سب کو محبت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ عذرا رسول اب بہنوں کی محفل میں باقاعدہ شریک ہیں محفل کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔ (جی بالکل) رفعت سراج پہ کہاں بچیں کہ دل ہے۔ ایک خوب صورت انداز میں آگے بڑھ رہا ہی ہیں لیڈی صوفیہ کا کردار یہ احساس دلاتا ہے کہ رکھ رکھاؤ نوک و پلک سے سنوری یہ خاتون اس عمر میں بھی محبت کا مرقع ہیں۔ نگہت اعظمی کا سوال لاجواب ہے۔ ہالہ احمد ہم بتلائیں کیا بلکہ دوست بہتر تھا کچھ انتظار کر لیتیں کھانا لینے کے لیے یوں نہ ہوتا...... سحرش فاطمہ کی تحریر میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں بہت زبردست ...... شیریں حیدر کی امرت پر گرفت ہے اب اور بھی دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ گتھیاں جو کھل رہی ہیں، سیمار ضا ردا کا ہم کو عبث بدنام کیا۔ لگتا ہے مائل بہ اختتام ہے۔ ثریا فرخ کا کنگن بہت زبردست اکثر ورکنگ وومن کا... یہی مسئلہ ہے۔''

☜ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''عید کی مصروفیات کی وجہ سے مہمانوں کی آمد و رفت رہی۔ پچھلا شمارہ تاخیر سے پڑھا۔ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ (آپ لوگوں کے دم سے ہی رسالے میں رونق ہے پھر یاد تو ضرور رکھیں گے) گولڈن اسٹار بہت اچھے موضوع پر افسانہ لکھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ، ساتھ ان کی ایکٹویٹی پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ طیبہ نے کو ایجوکیشن میں پڑھنے والے بچوں کے مسائل کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سحرش فاطمہ بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ عالیہ حرا کا اشک جگنو اور ستارے پُراثر تحریر تھی۔ نگہت اعظمی کا سوال واقعی ہمارے لیے بھی سوال ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ جھوٹ بول کر ہی کسی سے امداد وصول کی جائے لیکن اگر ضرورت مند جھوٹ نہ بولے تو وہ اپنی ضروریات کیسے پوری کرے۔ حقدار کو حق کیسے ملے۔ اگر کوئی پیٹ بھرنے کے لیے ہی جھوٹ بول رہا ہے تو اس کو ضرورت مند سمجھ کر ہی حسب توفیق دے دینا

چاہیے۔ پیشہ ور گداگروں کا پتا لگتا ہے وہ اس کے عادی ہوتے ہیں اللہ ایسی آزمائشوں سے بچائے۔ معاشرے کا ہر طبقہ زکوٰۃ ادا کرے تو شاید ضرورت مند افراد کو چور رستے ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑے۔ (جی بے شک) شمع تفسیر کا جھلمل سپر ہٹ تھا...... بہت زیادہ بحث کرنے والی سسرال کو اس طرح کے کرنٹ کے جھٹکے لگتے رہتے ہیں۔"

ﷺ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ "ماشاء اللہ یہ ڈائجسٹ روز بروز ترقی کی منزل پر گامزن ہے۔ اور اس کی ترقی کی اصل حق دار محترمہ عذرا رسول صاحبہ ہیں وہ خود بھی محنت کر رہی ہیں اور تمام سینئر جونیئرز کی حوصلہ افزائی اس طرح کر رہی ہیں کہ مجھ جیسی پیار اور کم سمجھ رکھنے والی قاری بھی پاکیزہ سے کبھی رشتہ نہیں توڑنا چاہتی۔ پاکیزہ رسالے میں روز بروز نکھار پیدا ہو رہا ہے۔ میں کسی ایک کہانی کا ذکر کیا کروں ماشاء اللہ تمام رائٹرز بہت محنت اور جان مار کر ایسی کہانیاں لکھ رہی ہیں بالکل حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ بیٹی اور بیٹی پڑھ کر ایسا لگا کہ یہ میری کہانی ہے۔ بالکل میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ماں، باپ چاہے کتنا بھی دے دیں اگلے گھر میں وہ سامان اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔ میں ڈائجسٹ کو پہلے صفحے سے شروع کرتی ہوں آخر تک پڑھتی ہوں۔ مجال ہے جو کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس پر تنقید کی جاسکے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں نزہت اصغر صاحبہ نے بہت اچھے الفاظ میں حج کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ بالکل اسی طرح روحانی سکون اور دل کی حالت ہوتی ہے۔ میں نے دو دفعہ عمرہ کیا ہے حضور پاکؐ کے روضے پر گئی ہوں۔ دل ابھی تک حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کی جالی سے باہر نہیں آیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا کرے۔ (آمین) بہت اچھا لکھا اور لکھ رہی ہیں۔ قرآن پاک میں حساب کا علم جس طرح یکجا کر کے انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا اور سمجھایا ہے بہت ہمت اور محنت کا کام ہے۔ ننھی خواہش، فرح طاہر نے قربانی کے بارے میں بالکل حقیقت پر مبنی کہانی لکھی ہے۔ آج کل لوگ رشتے داریاں اور دوستیاں نبھانے کے لیے قربانی کرتے ہیں۔ سنتِ ابراہیمیؑ کو بھول جاتے ہیں۔ میں ہر سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قربانی کرتی ہوں۔ جب گوشت بن کر آتا ہے تو فوراً تین حصے کرتی ہوں۔ جو حصہ غریبوں، مسکینوں کا ہوتا ہے اسے الگ کر کے شاپر بنا کر الگ رکھ دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں گیٹ پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ان کے حصے کا سارا گوشت تقسیم کرنے کے بعد رشتے داروں کو بھیجتی ہوں۔ میری ایک رشتے دار عورت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں کہ لوگ تو دو دو بوٹیاں ان فقیروں کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔ اور آپ شاپر بنا کر دیتی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں سورۂ یٰسین پڑھ کر گوشت پر دم کرتی ہوں تو ان کا حصہ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ (سبحان اللہ بہت خوب صورت بات کہی) شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ بہت محنت سے مختلف کتابوں سے موتی چن چن کر پاکیزہ رسالے میں لکھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے۔" (جی بے شک، یہ سب آپ جیسے قدر دان قارئین کے لیے ہی تو ہے)

ﷺ منعم ملک، ڈیرہ غازی خان سے۔ "پاکیزہ کو بہترین بنانے میں آپ لوگ بلاشبہ بہت محنت کرتے ہیں اور یہ نظر بھی آتا ہے۔ میری بس ادنیٰ سی رائے یہ ہے کہ اگر زیادہ سے زیادہ تحریروں پر تعریف و تنقید کی جائے تو ساری کمی بیشی پوری ہو جائے گی۔ (جی بالکل درست کہا) میں خطوط شوق سے پڑھتی ہوں مگر کہانیوں پر بھرپور تبصرے والی حسرت کہیں نہ کہیں رہ ہی جاتی ہے۔ (اس مرتبہ نہیں رہے گی)

ﷺ فریدہ فضل، ڈالاس سے۔ "اس سے پہلے بھی ایک خط لکھا تھا۔ وہ پتا نہیں ملا یا نہیں (جواب تو دیا گیا تھا ڈیئر) پاکیزہ میرا بہت پسندیدہ رسالہ ہے۔ وجہ اس کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ عمیرہ احمد، رفاقت جاوید، سیما رضا ردا، سحر ساجد، رفعت سراج، شیریں حیدر، نگہت سیما سبھی بہترین لکھنے والوں کو آپ نے جمع کیا ہوا ہے اس لیے ہمیں بہترین تخلیقات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آپ کے ادارے کے چاروں ڈائجسٹ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں۔ میں نے کچھ مختصر تحریریں الگ، الگ عنوان سے بھیجی ہیں۔ پسند آئے تو شائع کریں۔" (جی آپ کے بھیجے گئے تراشے بہت خوب صورت ہیں۔ لگتے رہیں گے، خط بھیجنے کا شکریہ)

ﷺ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ "ستمبر کا پاکیزہ ملا دلہن بنی لڑکی بہت ہی پیاری لگی۔ امرت حسبِ معمول بہت خوب رہی۔ بہت ہی خوب طرزِ تحریر ہے۔ شیریں حیدر ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ رفعت سراج کا بھی ناول خوب جا رہا ہے۔ ہم کو عبث بدنام کیا بھی اچھا رہا۔ چھوٹی، چھوٹی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔" (آپ تفصیلی تبصرہ بھیجیں)

ﷺ ھادیہ احمد، میر پور، آزاد کشمیر سے۔ "بہترین سرورق کے ساتھ پاکیزہ کا شمارہ ملا۔ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اللہ اور اس کے نور سے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تمام ضرب اور تقسیم کی مثال خوب ہیں۔ ذکیہ آپا سے پُرعقیدت ملاقات کا بھی احوال ایسے ہی لگا جیسے ہم بھی اسی محفل میں تھے۔ خدا ان کو صحت و تندرستی نصیب کرے، آمین۔

نگہت اعظمی کا سوال اپنی مثال آپ رہا۔ سائرہ جاتے، جاتے بھی سوال چھوڑ گئی۔ میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں بہت، بہت بہترین ہے۔ دوسرے حصے کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ (اب تو انتظار ختم ہو گیا ہوگا) حاصلِ زندگی سے لے کر تو میرا نصیب ہے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ہماری مصنفہ بہنوں سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ متاعِ عمرو ہی سعدیہ رئیس کی بہترین کاوش میری طرف سے مبارک باد گوشہ ظرافت میرا فیورٹ کالم ہے۔'' (مختصر سے تبصرے کا شکریہ)

٭ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ ''پاکیزہ ملتا ہے میری تھکن راحت میں بدل جاتی ہے۔ میں نے سب چکوالی بک شاپس والوں سے کہہ رکھا ہے جونہی رسالہ آئے مجھے فون کر کے بتانا تو وہ اللہ کے بندے اپنی دکان داری بڑھانے اور کمیشن بنانے کے بہانے گھر تک دینے آجاتے ہیں۔ لو جی کر لو گل اب ساٹھ روپے کا پاکیزہ تو بیس روپے الگ سے دیں چونکہ خود کہہ رکھا ہوتا ہے اس لیے مجبوراً دس بارہ کاپیاں لینی پڑتی ہیں۔ ہر ایک سے ایک، ایک...... دو میں خود رکھ کر باقی ان بیچاروں کو دیتی ہوں جو گھر والوں سے چھپ کر رسالہ بغل میں دبا کر باتھ روموں میں چھپ، چھپ کر پڑھتی ہیں۔ (ارے بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے اب پاکیزہ کی محبت میں اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے) پہلے آپ کی من موہنی پیاری باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے اپنے فیورٹ ناول پہ کہاں بچیں کہ دل ہے۔ بھئی یہ زارا تو بڑی تیز نکلی مگر ہمیں نہیں لگتا لیڈی صوفیہ جیسی زمانہ شناس کے ہاتھوں یہ بچ نکلے گی۔ رفعت سراج صاحبہ کہانی سے ہٹ کر ایک بات پوچھوں اگر مائنڈ نہ کریں تو...... تو چپکے سے بتا دیں کیا اب بھی آپ کے بال اتنے ہی لمبے ہیں یا غمِ زندگی کی دھوپ کی میں محض چٹیا میں بدل گئے میں تو آپ کی کہانیوں کے لمبے بالوں کی بھی فین ہوں...... بہنوں کی محفل میں سب کے خطوط چھجے منے سے لے کر ڈھول ڈرم تک اچھے لگے...... اللہ اور اس کا نور ڈاکٹر ذکیہ، شمع ہدایت، اختر شجاعت کے مضمون میرے فیورٹ ہیں ان کو تو میں آرام اور دل کی گہرائیوں سے پڑھتی ہوں...... گوشہ ظرافت اچھا اضافہ ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں نازنین آفریدی کا مراسلہ سب سے اچھا تھا۔ ہر ماہ بہنوں کی محفل میں عذرا آپی کی حاضری ان کی نہ صرف پیاری سی باتیں بلکہ مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کے بارے میں ان کی فکرمندی اچھی لگتی ہے بہت اچھا لگا عذرا آپی آپ کی انٹری ہمیں بھی آپ کے خیالات پتا چلتے رہتے ہیں...... نگہت سیما کی صید ضیافت اچھی تحریر تھی ایسا تو ہر جگہ ہو رہا ہے ہر جگہ ناحق یتیموں کا مال کھانا...... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دادا کی زمین ہمیں نہ مل سکی۔ (اللہ لوگوں کو ہدایت دے) نزہت آپ نے جو یہ آئیڈیا دیا ہے ناں کہ بزم پاکیزہ والا سلسلہ بند کر کے سوال ہمارا جواب آپ کا...... تو بھئی کمال ہے ایسا آئیڈیا ہمارے ذہنوں میں کیوں نہیں آیا زبردست...... یہ سلسلہ شروع کر دیں لیکن...... ہم تو ٹھہرے پاکیزہ کے کافی پرانے اور دیرینہ ساتھی تو ہر سلسلے کی کوئی یادگار تو ہمارے پاس ہونی چاہیے ناں تو جب تک میرا بزم پاکیزہ میں انعام نہیں نکلتا تب تک ہم اجازت دینے والے نہیں سوال میں بھیج دوں گی۔ (جی ضرور بھیجیں اور انعام بھی پائیں)

٭ انیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، تو بالکل ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ انتظار تھا، طویل تھا پر اس کے بعد ملنے والا اجر ایسی پزیرائی اور محبت جس کی ہر انسان کی طرح چاہ تو ضرور تھی پر امید ہرگز نہیں تھی۔ بے شک یہ میرے رب کا فضل ہے۔ جزاک اللہ خیر نزہت آنٹی اور قارئین کا بے حد شکریہ جن کی تعریف نے میرا سیروں خون بڑھا دیا ہے۔ سحرش فاطمہ کے ناول کا اینڈ اچھا رہا...... اور راحم کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کانوں کے کچے مردوں سے محفوظ رکھے۔ رفعت سراج کے ناول میں زارا کی مادہ پرستی اور خود غرضی بھی اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی کرنے لگی ہے۔ پرنس جیسے لوگ یقیناً اس دنیا میں ہوتے ہیں لیکن کہاں ہوتے ہیں؟ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے جا رہے ہیں اللہ اور اس کا نور ہمارے دلوں کو بھی منور کر رہا ہے۔'' (آپ کی تحریر اچھی تھی تو پزیرائی پائی۔ مختصر تبصرے کا شکریہ)

٭ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ ''بہت مبارک باد سرورق ایسا پہلے کبھی نہیں لگا جتنا اچھا اب کے لگا۔ اب میں پہلے تو نزہت اصغر کی تعریف کروں گی کہ بہت ہی بہترین انداز میں پاکیزہ سنبھال لیا ہے بلکہ بہت عمدہ کام کر رہی ہیں (بہت شکریہ) اب میں جو کہنے جا رہی ہوں اس کو لکھنے کے لیے مجھے شایانِ شان الفاظ نہیں مل رہے آنکھ میں آنسو ہیں اور دل میں دعائیں جزاک اللہ دوستو، میری پیاری، پیاری بہنو! کہ آپ سب نے میرے افسانے، گولڈن اسٹار، کو جس طرح پزیرائی بخشی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے لگا میرا اب تک کا لکھا گیا کچھ بھی رائگاں نہیں گیا میں ہر اس قاری اور رائٹر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کو میری تحریر پسند آئی اور اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر مجھے پڑھا بھی اور تبصرہ بھی کیا سلام ہے ان محبتوں کو اب

میں عذرا آپا، آپ کی محبتوں کا جواب کیونکر دوں میں مان لیتی ہوں کہ میری تحریر بہت عمدہ تھی اللہ تعالیٰ کے کرم سے لیکن میں نہیں سمجھتی آپ جیسی ہستی میرے لیے یہ الفاظ کہیں کہ مجھے گولڈن اسٹار مل گیا یہ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا جو آپ نے کہہ ڈالا جزاک اللہ...... پاکیزہ کی وجہ سے میں مصنفہ کہلائی انجم آپی کی محبتوں سے لے کر آمنہ حماد، نزہت اصغر اور اب سب پر بھاری عذرا جی کی ستائش...... مجھے اپنے پاکیزہ پر ناز ہے اسی باغ کی خوشبو نے مجھے چہار جانب پھیلا دیا، میری ہر کامیابی میرے پاکیزہ کی پاکیزگی کے نام...... شکریے کے الفاظ نہیں۔ بزم پاکیزہ کی جگہ نزہت کی تجویز زیادہ مناسب رہے گی۔‘‘ (بہت خوب طیبہ، اب اچھی چیز کی تعریف تو کرنی ہی چاہیے ناں......)

☒ فریدہ سیفی، اسلام آباد...... آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہونے پر ضرور لگے گی تھوڑا انتظار کریں۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ، تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ’’پاکیزہ آتا ہے اور بس اسے جلد سے جلد پڑھنے کی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ یہ ہر وقت رہتا ہے اسکول ہو، میٹنگ ہو یا گھر میرے تو سب ملنے والے، رشتے دار میرے اور پاکیزہ کے رشتے پر رشک کرتے ہیں۔ میرے بھانجے، بھتیجے کا ذکر اگر میں رسالے میں کر دوں تو وہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میرے شوہر فلک شیر صاحب بھی کبھی کبھی ورق گردانی کر لیتے ہیں۔ پاکیزہ تو پورے میاں چنوں، خانیوال، ملتان سب جگہ یکساں مقبول ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک تقریب ہوئی تھی میں اس کا بھی حال لکھوں گی (جی ضرور) میری نظم اور تصویر رسالے میں دیکھ کر میری ساتھی اساتذہ بھی بہت خوش تھیں۔ پاکیزہ ہر لمحے ہمارا مان بڑھاتا ہے۔‘‘ (بہت پیاری باتوں کے لیے جزاک اللہ آپ لوگوں کا ہی حق ہے اس پاکیزہ پر بہت شکریہ، اپنا قیمتی وقت دینے کا)

شاہدہ ذاکر، کراچی سے۔ ’’آپ کو ایڈیٹر شپ مبارک ہو...... امید ہے رسالہ مزید ترقی کرے گا...... میں دبئی میں تھی جب بھی باقاعدگی سے مطالعہ کرتی تھی۔ میں بھی بذریعۂ تحریر اس میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔‘‘ (جی ضرور، آپ کی بھیجی گئی کہانیاں جلد لگیں گی)

☒ وزیہ ظفر، تلہ گنگ، چکوال۔ پیاری بہن آپ سے گزارش ہے کہ پہلی تحریر مختصر لکھیں تاکہ آپ کا اسلوب انداز اور بُنت دیکھی جائے۔ آپ کہانیاں ضرور لکھیں مگر پہلے خوب مطالعہ کریں...... پہلی کہانی کی ناکامی پر دلبرداشتہ نہ ہوں...... دوبارہ سے لکھیں۔ آپ میں ٹیلنٹ ہے بس اسے خود تلاش کریں پھر ہم سنوار بھی دیں گے۔

صبا آصف، گلشن حدید، کراچی سے۔ ’’ابھی ہم بہن اور بھانجے کے غم میں مبتلا تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ امی کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آپ سب لوگ ہمارے حق میں دعا کیجیے گا...... اس ماہ کا رسالہ مکمل نہ پڑھ پائی۔ رفعت سراج کا ناول بہت بہترین جا رہا ہے ان سے مجھے بات کرنی ہے کہ جب وہ گلشن حدید میں رہتی تھیں تو ہماری باقاعدہ بات چیت ہوتی تھی۔ پھر میرا وہ نمبر بند ہو گیا تھا۔ انشاء اللہ میں ضرور بات کروں گی۔ (آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا ہے) بہنوں کی محفل کی وہی آب و تاب اور رونق ہے، بہن کوثر خالد نے میرا دکھ بانٹا اور اپنی بیٹی صبا کا بتایا میرا دل بھی بہت دکھی ہوا۔ نئے سلسلوں میں گوشۂ ظرافت بہت عمدہ جا رہا ہے۔ کیا میں اپنے ابو کے بارے میں تعزیتی مضمون لکھ سکتی ہوں؟‘‘ (جی مختصراً لکھ سکتی ہیں۔ اللہ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور والد صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔)

☒ نسرین اختر نینا، لاہور...... آپ کی جو کہانیاں قابلِ اشاعت ہیں وہ جلد از جلد لگیں گی۔ رسالے کی پسندیدگی کا بہت، بہت شکریہ۔

☒ ایک دکھی بہن، چکوال۔ آپ بالکل دل ملول نہ ہوں، اللہ پاک بہترین راستے نکالے گا۔ بس آپ بتائی گئی دعاؤں کی باقاعدگی رکھیں۔ ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے اس دیر میں بھی خدا کی حکمت شامل ہوگی۔ اس مرتبہ خاص روحانی مشوروں سے فیض یاب ہوں۔ اور سورۂ یٰسین والا عمل ضرور کریں۔

☒ مریم شہزاد، کراچی۔ آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہے جلد ہی لگے گی۔ آپ مطالعہ جاری رکھیں اور پھر کہانیاں بھی لکھتی رہیں۔

☒ سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ۔ آپ کے بھیجے گئے مراسلے لگتے رہیں گے، مزید چیزیں بھی بھیج سکتی ہیں۔ پاکیزہ کہانیوں پر تبصرہ بھی لکھیں۔

☒ مسکان اقبال خان، میر پور خاص۔ آپ کا انتخاب اچھا ہوتا ہے۔ اپنی شاعری کی اصلاح کروا کر بھیجیں۔

رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

٭ نگینہ ضیا بنگش، کیماڑی سے۔ ''باجی اس دفعہ تو رسالہ بھی رک، رک کر پڑھا ہے۔ بچے بیمار تھے اور میں بھی...... آپ کا بہت شکریہ کہ مراسلات لگاتی رہتی ہیں، میں تو تقریب کے احوال کا انتظار کر رہی ہوں آپ لوگ بہت محبت اور خلوص سے بلاتے ہیں، کہانیوں کا اس دفعہ کا بھی انتخاب بہت خوب تھا۔ ہاجرہ ریحان اچھے اور مختصر افسانے لکھ رہی ہیں۔ عقیلہ حق، ہما بیگ اور سحر ساجد کی کہانیاں بہت اچھی لگیں، اس کے علاوہ صبیحہ شاہ کی بھی بہت زبردست تھی۔ پاکیزہ میں اتنی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ میری بچیاں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ اختر شجاعت آپی سے مل کر بھی خوشی ہوئی اور ان کے مضمون پڑھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ذکیہ آپا کو ہمارا عقیدت بھرا سلام...... بہت، بہت نیکی کا کام کر رہی ہیں۔'' (او ہو چلو تم بچوں کو دیکھو اگلے مہینے تفصیلی تبصرہ لکھنا)

٭ صبا نور، لیہ سے۔ ''مجھے تو پاکیزہ سے عشق ہے، میں نے اور میری کزن اور دوستوں نے پاکیزہ رسالے سے بہت سیکھا ہے۔ نبیلہ انجم باجی بھی بہت محبت سے بات کرتی تھیں اور آپ بھی...... انہیں اور عظمیٰ آفاق کو میرا سلام کہہ دیں۔ (جی ضرور) میں سنبل ملک اعوان سے بات کرنا چاہتی ہوں (سنبل بھئی صبا نور سے رابطہ کرو) باجی مجھے ...ارشد ملک شاعر کی شاعری بہت پسند ہے۔ آپ وہ بھی چھاپا کریں۔ اس دفعہ بھی ساری ہی کہانیاں اچھی تھیں۔ رفعت سراج آنٹی کا ناول تو بے حد اچھا ہے اور ہاں مدیحہ رضوی کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ تصویریں بھی اچھی تھیں۔'' (بہت شکریہ)

٭ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''اکتوبر کا شمارہ دلکش چہرے کی مالک ماڈل کی خوب صورت تصویر کے ساتھ سرورق سجائے پیارا لگا...... دیکھیے سادگی میں کتنا حسن ہے اور دوپٹے نے اسے مزید خوب صورت بنا دیا۔ ماڈل کی بولتی آنکھیں پسند آئیں اداریہ نئے اسلامی سال کے حوالے سے مسلم امہ کو اتحاد و یگانگت کا پیغام دیتا نظر آیا۔ نیا اسلامی سال سب کو مبارک ہو اللہ کرے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے اچھا اور پُرامن ثابت ہو آمین ثم آمین۔ اللہ اور اس کا نور بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ افسانوں میں ثمر کاظمی کا افسانہ بس عشق کیا تھا، اچھا لگا، واہ ثمر آپ نے تو کمال کر دیا۔ بڑے، مزے کا افسانہ لکھا...... مدیحہ رضوی سے ملاقات بھلی لگی پاکیزہ کا شکریہ دیبا کی بیٹی سے ملاقات کروانے کا...... روحانی مشورے بڑے اچھے لگے فوٹو کاپی کروالی ہے کیونکہ ہر وقت تو پاکیزہ ہاتھ میں نہیں رکھ سکتے ناں کیونکہ بقول شاعر اور بھی غم ہیں زمانے میں پاکیزہ کے سوا۔ طیبہ عنصر مغل کا ناولٹ کمال کا ہے۔ اے عشقا مجھے پارس کر دے۔ واہ طیبہ مبارک باد قبول فرمائیں۔ باقی بہنوں کی محفل میں خوب رونق لگی ہے ہمارے علاوہ بھی تشریف فرما ہیں۔ عذرا رسول صاحبہ شروع میں جھلک دکھاتی ہیں اور بعد میں بہنیں ہی بہنیں، پورے پاکستان سے بہنوں کی شرکت پاکیزہ کی پسندیدگی کا ثبوت ہے۔ ایک بات کہ نیٹ، ٹی وی موبائل نے لکھنے پڑھنے کے سلسلوں کو متاثر ضرور کیا ہے تاہم ابھی تک ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور ڈائجسٹ کا اپنا ایک مقام ہے۔'' (جی بالکل...... بہت پیارے تبصرے کا شکریہ...... پاکیزہ پاکستان تو کیا پوری دنیا میں ماشاء اللہ ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے)

جی تو پیاری، پیاری بہنو! فی الحال محفل کو یہیں روکتے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں۔ پروردگار عالم نے مزید مہلتِ حیات و صحت بخشی تو اگلے ماہ پھر حاضری دیں گے تب تک کے لیے خدا حافظ...... رب کائنات کے حضور دعا گو ہیں کہ...... اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے۔ اے معبودِ برحق! ہمیں اپنی اس نظرِ کرم سے بہرہ مند فرما جس سے بھی سختیاں مصائب و آلام ٹل جائیں۔ یاارحم الرحمین ہم پر موت کے وقت رحم فرما اور موت کے بعد عذاب قبر، فشارِ قبر سے محفوظ رکھنا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

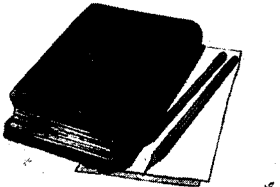
آپ کی خیریت کی طالب

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری
عظمیٰ آفاق سعید

حمد رب تعالیٰ

دنیا کی ہر زبان کا حُسنِ ادا وہی
اپنا خدا جو آپ ہے، میرا خدا وہی
اپنا خیال آپ تو اپنا بدن بھی آپ
پوچھا گیا 'وہ کون ہے' دل نے کہا 'وہی'
دستِ عطا سے منظروں کو بھی ملی زباں
صحنِ خیال میں نظر آتا رہا وہی
کوئی بھی سوچ اس کا احاطہ نہ کرسکی
دے کر شعور و آگہی سب پر کھلا وہی
یوں تو سبھی جہان میں ہیں معترف مگر
جو اس کے عشق میں ہے یقیناً جدا وہی
نظمِ سخا پہ میرے دل و جاں بھی نثار
لازم تھا نقشِ پائے محمدؐ، ملا وہی
خالق سے پیار ہے مگر تخلیق سے نہیں
اب بھی فریبِ ذات کا ہے مسئلہ وہی
ناصر جو قلب و جان پہ چھایا رہا سدا
عقلِ جہاں سے آج بھی ہے ماورا وہی

کلام: ناصر ملک
پسند: صبا نور، لیہ

نعت شریف

وہ ہیں مالکِ مدینہ
وہ ہیں صاحبِ مدینہ
مری بے قراریوں سے
مجھے آزما رہے ہیں
جو گزر رہی ہے دل پر
اسے خوب جانتے ہیں
مجھے پاس وہ بلائیں
یہی دل کی ہے تمنا
میں انہی کی خاکِ پا ہوں
میں تو ہوں سنگِ مدینہ
کوئی جا کے انؐ سے کہہ دو
میں تڑپ رہی ہوں پل پل
مجھے اذنِ حاضری دیں
جو ہیں صاحبِ مدینہؐ

عقیدت گزار: فریدہ افتخار، اسلام آباد

منقبت بحضور امام حسینؓ

ہر مصطفیٰ کے ساتھ ہو ہر ہاشمی کے ساتھ
یارب ہمارا حشر ہو آلِ نبیؐ کے ساتھ
پہنچے تجھے سلام ادب شاہِ کربلا
تیرا خیال دل کو ہے تیرہ شبی کے ساتھ
تیری پیاس، اعدا کے اب ساتھ، ساتھ ہے
ہر کاروبارِ زیست ہے تشنہ لبی کے ساتھ
تیرا سا وہ جمالِ پیمبر کہیں نہیں
تھوڑی جھلک دکھائی دے بس روشنی کے ساتھ
تیرا وہ عزم تیری دلیری تھی خود مثال
سر کو مگر جھکا دیا کس عاجزی کے ساتھ
وہ سر زمین خود پر کرے گی سدا یہ ناز
سب پاک خون اس پر بہا سرخوشی کے ساتھ
تیری وفا کی آج بھی توقیر ہے شاہا
روشن ہے شمعِ جان تری خرمی کے ساتھ
دامانِ دل کو کھینچے ہے مخفی یہی خیال
جانیں لٹی ہیں کتنی وفائے نبیؐ کے ساتھ

کاوش: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

نماز اور اذان

برسوں سے دنیا میں سب سے زیادہ سنی جانے

والی آواز، اذان کی ہے جو انسان کو خدا کی طرف بلاتی ہے اور انسان ہر کام چھوڑ کر عبادت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لفظ مسجد جس کے معنی ہیں سجدہ کرنے کی جگہ...... سورج کے طلوع ہوتے ہی چرند، پرند، انسان سب خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عبادت سے دل کو سکون، دن کی شروعات اچھی ہونے کی خوشی ملتی ہے۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا ہر چیز انسان نماز سے سیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ سجدے کی جگہ پر دھیان یعنی غور و خوص اور توجہ وہ بھی ہم نماز سے سیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے مسجد اور نماز کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ خداوند تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ انسان اگر ایک چڑیا کی بھی مسجد میں بیٹھنے کی جگہ بنانے میں مدد کرتا ہے تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔ اگر ہر انسان پانچوں وقت کی نماز با قاعدگی سے اور حسنِ نیت سے ادا کرے تو دنیا کتنی خوب صورت اور حسین ہو جائے۔ آج کے اس ماڈرن اور مشینی دور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔

از: فریدہ فضل، ڈالاس، یو ایس اے

کچھ جاننے کی باتیں

☆ نفرت ایک ایسا زہر ہے جو اگر انسان کی رگ، رگ میں بس جائے تو وہ اسے مار ڈالتا ہے۔

☆ زندگی محبت کے لیے کم ہے تو نفرت کی کہاں گنجائش......

☆ جب کوئی بہت ہی عزیز دوست یا رشتہ، اعتبار کو چکنا چور کر دیتا ہے تو انسان نفرت کرنے کا بھی حوصلہ نہیں پاتا۔

☆ بے صبری اور جلد بازی میں اٹھائے گئے قدم پچھتاوے بن جاتے ہیں۔

☆ لوگ دوسروں کے بارے میں جلد غلط رائے قائم کر لیتے ہیں، دوسروں کے بارے میں ہمیشہ مثبت سوچ رکھیں۔

☆ کسی کو چاہ کر چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا کیونکہ جس سے محبت ہو اسے بھولنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

از قلم خود: ایمان زہرا شیرازی، کھڈیاں چکوال

موبائل فون کے تحفے

پاس بیٹھے لوگ بھی
اجنبی سے لگتے ہیں
دیکھے، دیکھے چہرے ہیں
اب پرائے لگتے ہیں
دوریاں پہلے بھی تھیں
دوریاں تو اب بھی ہیں
پاس، پاس رہ کر بھی
دور، دور رہتے ہیں
وقت کا تقاضا ہے
یا کہ دل بنے پتھر
ایک گھر میں رہ کر بھی
کیوں پرائے لگتے ہیں
میں بھی کتنی پاگل ہوں
کیسا قصہ لے بیٹھی
اجنبی سے چہروں میں
ڈھونڈتی ہوں اپنوں کو

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

میری آنکھوں کے دریا کی روانی کیوں نہیں دِکھتی
اسے اجڑی ہوئی میری جوانی کیوں نہیں دِکھتی
میرا کردار شامل وہ اگرچہ کیوں نہیں کرتا
اسے یہ غم زدہ میری کہانی کیوں نہیں دکھتی
وہ جس پر دل کی دنیا بھی لُٹائی جا چکی میری
میرے دل پر اسی کی حکمرانی کیوں نہیں دکھتی
میری آنکھیں سلگتے دشت کی صورت ہوئیں آخر
کسی کے پیار کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھتی
زمانہ جانتا ہے میں اسی سے پیار کرتی ہوں
اسے میری محبت راج دھانی کیوں نہیں دکھتی
جہاں بھر سے وہ کرتا ہے بہت ہی پیار کی باتیں
اسے اپنی یہ تمثیلہ بھی رانی کیوں نہیں دکھتی

شاعرہ: تمثیلہ لطیف، لاہور

مختصر بات

جملہ بہت چھوٹا لیکن اس کی طاقت بہت ہے۔
اللہ کی طرف آ جاؤ اس سے پہلے کہ اللہ تمہیں اپنی طرف بلا لے۔

از: صبا نور، لیہ

ماں کیا ہے؟

ماں۔ ''بیٹا! آج اتنی دیر سے گھر آئے ہو، کھانا لاؤں؟''

بیٹا۔ ''ماں! آپ سو جایا کریں میں خود کھا لیا کروں گا۔

ماں...... ''نہ بیٹا! مجھے نیند نہیں آتی جب تک تو گھر نہیں آ جاتا۔''

بیٹا۔ ''ماں! آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ چلیں دونوں ساتھ کھائیں گے۔''

ماں۔ ''ٹھہرو بیٹا! میں گرم کر لاؤں۔ مجھے پتا ہے تمہیں ٹھنڈا کھانا پسند نہیں۔''

وقت کیسے بیت جاتا ہے، آج دس سال بعد دیر سے گھر آیا تو کسی کو اس کا انتظار نہیں تھا۔ کچن سے کھانا لیتے وقت اسے ماں کی یاد آ گئی۔ بیوی، بچے سو رہے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے یاد آیا وہ تو گرم کھانا کھاتا تھا۔ نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

چاند

گرل فرینڈ نے پوچھا۔ ''چاند کتنے ہوتے ہیں؟''

بوائے فرینڈ بولا۔ '' ایک تم اور ایک وہ اوپر......''

ان دونوں کی شادی کے بعد بیوی نے پیار سے پوچھا۔

''چاند کتنے ہوتے ہیں؟''

شوہر بولا۔ ''اندھی ہو کیا؟ وہ اوپر خربوزہ نظر آ رہا ہے؟''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کچھ پل خزاں کے سنگ

خزاں کے پتے
پرندوں کے مانند
شاخوں سے بچھڑے
وجود کو سنبھالے
زمین پہ اترے
دیکھا جو پانی
ناسمجھ بچوں کی طرح
بلا سوچ سمجھے
گئے کود
اب ہوا کے دوش پر
خود کو کشتی بنائے
لہروں کے ساتھ، ساتھ
کر رہے ہیں رقص
ہے تو کچھ ہی لمحے کا کھیل
پھر......بھی
پورے جوش سے
گھوم رہے ہیں
نہیں جانتے
کہاں ہے منزل
ٹھنڈی ہوا ہے......پانی میں
اور......کچھ......پل......
جو......بہت خوب صورت ہیں

کاوش: عذرا آفتاب خان، کراچی

ادھوری بات

ادھوری بات کہتا ہے
ادھوری بات سنتا ہے
نہ جانے کب فراغت ہو
ادھوری بات پوری ہو

ہائے لڑکیاں

لڑکیاں آئیڈیل ازم کے چکر میں
اچھے رشتے ٹھکراتی ہیں
دھیرے، دھیرے
عمر بڑھنے پر
کسی بوڑھے برگد کے سائے تلے
ستاتی ہیں

اصل ٹھکانا

مجھے شہرِ خموشاں سے
یہی پیغام ملتے ہیں
کسی بھی دیس میں ٹھہرو
کہیں بھی جا کے بس جاؤ
یہیں پہ لوٹ آنا ہے
یہیں اپنا ٹھکانا ہے

کاوش: افتخار شوق، میاں چنوں

آہ فریادِ بکرا

دبلی پتلی ٹانگوں سے آپ کو اس ناتواں بکرے کا سلام عرض ہے۔ کیا کہانی سناؤں میں بھلا اپنی......

پڑوس کی خالہ رخسانہ میری چاروں ٹانگیں فریزر میں دبائے بیٹھی ہیں۔ جس کی وجہ سے عید کے دن جو میری ڈائریکٹ فلائٹ جنت کو تھی وہ ملتوی ہو گئی۔

خالہ ذکیہ کے فریزر میں سب کی ملا کر چھ رانیں پڑی ہیں جبسِ بے جا میں۔ جب تک ان کی میریڈ بیٹیاں میکے نہیں آئیں گی تب تک وہ میری تکہ بوٹی نہیں کریں گی اور میں ایسے ہی دہائیاں دیتا رہوں گا۔

سکینہ بجو کے گھر میری سری پر کھیاں بھنبھنا رہی ہیں، میں اور میرے ساتھی ابھی تک ہم جنت میں نہیں پہنچے۔ خدارا میرا گوشت استعمال میں لاؤ اور میری تکلیف معاف کرو۔

منجانب...... قربانی کا بکرا

از: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

غزل

خواہشوں سے نفس جو آزاد ہے
اصل میں انسان وہ فولاد ہے
ابلیس کو شرمندہ جس نے کردیا
حضرتِ آدمؑ کی یہ اولاد ہے
قتل کرتا ہے جو بچوں کو یہاں
آدمی کی شکل میں جلاد ہے
اب کوئی نہر نکالے تو ذرا
آج زندہ گر کوئی فرہاد ہے
جس نے بھی ماں، باپ کو ہے دکھ دیا
دین و دنیا اس کا سب برباد ہے
اے خدا تو دل میں اپنا خوف دے
بس تری خانم کی یہ فریاد ہے

کلام: فریدہ خانم، لاہور

غزل

جو تم سے ربط قائم تھا دوبارہ ہو نہیں سکتا
ہوئے ہیں مسئلے پیدا گزارہ ہو نہیں سکتا
وفا کی راہ میں اس نے جفا کا درد چھیڑا ہے
جفا اب ہم نبھائیں گے ادھارہ ہو نہیں سکتا
یہ دنیا ساتھ ہے اس کے جو سب کا مان رکھتا ہو
جو اپنا بن نہیں پایا ہمارا ہو نہیں سکتا
اگر ہم جان جائیں عشق کی سچی حقیقت کو
تو ہم کو دین و دنیا میں خسارہ ہو نہیں سکتا
نزہی ہم کو مدینے کا سفر درپیش ہو جائے
کہ ان کی ذات سے بڑھ کر سہارا ہو نہیں سکتا

کلام: نازیہ نزہی، نوشہرہ کینٹ

دوستی

☆ اچھا دوست حاصل کرنے کے لیے پہلے خود اچھے بنو۔

☆ دوستی کرنے کے بعد دوست کو سچا پیار اور خلوص دو اس سے کبھی دھوکا اور بے وفائی نہ کرو۔

☆ دوستی کی بنیاد ہی اعتماد ہے۔

☆ دوست سے کبھی ایسی بات نہ کرو کہ اس کا دل ٹوٹ جائے۔

☆ اچھے دوست کی دوستی ایک چھت کے مانند ہے جو آپ کو دھوپ اور بارش سے بچاتی ہے۔

☆ مخلص دوست جتنی بار روٹھے اسے مناؤ کیونکہ اچھا دوست کبھی نہیں ملتا۔

☆ دوست مخلص ہو اور ناراض ہو جائے تو اس کی خاطر آنسو بہاؤ کہ تمہارے آنسو اس کی دہلیز تک پہنچ جاتے ہیں۔

☆ پُرخلوص مسکراہٹ دوستی کی ابتدا ہے۔

از: نگہت غفار، کراچی

غزل

آجاؤ اپنے شہر کی تحقیر مت کرو
تم غیر کی فضاؤں کی توقیر مت کرو
لوٹ آؤ اپنے شہر میں تاخیر مت کرو
بچپن کی یادگار کی تحقیر مت کرو
مانا کہ زندگی نے کبھی سُکھ نہ دیا پر
اپنے دکھوں کی ایسے تو تشہیر مت کرو
ان سے فضا میں رنگ ہوا میں کھنک سی ہے
اڑتے ہوئے پرندوں کو زنجیر مت کرو
پڑھ کر کسی کی آنکھ کے تارے لٹاؤ مت
اپنے دکھوں کو ایسے تو تحریر مت کرو
ڈھا کر کسی کے پیار کے تم تاج محل کو
اس پر جہان اپنے کی تعمیر مت کرو
یہ کائنات ساری تمہارے لیے کنول
کس نے کہا ہے تم کو کہ تسخیر مت کرو

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

غزل

اب تک اسی موڑ پر کھڑا ہے محبت کا استعارہ دل
آگے جا کے کچھ دیر رکی میں پر اس نے کہاں پکارا دل
سرد رُتوں کی تنہائی جس کو پاگل کر دیتی ہے
اداسی کی کہر میں لپٹا چاند کے پاس ستارہ دل
وہ بولیں تو سچی باتیں، ہم بولیں تو جھوٹ ہوا
ہمارے آگے ڈٹ کے کھڑا ہے دیکھو آج ہمارا دل
بکھرے گیسو پھیکی رنگت دیکھی تو درپن بولا
تیرا روپ تھا چاندی سونا آنکھیں جھیل کنارہ دل
اس کو دیکھے اب مدت گزری اکثر ہی کہتا تھا
اِک دن تم کو نہ دیکھوں تو ہوتا نہیں گزارہ دل
عقل کی سب دلیلیں ہیں رد بھلانے کے وعدے سب جھوٹے
وہ کہے اور ہم نہ مانیں تیرا ایک اشارہ دل
سچے موتی جیسے لوگ چاہ نے تیری رول دیے
سونا مٹی بنجر کر دی عشق نے یوں اجاڑا دل
تیری چاہ میں سب کچھ کھویا کیسا یہ کہرام مچا
چپ کی مُکل مارے بیٹھا دیکھ ذرا ہمارا دل

کاوش: ام ثمامہ، جھڈو سندھ

ماں کا دودھ پینے والے بچے دمے سے محفوظ رہتے ہیں

امریکی ماہرین نے کہا ہے کہ ماں کا دودھ پینے والے بچے دمے کے مرض سے محفوظ رہتے ہیں۔

امریکی سائنس دانوں نے ایک سے چار سال تک کے بچوں پر تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ماں کا دودھ پینے والے بچے دیگر بچوں کی نسبت ہر حال میں بہتر پائے گئے ان کی نشوونما بھی زیادہ تیز رفتاری سے ہونے کا پتا چلا اور ان میں سانس کی مختلف بیماریوں کے خلاف زیادہ قوتِ مدافعت پیدا ہوئی۔ ان بچوں میں بیماریوں کے خلاف لڑنے کی طاقت بازار کا دودھ پینے والے بچوں سے کہیں زیادہ پائی گئی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بچوں کے لیے یوں تو ماں کے دودھ کے متعدد فوائد کا ذکر کیا گیا ہے اور ہزاروں سال سے اسے بچے کے لیے ایک مکمل غذا قرار دیا جاتا ہے مگر سانس کی بیماریوں کے خلاف خصوصی مزاحمت بھی پیدا ہوتی ہے چاہے ماں کی صحت بھی قابلِ رشک نہ ہو۔ ان بچوں میں زیادہ طاقت اور بیماریوں کے خلاف لڑنے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

مرسلہ: ایمان چوہدری، فیصل آباد



☆غزالہ طارق......سرگودھا
نہ ڈگمگاتے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
کسے لگاتے گلے اور کہاں، کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ و گل ہیں صبا کے رستے میں

☆جمیلہ بلوچ......لوہی، بلوچستان
ہم نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں
صرف دھندلاتے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا کس سے خفا یاد نہیں

☆مسز نگہت غفار......کراچی
کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو
پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائگاں کوئی پل نہ ہو

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص
ہم کب تک پیت کے دھوکے میں
تم کب تک دور جھروکے میں
کب دید سے دل کو سیری ہو
اِک بار کہو تم میری ہو

☆جبیں ہاشمی......بھیرہ
اگر طوفاں میں کشتی ڈوب جاتی تو غنیمت تھا
مگر ساحل پر آ کر ڈوبتی دیکھی نہیں جاتی

☆حسینہ ممتاز خان......اسلام آباد
نہ دولت سے نہ دنیا سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ
گریہ کیا تو آنکھ میں بھرتا گیا دھواں
دل نے متاع درد کو جلنے نہیں دیا
نظروں سے اپنی آپ ہی گرتے گئے ہیں لوگ
اے عشق تو نے ہم کو سنبھلنے نہیں دیا

☆فریدہ افتخار......اسلام آباد
یاد کرتی ہیں تمہیں آبلہ پائی کی رتیں
کس بیاباں میں ہو، بولو مرے تنہا یارو

☆ماہ نور خان...... بہارہ کہو
آئینہ پھیلا رہا ہے خود فریبی کا مرض
ہر کسی سے کہہ رہا ہے آپ سا کوئی نہیں

☆ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ
زمیں پہ چل نہ سکا آسمان سے بھی گیا
کٹا کے پر وہ پرندہ اڑان سے بھی گیا
تباہ کر گئی پکے مکان کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا

☆نگہت اعوان......سرگودھا
کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حُسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

☆جبیں نیاز......ملتان
پانی کی ضرورت ہے محبت کے شجر کو
پتھر پہ کبھی پیڑ اگائے نہیں جاتے

☆سیدہ جیا عباس......تلہ گنگ
خامشی بے سبب نہیں ہوتی
درد آواز چھین لیتا ہے

☆دل جان بیگم......صوابی
نیند سوتی ہے میرے بستر پر
اور میں رات بھر ٹہلتا ہوں

☆شائلہ انجم......سرگودھا

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے
تیرے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

☆ایمن رانی......کمالیہ

بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا بگڑ سکتا
ہوا کا زور تو چڑیوں کے آشیاں تک تھا
مجھے زمیں کے مسافر کہاں شکست دیتے
مرا ضمیر بلندی میں آسمان تک تھا

☆نگہت غفار......کراچی

نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح کوئی ڈھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت، وقت کی بات ہے، تجھے زندگی بتائے گی

☆ناہید......آزاد کشمیر

میری خوبی پہ رہتے ہیں یہاں اہلِ زباں خاموش
میرے عیبوں کا چرچا ہو تو گونگے بول پڑتے ہیں

☆فرح طاہر......ملتان

کون اب روز، روز یاد کرے
ہم اسے حفظ کر کے بیٹھے ہیں

☆تسنیم......جہلم

ادھوری باس، ادھوری آس، ادھوری ذات ہے میری
جو تم سوچو، جو تم چاہو، مری تکمیل ہو جائے

☆مسز یٰسین......لیہ

اسی کے در پر سکون ملتا ہے
اسی کی عبادت سے نور ملتا ہے
جو جھک گیا اللہ کی بارگاہ میں
اسے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

تمام جذبوں سے معتبر ہے
اداس آنکھوں سے مسکراتا

☆سعیدہ بانو......مری

ضبط، تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زبان ہیں ہم

☆حرا قریشی......ملتان

نہ میری آنکھ، نہ قلب و جگر میں رہتا ہے
وہ درد بن کے مرے آدھے سر میں رہتا ہے

☆سلمیٰ شاہین......حیدرآباد

تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

☆عرشیہ جنید......کراچی

بتاؤ ان سے کہاں رابطہ کیا جائے
کبھی جو ہم کو ضرورت ہو بات کرنے کی

☆ثمینہ کوکب......جہلم

تشنگی، تشنگی ارے توبہ
قطرے، قطرے کو ہم ترستے ہیں
اے خداوندِ کوثر و تسنیم
تیرے بادل کہاں برستے ہیں

☆مہوش پونم......ملتان

تلاش میری تھی اور بھٹک رہا تھا وہ
دل میرا تھا اور دھڑک رہا تھا وہ
پیار کا تعلق عجیب ہوتا ہے
پیاس میری تھی اور سلگ رہا تھا وہ

☆رفیعہ ابدالی......کراچی

برسیں آنکھیں جس کی یاد میں برسات کی طرح
وہ بدل گیا میرے حالات کی طرح
حال جیتے جی انسان کا کوئی پوچھتا نہیں
پھر میّت پہ کیوں آتے ہیں سب بارات کی طرح

☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤالدین

جھولی میں ڈال دیجیے رخسار و لب کی بھیک
چلیے کسی غریب کو خوشحال کیجیے

☆درخشاں ساگر......کہروڑ پکا

اس قدر رنج نہ دے جن کو اٹھا بھی نہ سکوں
ورنہ دنیا میں تیرے ظلم کی شہرت ہو گی

منتخب غزلیں

اعلیٰ شعری ذوق رکھنے والے ہمارے پیارے قارئین کے لیے اس ماہ نامور شاعر اور ممتاز ادیب احمد ندیم قاسمی کے یومِ پیدائش کے حوالے سے ان کی غزلیات سے انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اٹھتے ہیں بگولے کیا کیا

عشق معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیلام
ورنہ ادراک نے دکھلائے تھے رستے کیا کیا

یہ الگ بات کہ برسے نہیں گرجے تو بہت
ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُمڈے کیا کیا

آگ بھڑکی تو در و بام ہوئے راکھ کے ڈھیر
اور دیتے رہے احباب دلاسے کیا کیا

لوگ اشیا کی طرح بک گئے اشیا کے لیے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

لفظ کس شان سے تخلیق ہوا تھا لیکن
اس کا مفہوم بدلتے رہے نقطے کیا کیا

اک کرن تک بھی نہ پہنچی مرے باطن میں ندیم
سرِ افلاک دمکتے رہے تارے کیا کیا

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بُجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

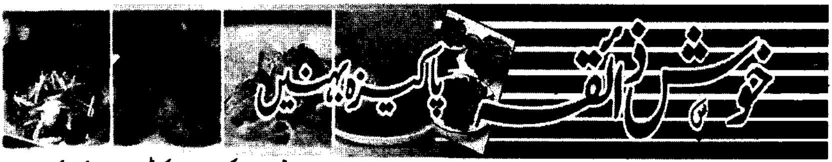
آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یا رب
ہو اِذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں

20 نومبر 1916ء تا 10 جولائی 2006ء



بیف اسٹیک ودساتے بیل پیپرز

اشیا: بیف کے بوٹے، اسٹیک کے لیے۔2 عدد (کٹ لگالیں) آئل، 2 کھانے کے چمچ لہسن، ادرک پیسٹ، 1 چائے کا چمچ۔ سرکہ، 1/2 کھانے کا چمچ۔ کٹی کالی مرچ، 1 چائے کا چمچ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز، 1/2 عدد۔ لیموں کا رس، 1 کھانے کا چمچ۔ مکھن، 1/4 کھانے کا چمچ۔

سوس کے لیے:

پی نٹ بٹر، 1 کھانے کا چمچ۔ گارلک مایوسوس، 1 کھانے کا چمچ۔ وائٹ پیپر، 1 چائے کا چمچ۔

ساتے ویجی ٹیبل کے لیے:

پیلی شملہ مرچ، 2 عدد۔ سرخ شملہ مرچ، 2 عدد۔

ترکیب: بیف پر لہسن، ادرک پیسٹ، کٹی کالی مرچ، سرکہ اور نمک لگا کر دو گھنٹے کے لیے ریفریجریٹر میں رکھیں۔ اب پین میں آئل گرم کر کے بیف اسٹیک کو دونوں طرف سے فرائی کریں۔ اچھی طرح سے گلانے کے لیے دو سے تین منٹ کے لیے گرل پین میں گرل بھی کرلیں۔ شملہ مرچوں اور پیاز کو باریک سلائسز میں کاٹ لیں۔ اب مکھن، پین میں گرم کریں۔ ساتھ ہی لیموں کا رس اور نمک بھی ڈال دیں۔ سوس کے لیے تینوں اجزا کو اکٹھا بیٹ کرلیں۔ سرونگ پلیٹ میں تیار اسٹیک رکھیں پھر کٹی ہوئی ویجی ٹیبلز ڈالیں اور سوس کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو

ڈھابا گوشت

اشیا: مٹن، 1/2 کلو بغیر ہڈی کا۔ مکھن، 4 کھانے کے چمچ۔ سبز الائچی پاؤڈر، 1/4 چائے کا چمچ۔ دہی، 5 کپ۔ پانی، ہڈیوں کی یخنی 1 کپ۔ سبز الائچی، 8 عدد۔ بڑی الائچی، لونگ، 6 عدد۔ سونف پاؤڈر، 1/2 کھانے کے چمچ۔ ادرک پاؤڈر، 1/2 کھانے کا چمچ۔ پیاز، 2 عدد (فرائی کر کے پیسٹ بنالیں) لہسن پیسٹ، 1 کھانے کا چمچ۔ (1/4 کپ پانی میں مکس کرلیں) پودینہ (پتے)، 1/2 کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: مٹن ہیمر کی مدد سے کوٹیں یہاں تک کہ اس کا رنگ بدل جائے۔ اب اس میں مکھن اور سبز الائچی پاؤڈر مکس کر کے مزید کوٹیں یہاں تک کہ پیسٹ کی طرح ہوجائے۔ ہتھیلی پر پانی لگا کر اس پیسٹ کی بالز بنالیں پھر دہی میں پانی ڈال کر اچھی طرح پھینٹیں اور مسلسل ہلاتے ہوئے تیز آنچ پر پکائیں۔ جب ابلنے لگے تو آنچ ہلکی کر کے اتنا پکائیں کہ آدھا رہ جائے۔ اب اس میں میٹ کی چپٹی بالز، گھی اور یخنی ڈال کر تیز آنچ پر ابالیں۔ پھر سبز اور بڑی الائچی لونگ، سونف اور ادرک پاؤڈر ڈال کر ڈھک دیں اور 10.12 منٹ تک ابلنے دیں۔ اب لہسن والا پانی، نمک اور پیاز کا پیسٹ شامل کر کے اتنا پکائیں کہ گریوی گاڑھی ہوجائے اور میٹ بالز گل جائیں۔ آئل چھوڑنے لگے تو چولھے سے اتارلیں۔ پودینہ چھڑک کر سرو کریں۔

یہ نئی طرح کی ڈش آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، دبئی

فش ویجی ٹیبل سوپ

اشیا: مچھلی، بغیر کانٹے کی 500 گرام، آلو (چوکور ٹکڑے کاٹ لیں)، ایک عدد۔ پیاز، (باریک کاٹ لیں) 1 عدد۔ مکھن، 50 گرام۔ سیلیری، 1 ڈنٹھل۔ (چھلکا اتار کر باریک کاٹ لیں) آٹا، 2 کھانے کے چمچ۔ مسٹرڈ پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ ووسٹر شائر سوس، 1/2 چائے کا چمچ۔ کارن فلور، (ایک کپ پانی میں گھول لیں) 2 کھانے کے چمچ۔ تازہ پارسلے (کٹا ہوا) 1/2 کپ۔ کریم، 2 کھانے کے چمچ۔ نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، حسب ذائقہ۔

مچھلی کو ایک فرائنگ پین میں رکھ کر اتنا پانی ڈال کر ابالیں کہ مچھلی ڈوب جائے۔ ابال آجائے تو آنچ کم کر کے 8 منٹ تک پکائیں۔ چھان کر مچھلی کی یخنی الگ رکھ لیں۔ اس کے بعد مچھلی کی کھال اتار کر ایک طرف رکھ دیں۔ آلو، سیلیری اور پیاز ایک پین میں ڈالیں اور 1-1/2 کپ مچھلی کی یخنی ڈال دیں پھر ابالیں، ابال آنے پر آنچ کم کر کے سبزیاں گل جانے تک پکائیں۔ اسی دوران ایک بڑے سوس پین میں مکھن پگھلائیں۔ آٹا، مسٹرڈ پاؤڈر اور ووسٹر شائر سوس ڈال کر

اچھی طرح چلائیں۔ 1 منٹ تک پکائیں تھوڑا، تھوڑا کر کے 2 کھانے کے چمچ کارن فلور شامل کریں۔ اچھی طرح مکس ہونے تک چلائیں اور یہ آمیزہ ابلنے اور گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اب سبزیاں اور یخنی ڈال دیں۔ اس کے بعد پارسلے اور مچھلی ڈالیں۔ دھیمی آنچ پر پانچ منٹ تک پکائیں۔ کریم، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر شامل کر کے گرما گرم سرو کریں۔

مرسلہ: بتول رضا، جرمنی

رینبو بالز ود رائس

اشیاء: مرغی کا قیمہ، ایک کلو۔ پالک، ایک کپ۔ آلو، 1/2 کپ۔ لال مرچ پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ دھنیا پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ پیاز، چار عدد۔ (2 عدد پیاز کو باریک چوپ کرلیں دو عدد پیاز کے سلائس کاٹ لیں) ادرک، لہسن پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ ہرا دھنیا، 1 گٹھی۔ ہری مرچیں، 6، 4 عدد۔ لونگ، 8 عدد۔ دار چینی، 5، 6 عدد۔ ثابت سیاہ مرچیں، 25 عدد۔ انڈے، 2 عدد۔ بڑی الائچی، 4 عدد۔ سبز الائچی، 4 عدد۔ بادام، 2 کھانے کے چمچ۔ ہری پیاز، 2 عدد۔ (ہرے پتے سمیت چوپ کرلیں) پستے، 2 کھانے کے چمچ۔ کاجو، 2 کھانے کے چمچ۔ خشخاش، 2 چائے کے چمچ۔ چنے (بھنے ہوئے) 4 کھانے کے چمچ۔ مکھن، حسب ضرورت۔ ہرا رنگ (فوڈ کلر) چند قطرے۔ میتھی دانہ، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، 1/4 چائے کا چمچ۔ کریم، حسب ضرورت۔ پنیر، (کدوکش) 1 کپ۔ کری پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ چاول (بھگودیں) تین کپ۔ ٹماٹر، 2 عدد۔ کشمش، 2 کھانے کے چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔ گھی، حسب ضرورت۔ ثابت دھنیا، 1 کھانے کا چمچ۔ مرغی کی یخنی، حسب ضرورت۔ لہسن (چوپ کیا ہوا) 2 کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب: بلینڈر میں لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ہری مرچیں، ادرک، لہسن پیسٹ، خشخاش، چنے، 15 عدد ثابت سیاہ مرچیں، 2 عدد بڑی الائچی اور 2 عدد سبز الائچی ڈال کر باریک پیس کر قیمے میں ملا دیں۔ نمک اور 1 انڈا بھی شامل کر دیں۔ آلو ابال کر چھیل لیں اور اسے میش کر کے اس میں ہرا دھنیا، چوپ کی ہوئی پیاز اور 1 انڈا شامل کر دیں۔ پالک کو ابال کر نچوڑ کر پیس لیں۔ سوس پین میں 2 کھانے کے چمچ گھی گرم کر کے اس میں لہسن اور سلائس کی ہوئی پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں مکھن، ہرا رنگ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر چمچہ چلائیں پھر پالک ڈال کر خوب اچھی طرح بھونیں۔ پنیر کا تھوڑا سا آمیزہ لے کر ہتھیلی پر پھیلائیں اس کے درمیان میں بادام، پستہ، کاجو اور کشمش کی مناسب مقدار رکھ کر چھوٹے، چھوٹے کوفتے بنا کر فریج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔۔۔ پھر پالک کا آمیزہ ان پنیر کے کوفتوں پر چڑھا کر فریج میں دوبارہ جمنے کے لیے رکھ دیں۔ آخر میں قیمہ کا آمیزہ کوفتوں پر چڑھا کر فریج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے کوفتوں کو درمیانی آنچ پر ڈیپ فرائی کرلیں۔ ایک پتیلی میں مکھن اور گھی گرم کریں اس میں لونگ، ثابت دھنیا، دار چینی، میتھی دانے، 2 بڑی الائچی، 2 سبز الائچی اور 10 ثابت سیاہ مرچ ڈال کر کڑکڑائیں۔ ہری پیاز اور کری پاؤڈر ڈالیں۔ ٹماٹر ڈال کر بھونیں پانی نتھار کر چاول ڈالیں نمک اور حسب ضرورت یخنی ڈال کر چاول پکائیں۔ چاولوں کو سرونگ ڈش میں نکال لیں اور فرائی کیے ہوئے کوفتوں کو درمیان میں سے کاٹ کر اس کے اوپر رکھ کر سیٹ کریں۔ مزیدار رینبو بالز ود رائس تیار ہے کریم سے گارنش کر کے گرما گرم سرو کریں۔

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان

سوئیٹ میتھی مونگ پینڈیاں

اشیاء: میتھی دانہ، 125 گرام۔ ثابت مونگ، آدھا کپ۔ دودھ، 500 ملی لیٹر۔ گھی، 1 کپ۔ آٹا، آدھا گرام۔ گڑ، 375 گرام پیس لیں۔ ناریل، (پسا ہوا) 1/4 کپ۔ بادام، (باریک کٹے ہوئے) 1/4 کپ۔ کشمش، 1/4 کپ۔ مکھانے، 1/2 کپ۔ چاندی کے ورق، (تمام میوہ پیس لیں)

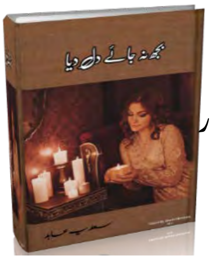
ترکیب: میتھی دانہ اور دال کو بالکل باریک پاؤڈر کی شکل میں پیس لیں اب اس میں پاؤڈر کی..... تھوڑی سی مقدار بچا کر دودھ میں پاؤڈر ڈال کر رات بھر کے لیے چھوڑ دیں۔ ایک نان اسٹک پین میں 1 کھانے کا چمچ گھی گرم کریں اور یہ دودھ والا آمیزہ ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ چمچ مسلسل چلائیں اور اتنا پکائیں کہ یہ بریڈ کرمبز کی طرح نظر آنے لگے۔ ایک طرف رکھ دیں۔ دوسرے پین میں باقی گھی گرم کر کے دھیمی آنچ پر آٹا بھونیں۔ باقی بچا ہوا میتھی پاؤڈر، بادام، مکھانے، ناریل اور کشمش کے ساتھ گڑ بھی ڈال دیں۔ اب دونوں آمیزے کو چھوٹے لڈوؤں کی شکل دیں اور چاندی کے ورق سے سجا کر سرو کریں۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد



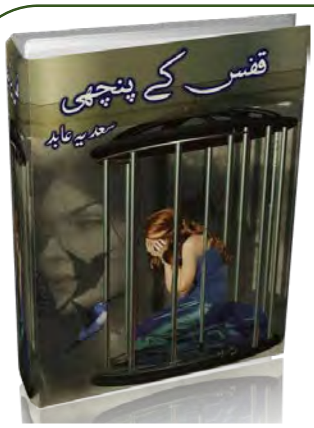
عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



بُجھ نہ جائے دِل دیا

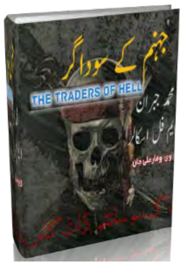
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



قفس کے پنچھی

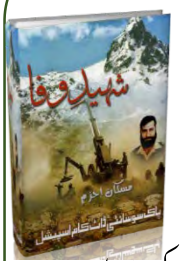
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، کتابی شکل میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔



بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆سیدہ علیشاہ، بہاول پور

سوال: اگر میں ان کی رشکِ قمر ہوں تو وہ بھلا میرے کیا ہوئے؟

جواب: قمر ہوئے ناں!

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ناعمہ تحریم، ملیر ہالٹ، کراچی

سوال: جو لوگ حسد کی بھٹی میں جلتے ہیں ان کا علاج بتائیں؟

جواب: جل بھُن کر مرجاتے ہیں تو علاج کی ضرورت۔

☆فرخندہ جعفری، گجرات

سوال: سانپ کے ڈسنے اور انسان کے ڈسنے میں کیا فرق ہے؟

جواب: سانپ کا ڈسا تو قابلِ علاج مگر انسان کا ڈسا ناقابلِ علاج......زخم قبر تک ساتھ جاتا ہے۔

سوال: بعض لوگ کسی کا دل دُکھا کر اور طعنہ زنی کر کے خوش کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: ان کے ڈی این اے میں یہی پیوست ہوتا ہے، کیا کریں......

سوال: بخیل اور کنجوس میں کیا فرق ہے؟

جواب: آپ نے تو ایک ہی صفحے پر تبصرہ اور سوال لکھ کر بھیج دیے یہ کنجوسی نہیں؟

☆نسرین منظر، کراچی

سوال: پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟

جواب: تم ابھی تک کیا کر رہی ہو محنت یا پھر قسمت کا انتظار۔

سوال: آئینہ دیکھ کر خود سے باتیں کرتی ہوں اور ساتھ، ساتھ گنگناتی رہتی ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: آئینے پر زیادہ دھیان دوگی تو ڈر جاؤ گی، گنگنا کر موڈ جو صحیح کرتی ہو۔

سوال: انسانیت کی معراج کیا ہے؟

جواب: بندگیِ پروردگار و اطاعت گزاریِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

سوال: یہ زندگی افسانہ ہے، ناول ہے یا ناولٹ؟

جواب: طویل......طویل ترین ناول جو محشر پر ہی تمام ہوگا۔

☆ماہ رخ، حیدر آباد

سوال: سفر کے دوران اکثر گاڑیوں میں لکھا ہوتا ہے۔ اپنے سامان کی خود حفاظت کریں اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یعنی دوسروں کے سامان کو بھی اپنا ہی سمجھیں۔

سوال: حُسن کو چاند کیوں کہتے ہیں؟

جواب: تمہیں کیوں اعتراض ہے تم حسن کو سورج کہہ لو، حسن کو کیا فرق پڑے گا۔

سوال: ہر شوہر کو اپنی بیوی سے اور ہر بیوی کو اپنے شوہر سے شکایت کیوں ہوتی ہے؟

جواب: شکایت ہر رشتے کی مجبوری ہے۔

☆جبیں نیاز، ملتان

سوال: باجی یہ مہنگائی بھلا کون بڑھاتا ہے؟

جواب: جواب جان کر مرواؤ گی کیا لڑکی......

☆عرشیہ جنید، کراچی
سوال: مجھے دو اور دو پانچ کرنے ہیں ......طریقہ بتادیں؟
جواب: تم زیادہ کے چکر میں ہو ایسا کرو 2 اور 2 بائیس کرلو فائدے میں رہوگی۔
☆فلک بنت عبدالندیم، حیدرآباد
سوال: حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ کب دلوائی جاتی ہے؟
جواب: پڑوس کی شادی میں اپنے رشتے داروں کو بلا کر۔
سوال: آئیں بائیں شائیں کب کیا جاتا ہے؟
جواب: جب ابا جان رزلٹ کے بارے میں پوچھیں۔
سوال: یہ بزرگ لوگ ہر وقت اپنی جوانی کے قصے کیوں سناتے ہیں؟
جواب: تو تمہارا کیا خیال ہے بعد از مرگ کے قصے ابھی سے بتادیں۔
☆نسرین یاسین، لطیف آباد
سوال: دنیا کے دو ایسے ہتھیار جو ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہیں؟
جواب: معلوم تو ہے تمہیں، دو چھٹانک کا گوشت کا لوتھڑا جسے بیچارے دانتوں کے بیچ رہنا پڑتا ہے......اور سب کچھ کہتی آنکھیں جو قیامت سی ڈھاتی ہیں۔
سوال: کوّے کو کبوتر کی طرح خط دے کر کیوں نہیں بھیجا جاتا؟
جواب: سیانا ہے، راستے ہی میں پڑھ پڑھا کر پھاڑ دے گا۔
سوال: مرد اتنے جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟
جواب: کن، کن بیچاروں نے تم سے جھوٹ بول دیا ذرا نام اور حلیہ تو بتانا۔
☆نرمین سرھیو، سندھ
سوال: منافق لوگوں کی چٹنی بنانے کا آسان طریقہ؟
جواب: خلوص کی چاشنی میں کئی بار جوش دے لو پھر اسے محبت کے پٹے سے باریک پیس لو لاجواب چٹنی تیار ہے۔
سوال: انسان کی منفی سوچ پر تالا لگانا ہے کہیں چابی آپ نے تو نہیں اٹھالی ہے؟
جواب: ایسے تالے کی کوئی چابی نہیں ہوا کرتی، اسے آگ لگا کر سیل بند کیا جاتا ہے۔
سوال: عورتوں کو بھلا ناقص العقل کیوں کہا جاتا ہے؟
جواب: اوپر کے دو سوالوں کی بنا پر...... ہاہاہا......
☆ماہ نور خاں، بہارہ کہو
سوال: دل کی سنو مگر دو ماغ کی......کا کیا مطلب ہوتا ہے؟
جواب: بہن یہ ان سے کہا جاتا ہے جن کا دماغ بھی ہوتا ہے......تم کیا کروگی جان کر۔
سوال: لوگ جل کر کباب ہونے کے بجائے کھل کر گلاب کیوں نہیں ہوتے؟
جواب: یہ تو اپنی اپنی جگہ کی بات ہے وہ چولھے پر بیٹھے ہیں یا باغ میں کھڑے ہیں۔
سوال: دیرینہ خواہش کی تکمیل پر بے اختیار آنسو کیوں نکل پڑتے ہیں؟
جواب: تشکر و خوشی کے......آنسو ہی تو اصل ہم دم ہیں۔
سوال: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟
جواب: مرکر......ابدی زندگی میں۔
☆نسرین......حیدرآباد
سوال: کون سی بات شوہروں کو خوش کردیتی ہے؟
جواب: ایک شوہر کو یا سب شوہروں کو وضاحت کردو۔

☆☆☆



آج کل میک اپ کا استعمال اس قدر عام اور ضروری ہوگیا ہے... لگتا ہے کہ اب کوئی بھی خاتون اس کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر تحقیق نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ کاسمیٹکس میں شامل کیمیائی اجزا جلد سے متعلق پیچیدہ مسائل پیدا کرسکتے ہیں۔ معیاری اور مہنگی اشیا (آرائشِ حسن) ان خطرات کو قدرے کم کرتی ہیں۔

میک اپ ضرور کریں مگر ایک تو معیاری اشیا استعمال کریں دوسرے جلد کی صفائی اور نگہداشت بھی کریں۔

کلینزنگ

میک اپ سے پہلے اور بعد میں چہرے کو کسی صابن سے دھونے سے گریز کریں۔ اس کے بجائے پھولوں اور پھلوں کا اعلیٰ تیل یا عرق یا بغیر خوشبو کا کلینزر استعمال کریں جو آپ کی جلد کے لیے مناسب ہو۔ کلینزنگ کے لیے ہمیشہ نرم وملائم ٹشو یا ململ کا کپڑا استعمال کریں۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ دن کے اختتام پر آپ کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہو۔ اس لیے میک اپ صاف کیے بغیر کبھی سونے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مسام بند ہوجاتے ہیں۔ ماہر سے ماہر بیوٹیشن بھی آپ کو یہی مشورہ دیں گی۔ اگر آپ وقت بچانے کے لیے ایسا کررہی ہیں تو آپ کو اس کی بھاری قیمت داغ دھبوں اور پھیکی رنگت کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی۔ اگر آپ کے پاس وقت نہیں تو آپ اسکن کیئر وائپس استعمال کرسکتی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ کوئی بھی چیز خریدتے وقت اس کے اجزا کی فہرست ضرور دیکھ لیں۔ نامیاتی اجزا پر مشتمل کلینزر خریدیں۔

میک اپ سے پہلے کلینزر کا استعمال جلد پر پالش کا کام کرتا ہے اور جلد ایسی نظر آتی ہے جیسے آپ نے فیشل کیا ہو، اگرچہ کاسمیٹکس کی جدید دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر نتائج کی حامل کلینزنگ کریمیں دستیاب ہیں تاہم انہیں ہر کوئی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اگر آپ چاہیں تو ذیل میں دیے گئے کلینزنگ کے گھریلو نسخے استعمال کرسکتی ہیں۔

چکنی جلد کے لیے...... لیموں یا سنگترے کا عرق

خشک جلد کے لیے...... عرقِ گلاب یا عرقِ صندل

نارمل جلد کے لیے..... سونف، لیموں، گلاب اور صندل کا عرق

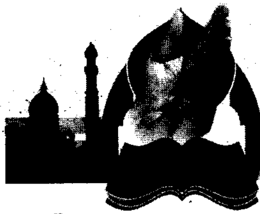
حساس جلد کے لیے...... گلاب اور صندل کا عرق

ایک بہترین نسخہ یہ بھی ہے کہ ایک پیالی نیم گرم پانی میں ایک قطرہ لیموں کا ڈالیں۔ فلالین کا ٹکڑا لے کر اس پانی میں بھگوئیں اور چہرے پر اتنی دیر رکھیں کہ آپ تازگی محسوس کرنے لگیں۔ یہ عمل ٹونر اور کلینزر دونوں کا کام دے گا اور جلد جان دار، صاف اور چمک دار ہوجائے گی۔

ٹوننگ

ٹوننگ چہرے کے کھلے مساموں کو صاف کرتی اور انہیں میک اپ کے اثرات سے محفوظ رکھتی ہے، نیز جلد کو تازہ دم اور تندرست رکھتی ہے مگر اس کی زیادتی جلد کو خشک کرسکتی ہے، اس لیے اسے ہفتے میں ایک بار استعمال کریں۔ ایک اچھا ٹونر جلد کو صاف اور نرم بھی کرتا ہے۔ چہرے پر برف کے پانی کے چھینٹے بہترین گھریلو ٹونر ہے، جو جلد کو طویل عرصے تازہ دم رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف چہرے پر بلکہ طبیعت پر بھی خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس کا فیشل چہرے پر خون کی گردش بڑھا کر سرخی لاتا ہے، مگر اسے ہفتے میں ایک مرتبہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ عرق گلاب کو بھی مؤثر ٹونر سمجھا جاتا ہے۔ چار چائے کے چمچ لیموں کا رس اور چار چمچ گلاب کا عرق ملا کر بوتل میں رکھ لیں۔ اسے چہرے پر لگائیں پھر دیکھیں اس کا اثر......

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

وسعتِ رزق کے لیے

خواہشات لامحدود ہو جائیں تو اپنا رزق ہمیشہ کم لگتا ہے۔ پروردگار تو ہر بندے کو اس کی ضرورت کا رزق ضرور مہیا کرتا ہے۔ یہ ہم ہیں جو ناشکری کیے جاتے ہیں ربِ غفور نے تو زندہ رہنے کے لیے اور عبادت اور حلال کاموں کے لیے طاقت بھر کا رزق دیا تو ہم نے تین وقت کے بجائے چھ وقت کھانا شروع کر دیا۔ چار جوڑ لباس ضرورت کے لیے کافی مگر چالیس جوڑ کپڑے بھی کم لگے۔ اس طرح مخلوقِ خدا کی مدد کے لیے دل آمادہ نہ ہو سکا پھر تو اپنی روزی روزگار تو کم ہی لگے گا ناں......

اللہ پاک نے صدقہ و خیرات، زکوٰۃ کے ذریعے ہمارے رزق کو فراواں کرنا چاہا مگر ہم نے اسے اپنے تک ہی محدود کر لیا اور تنگیِ رزق کی شکایت اپنا معمول بنا لیا۔ بہر حال اپنے اعمال پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کیا ایسے افعال و اعمال تو نہیں جو دعاؤں کی قبولیت میں رکاوٹ اور تنگیِ رزق کا باعث ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو صحیح طور پر سنت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلنے کی توفیق عطا کرے الٰہی آمین۔

وسعتِ رزق کے لیے گھر میں سلام کو عام کریں۔ باہر سے آنے والا بہ آواز بلند سلام کرے۔ ہر نماز کے بعد تین دفعہ درود ابراہیمیؑ پڑھ کر سورۂ قریش پانچ بار پڑھیں اور پھر درود پاک پڑھیں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ اور چیخ و پکار سے بچیں...... بزرگوں کی خدمت واطاعت کو اپنا شعار بنائیں۔ یتیموں پر رحم کریں۔ اپنے آپ کو

ہرگز ایسا نہیں سمجھیں کہ میں تو بہت عبادت کرتی ہوں اور اللہ پاک میری دعا نہیں سنتا یہ (اللہ نہ کرے) کفر کے برابر ہے۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا رحمِ خاص فرمائے، آمین۔

☆☆☆

بچوں کی شادی کے لیے خصوصی عمل......

دو رکعت نفل حاجت کی نیت سے کسی بھی فرض نماز کے بعد پڑھیں اور خضوع خشوع کے ساتھ گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور دعا مانگیں۔

”اے اللہ پاک و طاہر ہے تیری ذات...... (حنان ہے منان ہے، مستعان ہے، یکتا وحدہ لاشریک ہے)

تیری قدرت بیش بہا ہے تو اپنے کرم سے اپنے رحم سے اپنے جود و سخا سے ہم پر عنایت فرما...... ہم اپنے گناہوں پر سچے دل سے نادم ہیں۔ ہماری خطاؤں کو درگزر فرما۔ ہمیں سچی توبہ کی توفیق دے۔ ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق بخش، طاقت دے، ہمت دے...... ہماری مشکلات کو حل کر...... ہمارے لڑکے، لڑکیوں کو پاک دامنی عطا فرما..... نیک ازواج نصیب فرما...... اے پالنے والے، ہماری قسمتیں بنانے والے ہمارے بچوں کے اچھے نصیب کر...... اپنے حبیب پاکؐ کے صدقے میں دنیا و آخرت میں ہمیں سرخرو کر...... ہماری آل اولاد کو ہمارے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔“

آخر میں پروردگارِ عالم کے حضور ہم بھی دعا گو ہیں کہ جن بچیوں کے والدین اپنی بیٹیوں کی

شادی کے لیے ازحد پریشان ہیں میرے آقا رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کے صدقے سے جلد سے جلد ان بچیوں کو بہترین، نیک خصلت اور صالح زوج عطا ہوں، الٰہی آمین۔

☆☆☆

سمندر کے جھاگ کے برابر گناہ معاف

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی دن میں سو مرتبہ کہا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ تو اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں، خواہ سمندر کے جھاگ کے مانند ہوں۔ (بخاری مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے چُن لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے (یہ وظیفہ) سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ (صحیح مسلم)

معلوم ہوا کہ یہ وظیفہ فرشتے بکثرت پڑھتے ہیں۔ آپ بھی کم از کم ایک سو بار روز پڑھ لیا کریں۔

عرش کا خزانہ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن قیس کو کہا۔ ”کیا میں خبردار نہ کروں تجھ کو فرشتوں کے خزانوں میں سے ایک خزانے پر۔“ عبداللہ بن قیسؓ نے کہا حضورؐ! ضرور مجھے خبردار کیجیے...... آپ نے فرمایا۔ ”وہ خزانہ یہ ہے۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ......“ (بخاری مسلم)

نہیں ہے طاقت گناہوں سے پھرنے کی اور نہ قوت نیکی کرنے کی مگر ساتھ اللہ کی مدد سے......

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ...... دَوَاءٌ مِنْ تِسْعَۃٍ وَّ تِسْعِیْنَ دَاءٍ اَیْسَرُھَا اَلْھَمُّ (مشکوٰۃ) یعنی لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ ننانوے بیماریوں کی دوا ہے۔ ادنیٰ ان میں سے غم ہے۔

دین و دنیا کے فکروں سے کفایت کرنے والا وظیفہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص صبح کو پڑھے اور شام کو (آیت ذیل) سات، سات بار۔ اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا اس کو دنیا و آخرت کے فکروں سے آیت یہ ہے۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ (ابن سنی) کافی ہے مجھ کو اللہ، نہیں کوئی معبود سوا اس کے، اسی پر بھروسا کیا میں نے اور وہ رب ہے بڑے تخت کا۔

☆☆☆

ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں لینے کا عمل

حضرت معقل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص صبح کو تین مرتبہ پڑھے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سننے والے جاننے والے کی شیطان مردود سے۔

پھر ایک بار سورۂ حشر کی آخری چار آیتیں پڑھے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں اور اگر اسی طرح شام کے وقت پڑھے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اگر پڑھنے والا اس دن یا اس رات مرجائے تو شہادت کا ثواب پائے گا۔

☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

جگر کا بڑھنا

مسز طارق...... سیالکوٹ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا جگر بڑھا ہوا ہے، لیکوریا بہت زیادہ ہے، ہر قسم کے ٹوٹکے، دوائی وغیرہ استعمال کرتی ہوں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ میری گردن بہت کالی ہے۔ کمر میں درد بھی بہت زیادہ ہے، سانس بھی پھولتا ہے۔ گرمی میں پسینا بھی بہت زیادہ آتا ہے، بدبودار۔ پندرہ سال سے آپ کا رسالہ پڑھتی آرہی ہوں۔ میرے لیے کوئی بہتر نسخہ تجویز کریں،

جواب۔ صحیح تشخیص صحیح علاج کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت مختصراً آپ نے حال لکھا ہے۔ اور نہ کوئی بیماری کی ہسٹری کہ کب سے ہے اور کیا کیا دوائیں کھائیں؟ اور نہ ہی کوئی ٹیسٹ رپورٹس۔ برائے مہربانی CBC,LFT , Whole abdomen الٹرا ساؤنڈ اور Hepatitis B & C کی رپورٹس کرا کر مکمل حال بتائیں تاکہ صحیح تشخیص اور پھر صحیح دوا تجویز کرسکیں گے۔

جسمانی کمزوری

مسز شازیہ...... حیدرآباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال سفید ہونا شروع ہو

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

دسمبر 2017ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

گئے ہیں، لیکوریا بھی ہے۔ میرے منہ پر دانے، کیل مہاسے اور چھائیاں بہت زیادہ ہیں۔ کبھی جلد کا رنگ بڑا صاف سا ہوا کرتا تھا، اب جب سے بیمار ہوں خراب ہوگیا ہے۔ برائے مہربانی میرے لیے اچھی سی دوائیں تجویز کریں جن سے فریش نظر آؤں۔

جواب۔ آپ کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی شادی انتہائی کم عمری میں ہوگئی، پھر اوپر تلے کے بچے، آپ کے اندر خون کی کمی بھی ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Lycopodium 30، Sepia 30 کے 7,7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں، اور Ferrum Pentarkan Ptk 45 کی دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ سادے پانی کے ساتھ لیں، چہل قدمی کیا کریں اور متوازن غذا کا استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ماہانہ نظام

زاہدہ...... فیصل آباد

ماہانہ نظام کی خرابی کا مسئلہ اللہ کا شکر ہے تھوڑا بہتر ہوا ہے۔ لیکن بالکل درد ختم نہیں ہوا ہے۔ پیٹ بھی کم ہوا ہے۔ غیر ضروری بالوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ویسے ہی ہیں بلکہ اپرلپس پر اور واضح ہو رہے ہیں۔

جواب۔ PTK-60 اسی طرح چبتی رہیں اس کے ساتھ Pulsatilla 30 اور Calc Phos-30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ دو ماہ تک۔

وزن بڑھ گیا ہے

نام شائع نہ کریں...... رازق آباد

میں آپ کا یہ سلسلہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مسئلہ میری بیٹی کا ہے۔ اس کا وزن بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پیٹ اور کولھے بہت بھاری ہوگئے ہیں۔ پیٹ باقاعدہ لٹک گیا ہے۔ اس کے ماہانہ نظام میں بے قاعدگی ہے۔ رنگ سانولا ہوگیا ہے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے بن گئے ہیں۔ اکثر سر درد رہتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا وہ کہتی ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف وزن کم کریں۔ چاول، بڑا گوشت، دہی، نان وغیرہ بالکل نہیں کھاتی۔ سیڑھیاں بھی بہت اترتی چڑھتی ہے۔ کالج میں بھی پھرتی رہتی ہے۔ اگلے سال کے شروع میں انشاء اللہ شادی طے کر دی ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھی سی دوا تجویز کر دیں۔

جواب۔ ایام کب شروع ہوئے اور جس عمر میں شروع ہوئے اس وقت اس کی کیا حالت تھی؟ تفصیل سے لکھیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Magnesium Phos Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں دو مرتبہ چوسیں۔ جبکہ Pulsatilla 200 کے پانچ قطرے آدھے گلاس پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ پیئں، Calc Phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ جواب پاکیزہ کے ذریعے ہی دیا جائے گا۔ اس لیے جوابی لفافہ نہ بھیجا کریں۔ اور نہ ہی فون کریں۔

ناک کا گوشت

روحیلہ...... لانڈھی

میں نے آپ کو اپنی بیٹی کی ناک کے بڑھے ہوئے گوشت کا مسئلہ لکھا تھا۔ بیٹی کو دوا سے سانس لینے میں کافی آرام آیا ہے۔ کیا ابھی وہی دوا استعمال کروں؟

جواب۔ جی ہاں مزید ایک ماہ یہی دوا استعمال کریں۔

مسئلہ کچھ اور ہے

اختری...... کورنگی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ دنوں پہلے میرے گردے میں درد ہوا۔ محلے کے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی جس نے نیند کی گولیاں دے دیں۔ گولی کھاؤں تو نیند آجاتی ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پھر درد شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ 6 ماہ علاج

کروانا پڑے گا۔ پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے 6 ماہ علاج کا خرچہ پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا ہر ماہ کا خرچہ تقریباً 10,000 روپے آئے گا۔ میں ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ اتنا مہنگا علاج نہیں کروا سکتی۔ جس کی وجہ سے مایوس ہو گئی ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ تازیست دعاگو رہوں گی۔

جواب۔ رپورٹس کے مطابق خون کی کمی ہے اور جگر کا مسئلہ ہے۔ خط میں آپ نے یہ نہیں لکھا کہ گردے کا درد کس طرف اور کہاں ہوا تھا۔ کیا کھانے سے ہوا تھا۔ اب کیفیت کیا ہو رہی ہے۔ پیشاب، بھوک اور درد کی تفصیل لکھیں۔ کسی اچھی جگہ سے الٹرا ساؤنڈ Whole Abdomen، ESR، CBCHCVLFT کرائیں۔ رپورٹ کمپیوٹر پر ہو ہاتھ سے لکھی نہ ہو۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Berberis VulgQ کے ساتھ ساتھ Carduus Marianus Pentarkan Ptk-23 کے 10 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ پئیں۔ ان کے علاوہ Ferr. Phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں، نظر بھی چیک کرائیں۔

سانس کا مسئلہ

فرزانہ......میر پور

میرے بیٹے جس کی عمر 4 سال ہے بہت سخت بیمار ہے۔ میں آپ کو بہت دکھی ہو کے خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے جلد سے جلد جواب سے نوازیں، میرا بیٹا جب سے پیدا ہوا ہے۔ 4 مہینے ٹھیک رہا ہے۔ اس کے بعد اس کو ہر وقت نزلہ زکام اور شدید کھانسی رہتی تھی۔ ساری رات کھانستا رہتا یا چھاتی بند ہو جاتی تھی اور میں ساری رات اسے گود میں لے کر گزارتی تھی۔ بہت علاج کروائے مگر آرام نہیں آیا۔ پھر جب تقریباً ڈیڑھ سال کا تھا تب سے ایسی کھانسی لگی ہے کہ آج تک ٹھیک نہیں ہوئی اور اب دمہ بن چکا ہے۔ بار، بار نیبولائز کرتے ہیں، رات میں کئی بار نیبولائز کرتے ہیں اور سانس اتنی شدت سے بند ہوتی ہے کہ بچہ تڑپتا ہے اور کہتا ہے امی میں مر گیا۔ کبھی کبھی نیبولائز کرنے سے بھی فرق نہیں پڑتا ہے اور اب صبح شام انہیلر کے بھی دو پف دیتے ہیں تو چار پانچ گھنٹے گزرتے ہیں۔ یہاں پر ہومیو ڈاکٹر سے تین مہینے علاج کروایا مگر آرام نہیں آیا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے پھیپھڑے سکڑ گئے ہیں۔ ایک اور ڈاکٹر کے مطابق بچے کی سانس کی نالیاں تنگ ہو گئی ہیں اور ریشے سے بھر جاتی ہیں۔ اس لیے سانس نہیں آتا۔ کبھی کبھی الٹی آتی ہے تو کچا ریشہ بہت نکلتا ہے۔ اور جب سانس کھینچتا ہے تو گردن کے نیچے اور پسلیوں کے درمیان میں گڑھا بنتا ہے۔ کمزور بھی بہت ہے۔ بازو بہت پتلے ہیں اور جسم پر چمڑا ہی نظر آتا ہے۔ گوشت کا تو نام ونشان بھی نہیں ہے۔ اب بھی، کبھی کہتا ہے کہ میرے کان بند ہو گئے ہیں نظر بھی بہت کمزور ہے۔ کلاس میں بورڈ کے بالکل پاس بیٹھتا ہے تب نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی آنکھ میں ٹیڑھا پن ہے جس کی وجہ سے اسے نظر نہیں آتا اور یہ مسئلہ آپریشن سے حل ہو گا۔ اس کے بارے میں بھی بتائیں۔ بظاہر دیکھنے میں آنکھیں ٹھیک لگتی ہیں۔ میرے بیٹے کے لیے کوئی اچھی سی دوا بتا دیں۔

جواب۔ خاندان میں کسی کو ٹی بی یا دمہ ہو یا نزلہ زکام کا مسئلہ ہو اور ماں دورانِ حمل اپنی صحت کا خیال نہ رکھے یا وہ خود کمزور ہو تو اس کے ہاں ہونے والی اولاد بھی کمزور اور قوتِ مدافعت کی بھی کمزوری ہوتی ہے۔ دودھ پلانے کے زمانے میں بھی ماں اپنی صحت کا خیال نہ رکھے تو بچے مختلف بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اب آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہیں کیونکہ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اپنی صحت کا پہلے خیال کریں۔ بچے کو تازہ ہوا زیادہ دیں، گائے اور بکرے کا گوشت کھلائیں، موسم کی سبزیوں کے ساتھ موسم کے تمام پھل دیں۔ اصلی دیسی مرغی اور انڈا فائدہ مند ہے۔ میدے سے بنی چیزیں پراٹھا، بسکٹ، ڈبل روٹی، پاپے نہ دیں

اور چینی کی چیزوں سے بھی پرہیز کرائیں۔ نہانے کے بعد پنکھے، اے سی یا دھوپ میں فوراً نہ جائیں اس طرح گرمی سے یکدم ٹھنڈی جگہ میں نہ آئیں۔ ٹھنڈا پانی، شربت، کولڈ ڈرنکس، قلفی، برف جیسی چیزوں سے بچیں۔ ناریل پانی دیں۔ شہد اصلی صبح ناشتے میں دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Grindelia Pentarkan-Ptk-51 کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں، ایمرجنسی کی صورت میں اس کے 15 سے 20 قطرے آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے سے دے سکتی ہیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے دوبارہ مطلع کریں۔

مختلف مسائل

شائزے......اٹک

کچھ عرصے سے میرے ساتھ کچھ مسائل ہیں وہ لکھ رہی ہوں۔ دائیں آنکھ بڑی اور بائیں آنکھ چھوٹی لگتی ہے۔ ماہانہ ایام صرف ایک دن کے ہوتے ہیں۔ چہرے پر بال ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے اور گڑھے بن گئے ہیں۔ نیند بالکل نہیں آتی۔ آتی بھی ہے تو 3 سے 4 گھنٹے اور بار بار آنکھ کھلتی رہتی ہے۔ ٹانگوں پر اکثر اور باقی جسم پر کبھی کبھار اس قدر خارش ہوتی ہے کہ خون بہنے لگتا ہے۔ سانس کی تکلیف ہے۔ انہیلر کا استعمال کرتی ہوں۔ کچھ مخصوص مہینوں میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ سینے میں اکثر جلن رہتی ہے اور گیس بنتی ہے۔ گردن معمولی سی سوجی ہوئی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں کبھی کبھار درد ہوتا ہے۔ پٹھوں میں درد رہتا ہے۔ چہرے کی جِلد ڈھیلی ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے پاس لائنیں پڑ گئی ہیں۔ سر کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے اب بال بے حد ہلکے ہو گئے ہیں اور تیزی سے سفید ہو رہے ہیں۔ بال گر بھی رہے ہیں۔ میرے لیے اچھا سا علاج تجویز کریں کہ میں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sulphur 200 کی ایک خوراک (5 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی) صبح نہار منہ لے کر ایک دن کے بعد مندرجہ ذیل ادویات شروع کریں۔ Asafoetida Pentarkan- Ptk-12 دس قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ، Ferrum Pentarkan-Ptk-45 2 گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ، GrindeliaPentarkan-Ptk-51 10 قطرے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ، Magnesium Phosphorium-Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ، Passiflora Pentarkan- Ptk-66، 15 قطرے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ شام اور رات کو، Urtica Pentarkan-Ptk-86 دس قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔

چہرے اور ہاتھوں پر ورم

نشاط بانو......کراچی

میں آپ کا کالم ہومیو کلینک کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، کچھ عرصے سے میں مختلف بیماریوں میں گھری ہوئی ہوں۔ جسم ہر وقت سست رہتا ہے۔ ذرا سا چلتی ہوں تو گرمی اور گھبراہٹ سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور گھبراہٹ بھی ہوتی ہے۔ پیشاب کے بعد قطرے بھی آتے ہیں۔ حاجت بھی صحیح نہیں ہوتی، دو تین بار جانا پڑتا ہے۔ صبح اٹھتی ہوں تو ہاتھوں اور چہرے پر ورم ہوتا ہے۔ ہاتھوں کا ورم کچھ دیر بعد کم ہو جاتا ہے لیکن چہرے پر ہر وقت ورم رہتا ہے۔ پیریڈ ایک دن بھی صحیح نہیں ہوتے۔ لیکوریا کی بھی شکایت ہو گئی ہے۔ بلڈ پریشر کے لیے میں ٹینورمن لیتی ہوں۔ میں اپنی بیماریوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میرے لیے اچھا سا نسخہ تجویز کریں۔

جواب۔ آپ کے اعتماد کرنے کا اور پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ نے اپنا وزن اور عمر نہیں لکھی۔ آپ کراچی میں رہتی ہیں بہتر ہے کہ ٹائم لے کر آ کر ملیں۔ بلڈ ٹیسٹ کرائیں، CBCLipid،Urea,Uric Acid ESR

profile اور فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ 10 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ Solidago Pentarkan- Ptk-79، 10 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ Viscum Pentarkan- Ptk-89، ایک گولی دن میں تین مرتبہ Magnesium Phosphorium Pentarkan- Ptk-60، نمکین چیزیں اور مرغن اشیا سے پرہیز کریں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

پٹھوں میں درد اور کھنچاؤ

عشرت عزیز......لاہور

عرصہ 6 سال سے پٹھوں میں کھنچاؤ کی شکایت ہے، دوسال پہلے ڈاکٹر کا علاج بھی کرایا، وقتی افاقہ ہوتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ گردن، ٹانگوں بازوؤں میں شدید کھنچاؤ ہے، ہاتھ پاؤں میں کڑلیں پڑتی ہیں، نماز بھی نہیں پڑھی جاتی۔ روزانہ دبوانا پڑتا ہے تب کہیں رات گزرتی ہے، کولہے اور پسلیوں کے نیچے 10 منٹ چلنے سے درد شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو میں تکیہ بھی نہیں رکھتی کہ گردن اکڑ جاتی ہے۔ بلڈ پریشر رہتا ہے اور گیس بھی ہوتی ہے۔ اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔

جواب۔ جتنا پیدل چل سکتی ہیں چلیں، تیز مرچ مصالحے اور مرغن کھانوں سے بچیں، Urea, Uric Acid، E S R، CBCLipid profile اور HbA1C,Calc.Vit-D, کرائیں۔ اس وقت تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Carbo Vegetabilis Pentarkan- Ptk-22 ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں، Rhus toxicodendron Pentarkan- Ptk-73 ایک گھونٹ سادہ پانی میں 11 قطرے دن میں 4 بار لیں۔ Spigelia Pentarkan- Ptk-81، 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا

رافعہ......لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے پانچ چھ سالوں سے لیکوریا کی شکایت ہے جس کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ کچھ عرصے میں میرا وزن بے حد بڑھ گیا ہے۔ میرے لیے دوائیں تجویز کریں۔

جواب۔ آپ Serum Prolactin, Insulin, Thyroid Profile چیک کرا کر رپورٹ بھیجیں۔ تمام چیزوں سے بچیں جو ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔ Iodium 30, Natr-Mur 30, Borax 30 کے 7,7 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

پیٹ میں گیس

اُمِّ عبداللہ......سیالکوٹ

میرا بیٹا 9 سال کا ہے۔ اس کو گیس پرابلم ہے۔ سارا دن گیس خارج کرتا ہے۔ اور گرمیوں میں صبح نہار منہ یا ناشتے کے بعد الٹی کر دیتا ہے۔ تمام گرمی اس کا یہ مسئلہ رہتا ہے۔

جواب۔ بچے کو سوتے وقت دودھ نہ پلایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Carboveg 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 2 مرتبہ دیں (صبح وشام) 15 دن بعد حال بتائیں۔ کھانے میں ہلکی غذا دیں۔